بلوغ المرام

من أدلة الأحكام

(جلد اوّل)

تأليف

ابو الفضل شهاب الدين احمد ابن حجر العسقلانی

(۷۷۳-۸۵۲ھ)

اتحاف الکرام شرح بلوغ المرام

شارح

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری

مترجم

مولانا عبدالوکیل علوی

تصحیح و تنقیح

مولانا ارشاد الحق الاثری

دار السلام

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

ریاض ۔ لاہور

فہرست مضامین

جلد اوّل

فہرست ائمہ مشاہیر
(حالات زندگی)

فہرست اسماء الرواۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض ناشر

دارالسلام -- الریاض' لاہور -- اپنی علمی و دینی مطبوعات کی وجہ سے دینی اور علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ الحمدللہ' اس کی مطبوعات ہی اس کا بہترین تعارف ہیں.جو تحقیقی اعتبار سے بلند پایہ بھی ہیں' زبان و بیان کے لحاظ سے معیاری بھی' اور طباعت و کتابت کے ظاہری حسن و جمال سے آراستہ بھی۔

اس کے اسی معیار اور کام نے اسے نہ صرف پاک و ہند کا ایک معیاری نشریاتی ادارہ بنا دیا ہے بلکہ اسے ایک بین الاقوامی ادارے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص اور اس کی مہربانی کا نتیجہ اور کارکنان ادارہ اور اس سے وابستہ اہل علم و تحقیق کی محنت و جانفشانی کا صلہ ہے' بس پر ہم بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز اور وابستگان ادارہ کے مشکور ہیں۔ جَزَاهُمُ اللهُ أَحْسَنَ الْجَزَاءِ، وَوَفَّقَنَا اللهُ وَإِيَّاهُمْ لِمَا يُحِبُّ وَيَرْضَى

ادارے کی مطبوعات میں ایک اہم عربی کتاب "بلوغ المرام فی ادلۃ الاحکام" بھی ہے' ہم نے اسے پہلی مرتبہ جیبی سائز میں نہایت دیدہ زیب انداز میں شائع کیا' اس سے قبل اسے مختصر عربی شرح کے ساتھ شائع کیا تھا' یہ شرح عالم اسلام کی ممتاز شخصیت مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری حفظہ اللہ تعالیٰ کی تحریر کردہ ہے۔

"بلوغ المرام" پاک و ہند کے دینی مدارس میں بھی داخل نصاب ہے اور علمی و دینی حلقوں میں بھی متد اول۔ اس لیے اس کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ حدیث کا یہ مجموعہ اپنے ایجاز و جامعیت کے اعتبار سے یقیناً بے مثال ہے' چنانچہ ہم نے اس کی اسی حیثیت کے پیش نظر اسے اردو میں مولانا مبارکپوری حفظہ اللہ کی شرح کے ساتھ شائع کرنے کا پروگرام بنایا' تاکہ اردو دان حلقہ بھی اس سے

استفادہ کر سکے۔

چنانچہ اس کے لیے ہم نے اپنے فاضل دوست اور برادر محترم مولانا عبدالوکیل علوی صاحب کی خدمات حاصل کیں' انہوں نے اسے اس کی عربی شرح سمیت اردو کے قالب میں ڈھال دیا' فاضل محقق مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ (فیصل آباد) نے اس پر نظرثانی فرمائی' اس کے بعد بھی اس کی نوک پلک درست کرنے میں ادارے کے بعض اور رفقاء نے بھی حصہ لیا۔

عزیزم حافظ عبدالعظیم سلمہ اللہ تعالیٰ میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ اس سارے کام کی نگرانی میں انہوں نے بڑی محنت فرمائی اور اسے بہتر سے بہتر بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اس طرح رفیق ادارہ جناب محمود الحسن اسد نے بھی اس کی تصحیح و نظرثانی میں بڑی پرخلوص محنت کی ہے۔ جَزَاهُمُ اللهُ أَحْسَنَ الْجَزَاءِ

اس تمام تر سعی و کاوش کے باوجود اگر اس میں کچھ فروگزاشتیں رہ گئی ہوں تو قارئین کرام ان سے ہمیں آگاہ فرمائیں' ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں مزید اصلاح کر دی جائے گی۔ علمی و تحقیقی کاموں میں اصلاح و نظرثانی کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے' اس لیے ادارہ اس کو قارئین کی تجاویز و اصلاح کی روشنی میں مزید بہتر بنانے میں کبھی تامل نہیں کرے گا۔

خادم' توحید و سنت

عبدالمالک مجاہد

دارالسلام۔ الریاض لاہور

ربیع الاول ۱۴۱۸ھ / جولائی ۱۹۹۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ عَلَی الْعَالَمِیْنَ نَذِیْرًا وَبَعْدُ:

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام" اپنے موضوع میں درج ذیل متعدد خصائص کی بدولت نمایاں اور ممتاز حیثیت کی حامل ہے' یہ کہ مؤلف نے اس میں احکام کی احادیث میں سے ایسی احادیث کے جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے جو عموماً صحیح اور قوی ترین ہیں' جس سے اس فن کا حسن و جمال کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ اور لمبی احادیث کا شاندار انداز میں اختصار پیش کیا اور حدیث کو ائمہ حدیث کی طرف منسوب کرنے میں بڑی وسعت سے کام لیا ہے اور صحت و حسن اور ضعف کے اعتبار سے ہر حدیث کا درجہ بیان کرنے کا اعتناء کیا ہے' جیسا کہ بہت سی علل کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے۔ واضح ہو کہ ان کے انتہائی عمدہ اور نفیس کاموں میں سے ایک کام یہ بھی ہے کہ آپ حدیث بیان کرنے کے بعد حدیث کے بعض طرق میں وارد متعدد ٹکڑے اور اضافے بھی بیان کرتے ہیں' جو مطلق کو مقید اور مجمل کو مفصل بنانے اور مغلق کو واضح' تعارض کو رفع اور باہمی اختلاف کو دور کرنے کا فائدہ دیتے ہیں' بلکہ بعض دفعہ یہ اضافے اختلاف کے موقع پر ایسی نص ثابت ہوتے ہیں' جو تاویلات کا قلع قمع اور بحث و تحقیق سے مستغنی کر دیتی ہے۔

مذکورہ بالا اور دیگر متعدد خصوصیات کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اہل علم میں اس کتاب کو مقبول عام بنایا' مشرق و مغرب کے طلبہ کے ہاتھوں کا زینہ بنی اور اہل مدارس نے اسے نصاب میں شامل کر لیا اور اس فن کے عالی مقام علماء نے اس کی شروح و توضیحات کا اہتمام کیا اور متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

سابق الذکر اہتمام و اعتناء کے باوجود متعدد بھائیوں نے اپنی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے اس کتاب کی ایسی مختصر مگر نفیس شرح لکھنے کی تجویز پیش کی' جس میں قدیم و جدید انداز کی معروف و مشہور شروح کے التزام کے ساتھ ساتھ معانی کی تفہیم اور خاص طریقے سے ان کی تسہیل کے پہلو کو مد نظر رکھا گیا ہو' چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگتے ہوئے اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا و آخرت میں

میرے اور اہل علم کے لیے مفید اور نافع بنائے گا' اس عمل عظیم کو شروع کیا' بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا اہل اور اس پر قادر ہے۔

یاد رہے کہ قاری کو میری اس لطیف شرح میں بعض مقامات پر طوالت محسوس ہو گی' جو کہ اس شرح میں میرے عام اسلوب کے برعکس ہو گی' تاہم یہ اس وقت ہو گا جب میں کسی ایسے عمدہ فائدہ کا اثبات کرنا چاہوں جو عام کتابوں میں ناپید ہو یا میں یہ خیال کروں کہ حق اکثر یا جملہ شارحین کے مذہب کے برعکس ہے یا میں ایسے غامض اور مخفی امور پاؤں جن کے حل میں شارحین نے محض احتمالات پر بھروسہ کیا ہو' جب کہ وہ طبعی' تاریخی' جغرافیائی اور دیگر قسم کی تحلیل کی روشنی میں علمی اور دقیق بحث کے محتاج ہوں' چنانچہ ایسے مقامات پر میں بحث میں کچھ طوالت دینے پر مجبور ہوا تا کہ حق اور صحیح مسلک واضح اور نمایاں ہو سکے۔ اللہ ہی توفیق دینے والا ہے اور وہی مجھے کافی اور اچھا کارساز ہے۔

وَصَلَّى اللهُ عَلَى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ

صفی الرحمٰن مبارکپوری
شعبان ۱۳۹۴ھ

مؤلف کتاب کے مختصر حالات

ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد بن محمد بن احمد کنانی شافعی' المعروف ابن حجر عسقلانی' سنت نبوی کا علم بلند کرنے والے قاضی القضاۃ اور حفاظ و رواۃ میں منفرد ہیں۔ دس شعبان ۷۷۳ھ کو مصر میں پیدا ہوئے اور مصر ہی میں پرورش پائی اور نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور الحاوی اور مختصر ابن حاجب اور دیگر کتب یاد کیں اور اپنے کسی ایک وصیت کرنے والے کے ساتھ مکہ مکرمہ کا سفر کیا اور وہاں اہل علم سے سماع کیا' پھر آپ کو طلب حدیث کا شوق ہوا تو آپ حجاز' شام اور مصر کے کبار شیوخ الحدیث سے علم حدیث حاصل کرنے میں مشغول ہوئے' چنانچہ آپ نے دس سال تک علم حاصل کرنے کے لیے زین عراقی کے پاس قیام کیا اور بلقینی' ابن الملقن اور دیگر اہل علم سے فقاہت حاصل کی' آپ کو جلیل القدر ائمہ و شیوخ الحدیث کے پاس بیٹھنے اور علم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا' جو کسی دوسرے کو میسر نہ آیا' جیسا کہ متقدم الذکر ائمہ و شیوخ نے آپ کو فتویٰ دینے اور تدریس کرنے کا اجازت نامہ عطا کیا۔ اور آپ نے دونوں اصول یعنی کتاب و سنت اور دیگر علوم عز بن جماعہ سے' لغت المجد فیروز آبادی سے' عربی زبان عماری سے' ادب و عروض بدر مشتگی سے اور کتابت جماعہ سے حاصل کی اور فنون و علوم میں اس قدر سعی کی کہ ان کی چوٹیوں کو چھونے لگے اور قرأت سبعہ میں قرآن مجید کا کچھ حصہ تنوخی سے پڑھا۔

پھر علم حدیث کی نشرواشاعت کی طرف متوجہ ہوئے اور مطالعہ' قرأت' تدریس و تصنیف اور افتاء کی صورت میں اس پر جمے رہے اور متعدد جگہوں میں تفسیر' حدیث' فقہ اور وعظ و نصیحت کی تدریس کی اور ازھر' جامع مسجد عمرو اور دیگر مقامات پر خطبہ دیتے رہے اور اپنے سینے میں محفوظ خزینے کی املاء کروائی اور بڑے بڑے فضلاء اور نامور علماء آپ سے فیض یاب ہوئے اور آپ کے علمی چشمے سے سیراب ہونے کے لیے آپ کے پاس آتے رہے۔

آپ کی تصانیف ۱۵۰ کتب سے متجاوز ہیں۔ علم حدیث کے فنون میں شاید ہی کوئی ایسا فن ہو جس میں آپ نے ضخیم کتب تصنیف نہ کی ہوں' اور آپ کی یہ تصانیف آپ کی حیات ہی میں طباعت کے زیور سے آراستہ ہو گئی تھیں۔ اور بادشاہ اور امراء ایک دوسرے کو ان کتب کے تحائف دیا کرتے تھے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ اگر "فتح الباری شرح صحیح بخاری" کے علاوہ آپ کی کوئی اور تالیف نہ بھی ہوتی تو یہی

فتح الباری ہی آپ کی شہرت اور آپ کے عظیم المرتبت ہونے پر واقفیت حاصل کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ آپ کی یہ کتاب سنت نبوی کے لیے قاموس کا مقام رکھتی ہے۔ ۸۱۳ھ میں اس کا مقدمہ مکمل کرنے کے بعد آپ نے ۸۱۷ھ میں اس کی تالیف کا آغاز کر کے شروع رجب ۸۴۲ھ میں اس کی تکمیل کی۔ اور اس کی تکمیل پر آپ نے ایک دعوت عام کا اہتمام کیا' جس میں تمام عام و خاص مسلمان شریک ہوئے۔ اس دعوت پر آپ نے پانچ سو دینار خرچ کیے اور ایک بادشاہ نے آپ سے یہ کتاب طلب کر کے تین سو دینار میں خرید لی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سنت نبوی کی نصرت پر نہایت اچھا صلہ عطا فرمائے۔ آمین !

اسی طرح حدیث کی کتابوں میں سے ان کی ایک کتاب "بلوغ المرام فی ادلۃ الاحکام" جو اس وقت قارئین کے ہاتھوں میں ہے' گو یہ کتاب مختصر ہے' مگر اس کی بہت سی شروحات لکھی گئی ہیں جن میں ایک یہی مولانا صفی الرحمان مبارکپوری حفظہ اللہ تعالیٰ کی اتحاف الکرام ہے جسے اردو دان طبقہ کے لیے اردو پیرائے میں ڈھالا گیا ہے۔

پہلے پہل آپ (حافظ ابن حجر رحمہ اللہ) مصری علاقوں کے قاضی بنے' پھر چند سال کے بعد مستقل طور پر شاہی علاقے بھی آپ کی قضاء میں شامل کر دیے گئے' جو اکیس سال سے زائد عرصہ تک آپ کے زیر قضاء رہے' شروع میں آپ قاضی بننے سے پرہیز کرتے رہے' حتیٰ کہ بادشاہ وقت نے آپ کو ایک خاص مقدمے میں قاضی مقرر کیا' پھر آپ بلقینی کے اصرار پر ان کے نائب بنے' بلقینی کی جانشینی کی وجہ سے انہیں کئی اور لوگوں کا نائب بننا پڑا' یہاں تک کہ آپ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر ہوئے' آپ کی یہ تقرری ۱۲ محرم بروز ہفتہ ۸۲۷ھ عمل میں آئی' پھر سات مرتبہ آپ کی قاضی القضاۃ کے عہدے پر تقرری ہوئی اور سات ہی مرتبہ اس سے الگ ہوئے' پھر جمادی الثانی ۸۵۲ھ کو آخری مرتبہ اس عہدہ سے دستبردار ہوئے اور اسی سال میں آپ کی وفات ہوئی۔

اس کے علاوہ آپ' تواضع' بردباری' صبر و تحمل' خوش طبعی' وسعت و ظرافت' قیام و صیام' احتیاط و ورع' جود و سخاء' برداشت' باریک و لطیف کلام اور عمدہ اور نفیس نوادر کی طرف میلان میں مشہور و مختار تھے' جیسا کہ آپ ائمہء متقدمین و متاخرین اور اپنے پاس بیٹھنے والے ہر چھوٹے بڑے کا ادب و احترام کرنے میں منفرد اور بے مثال تھے۔

آپ بروز ہفتہ آٹھ ذی الحجہ ۸۵۲ھ کو عشاء کی نماز کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اچھا ثواب اور بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ آمین !

تلخیص از "التبر المسبوک وغیرہ"

کلمۂ مؤلف

بسم الله الرحمن الرحيم

آغاز اللہ رحمٰن اور رحیم کے نام سے

الحَمْدُ لِلَّهِ عَلَى نِعَمِهِ الظَّاهِرَةِ وَالبَاطِنَةِ قَدِيْماً وحَدِيثاً، والصَّلاَةُ والسَّلامُ عَلَى نَبِيِّهِ وَرَسُولِهِ مُحَمَّدٍ وآلِهِ وصَحْبِهِ الَّذِيْنَ سَارُوا فِي نُصْرَةِ دِينِهِ سَيْراً حَثِيثاً، وعلى أتْبَاعِهِمُ الَّذِين وَرِثُوا العِلْمَ، وَالعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ، أَكْرِمْ بِهِم وَارِثاً ومَوْروثاً.

ظاہری، باطنی، قدیم و جدید انعامات و احسانات کی بنا پر تعریف صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے اور درود و سلام اس کے نبی اور رسول حضرت محمد ﷺ پر اور (مزید برآں) اس کی آل اور اس کے اصحابؓ پر جنہوں نے آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی نصرت و اشاعت کے لیے اپنی پوری تندہی اور برق رفتاری کا مظاہرہ کیا اور تابعین کرامؒ پر جو "العلم" کے وارث ہوئے اور حقیقت ہے بھی یہی کہ علماء ہی انبیاء کرامؑ کے وارث ہوتے ہیں۔ کیا خوب ہیں یہ وارث اور کتنا عمدہ اور اچھا ہے یہ ورثہ۔

أما بَعدُ، فَهذَا، مُخْتَصَرٌ يَشْتَمِلُ عَلَى أُصُولِ الأَدِلَّةِ الحَدِيْثِيَّةِ لِلأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ، حَرَّرْتُه تَحرِيْراً بَالِغاً، لِيَصِيْرَ مَنْ يَحفَظُه مِنْ بَينِ أَقْرَانِهِ نَابِغاً، ويَسْتَعِيْنَ بِهِ الطَّالِبُ المُبْتَدِي، ولاَ يَسْتَغْنِي عَنْهُ الرَّاغِبُ المُنْتَهِي.

حمد و صلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جو احادیث میں احکام شرعیہ کے بنیادی دلائل پر مشتمل ہے۔ میں نے اس کی تنقیح و تہذیب میں بڑی جانفشانی اور تندہی سے کام لیا ہے تاکہ اسے یاد کرنے والا اپنے ساتھیوں میں بحیثیت ماہر اور بڑی شان والا بن جائے۔ مبتدی طالب علم اس کے ذریعہ مدد طلب کرے اور منتہی شوقین بھی اس کی اہمیت و ضرورت سے مستغنی نہ رہ سکے۔ (یعنی یہ کتاب مبتدی اور منتہی دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔)

وَقَدْ بَيَّنْتُ عَقِبَ كُلِّ حَدِيثٍ مَنْ أَخْرَجَهُ مِنَ الأَئِمَّةِ، لِإِرَادَةِ نُصْحِ

میں نے ہر حدیث نقل کرنے کے بعد اس محدث کا نام بھی بیان کر دیا ہے جس نے امت کی خیر

الأُمَّة، فَالمُرَادُ بِالسَّبْعَةِ: أَحْمَدُ والبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ وأَبُو دَاوُدَ والنَّسَآئِيُّ والتِّرْمِذِيُّ وَابنُ مَاجه، وَبِالسِّتَةِ: مَنَ عَدَا أَحْمَدَ، وبِالخَمْسَةِ: مَنْ عَدَا البُخَارِيَّ وَمُسْلِماً، وَقَدْ أَقُولُ: الأَرْبَعَةُ وأَحْمَدُ وَبِالأَرْبَعَة: مَنْ عَدَا الثَّلاثَةَ الأُوَلَ، وَبِالثَّلاثَةِ: مَنْ عَدَاهُمْ وَالأَخِيْرَ، وبالمُتَّفَقِ: البخاريُّ وَمُسْلِمٌ، وَقَدْ لاَ أَذْكُرُ مَعَهُمَا غَيْرَهُمَا، وَمَا عَدَا ذَلِكَ فهُو مُبَيَّنٌ.

خواہی کے لیے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ جہاں میں نے ﴿ اخرجه السبعة ﴾ نقل کیا ہے اس سے میری مراد امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ' بخاری رحمۃ اللہ علیہ ' مسلم رحمۃ اللہ علیہ ' ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ ' ترمذی رحمۃ اللہ علیہ ' نسائی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور جہاں ﴿ اخرجه الستة ﴾ نقل کیا ہے اس سے مراد امام احمد بن حنبل کے ماسوا باقی تمام آئمہ ہیں اور ﴿ اخرجه الخمسة ﴾ سے مراد بخاری و مسلم کے علاوہ باقی پانچ امام ہیں اور کبھی میں ﴿ اخرجه الاربعة ﴾ کہتا ہوں اور ﴿ اربعة ﴾ سے مراد پہلے تین امام یعنی احمد' بخاری اور مسلم کے علاوہ باقی آئمہ مراد ہوتے ہیں اور ﴿ اخرجه الثلاثة ﴾ سے مراد پہلے تینوں اور آخری کے علاوہ بقیہ تین امام مراد ہیں (یعنی امام ابوداؤد' نسائی' ترمذی) اور ﴿ متفق علیه ﴾ سے مراد بخاری اور مسلم ہیں اور بسا اوقات میں بخاری و مسلم کے علاوہ دوسرے آئمہ کا ذکر چھوڑ دیتا ہوں۔ متذکرہ بالا صورتوں کے ماسوا باقی تمام صورتوں میں روایت کرنے والے آئمہ کا ذکر ہر موقع پر نمایاں طور پر ذکر کر دیتا ہوں۔

وَسَمَّيْتُه **بُلُوغُ المُرام مِنْ أَدِلَّةِ الأَحْكَام**، واللَّهَ أَسْأَلُ أَن لاَّ يَجْعَلَ مَا عَلِمْنَاهُ عَلَيْنا وَبَالاً وَأَنْ يَرْزُقَنَا العَمَلَ بِمَا يَرْضَاهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى.

میں نے اس مختصر کتاب کا نام ﴿ بلوغ المرام من ادلة الاحکام ﴾ تجویز کیا ہے۔

آخر میں رب کائنات کے حضور دست بدعا ہوں کہ وہ ہمارے علم کو ہمارے لیے وبال نہ بنائے بلکہ اپنے پسندیدہ اور محبوب عمل کی توفیق سے نوازے۔ آمین۔

لغوی تشریح: ﴿ بسم الله الرحمن الرحيم ﴾ سے مؤلف نے اپنی کتاب کا آغاز قرآن پاک کے طریقہ کی پیروی اور نبی ﷺ سے ایسے پسندیدہ اسلوب کے ساتھ ابتداء کرنے کی تعمیل کے لیے کیا ہے۔ ﴿ الحمد ﴾ میں حمد سے مراد ہے بہترین تعریف۔ بہترین اسلوب کے ساتھ جو انسان کے اختیار میں ہو۔ ﴿ النعم ﴾ ن پر دو اعراب منقول ہیں۔ کسرہ اور فتح۔ یہ جمع ہے اس کا واحد نعمة ہے۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے کہ جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ ﴿ الظاهرة ﴾ سے مراد ایسی نعمتیں ہیں جن کا انسان ادراک کر سکتا ہے اور شعور رکھتا ہے۔ ظاہری انعامات و احسانات میں انسان کی شکل و صورت کا موزوں و مناسب بنانا اور لذیذ و عمدہ طرح طرح کے کھانے جو

اس کے منہ کے ذریعہ شکم میں جاتے ہیں شامل ہیں اور ظاہری نعمت سے اسلام بھی مراد ہے۔ ﴿ الباطنہ ﴾ ایسے انعامات جن کا انسان ادراک نہیں کر سکتا۔ بے شمار نعمتیں ایسی ہیں جو ارض و سماء میں ہی نہیں بلکہ انسان کے اپنے نفس میں پائی جاتی ہیں۔ جن کا علم بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور ایسی بہت سی نعمتیں ہیں جن کا انسان کو پہلے علم نہیں تھا پھر بعد میں اس کے علم میں آئی ہیں۔ باطنی نعمتوں میں عیوب پر پردہ پوشی بھی شامل ہے۔ قدیم و جدید سے مراد ایسی نعمتیں ہیں جن سے انسان نے اپنی زندگی کی سہولت اور آسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی عنایت کردہ عقل و خرد کو استعمال کر کے معیشت و معاشرت اور تمدن کے لیے ایجادات کی ہیں۔ دور جدید کے انکشافات نے انسانی تمدن کو ایسی نعمتوں سے روشناس کرایا ہے جن کے ذریعہ انسان بحر و بر تو درکنار فضا میں ہوا سے تیز رفتار ایجاد کی وجہ سے ہوا کے دوش پر سوار ہو کر مہینوں کا سفر دنوں میں طے کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ چند لمحوں میں ہزارہا میل دور بیٹھے ہوئے انسان سے گفتگو کر سکتا ہے۔ ﴿ الصلوۃ ﴾ کے معنی دعا رحمت' بزرگی اور عزت و تکریم کے ہیں ﴿ السلام ﴾ آفات ظاہری و باطنی سے تحفظ۔ مصنف نے کتاب کا آغاز حمد و ثنا کے بعد قرآن مجید میں رب کائنات کے ارشاد صلوا علیہ وسلموا تسلیما کی تعمیل اور سلف کی پیروی میں صلوٰۃ و سلام سے کیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ رب العزت نبی کریم ﷺ کی عزت افزائی فرمائے اور آپ ﷺ کی شان بلند کرے۔ ﴿ ال ﴾ آدمی کے گھر کے افراد بھی اس میں شامل ہیں اور اس کے پیروکار بھی۔ یعنی اس لفظ میں بڑے لوگوں کی اولاد اور ان کے اتباع و پیروکار بھی شامل ہیں۔ مثلاً ال ابراہیم سے جس طرح ان کی اولاد مراد ہے اسی طرح ان کے متبعین بھی مراد ہیں بعینہ جس طرح ال فرعون میں فرعون کی اولاد بھی شامل ہے اور اس کے نظریہ کے پیروکار بھی۔ ﴿ صحبہ ﴾ فتح یعنی زبر کے ساتھ۔ صاحب کی جمع ہے اور صحابی سے مراد وہ شخص ہے جس نے نبی کریم ﷺ سے بحالت ایمان ملاقات کی ہو اور ایمان کی حالت میں وفات پائی ہو۔ اس میں اور بھی اقوال ہیں مگر زیادہ صحیح یہی ہے۔ ﴿ الحثیث ﴾ تیز رفتاری' تیز گامی۔ ﴿ اتباع ﴾ ہمزہ کے فتح یعنی زبر اور تاء کے سکون۔ تابع کی جمع ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین اسلام کے حاصل کرنے اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے ان تھک کوششیں کیں۔ تحصیل علم کے بعد اس کے دقیق مسائل نکالے۔ یہ بزرگ اگر جانفشانی اور سعی و جدوجہد کر کے علم حقیقی ہم تک نہ پہنچاتے تو آج انسانیت کفر و الحاد کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی پھرتی۔ ﴿ اکرم بہم فعل تعجب ﴾ یعنی کتنے معزز و مکرم ہیں یہ لوگ۔ ﴿ وارثا ﴾ اکرم ھم میں ضمیر مجرور کی تمیز کے طور پر ہے۔ اسے منصوب لایا گیا ہے۔ یعنی تابعین صحابہ کرامؓ سے دین حقیقی کے علم کو وراثت میں پانے کی وجہ سے بہت ہی معزز و مکرم ہیں۔ ﴿ اما بعد ﴾ حرف شرط ہے اور بعد کے "د" پر ضمہ ہے گویا مبنی بر ضمہ ہے۔ یہاں ظرف واقع ہو رہا ہے مضاف الیہ کی نیت موجود ہے مگر اضافت بظاہر موجود نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حمد و صلوٰۃ کے بعد۔ ﴿ اصول ﴾ جمع ہے اصل کی۔ جس پر کسی چیز کا انحصار ہو۔ ﴿ الادلۃ ﴾ ہمزہ کے فتح "د" کے کسرہ اور "ل" کی تشدید دلیل کی جمع ہے۔ لغوی اعتبار سے دلیل کا معنی مطلوب و مقصود کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔ ﴿ الاحکام ﴾ حکم کی جمع ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا خطاب جو مکلفین کے افعال سے متعلق ہو۔ ﴿ حررتہ ﴾ تحریر سے ہے جس کے معنی تنقیح تہذیب کے ہیں۔ ﴿ نابغہ ﴾ عظیم الشان ماہر کو کہتے ہیں۔ ﴿ المبتدی ﴾ فن

حدیث کا ابتدائی طالب علم۔ ﴿ المنتھی ﴾ اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مطلوب و مقصود کی انتہا تک پہنچے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مختصر مگر جامع کتاب ابتدائی طلباء سے لے کر کامل ماہرین دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ ﴿ عقب ﴾ "ع" کے فتح اور "ق" کے کسرہ۔ بعد کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ﴿ من اخرجہ ﴾ اس میں "من" موصولہ ہے اور اخرجہ کے ساتھ مل کر بینت کا مفعول ہے اس میں اخراج' تخریج اور روایت کے معنی میں استعمال ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ محدث کا اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ کتاب میں بیان کرنا اور مصنف نے مخرجین کے ذکر کے ساتھ ہی حدیث کی حیثیت بھی بیان کر دی ہے کہ یہ حدیث محدثین کی نظر میں صحیح ہے حسن یا ضعیف ہے۔ ﴿ النصح ﴾ بھلائی اور خیر خواہی۔ ﴿ فالمراد ﴾ کا مطلب ہے میری مراد۔ یعنی اس کتاب میں جب میں بالسبعۃ کہتا ہوں تو میری مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ اس حدیث کو سات محدثین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ اور جب میں حدیث بیان کرنے کے بعد "اخرجہ السبعۃ " کہتا ہوں تو اس کا بھی وہی مطلب ہوتا ہے کہ اس حدیث کو سات محدثین نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ ﴿ عدا ﴾ غیر اور سوئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ ان الفاظ میں سے ہے جو استثناء کے لیے ہیں اور اس کے بعد آنے والا لفظ منصوب ہوتا ہے اور کبھی میں ﴿ الاربعۃ واحمد ﴾ کہتا ہوں تو اس سے مراد ﴿ اخرجہ الخمسۃ ﴾ کی طرح پانچ محدث مراد ہوتے ہیں ﴿ الاربعۃ واحمد ﴾ اور ﴿ اخرجہ الخمسۃ ﴾ بیان کا طریق مختلف ہے مگر مفہوم و مراد دونوں سے ایک ہی ہے۔ ﴿ الثلاثۃ الاول ﴾ الاول ہمزہ کے ضمہ اور "و" کے فتح۔ اول کی جمع ہے اور ثلاثہ سے میری مراد پہلی تین کتابوں بخاری' مسلم اور احمد کے علاوہ ہے۔ ﴿ الاخیر ﴾ سے ابن ماجہ مراد ہے۔ یعنی پہلی تین اور آخری ابن ماجہ کے علاوہ باقی ابوداؤد' ترمذی اور نسائی رہ جاتی ہیں بالثلاثۃ سے یہی تین مراد ہیں۔ ﴿ معھما ﴾ اس سے مراد بخاری و مسلم کے ساتھ۔ ﴿ غیرھما ﴾ حدیث کی نسبت بخاری و مسلم کی جانب ہے۔ حدیث کے مرتبہ صحت کے لیے کافی ہے مگر مزید برآں تائید کے لیے ان دونوں کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ﴿ ما عدا ذلک ﴾ ان سات محدثین کے علاوہ اور محدثین نے بھی روایت کیا ہے ان کے اسماء گرامی بھی واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں۔ ﴿ المرام ﴾ کے معنی طلب کے ہیں اور مراد سے مطلوب ہے۔ ﴿ واللہ ﴾ مفعول مقدم ہے اس لیے منصوب ہے اسال کا مفعول ہے۔ مفعول کو مقدم بیان کرنے سے مقصود کلام میں حصر کرنا ہے یعنی میں صرف اللہ تعالیٰ سے دست سوال دراز کرتا ہوں۔ بجز اس کے کسی اور سے سوال نہیں کرتا۔ ﴿ ما علمناہ ﴾ اپنے صلہ کے ساتھ مل کر جعل فعل کا پہلا مفعول ہے اور دوسرا مفعول و بالاً ہے۔ وبال کی "و" پر فتح ہے اس کے معنی برے انجام کے ہیں۔ اس دعا کے ساتھ اللہ کے حضور استدعا کی ہے کیونکہ نیکی جب تک خالصۃ اللہ کے لیے نہ کی جائے تو وہ برائی اور گناہ بن جاتی ہے اور ان یرزقنا کے معنی ہیں یوفقنا یعنی ہمیں اللہ توفیق دے۔

١۔ كِتَابُ الطَّهَارَةِ

طہارت کے مسائل

١ - بابُ المِيَاه

پانی کی اقسام

(مختلف ذرائع سے حاصل شدہ پانی کا بیان)

(١) عَنْ أَبِي هُرَيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قال رسولُ الله ﷺ في البَحْرِ: **«هُوَ الطَّهُورُ مَاؤُهُ والحِلُّ مَيْتَتُهُ»**. أَخرَجَهُ الأَرْبَعَةُ وَابْنُ أَبي شَيْبَةَ وَاللَّفْظُ لَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ والتِّرْمِذِيُّ، وَرَوَاهُ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سمندر کے پانی کے متعلق (ایک شخص کے استفسار کے جواب میں) فرمایا کہ "اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔" (اس حدیث کو ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ ابن ابی شیبہ کے ہیں۔ ابن خزیمہ اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت کو مالک' شافعی اور احمد نے بھی روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿كتاب الطهارة﴾ کتاب' کتب سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے اور ملانے کے ہیں اور مصنفین کے نزدیک کتاب مسائل کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جو مستقل حیثیت کے حامل ہوں چاہے وہ کئی انواع یعنی مختلف ابواب پر مشتمل ہو یا نہ ہو۔ اور طہارت پلیدی یا ناپاکی کے ازالے کو کہتے ہیں۔

﴿باب المياه﴾ باب ایک ہی نوع سے متعلق مسائل جس میں بیان کئے جائیں اسے باب سے تعبیر کرتے ہیں اور ﴿مياه﴾ ماء کی جمع ہے "مویہ" اس کی تصغیر آتی ہے۔ بدوی عربوں نے اس کی صورت بگاڑ کر "مویہ" کر دی ہے۔ مصنف اس کو جمع اس بنا پر لائے ہیں کہ اس باب میں وہ کنوئیں کا پانی' دریا اور سمندر کا پانی اور چشموں اور باران رحمت کے پانی کا ذکر کریں گے۔

﴿ عن ابی ھریرۃ ﴾ اس کا تعلق محذوف سے ہے جو روی یا مروی وغیرہ ہو سکتا ہے اور ﴿ فی البحر ﴾ کا مطلب ہے دریا و سمندر کے پانی کا کیا حکم ہے۔ پھر ﴿ الطھور ﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے "طاء" کے فتح سے اگر اسے ادا کیا جائے تو اس صورت میں وہ اسم مراد ہو گا جو مطہر یعنی پاک کرنے والا کے معنی میں ہو گا۔ دریا و سمندر کا پانی بذات خود پاک بھی ہے اور پاک کرنے والا بھی ہے۔ ﴿ الحل ﴾ "حاء" کے کسرہ اور "لام" کی تشدید کے ساتھ۔ اس کے معنی ہیں حلال۔ ﴿ میتته ﴾ سے وہ جانور مراد ہے جو پانی میں ہی صرف زندہ رہ سکتا ہے۔ اس سے وہ جانور مراد نہیں جو پانی کے باہر بھی زندہ رہ سکتا ہو۔

حاصل کلام: یہ حدیث دراصل ایک سائل کے جواب میں ارشاد فرمائی گئی ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے یوں روایت کیا ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! ہم سمندر میں سفر کرتے ہیں' ہمارے ساتھ تھوڑا بہت پانی ہوتا ہے' اب اگر ہم اس پانی سے وضو کریں تو پیاسے مر جائیں تو کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ فرمایا "وہ پانی پاک ہے۔"

یہ حدیث دلیل ہے' اس کی کہ سمندری پانی بغیر تفصیل کے مطلقاً پاک ہے۔ نیز یہ کہ سمندری جانور بھی حلال ہیں خواہ وہ کتے اور خنزیر کی شکل کے ہوں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے البتہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سمندری جانوروں میں سے صرف مچھلی کو حلال سمجھتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو سمندری پانی کی حلت کے ساتھ بغیر سائل کے دریافت کئے' اس میں طبعی موت مرے ہوئے جانور کی حلت بھی مزید بتا دی۔ اس لئے کہ جو آدمی سمندری پانی کی حلت کے متعلق شک میں مبتلا ہو سکتا ہے وہ تو اس میں مرے ہوئے جانور کی حلت کے بارے میں اس سے کہیں زیادہ شک و شبہ میں رہ سکتا ہے۔ خاص کر جب کہ قرآن مجید میں مردار کی حرمت نص سے واضح ہے مگر اس کی تفصیل نہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ سمندر میں سفر کرنے والا اس صورتحال میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب حکمت و دانائی اور شفقت پر مبنی ہے۔ یہ سائل کون تھا؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام عبداللہ المدلجی رضی اللہ عنہ تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام عبدالعرکی رضی اللہ عنہ تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عبید العرکی رضی اللہ عنہ تھا اور عرکی سمندر و دریا میں کشتی چلانے والے کو کہتے ہیں۔ یعنی ملاح۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سمندری پانی کا پاک ہونا' اس سے وضو کرنا' اس کو (صاف کر کے) اپنے استعمال میں لانا صحیح ہے اور اسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو جانور صرف سمندر کے ہیں (یعنی وہ سمندر کے باہر زندہ نہیں رہ سکتے) وہ سب حلال ہیں' چاہے سمندر میں مر جائے یا نکالنے کے بعد مر جائے اور یہ کہ سمندر میں سفر کرنا جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ ﴾ وہ جلیل القدر صحابی رسول ہیں جن سے سب سے زیادہ احادیث نبوی ہم تک پہنچی ہیں۔ صاحب استیعاب کی رائے کے مطابق ان کا نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن تھا۔ قبیلہ دوس سے تھے۔ ۷ھ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اٹھتر سال کی عمر پائی اور ۵۹ھ میں اس دنیائے فانی

سے کوچ کیا اور مدینہ منورہ کے بقیع غرقد نامی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں مفتی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان سے کم و بیش ۵۳۸۴ احادیث مروی ہیں۔ واللہ اعلم۔

(۲) وعَنْ أَبِيْ سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قال رسول الله ﷺ: «إِنَّ المَاءَ طَهُورٌ لاَ يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ». أَخرَجَهُ الثَّلاَثَةُ وَصَحَّحَهُ أَحْمَدُ.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "پانی پاک ہے' اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی۔" (اس روایت کو ابوداؤد' ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور احمد نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الخدری﴾ "خاء" کے ضمہ اور "د" کے سکون کے ساتھ۔ "خدرة" کی طرف منسوب ہے جو انصار کا ایک معروف و مشہور قبیلہ ہے۔ ﴿طھور﴾ "طاء" کے فتح کے ساتھ اس کے معنی پاک کے بھی ہیں اور پاک کرنے والے کے بھی۔ ﴿لا ینجسه﴾ میں ینجسه تنجیس سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کہ کوئی چیز اسے نجس یعنی ناپاک نہیں کرتی۔ مفہوم و معنی یہ ہے پانی میں نجاست کا محض گر جانا اسے ناپاک نہیں کرتا۔

حاصل کلام: حدیث کا مقصود یہ ہے کہ پانی پاک ہے محض نجاست کے واقع ہونے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا خواہ پانی کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔ امام مالک رحمہ اللہ اور ظواہر اور ایک قول کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے مشروط بات کی ہے کہ جب تک اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی وصف عملاً رونما نہ ہو جیسا کہ آگے ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بیان ہوا ہے لیکن ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا ہم بئر بضاعہ کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ (بئر بضاعہ ایک پرانا کنواں تھا جس میں حیض والے کپڑے' کتے کے گوشت کے ٹکڑے اور بدبودار چیزیں ڈالی جاتی تھیں) آپؐ نے اس کے جواب میں فرمایا "پانی تو پاک ہے۔" بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ الماء میں جو "لام" ہے یہ لام عہد کا ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ سائل کے ذہن میں جس کنوئیں کا پانی مراد تھا اور وہ بئر بضاعہ کا پانی تھا' اس کنوئیں کی چوڑائی چھ ہاتھ تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس میں پانی ناف سے اوپر کی حد تک رہتا تھا اور جب کم ہوتا تو ناف سے نیچے کی حد تک ہو جاتا۔ جیسا کہ ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس کا ذکر کیا ہے۔

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جب پانی اتنی کثیر مقدار میں ہو تو محض نجاست کا اس میں گر جانا اسے ناپاک نہیں کرتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مطلق پانی میں نجاست گرنے سے وہ ناپاک نہیں ہوتا۔ (اگر مذکورہ کثیر مقدار ہو تو اس میں نجاست واقع ہونے سے وہ ناپاک نہیں ہوتا ورنہ ناپاک ہو جاتا ہے)۔

راوی حدیث: ﴿ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ﴾: ابوسعید کنیت ہے اور ان کا اسم گرامی سعد بن مالک بن سنان رضی اللہ عنہ ہے۔ انصار کے قبیلہ خزرج سے ان کا تعلق تھا۔ کبار صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ خدرہ

ایک انصاری قبیلہ ہے جس کی طرف یہ منسوب ہیں۔ تقریباً چھیاسی برس کی طویل عمر پائی اور ۷۴ھ کے آغاز میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہ ۔ ان سے بھی بکثرت احادیث مروی ہیں۔

(۳) وعَنْ أَبِي أُمامَةَ البَاهِلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «إِنَّ المَاءَ لاَ يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ إِلاَّ مَا غَلَبَ عَلَى رِيحِهِ وَطَعْمِهِ وَلَوْنِهِ». أخرجَهُ ابنُ ماجه، وَضَعَّفَهُ أبو حاتِم، وَلِلْبَيْهَقِيِّ: الماءُ طَهُورٌ إِلاَّ إِن تَغَيَّر رِيحُه أو طَعْمُه أو لَونُه بَنَجاسَةٍ تَحدُثُ فِيْهِ.

حضرت ابوامامہ الباہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "یقیناً پانی کو کوئی چیز ناپاک و پلید نہیں کرتی الا یہ کہ پانی پر اس ناپاک و پلید چیز کی بو' ذائقہ اور رنگت غالب ہو جائے۔" (اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابوحاتم نے اسے ضعیف قرار دیا ہے) بیہقی میں الفاظ حدیث اس طرح ہیں "پانی پاک ہے (اور پاک کرنے والا بھی ہے) بجز اس کے وہ ناپاک پانی میں گرنے والی چیز پانی کی بو' ذائقہ اور رنگت کو تبدیل کر دے۔"

لغوی تشریح: ﴿ لا ینجسه ﴾ تنجیس سے ہے۔ محض نجاست کا پانی میں گر جانا اسے ناپاک نہیں بناتا۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ پانی کی مقدار کثیر ہو یعنی دو بڑے مٹکوں کی مقدار کے برابر ہو۔ پھر اگر پانی دو بڑے مٹکوں کی مقدار کے مساوی ہو اور اس میں نجاست گر کر اس کی بو' ذائقہ اور رنگت میں سے کوئی ایک وصف بھی تبدیل کر دے تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔ اس میں پانی کی مقدار قلیل یا کثیر کا اعتبار نہیں ہو گا﴿ تحدث فیه ﴾ معنی نجاست پانی میں واقع ہو جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی سند میں رشدین بن سعد راوی متروک ہے اور وہ اسے موصول بیان کرتا ہے جبکہ راشد بن سعد جو ثقہ راوی ہے اسے مرسل بیان کرتا ہے۔ یہ حدیث اگرچہ اپنی سند کے اعتبار سے ضعیف ہے تاہم معنوی اعتبار سے اس کی صحت پر اجماع ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور بیہقی رحمہ اللہ اور ابن منذر رحمہ اللہ نے اس بات پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے کہ پانی خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ نجاست کے اس میں گرنے سے اس کے تین اوصاف میں سے کسی ایک کی تبدیلی کی صورت میں وہ ناپاک ہو جاتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پانی کو اگر زیادہ مقدار مثلاً دو قلے' یا اس سے زیادہ ہو تو کوئی چیز پلید نہیں کرتی۔ ہاں اگر نجاست گرنے کی وجہ سے اس کا رنگ' بو یا مزہ بدل جائے تو وہ پلید ہو جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابو امامة الباهلی رضی اللہ عنہ ﴾: ابوامامہ کنیت۔ امامہ ھمزہ کے ضمہ کے ساتھ۔ باھلہ قبیلہ میں سے ہونے کی وجہ سے باھلی کہلائے۔ ان کا نام صدی (تصغیر) بن عجلان ہے۔ مشہور صحابی رسول ﷺ ہیں۔ یہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جن سے بکثرت روایات مروی ہیں۔ مصر میں سکونت اختیار کی پھر حمص کی جانب منتقل ہو گئے۔ ان کی وفات ۸۱ھ یا ۸۶ھ میں ہوئی۔ شام میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی رضی اللہ عنہ یہی ہیں۔

(٤) وعَنْ عَبدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعالَى عَنهُما قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «إِذَا كَانَ المَآءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحمِلِ الخَبَثَ». وفي لَفظٍ: «لَمْ يَنْجُسْ». أخرَجَهُ الأَربَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابنُ خُزَيمَةَ وابنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب پانی کی مقدار دو بڑے مٹکوں کے برابر ہو تو وہ نجاست کو قبول ہی نہیں کرتا۔" ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ "پانی نجس (ناپاک) نہیں ہوتا۔" (اسے ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ' ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ قلتین ﴾ "قاف" کے پیش اور "لام" کی تشدید۔ بڑے مٹکے کو کہتے ہیں۔ اس کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی وجہ سے اس کی مقدار میں اختلاف رائے واقع ہوا ہے۔ لیکن عرب میں ھجر کے مٹکے مشہور و معروف تھے۔ شعراء نے اپنے اشعار میں بکثرت اس کا استعمال کیا ہے اور امثال میں بھی اسے بہت بیان کیا ہے۔ اس طرح حدیث میں بیان شدہ مٹکے سے مراد یہی ھجر کا مٹکا ہے اور دوسرا کوئی مراد نہیں ہو سکتا اور ان کے مٹکے میں اڑھائی سو رطل پانی کے سمانے کی گنجائش تھی لہٰذا دو قلوں کے پانی کی مقدار پانچ صد رطل ہوئی جو موجودہ زمانہ کے پیمانہ کے مطابق دو سو ستائیس کلوگرام ہوتی ہے۔ ﴿ یحمل الخبث ﴾ الخبث میں "خاء" اور "با" دونوں پر زبر ہے۔ معنی اس کے نجاست اور گندگی کے ہیں۔ ﴿ لم یحمل الخبث ﴾ کے معنی ہیں کہ پانی اس نجاست کو قبول ہی نہیں کرتا' قبول کرنے سے انکاری ہے اور صرف نجاست کے پانی میں گرنے سے وہ ناپاک ہوتا بھی نہیں۔ وفی لفظ ﴿ لم ینجس ﴾ میں ایک قرأت کے مطابق تو "جیم" پر زبر (فتح) ہے اور دوسری قرأت کے مطابق پیش (ضمہ) ہے' دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث پانی کی قلیل و کثیر مقدار کے فرق اور حد بندی میں بالکل واضح اور صریح ہے۔ ان تمام احادیث سے جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب پانی کی مقدار دو قلوں (مٹکوں) سے کم ہوگی تو نجاست کے اس میں محض گرنے سے ہی وہ ناپاک ہو جائے گا۔ خواہ اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی ایک وصف میں تغیر واقع ہوا ہو یا نہ اور اس کی مقدار قلتین (مٹکوں) کے برابر یا اس سے زیادہ ہوگی۔ تو محض وقوع نجاست سے وہ ناپاک نہیں ہوگا بلکہ وہ خود بھی پاک ہی رہے گا اور دوسری چیز کو پاک کرے گا اور جب ان اوصاف ثلاثہ (بو' ذائقہ اور رنگت) میں سے کوئی وصف اس کی وجہ سے رونما ہوگا تو وہ پانی ناپاک شمار ہوگا۔ جیسا کہ ابوامامہ سے مروی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے۔

جہاں تک "بئر بضاعۃ" والی حدیث کا تعلق ہے اس کے متعلق تمہیں علم ہے کہ اس میں پانی دو قلوں سے بھی زیادہ تھا۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث کے ایک جم غفیر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' ابوعبید رحمۃ اللہ علیہ' احمد رحمۃ اللہ علیہ' اسحاق رحمۃ اللہ علیہ' یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ' ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ' طحاوی رحمۃ اللہ علیہ' ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ' دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ' ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ'

حاکم رحمۃ اللہ علیہ، خطابی رحمۃ اللہ علیہ، بیہقی رحمۃ اللہ علیہ، ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ جیسا کہ علامہ سیوطی نے قوت المغتذی میں نقل کیا ہے۔ یہ اہلحدیث اور شوافع کی دلیل ہے کہ دو قلوں سے کم پانی کثیر کے زمرہ میں نہیں آتا اور دو قلوں یا اس سے زیادہ پانی کی مقدار کثیر ہے۔ احناف کا "دہ دردہ" کا مسئلہ عقلی ہے۔ حدیث کے مقابلہ میں عقل کی کیا حیثیت ہے۔

معلوم ہوا کہ کھڑے پانی میں نہ تو نجاست ڈالی جائے اور نہ جنبی نہائے۔ پانی اگر دو قلوں سے کم ہو تو نجاست پڑنے سے ناپاک ہو جاتا ہے، چاہے اس کا رنگ، بو اور مزہ بدلے یا نہ بدلے اور اگر دو قلوں سے زیادہ ہو تو اس وقت تک پلید نہیں ہوتا جب تک اس کا رنگ، بو اور مزہ نجاست پڑنے سے بدل نہ جائے۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما﴾ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ زاہد اور وسیع علم کے مالک تھے۔ صغر سنی میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت بھی کی۔ پہلی مرتبہ غزوۂ خندق میں شریک ہوئے۔ ۷۳ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور ذی طویٰ نامی جگہ میں دفن ہوئے۔

(٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: «**لا يَغْتَسِلْ أَحَدُكُمْ فِي المَاءِ الدَّائِمِ وَهُوَ جُنُبٌ**». أخرجه مسلم.

وللبخاري: «لاَ يَبُولَنَّ أَحَدُكُمْ فِي المآءِ الدَّائِمِ الَّذِي لاَ يَجْرِي، ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيهِ». ولِمُسْلِمٍ «منه» وَلأَبِي دَاوُد «وَلاَ يَغْتَسِلْ فِيهِ مِنَ الجَنَابَةِ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جو شخص حالت جنابت میں ہو وہ کھڑے (ساکن) پانی میں غسل نہ کرے۔" (مسلم) اور بخاری کے الفاظ ہیں کہ "تم میں سے کوئی بھی کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرے اور پھر اس میں غسل کرے۔" صحیح مسلم کے الفاظ فیہ کے بجائے منہ ہیں یعنی اس سے کچھ پانی لے کر غسل کرے اور ابوداؤد کے الفاظ ہیں "ولا یغتسل فیہ من الجنابۃ" یعنی "جنابت لاحق ہو جانے کی صورت میں اس میں غسل نہ کرے۔"

لغوی تشریح: ﴿الدائم﴾ ایسا ساکن جو بہتا نہ ہو ﴿جنب﴾ جیم اور نون کے ضمہ (پیش) کے ساتھ۔ جسے جنابت لاحق ہو جائے اور جنابت ایسی کیفیت ہے جو جماع یا احتلام کی وجہ سے انزال کے بعد پیدا ہو۔ ﴿ثم یغتسل فیہ﴾ اس میں ثم دوری ظاہر کرنے کے لئے ہے یعنی عقل مند آدمی سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اور ﴿یغتسل﴾ میں پیش (رفع) بھی جائز ہے، مبتدا محذوف "ھو" کی خبر ہونے کے اعتبار سے اور سکون (جزم) پڑھنا بھی جائز ہے ﴿لایغتسل﴾ کی نہی پر عطف کی وجہ سے اور زبر (نصب) پڑھنا بھی جائز ہے، (ان) پوشیدہ (مقدر) مان لینے کی وجہ سے۔

حاصل کلام: مسلم کی روایت میں "فیہ" کی جگہ "منہ" ہے اگر "فیہ" ہو تو اس سے مراد ہے کہ اس

پانی میں داخل ہونا اور غوطہ لگانا منع ہے اور "منہ" ہو تو اس سے مراد ہے کہ اس سے کسی برتن میں پانی لے کر الگ طور پر غسل کرنے کی بھی نہی ہے۔ بہرحال مسلم کی روایت سے صرف غسل کرنے کی ممانعت نکلتی ہے اور بخاری کی روایت میں اس میں پیشاب کرنے اور اس میں غسل کرنے دونوں کی ممانعت ہے۔ ابوداؤد کی روایت کی رو سے دونوں کی انفرادی طور پر ممانعت ہے یعنی اس میں پیشاب کرنا بھی ممنوع ہے اور اس پانی میں یا اس میں سے کچھ لے کر نہانا دونوں کی ممانعت ہے۔ تمام روایات سے حاصل یہ ہوا کہ دونوں عمل ہی ممنوع ہیں۔ یہ اس بنا پر کہ کھڑا پانی اگر مقدار میں کم ہے تو پھر وہ ناپاک ہو جائے گا اور کثیر مقدار میں ہے تو یکے بعد دیگرے پیشاب اور غسل کرنا پانی کے اوصاف میں تغیر و تبدل کا موجب ہو گا۔

پس نہی تحریم کیلئے ہے جبکہ پانی کم مقدار میں ہو اور جب پانی مقدار میں کثیر ہو تو پھر نہی تنزیہی ہے کیونکہ کثیر مقدار رواں اور جاری کے حکم میں ہوتا ہے اور وہ ناپاک و نجس نہیں ہوتا۔

(٦) وعَنْ رَجُلٍ صَحِبَ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ تَغْتَسِلَ الْمَرْأَةُ بِفَضْلِ الرَّجُلِ، أَوِ الرَّجُلُ بِفَضْلِ الْمَرْأَةِ، وَلْيَغْتَرِفَا جَمِيعاً.
أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ.

ایک ایسے آدمی سے روایت ہے جو نبی ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ "عورت' مرد کے بچے ہوئے غسل کے پانی سے غسل کرے یا مرد' عورت کے باقی ماندہ غسل کے پانی سے غسل کرے۔ ہاں دونوں اکٹھے چلو سے لے لیں۔ (تو کوئی مضائقہ اور حرج نہیں) "
(ابوداؤد و نسائی۔ اور اس کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿ عن رجل صحب ﴾ صحب باب سمع یسمع سے فعل ماضی ہے اور اس مرد کی صفت میں واقع ہو رہا ہے۔ صحابی کا نام ظاہر نہ ہونا روایت حدیث میں ضرر رساں نہیں' کیونکہ اہل السنہ کا اتفاق ہے کہ "الصحابة كلهم عدول" کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل ہیں اور ﴿ بفضل الرجل ﴾ سے مراد ہے کہ آدمی کے غسل کرنے کے بعد جو پانی بچ جائے۔ ﴿ وليغترفا ﴾ میں "لام" امر کا ہے اور ﴿ اغتراف ﴾ کے معنی ہیں دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی لینا۔ یعنی دونوں چلو سے پانی لینا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نھی سے مراد نہی تنزیہی ہے۔ آئندہ حدیث میں اس کا جواز منقول ہے' تا کہ کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ عورت کے غسل سے بچا ہوا پانی اپنے غسل کے لئے استعمال نہیں کر سکتا۔ چلو سے بیک وقت مرد و عورت کا پانی لینا ایسا فعل ہے کہ جس میں ایک کا اثر دوسرے پر پڑ سکتا ہے اس طرح دونوں ایک دوسرے کا بدل بن جاتے ہیں اس میں چونکہ کوئی مضائقہ نہیں تھا اس لئے اس کی اجازت دے دی گئی۔

اگر خاوند و بیوی دونوں اکٹھے ایک برتن سے پانی لے کر نہائیں تو جائز ہے۔ لیکن صرف خاوند یا صرف بیوی کے غسل جنابت کے بعد اس کا بچا ہوا پانی دوسرے کیلئے اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے'

تا کہ دونوں کے ذہن میں کسی قسم کا شک باقی نہ رہے۔

(۷) وعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَغْتَسِلُ بِفَضْلِ مَيْمُونَةَ رَضِيَ الله تعالى عنها. أخرجه مسلم. وَلِأَصْحَابِ السُّنَنِ: اغْتَسَلَ بَعْضُ أزوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ فِي جَفْنَةٍ، فَجَآء النَّبِيُّ ﷺ لِيَغْتَسِلَ مِنها، فَقَالَتْ له: إِنِّي كُنْتُ جُنباً، فَقَالَ: «إِنَّ المَاءَ لاَ يَجْنُبُ». وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ اپنی اہلیہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے بچے ہوئے غسل کے پانی سے نہالیا کرتے تھے۔ (مسلم) اصحاب سنن کی روایت میں اس طرح ہے کہ ازواج مطہرات میں سے ایک نے ٹب نما برتن میں غسل کیا۔ نبی ﷺ تشریف لائے کہ اس میں باقی بچے ہوئے پانی سے غسل فرمالیں تو اس نے آپؐ سے عرض کیا کہ میں نے اس میں حالت جنابت سے غسل کیا ہے تو آپؐ نے فرمایا "پانی ناپاک نہیں ہوتا۔" (اس روایت کو ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لاصحاب السنن ﴾ سے ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' اسی طرح دارمی' دارقطنی' ابن خزیمہ اور حاکم مراد ہیں۔ ﴿ جفنۃ ﴾ "جیم" کے فتح اور "فاء" کے سکون کے ساتھ۔ ایک بڑا سا پیالہ اور عام لوگ اسے "اجانۃ" (یعنی چمڑے کی ٹوکری) کہتے ہیں۔ ﴿ یغتسل منھا ﴾ یعنی اس کے پانی سے ﴿ فقالت: انی کنت جنبا ﴾ سے مراد ہے کہ میں نے اس پانی سے غسل کیا ہے اور یہ پانی میرے غسل کا بچا ہوا ہے۔ ﴿ لایجنب ﴾ میں جنب سمع اور کرم دونوں ابواب سے پڑھنا جائز ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ باب اکرام سے ہو ۔اس کا معنی ہے کہ جنبی کے کسی پانی والے برتن سے پانی لے کر غسل کرنے کی وجہ سے وہ پانی ناپاک نہیں ہو جاتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کسی کو یہ شک پیدا نہ ہو کہ یہ حدیث پہلی کے مخالف ہے۔ درحقیقت امت کی سہولت اور آسانی کیلئے ایسا فرمایا ہے اور خود عمل کر کے بتا دیا دونوں احادیث اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اس حدیث میں جو نہی ہے وہ نہی تنزیہی ہے' تحریمی نہیں۔ یہ حدیث جواز پر دلالت کرتی ہے اور پہلی ترک اولیٰ پر۔

رسول اللہ ﷺ اپنی زوجہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے بچے ہوئے غسل کے پانی سے نہا لیتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اور آپ دونوں ایک برتن سے پانی لے کر نہاتے تھے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی اسی حدیث کی دوسری سند سے واضح ہے۔ اصحاب سنن والی روایت بلحاظ سند ضعیف ہے۔ للذا راجح یہی ہے کہ خاوند اور بیوی دونوں اکٹھے تو ایک برتن سے پانی لے کر نہا سکتے ہیں مگر علیحدہ علیحدہ نہانے کی صورت میں ایک کو دوسرے کا بچا ہوا پانی استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ﴾ ان کا نام عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ

عنہما تھا۔ یہ وہی ہیں جنہیں اس امت کے بحرالعلم ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ بہت ذہین تھے۔ اپنی احاصت علمی کی شہرت کی وجہ سے تعریف سے مستغنی ہیں اس لیے کہ آپؓ کو نبی صلی اللہ علیہ و سلم نے علم و حکمت اور فقہ و تاویل میں زیادتی کی دعا دی تھی۔ ہجرت سے تین سال پہلے پیدا ہوئے اور ۶۷ھ میں طائف میں وفات پائی۔

﴿میمونہ رضی اللہ عنہا﴾ میمنہ بنت حارث الھلالیہؓ ۔ رسول اللہ ﷺ نے ۷ ھ میں عمرۃ القضاء کے موقع پر ان سے نکاح کیا۔ ۶۱ھ یا ۵۱ھ یا ۶۶ھ کو وفات پائی۔

(۸) وعَنْ أبي هُرَيرَةَ رضي اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: طُهُورُ إنَاءِ أَحَدِكُمْ إذَا وَلَغَ فِيهِ الكَلْبُ أنْ يَغْسِلَهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ، أُولاَهُنَّ بِالتُّرَابِ». أخرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَفي لَفظٍ لَهُ «فَلْيُرِقْه». وَلِلتِّرمِذِيِّ: «أُخرَاهُنَّ أَوْ أُولاَهُنَّ بالتُّراب».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "تم میں سے کسی کے برتن میں جب کتا منہ ڈال جائے تو اسے سات مرتبہ دھویا جائے۔ سب سے پہلے اسے مٹی مل کر (صاف کرنا چاہئے) " (مسلم) اور مسلم نے "فلیرقہ" یعنی اس کو گرا دینا چاہئے' نقل کیا ہے اور ترمذی نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں "پہلی یا آخری مرتبہ مٹی کے ساتھ صاف کرنا چاہئے۔"

لغوی تشریح: ﴿طھور﴾ طاء کے پیش (ضمہ) کے ساتھ۔ یہ مصدر ہے اور ترکیب میں مبتدا واقع ہو رہا ہے اور لفظ ﴿اناء﴾ جس کا معنی برتن ہے' کی طرف مضاف ہے۔ ﴿ولغ﴾ ولوغ الکلب کتے کا اپنی زبان کے اطراف کے ساتھ پینا (چاٹنا) ولغ باب فتح یفتح سے بھی آتا ہے اور اسی طرح حسب یحسب اور سمع یسمع سے بھی آتا ہے۔ ﴿ان یغسلہ﴾ یہ خبر واقع ہو رہی ہے جو جزاء شرط پر دلالت کرتی ہے۔ ﴿اولاھن﴾ کا مطلب یہ ہے سات مرتبہ دھونے کی صورت میں سب سے پہلی مرتبہ۔ ﴿فلیرقہ﴾ یہ "اراقۃ" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں برتن میں خورد و نوش کی جو چیز ہو اسے انڈیل کر فارغ کر دینا۔

حاصل کلام: ترمذی کی یہ عبارت کہ اخراھن او اولاھن غالب گمان یہ ہے کہ یہ راوی کا شک ہے ورنہ ایسا نہیں کہ دھونے والے کو اختیار دیا جا رہا ہے کہ وہ چاہے پہلی مرتبہ مٹی سے صاف کرے یا آخری مرتبہ اور اولاھن کا لفظ بکثرت روایات میں آنے کی وجہ سے اور خاص طور پر بخاری و مسلم کے روایت کرنے کی وجہ سے راجح ہے۔ یعنی اس بات کو ترجیح ہے کہ پہلی مرتبہ مٹی سے صاف کرنا چاہئے۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ کتے کا منہ' اس کا لعاب دہن اور اس کا جوٹھا نجس و ناپاک ہے اور یہی اس کے سارے بدن کے نجس و ناپاک ہونے پر دلالت کرتی ہے اور برتن کے سات مرتبہ دھونے کو واجب ٹھہراتی ہے اور مٹی کے ساتھ صاف کرنا بھی واجب ہے۔ یہی محققین کی رائے ہے اور بعض نے کہا

کہ سات مرتبہ دھونا اور ایک مرتبہ مٹی سے صاف کرنا مندوب ہے واجب نہیں اور بعض کا یہ بھی قول ہے کہ تین مرتبہ دھویا جائے لیکن سچ بات یہی ہے کہ دلیل ان دونوں اقوال کی تائید نہیں کرتی اور معلوم رہے کہ جب محض نجاست کے ازالہ کیلئے سات مرتبہ دھونے کی شرط نہیں ہے تو پھر ضروری ہے کہ نجاست کے علاوہ سات مرتبہ دھونے کے حکم کی حکمت اور ہو۔ دور حاضر کے کچھ اطباء نے واضح کیا ہے کہ اکثر کتوں کی آنتوں میں بہت چھوٹے چھوٹے جرثومے پائے جاتے ہیں۔ یہ چار ملی میٹر لمبے ہوتے ہیں۔ جب کتا اپنا فضلہ خارج کرتا ہے تو اس فضلہ سے بکثرت انڈے خارج ہوتے ہیں اور فضلہ خارج ہونے کی جگہ (دبر) کے اردگرد بالوں کے ساتھ ان میں کثرت سے چمٹ جاتے ہیں۔ پھر جب کتا اپنی زبان سے اپنا وجود صاف کرتا ہے تو یہ انڈے اس کی زبان اور منہ کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔ پھر جب کتا کسی برتن میں منہ ڈالتا ہے یا پانی پیتا ہے یا انسان اس کے منہ کا بوسہ لیتا ہے جیسا یورپین اقوام اور اس کے مقلدین عموماً ایسا کرتے ہیں تو یہ انڈے ان اشیاء کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں اور خورد و نوش کے وقت آسانی سے اس کے منہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ منہ میں رسائی حاصل کرنے کے بعد اس انسان کے معدہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھر اس سے جرثومے نکل کر معدہ کی دیواروں میں سوراخ کر کے خون کی نالیوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس طرح دل' دماغ اور پھیپھڑے کی بے شمار بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام چیزوں کا یورپین اطباء اپنے شہروں میں مشاہدہ کر چکے ہیں۔ ان جراثیم زدہ کتوں کی پہچان اور امتیاز بڑا مشکل کام ہے۔ اس کیلئے وقت درکار ہے اور انتہائی دقیق بحث مطلوب ہے۔ ایسے آلات کے ذریعہ جن کا استعمال بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ شرعاً اسے نجس و ناپاک قرار دینا اور سات مرتبہ دھونا برتنوں کی صفائی اور نظافت کیلئے ہے تاکہ مذکورہ بالا کوئی چیز برتن کے ساتھ لگی نہ رہ جائے اور یہ سراسر حکمت ہے اور قرین صواب ہے۔ حقیقت حال اللہ کے علم میں ہے۔

(احکام الاحکام شرح عمدۃ الاحکام لابن دقیق العید' ج ۱' ص : ۲۷) خورد و نوش کی جس چیز میں کتا منہ ڈال جائے اسے استعمال میں نہ لانا چاہئے اسے گرا دینا چاہئے اور حدیث کی رو سے اس برتن کو سات مرتبہ دھونا چاہئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتا خود بھی ناپاک ہے اور جس چیز کو منہ لگائے وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے۔ اگر برتن ہو تو اسے سات مرتبہ دھونا چاہئے۔ مسلم کی ایک روایت میں تو ساتویں بار کی بجائے آٹھویں مرتبہ مٹی سے دھونے کا ذکر ہے۔ یعنی پہلی بار مٹی سے صاف کیا جائے پھر سات بار پانی سے دھویا جائے۔ اس طرح کرنے سے مزید صفائی اور پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے۔ احناف تین مرتبہ دھونے سے برتن کے پاک ہونے کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل دارقطنی اور طحاوی میں منقول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے کہ اگر کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اسے تین مرتبہ دھونا چاہئے' حالانکہ صحیح سند کے ساتھ ان کا فتویٰ یہ بھی منقول ہے کہ ایسے برتن کو سات بار دھویا جائے۔ لہٰذا جو فتویٰ روایت کے موافق ہے' وہی راجح ہے اور وہ اسناد کے اعتبار سے بھی تین بار دھونے کے فتویٰ سے زیادہ صحیح ہے۔ (فتح الباری' ج ۱' ص : ۲۷۷) تعجب ہے کہ عموماً فقہائے حنفیہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ کہتے ہیں (معاذ اللہ) مگر یہاں حدیث مرفوع

اور صحیح کے مقابلہ میں ان کے مرجوح فتویٰ اور رائے کو ترجیح بھی دیتے ہیں۔ مولانا عبدالحئی لکھنؤی مرحوم نے اس سلسلے میں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کے اعتراضات باردہ کا کافی و شافی قابل دید جواب دیا ہے۔ (السعایۃ، ج ۱، ص: ۴۴۹۔ ۴۵۴)

(۹) وعن أَبِيْ قَتَادة رضي الله تعالى عنه أَنَّ رَسولَ الله ﷺ قَالَ في الهِرَّةِ: «**إِنَّهَا لَيْسَتْ بِنَجَسٍ، إِنَّمَا هِيَ مِنَ الطَّوَّافِينَ عَلَيْكُمْ**». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابوقتادۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بلی کے متعلق ارشاد فرمایا کہ "وہ نجس نہیں ہے کیونکہ یہ ہر وقت آمدورفت رکھنے والا گھریلو جانور ہے۔" (اس روایت کو چاروں (ابوداؤد' نسائی' ترمذی' ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فی الھرۃ ﴾ اس کا مطلب ہے کہ بلی کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟ ھرۃ کے علاوہ اسے قط اور سنور بھی کہتے ہیں۔ ﴿ الطوافین ﴾ "واؤ" کی تشدید۔ واحد اس کا طواف ہے اور یہ ایسا جانور ہے جن کی آمدورفت بکثرت رہتی ہے اور وہ گھر کا خادم ہے۔ بلی کو خادم کے ساتھ تشبیہہ دینے سے مقصود یہ اشارہ کرنا ہے کہ بلی کی نوعیت اس گھریلو خادم کی سی ہے جس کا گھریلو کام کے سلسلہ میں اہل خانہ کے پاس ملنے جلنے اور ان کی ضروریات کی فراہمی کیلئے کثرت سے آنا ناگزیر ہوتا ہے۔ دشواری اور دقت کے دور کرنے کی غرض سے بلی کو غیر نجس قرار دیا گیا ہے۔ اس کے غیر نجس ہونے کی بدولت ہی اس کے جوٹھے کو پاک قرار دیا گیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے اپنے وضو کا برتن ایک جگہ رکھا تھا۔ اتنے میں بلی آئی اور اس برتن میں منہ ڈال کر پانی پینے لگی تو حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے اس برتن کو فوراً جھکا دیا تاکہ بلی آسانی سے اور سیر ہو کر پی لے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے رسالت مآب ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ "بلی نجس نہیں ہے۔"

اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بلی کا جوٹھا پلید نہیں ہے بشرطیکہ اس کے منہ پر نجاست نہ لگی ہو۔

راوی حدیث: ﴿ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ ﴾ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ ان کی کنیت ہے۔ اصل نام حارث بن ربعی ہے۔ بڑے مشہور و معروف صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ (فارس رسول اللہ ﷺ) کے لقب سے مشہور ہیں۔ انصار سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انصاری کہلائے۔ غزوہ احد وغیرہ میں شریک جنگ رہے۔ سن وفات میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۴۰ھ بعض نے ۵۴ھ بیان کیا ہے۔ آخری قول زیادہ مشہور ہے۔ (تہذیب الاصابہ)

(۱۰) وعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله تعالى عنه قال: جَاءَ أعرابيٌّ،

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک بدوی آیا اور مسجد کے کونے میں پیشاب کرنا

فَبَالَ فِي طَآئِفَةِ المَسْجِدِ، فَزَجَرَهُ النَّاسُ، فَنَهَاهُمْ رسولُ الله ﷺ، فلما قَضَى بَولَهُ أمَرَ النَّبيُّ ﷺ بِذَنُوبٍ من مَآءٍ فأُهْرِيقَ عَلَيْه. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

شروع کر دیا تو لوگوں نے اسے ڈانٹا۔ لیکن نبی ﷺ نے انہیں ایسا کرنے سے منع فرمایا' جب وہ بدوی پیشاب سے فارغ ہوا تو آنحضرت ﷺ نے پانی کا ایک ڈول طلب فرمایا اور اس جگہ پر بہا دیا (جہاں اس نے پیشاب کیا تھا)۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اعرابی ﴾ اعراب کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اعرابی یعنی بادیہ نشین۔ اس کے معنی بدوی و دیہاتی کے ہیں۔ یہ اعرابی کون تھے؟ یہ کہا گیا ہے کہ وہ ذوالخویصرہ یمانی تھے اور وہ بڑے پیٹ والے آدمی تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ معکبر الضبی تھے۔ ﴿ طائفۃ المسجد ﴾ مسجد کا کوئی کونہ یا کنارہ۔ مسجد کی کسی جانب۔ ﴿ فزجرہ الناس ﴾ لوگوں نے اسے ڈانٹا' جھڑکا' سختی سے منع کیا۔ ﴿ فنھاھم رسول اللہ ﷺ ﴾ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے اور پیشاب رکوانے کی کوشش سے منع فرمایا کیونکہ پیشاب منقطع کرنا مرد کی شرم گاہ کیلئے ضرر رساں ہے اور بسا اوقات ایسا کرنے کی وجہ سے گردہ اور مثانہ کا خبیث مرض لاحق ہو جاتا ہے اور اس لئے بھی آپؐ نے لوگوں کو منع فرمایا کہ پیشاب کا منقطع کرنا بدن' لباس اور مسجد کے دوسرے حصے جہاں پیشاب نہیں کیا کے نجس اور گندہ کرنے کا موجب بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ ادھورا پیشاب لے کر بھاگ کھڑا ہوتا تو اس کے اپنے کپڑے اور بدن کے علاوہ مسجد کے دوسرے حصوں میں پیشاب کے چھینٹوں کا گرنا ممکن تھا جس سے گندگی زیادہ پھیلتی۔ ﴿ بذنوب ﴾ ذال کے زبر کے ساتھ۔ پانی سے لبالب بھرے ہوئے ڈول کو کہتے ہیں۔ ﴿ فاھریق ﴾ دراصل اریق تھا "ھا" کو ھمزہ سے بدل کر اس پر مزید ایک ھمزہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ جس کے معنی ہیں انڈیل دیا گیا۔

حاصل کلام: ترمذی نے بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت اسی طرح بیان کی ہے اور اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ آدمی کا پیشاب ناپاک ہے۔ امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے نیز یہ بھی مسئلہ ثابت ہوا کہ زمین اگر ناپاک ہو تو پانی سے پاک ہو جاتی ہے۔ خواہ زمین نرم و سہل ہو یا سخت و صعب۔ مزید برآں اس حدیث سے مسجد کی عظمت اور اس کا احترام' نادان آدمی کے ساتھ نرمی کرنا سختی اور درشتی نہ کرنا' حضور ﷺ کا حسن خلق اور نہایت عمدہ طریقہ سے تعلیم دین دینا وغیرہ باتیں نمایاں ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ حضرت انس رضی اللہ عنہ ﴾ : حضور ﷺ کے خادم خاص ہیں ان کی والدہ ام سلیم نے آپؐ کی خدمت کیلئے خدمت گار کے طور پر پیش کر کے سعادت حاصل کی۔ مدنی زندگی میں آخری سانس تک خدمت کرتے رہے۔ ابو حمزہ ان کی کنیت تھی۔ خزرج کے قبیلہ نجار سے ہونے کی وجہ سے نجاری خزرجی کہلائے۔ وہ ۹۱ھ کو فوت ہوئے اور بصرہ میں ہی دفن ہوئے۔

(۱۱) وعن ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ، فَأَمَّا المَيْتَتَانِ فَالجَرَادُ وَالحُوتُ، وَأَمَّا الدَّمَانِ فَالكَبِدُ وَالطِّحَالُ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ، وَفِيْهِ ضَعْفٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”دو مری ہوئی چیزیں اور دو خون ہمارے لئے حلال کئے گئے ہیں۔ دو مری ہوئی چیزیں (جنہیں ذبح نہ کیا گیا) ایک ٹڈی اور دوسری مچھلی۔ باقی رہے دو خون تو اس سے مراد ایک جگر اور دوسری تلی ہے۔“ (احمد اور ابن ماجہ نے اسے روایت کیا ہے اور اس میں کمزوری ہے)

حاصل کلام: مصنف نے اس روایت کو اس باب میں اس لئے ذکر کیا ہے کہ اس پر تنبیہہ ہو جائے کہ مچھلی اور ٹڈی جب پانی میں مر جائیں خواہ پانی کی مقدار کم ہو یا زیادہ‘ وہ پانی نجس و ناپاک نہیں ہوتا۔ اس روایت کی سند عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وہ اپنے باپ سے اور وہ آگے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سلسلہ سے مروی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن سے مروی حدیث منکر ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے۔ جیسا کہ امام ابو زرعہؒ اور ابوحاتم نے کہا ہے۔ بیہقی نے کہا کہ اس حدیث کو زید بن اسلم کی اولاد یعنی عبداللہ اور عبدالرحمٰن اور اسامہ نے مرفوع بیان کیا ہے اور ابن معین نے ان (یعنی زید بن اسلم کی اولاد) کو ضعیف قرار دیا ہے البتہ احمد بن حنبل ان میں سے عبداللہ کو ثقہ کہتے ہیں۔ گو اس حدیث کا سنداً موقوف ہونا صحیح ہے‘ مگر یہ مرفوع ہے کیونکہ صحابی کا ”احلت لنا“ کہنا حکماً مرفوع تسلیم کیا گیا ہے یا ”حرم علینا“ کہنا اسی طرح حکماً مرفوع ہے جیسے ”امرنا“ یا ”نهينا“۔

یہ حدیث دلیل ہے اس کی کہ ٹڈی بہرصورت حلال ہے۔ خواہ اپنی طبعی موت مرے یا کسی دوسرے سبب سے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا فتویٰ ہے کہ اگر ٹڈی آدمی کے پکڑے یا سر کے کٹنے سے مرے تو حلال ہے بصورت دیگر حرام ہے۔ حدیث بالا امام صاحب کے فتویٰ کے خلاف ہونے کی بنا پر اس کی تردید کرتی ہے۔ یہی حال مچھلی کا ہے خواہ پکڑنے کے بعد مری ہو خواہ دریائی لہروں نے باہر پھینک دی ہو اور وہ مر گئی ہو۔ دونوں صورتوں میں حلال ہے۔ احناف کے ہاں اگر مچھلی پکڑنے یا دریا کے باہر پھینک دینے اور دیگر کسی سبب سے مری ہو تو حلال ہے اور اگر وہ خود بخود مر جائے یا کسی حیوان کے مارنے سے مرے تو حلال نہیں حرام ہے۔ حدیث بالا احناف کے بھی خلاف ہے۔ احناف نے ابوداؤد کی جس روایت سے استنباط کیا ہے اسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ لہٰذا ٹڈی اور مچھلی کی حلت کو کسی شرط سے مشروط کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی اور ٹڈی دل دونوں حلال ہیں چاہے خود مر جائیں یا کسی طریقہ سے مار دیا جائے دونوں مردار کے عمومی حکم سے خارج ہیں‘ ان کا ذبح کرنا مشروع نہیں ہے۔

(۱۲) وعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جب تمہارے کسی

ﷺ: «إِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِي شَرَابِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْمِسْهُ، ثُمَّ لِيَنْزِعْهُ فَإِنَّ فِي أَحَدِ جَنَاحَيْهِ دَاءً، وَفِي الآخَرِ شِفَاءً». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَزَادَ: «وَإِنَّهُ يَتَّقِي بِجَنَاحِهِ الَّذِي فِيهِ الدَّاءُ».

مشروب میں مکھی گر جائے تو اسے اس میں ڈبکی دے کر نکالنا چاہئے اس لئے کہ اس کے ایک پر میں مرض (کے جراثیم) ہوتے ہیں اور دوسرے میں شفا و علاج کے۔" (اس کو بخاری اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔) ابوداؤد کی روایت میں اتنا مزید اضافہ ہے کہ مکھی مشروب میں اپنا وہ پر ڈبوتی ہے جس میں بیماری کے جراثیم ہوتے ہیں۔

لغوی تشریح ﴿الذباب﴾ پیش اور تخفیف کے ساتھ۔ سب کے جانی پہچانی۔ یعنی مکھی۔ ﴿شراب﴾ پینے کا ہر مشروب۔ ﴿فليغمسه﴾ "میم" کے زیر کے ساتھ۔ ﴿غمس﴾ سے۔ "غمس" کے معنی پانی یا مائع یعنی بہنے والی چیز میں غوطہ لگانا' ڈبکی مارنا۔ ﴿لينزعه﴾ نزع سے۔ باہر نکالنا' کھینچ کر نکالنا۔ دونوں صیغوں پر لام' لام امر ہے اور معنی ہوئے کہ غوطہ دینا اور نکالنا چاہئے۔ ﴿والجناح﴾ سے مراد پر' جس کے ذریعہ پرندہ پرواز کرتا ہے' اڑتا ہے۔ ﴿داء﴾ بیماری اور مرض اور ایک روایت میں "سما" بھی منقول ہے۔

حاصل کلام: ابوداؤد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ مکھی اپنا وہ پر بچا کر رکھتی ہے جس میں بیماری اور مرض کے جراثیم ہوتے ہیں۔ یعنی مکھی جب مشروب میں پر ڈالتی ہے تو اپنا بیماری والا پر اس لئے ڈالتی ہے کہ اپنا آپ بیماری سے بچا لے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں یہ ہے کہ مکھی زہر والا پر آگے کرتی ہے اور جس میں شفاء ہوتی ہے اسے پیچھے رکھتی ہے۔ غوطہ دینا اور ڈبکی دے کر نکالنے میں مقصود بیماری کو توڑنا اور زہر کو شفا کے ذریعہ زائل کرنا ہے۔

حدیث مذکور اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مکھی اگر کسی سیال چیز میں گر کر مرجائے تو وہ نجس نہیں ہو جاتی۔ اس سے یہ حکم بھی نکالا گیا ہے کہ جس میں بہنے والا خون ہی جسم میں موجود نہ ہو۔ مثلاً شہد کی مکھی' مکڑی' بھڑ وغیرہ اور انہیں سے ملتے جلتے دیگر پرند۔ تو ان کے کسی مشروب یا بہہ نکلنے والی چیز میں گر کر مرجانے سے وہ نجس اور ناپاک نہیں ہو جاتا' کیونکہ نجاست زدہ ہونے کا سبب تو بہہ جانے والا خون ہے جو اس کی موت کے وقت جسم سے بہہ کر نکل جاتا ہے اور مذکورہ حیوانات میں یہ سبب یعنی خون ہی موجود نہیں۔ اس لئے ان کے مائع قسم کی چیز میں گر کر مرجانے سے وہ نجس نہیں ہوتا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دفع ضرر کیلئے مکھی کا مارنا جائز ہے ورنہ بغیر کسی ضرورت معقول کے کسی کو مارنا ناروا فعل ہے۔ یہ تو معلوم حقیقت ہے کہ اکثر اوقات مکھی گرم چیز میں گر کر مرہی جاتی ہے اور بعض اوقات ٹھنڈی چیز میں ڈبکی دینے سے بھی اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ پینے کی کسی چیز میں مکھی کے گرنے سے وہ چیز ناپاک نہیں ہو جاتی بلکہ اس صورت میں اسے ڈبکی دے کر باہر پھینک دینا

چاہئے۔

(١٣) وعَنْ أَبِيْ واقِدِ اللَّيثِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسولُ الله ﷺ: «مَا قُطِعَ مِنَ البَهِيمَةِ، وَهِيَ حَيَّةٌ، فَهُوَ مَيِّتٌ». أَخرَجَهُ أَبو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

حضرت ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "زندہ جانور میں سے جو کچھ کاٹ لیا جائے وہ مردار ہے۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ترمذی کے ہیں اور ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ما قطع﴾ یہاں "ما" موصولہ ہے اور "قطع" فعل مبنی مفعول کے لئے ہے۔ یعنی جو کچھ زندہ جانور کے جسم سے کاٹ لیا گیا۔ ﴿البھیمۃ﴾ ہر چار پاؤں پر چلنے والا جانور مگر چیر پھاڑ کرنے والا نہ ہو۔ ﴿وھی حیۃ﴾ اس میں "واؤ" حالیہ ہے یعنی اس حال میں کہ اسے ذبح نہ کیا گیا بلکہ زندہ ہو۔ ﴿فھو﴾ سے مراد زندہ جانور سے جو کچھ کاٹ کر الگ کر لیا گیا وہ مردہ ہے' اس کا کھانا حرام اور نجس ہو جاتا ہے۔ پانی وغیرہ کو نجس کر دینے والے باقی نجاسات کے حکم میں یہ بھی شامل ہے۔

حاصل کلام: اہل جاہلیت زندہ جانوروں سے کچھ گوشت کاٹ کر کھایا کرتے تھے۔ اس حدیث میں ان کے اس فعل شنیع کا رد ہے اور یہ کہ ایسا کاٹا ہوا گوشت مردار اور پلید ہے۔ لہٰذا اس کا کھانا حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابوواقد لیثی﴾ ابو واقد کنیت ہے اصل نام حارث بن عوف ہے۔ بنی عامر بن لیث کی طرف منسوب ہیں اس لئے لیثی کہلائے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ بدر کے غزوہ میں شریک تھے۔ بعد میں مکہ کی رہائش اختیار کر لی۔ ۶۵ھ / ۶۸ھ میں وفات پائی۔ جبکہ ان کی عمر ۷۵ برس تھی۔ فنج میں مدفون ہوئے۔

٢ - بَابُ الآنِيَةِ

برتنوں کا بیان

(١٤) عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ اليَمَانِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «لاَ تَشْرَبُوا فِي آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالفِضَّةِ وَلاَ تَأْكُلُوا فِي صِحَافِهَا، فَإِنَّهَا لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَكُمْ فِي الآخِرَةِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیا کرو اور ان کے پیالوں میں کھایا بھی نہ کرو۔ دنیا میں یہ کافروں کیلئے ہیں اور آخرت میں فقط تمہارے لئے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الانیۃ﴾ آنیۃ' اناء کی جمع ہے جس کے معنی برتن کے ہیں۔ "ابواب الطہارت" کے درمیان میں برتنوں کے احکام بیان کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ شریعت اسلامیہ میں بعض برتن ایسے ہیں جنہیں استعمال کرنا جائز ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کا استعمال ممنوع ہے۔ اس طرح ایک پاکباز

انسان کو جائز اور ممنوع برتنوں میں امتیاز حاصل ہو جاتا ہے۔ ﴿ صحافها ﴾ صحاف صحفة کی جمع ہے جس کے معنی پیالہ کے ہیں۔ ﴿ لهم ﴾ سے مشرکین مراد ہیں۔ ﴿ فی الدنیا ﴾ یعنی دنیا میں یہ برتن ان کیلئے ہیں' کا یہ مطلب نہیں کہ سونے اور چاندی کے برتن مشرکین کیلئے حلال ہیں بلکہ اس کا مفہوم و معنی یہ ہے کہ جس پر یہ مشرکین عملاً کاربند ہیں۔ یعنی دنیا میں یہ برتن مشرکین کے استعمال میں ہیں۔

حاصل کلام : اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا' پینا حرام ہے اور ان برتنوں کے پانی سے وضو اور غسل کرنا عموم کے اعتبار سے حرام ہے کہ ان کا استعمال درست نہیں' ورنہ اس حدیث کا اصل مقام کھانے پینے کا باب تھا۔ ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ جواہرات و یاقوت وغیرہ کے برتنوں میں کھانا اور پینا اور وضو و غسل کرنا جائز ہے۔ البتہ جن برتنوں پر سونے چاندی کا پانی ملمع کیا گیا ہو ان کے بارے میں اختلاف ہے۔ اجتناب کرنا بہرحال بہتر اور اولیٰ ہے۔

سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا یا ان برتنوں کے پانی سے وضو و غسل کرنا سب حرام ہے۔

راوی حدیث : ﴿ حضرت حذیفة رضی اللہ عنہ ﴾ : حذیفہ تصغیر ہے۔ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ مشہور صحابی ہیں اور صحابی باپ یمان رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور راز دان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب سے مشہور و معروف ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (ذوالنورین) کی شہادت کے چالیس روز بعد ۳۶ یا ۳۵ھ میں مدائن میں فوت ہوئے۔

(۱۵) وعن أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعالَى عَنها قالت: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «الَّذِي يَشْرَبُ فِي إِنَاءِ الفِضَّةِ إِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِي بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.	حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص چاندی کے برتنوں میں (کھاتا) پیتا ہے تو وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ انڈیلتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ یجرجر ﴾ "جرجرة" سے ماخوذ ہے۔ پیٹ میں داخل ہوتے وقت گلے میں پانی سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اسے "جرجرة" کہتے ہیں۔

حاصل کلام : اس حدیث میں بھی سونے چاندی کے برتنوں میں خورد و نوش کی ممانعت ہے اور اس ممانعت پر عمل پیرا نہ ہونے والوں کیلئے جہنم کی آگ کی وعید ہے کہ ایسے لوگ نار جہنم کا ایندھن ہوں گے۔

راوی حدیث : ﴿ ام سلمة رضی اللہ عنہا ﴾ ان کا نام ھند بنت ابی امیہ۔ ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسواد المخزومی کی زوجیت میں تھیں۔ حبشہ کی جانب پہلی ہجرت میں ان کے ساتھ تھیں۔ غزوۂ احد میں ابوسلمہ کو جو زخم لگا تھا اس کی وجہ سے یہ وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد شوال ۴ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے حرم میں داخل فرما لیا۔ ۵۹ھ میں یا ۶۲ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۴ برس کی تھی۔ بقیع قبرستان میں

دفن ہوئیں۔

(۱۶) وعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «إِذَا دُبِغَ الإِهَابُ فَقَدْ طَهُرَ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَعِنْدَ الأَرْبَعَةِ «أَيُّما إِهابٍ دُبِغَ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جب کچے چمڑے کو (مسالہ لگا کر) رنگ دیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے۔" (مسلم) اور سنن اربعہ میں یہ الفاظ منقول ہیں کہ "جونسا چمڑہ بھی رنگا جائے۔"

لغوی تشریح: ﴿ دبغ ﴾ دباغ سے ماخوذ ہے۔ یہاں مفعول واقع ہو رہا ہے۔ معنی اس کا یہ ہے کہ چمڑے کی رطوبت اور دیگر فضلات (گندگیوں) کو خشک کرنا اور جو چیز اس کی بدبو اور خرابی کی موجب ہو اسے زائل کرنا۔ ﴿ الاهاب ﴾ بروزن کتاب۔ مطلق چمڑے کیلئے استعمال ہوتا ہے یا پھر اس چمڑے کو بھی کہتے ہیں جسے ہنوز رنگا نہ گیا ہو۔ ﴿ ایما اهاب دبغ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس میں تمام چمڑے شامل ہیں۔ "ایما" عمومیت کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

حاصل کلام: پس حدیث اپنے عموم پر رہتے ہوئے یہ مطلب دے رہی ہے کہ ہر قسم اور ہر نوع کے حیوانات کے چمڑے اس میں شامل ہیں اور خنزیر یعنی سور کا چمڑہ بالاتفاق اس سے مستثنیٰ ہے اور اکثریت کے نزدیک کتے کا چمڑا بھی اس زمرے میں شامل ہے اور محققین علماء کے نزدیک ان تمام جانوروں کا چمڑا بھی اس میں شامل ہے جن کا گوشت کھایا نہیں جاتا۔ حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ دباغت (رنگائی) کے بعد ہر قسم کا چمڑہ پاک ہو جاتا ہے' وہ چمڑہ خواہ حلال جانور کا ہو یا حرام کا ہو' جانور خواہ شرعی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو یا خود اپنی طبعی موت مرا ہو۔ اس اصول عمومی کے باوجود بعض جانور ایسے ہیں جن کے چمڑے کو دباغت کے باوجود پاک قرار نہیں دیا گیا' مثلاً خنزیر کا چمڑہ ہے اسے نجس عین ہونے کی بنا پر پاک قرار نہیں دیا گیا اور انسان کا چمڑہ ہے اسے بھی بوجہ اس کی کرامت و بزرگی اور شرف کے حرام ٹھہرایا گیا ہے' تاکہ بے قدری سے اسے محفوظ رکھا جائے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ خنزیر اور کتے پر اگر تکبیر پڑھ کر انہیں ذبح کیا جائے تو اس صورت میں وہ بھی پاک ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح رائے نہیں ہے اسی طرح احناف کا کتے کے چمڑے کو دباغت کے بعد حلال قرار دینا بھی صائب و صحیح رائے پر مبنی نہیں ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ جن جانوروں کے چمڑے دباغت کے بعد پاک ہو جاتے ہیں ان کے سینگ' بال' دانت اور ہڈیاں وغیرہ کام میں لائی جا سکتی ہیں نیز ان کی تجارت بھی کی جا سکتی ہے۔

(۱۷) وعن سَلَمَةَ بْنِ المُحبّقِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قال رسولُ الله ﷺ: «دِبَاغُ جُلُودِ المَيْتَةِ طَهُورُهَا». صَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت سلمہ بن محبق رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مردہ جانوروں کے چمڑوں کو رنگنا ہی ان کی طہارت و پاکیزگی ہے۔" (ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

راوی حدیث: ﴿ سلمة ﴾ "سین" "لام" اور "میم" کے زبر کے ساتھ۔ ﴿ المحبق ﴾ "میم" کی پیش، حاء کی زبر، "باء" کی تشدید اور زیر کے ساتھ، مگر محدثین "با" پر فتح کے قائل ہیں اور یہی زیادہ مشہور ہے۔ ابوسفیان ان کی کنیت ہے۔ بصری صحابہ میں ان کو شمار کیا جاتا ہے۔ ھذیل بن مدرکہ بن الیاس کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ھذلی کہلاتے ہیں۔ وہ حنین میں تھے جب انہیں ان کے بیٹے "سنان" کی پیدائش کی خوشخبری دی گئی تو انہوں نے فرمایا۔ جو تیر میں رسول اللہ ﷺ کی مدافعت میں چلاتا تھا اس کی خوشی مجھے میرے بیٹے کی بشارت سے زیادہ ہے۔

(١٨) وعَنْ مَيْمُونَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ بَشَاةٍ يَجُرُّونَها، فَقَالَ: «**لَوْ أَخَذْتُمْ إِهَابَها**» فَقَالُوا: إِنَّهَا مَيْتَةٌ، فَقَالَ: «**يُطَهِّرُهَا المَاءُ والقَرَظُ**». أَخْرَجَه أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيّ.

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک مردہ بکری کے پاس سے ہوا جسے لوگ گھسیٹتے ہوئے لئے جا رہے تھے۔ آپؐ نے ان سے فرمایا کہ "کاش تم نے اس کی کھال ہی اتار لی ہوتی۔" اس پر وہ بولے، (حضور ﷺ) وہ تو مری ہوئی ہے۔ آپؐ نے (یہ سنکر کر فرمایا پھر کیا ہوا؟) "اس کو پانی اور کیکر کی چھال پاک کر دیتی ہے۔" (ابوداؤد۔ نسائی)

لغوی تشریح: ﴿ القرظ ﴾ "قاف" اور "راء" کے زبر کے ساتھ۔ کیکر کے پتے، چھال۔ عرب میں اس کے ساتھ چمڑے کی دباغت مشہور و معروف تھی۔

حاصل کلام: یہ اور پہلی دونوں احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مردار کے چمڑے دباغت سے پاک ہو جاتے ہیں تو پھر ان کے برتنوں سے وضو وغیرہ بھی جائز ہے۔

معلوم ہوا کہ مردار چوپائیوں کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے لہٰذا ایسی کھال سے ڈول وغیرہ بنانا جائز ہے۔

(١٩) وعَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الخُشَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّا بِأَرْضِ قَومٍ أَهْلِ كِتَابٍ، أَفَنَأْكُلُ فِي آنِيَتِهِمْ؟ قَالَ: «**لاَ تَأْكُلُوا فِيهَا إِلاَّ أَنْ لاَ تَجِدُوا غَيْرَهَا، فَاغْسِلُوهَا، وَكُلُوا فِيهَا**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ہم اہل کتاب کے علاقے میں رہتے ہیں کیا ہم ان کے استعمال کے برتنوں میں کھا سکتے ہیں؟ جواب میں آپؐ نے فرمایا "ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ، البتہ اگر ان کے ماسوا اور برتن میسر نہ ہو سکیں تو پھر ان کو دھو کر ان میں کھا سکتے ہو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿انا﴾ ہمزہ کے کسرہ "نون" کی تشدید کے ساتھ، ضمیر متکلم کے ساتھ حرف تاکید ہے۔ ﴿اهل الكتاب﴾ کتاب والے، مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور یہ لفظ ان کیلئے بطور صفت استعمال ہوا ہے۔ ﴿افنا کل فی انیتهم﴾ ایک تردد اور تذبذب پیدا ہوتا تھا کہ یہود و نصاریٰ اکثر اوقات اپنے برتنوں میں سور کا گوشت پکاتے ہیں اور ان میں شراب پیتے ہیں۔ ابوداؤد اور مسند احمد کی روایت میں یہ صراحت و وضاحت موجود ہے کہ ہم اہل کتاب کے ساتھ رہتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی ہانڈیوں میں خنزیر کا گوشت پکا رہے ہوتے ہیں اور اپنے پینے کے برتنوں میں شراب نوشی کر رہے ہوتے ہیں تو آپؐ نے ارشاد فرمایا "پھر ان کے برتنوں میں مت کھاؤ، پیو۔" آپؐ کا جواب اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے برتنوں میں خورد و نوش سے احتراز کرنا چاہئے تاوقتیکہ ان کے استعمال کرنے میں اضطراری حالت پیش نہ آجائے۔ پھر جب مجبوری لاحق ہو جائے اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے تو پھر بھی ان کے پاک کرنے پر اعتماد نہ کیا جائے بلکہ خود ان کو پاک کیا جائے۔ اس حدیث میں نہی حرمت کیلئے نہیں ہے بلکہ طبعی منافرت کیلئے کہ ذوق سلیم ان برتنوں میں کھانے سے انکار کرتا ہے اور اس سے بھی نفرت کرتا ہے کہ جن برتنوں میں ایسی گندگی اور نجس چیزیں پکائی جائیں ان میں پکی ہوئی چیز استعمال کی جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے زیر استعمال برتنوں میں کھانا، ان میں پینا اور ان برتنوں کے پانی سے وضو کرنا وغیرہ جائز نہیں۔ اس کی علت اور وجہ واضح ہے کہ یہ لوگ ناپاک اور نجس چیزیں ان میں پکاتے ہیں۔ جب اہل کتاب کے برتنوں میں کھانا پینا وغیرہ جائز نہیں تو ہنود، دہریوں اور ملحدوں کے ان برتنوں میں بھی کھانے پینے سے اجتناب کرنا چاہئے جن میں ناپاک و نجس چیزیں پکائی اور کھائی جاتی ہوں۔

راوی حدیث: ﴿ابوثعلبة الخشنی﴾ "خاء" کے پیش اور "شین" کی زیر کے ساتھ، خشین بن نمر جس کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے تھا، کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے خشنی کہلائے۔ بیعت رضوان کرنے والوں میں سے تھے۔ اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا تو وہ سب اسلام لے آئے۔ شام میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں ۷۵ھ میں وفات پائی۔ نماز پڑھ رہے تھے کہ سجدہ کی حالت میں روح پرواز کر گئی۔ ان کے اور ان کے والد کے نام میں شدید اختلاف ہے۔ کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔

(۲۰) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ الله تعالى عنهما: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وأَصْحابَه تَوَضَّؤُوا مِن مَزَادَةِ امْرَأَةٍ مُشْرِكَةٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک مشرکہ عورت کے مشکیزہ سے پانی لے کر اس سے وضو کیا۔ (بخاری و مسلم۔ یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے)

لغوی تشریح: ﴿مزادة﴾ میم کے زبر اور زائے معجمہ کے ساتھ۔ مشکیزہ کے معنی میں آیا ہے۔ جس کی

ساخت چمڑے سے ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے اہل کتاب کے علاوہ مشرکین کے بھی زیر استعمال برتنوں کے پاک ہونے کی جانب راہنمائی ملتی ہے اور یہ اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ مردہ جانور کی کھال دباغت کے بعد پاک ہو جاتی ہے کیونکہ جس مشکیزہ سے آپؐ نے پانی لیا وہ ایک مشرکہ عورت کے قبضہ میں تھا اور مشرکین کے ذبح کردہ جانور کی کھال سے تیار کیا گیا تھا اور ان کے ذبائح تو مردار ہی ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین کے ایسے برتن جن میں نجاست وغیرہ کا اندیشہ نہ ہو ان کا استعمال بغیر کسی تردد و تذبذب کے جائز و درست ہے اور اس حدیث سے دباغت شدہ کھال کے پاک ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿عمران بن حصین رضی اللہ عنہ﴾ خزاعی کعبی تھے۔ ان کا شمار اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا تھا۔ ان کی کنیت ابونجید تھی۔ غزوۂ خیبر کے زمانہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں ۵۲ھ یا ۵۳ھ میں وفات پائی۔

(۲۱) وعن أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ الله تعالى عنه: أَنَّ قَدَحَ النَّبِيِّ ﷺ انْكَسَرَ فَاتَّخَذَ مَكَانَ الشَّعْبِ سِلْسِلَةً مِنْ فِضَّةٍ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ذاتی پیالہ ٹوٹ گیا تو آپؐ نے اس ٹوٹی جگہ پر چاندی کا تار لگوا دیا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿القدح﴾ "قاف" اور "دال" دونوں پر زبر۔ چھوٹا "پیالہ"۔ ﴿الشعب﴾ "شین" کے زبر اور "عین" کے سکون کے ساتھ۔ ٹوٹی ہوئی جگہ۔ ﴿سلسلۃ﴾ دونوں جگہ سین پر زبر۔ ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملانا' جوڑنا اور دونوں جگہ سین کے زیر کے ساتھ بھی ہے تو اس صورت میں لڑی' زنجیر وغیرہ کے معنی ہوں گے۔ وہ لوہے کی زنجیر دھاگے کی طرح باریک ہوگی۔ معنی یہ ہوا کہ دونوں جانب شکستہ مقام کو چاندی کے تار سے ملا دیا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ ایسی ضروریات و اغراض کیلئے تھوڑی سی چاندی استعمال کرنا جائز ہے۔ گویا کھانے پینے کے برتنوں میں ضرورتاً اتنی کم مقدار میں سونا اور چاندی اگر لگا ہو تو ایسے برتنوں میں کھانا پینا جائز ہے اور ان سے وضو' غسل وغیرہ کرنا بھی بلا کراہت درست اور جائز ہے۔ سونے' چاندی سے بنے ہوئے برتنوں کے استعمال میں تکبر اور تعلی کا عمل دخل ہوتا ہے۔ کبر و نخوت اور تعلی خالق کائنات کو پسند نہیں۔ اس لئے ان کا استعمال ناجائز قرار دیا گیا اور شکستہ کو تار کے ذریعہ پیوستہ کر کے استعمال کرنے میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں کبر وغرور اور تعلی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس بنا پر استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔

۳ - بَابُ إِزَالَةِ النَّجَاسَةِ وَبَيَانِهَا — نجاست کی تفصیل اور اسے

دور کرنے کا بیان

(۲۲) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه قَالَ: سُئِلَ رَسُولُ الله ﷺ عَنِ الخَمْرِ تُتَّخَذُ خَلاًّ؟ قال: «لاَ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے شراب سے سرکہ بنانے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ (مسلم و ترمذی۔ اور ترمذی نے اسے حسن اور صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ عن الخمر ﴾ یعنی حرمت شراب کے بعد۔ شراب سے سرکہ بنانے کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ ﴿ خل ﴾ "خاء" کے فتح اور لام کی تشدید' شراب یا انگور وغیرہ کے شیرہ سے تیار کردہ سرکہ' یعنی کیا شراب کی صورت تبدیل کر کے سرکہ بنا لینا جائز ہے یا نہیں؟ ﴿ فقال: لا ﴾ اس کے جواب میں فرمایا ایسا کرنا جائز نہیں۔ اس میں نہی تحریم کیلئے ہے۔

حاصل کلام: اس میں یہ دلیل پائی جاتی ہے کہ شراب کا سرکہ بنانا حرام ہے۔ البتہ اس میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں کہ شراب جب سرکہ بن جاتا ہے تو اس کے جواز اور حرمت کے بارے میں کیا رائے ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس کی حرمت پر کوئی واضح دلیل نہیں اور یہ حقیقت معلوم ہے کہ ایک چیز کی حالت کے بدلنے سے اس کا حکم بھی تبدیل ہو جاتا ہے لیکن شراب کا سرکہ بنانا ممنوع ہے۔

اس حدیث کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس یتیموں کی شراب تھی۔ حرمت شراب کے حکم آنے کے بعد انہیں اندیشہ لاحق ہوا کہ یتیموں کا بڑا نقصان ہوگا۔ اس نقصان سے بچنے کیلئے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے شراب کو سرکہ میں تبدیل کرنے کی اجازت طلب کی۔ جس کے جواب میں آپؐ نے ایسا کرنے سے صاف طور پر منع فرما دیا۔ اس کھلی اور واضح ممانعت کے باوجود جس کسی نے شراب سے سرکہ بنانے کے جواز کا فتویٰ دیا اس نے نص صریح کی خلاف ورزی کی۔ اس حدیث (اور دیگر ادلہ شرعیہ) سے معلوم ہوا کہ شراب کا ہر قسم کا استعمال ناجائز ہے اور اس سے سرکہ بنانا بھی ممنوع ہے۔

(۲۳) وعَنْهُ قَالَ: لَمَّا كَانَ يَومُ خَيْبَرَ أَمَرَ رَسُولُ الله ﷺ أَبَا طَلْحَةَ فَنَادَى: أَنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يَنْهَيَانِكُمْ عَنْ لُحومِ الحُمُرِ الأَهْلِيَّةِ، فإِنَّها رِجْسٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْه.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ جس روز غزوۂ خیبر تھا رسول اللہ ﷺ نے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا (کہ لوگوں کو مطلع کر دیں) انہوں نے بآواز بلند اعلان کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ دونوں تمہیں گھریلو گدھوں کے گوشت کو کھانے سے منع فرماتے ہیں' کیونکہ وہ رجس (ناپاک) ہے۔ (بخاری

و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یوم خیبر ﴾ سے غزوۂ خیبر کے روز مراد ہے ۔ خیبر مدینہ کے شمالی جانب ۹۶ میل کے فاصلہ پر ایک شہر ہے۔ یہاں یہود رہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد محرم ۷ھ میں یہ غزوۂ یہود کے ساتھ واقع ہوا۔ فتح خیبر کے بعد نبی ﷺ نے ان کو اسی جگہ پر اس شرط کے ساتھ رہنے کا حق دیا کہ وہ اپنے کھیتوں کے اناج اور باغات کے پھلوں کا آدھا حصہ مسلمانوں کو دیں گے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو تیماء اور اریحا کی طرف جلا وطن کر دیا۔ ﴿ ینھیانکم ﴾ میں تثنیہ کی ضمیر اللہ اور اس کے رسول کی طرف راجع ہے۔ یعنی تمہیں اللہ اور اس کا رسول منع فرماتے ہیں۔ ﴿ الحمر ﴾ "حاء" اور "میم" کے پیش کے ساتھ۔ اس کا واحد حمار ہے۔ اردو میں جسے گدھا کہتے ہیں۔ ﴿ الاھلیۃ ﴾ گھریلو (جنگلی نہیں) اھلیۃ کی نسبت اھل کی طرف ہے یعنی وہ جسے انسان اپنے گھر میں اہل و عیال کے ہاں پرورش کرتا اور پالتا ہے۔ ﴿ رجس ﴾ راء کے زیر سے۔ ہر وہ چیز جسے ایک انسان گندگی تصور کرتا ہے خواہ وہ نجس ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ گدھے کا جوٹھا نجس اور ناپاک ہے۔

حاصل کلام: گدھے کا گوشت بالاتفاق حرام ہے۔ صرف ابن عباس رضی اللہ عنہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ گدھے کا جوٹھا ائمہ اربعہ کے نزدیک پاک ہے۔ بعض فقہاء مثلاً امام حسن بصری رحمہ اللہ اور امام اوزاعی رحمہ اللہ وغیرہ اسے ناپاک کہتے ہیں۔ اس بارے میں ائمہ اربعہ کی رائے قابل ترجیح اور زیادہ قرین صواب ہے۔

راوی حدیث: ﴿ حضرت ابو طلحۃ رضی اللہ عنہ ﴾ : ابوطلحہ کنیت۔ نام زید بن سہل بن الاسود بن حرام انصاری، کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ بیعت عقبہ میں شریک تھے اور اس کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے۔ غزوۂ احد میں حضور ﷺ کا دفاع کرتے ہوئے ہاتھ شل ہوگیا۔ معرکہ حنین میں بیس دشمنان اسلام کو قتل کیا۔ ۳۴ھ یا بقول بعض ۵۱ھ میں وفات پائی۔

(۲٤) وعن عَمْرو بْنِ خَارِجَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسولُ الله ﷺ بِمنًى وَهُوَ عَلَى رَاحِلَتِهِ، وَلُعَابُهَا يَسِيْلُ عَلَى كَتِفِي. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ.

حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی سواری پر مقام منیٰ میں ہمیں خطاب فرمایا اور اس اونٹنی کا لعاب دہن میرے کندھوں پر بہتا تھا۔ (احمد و ترمذی۔ اور ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ بمنی ﴾ تنوین کے ساتھ مکہ مکرمہ کے ساتھ یہ وہ جگہ ہے جہاں حج کے مشہور ترین شعائر میں سے قربانی کے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ ﴿ لعابھا ﴾ "لام" کے ضمہ کے ساتھ۔ منہ سے پانی کی صورت میں جو رال ٹپکتی اور گرتی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ان حیوانات کا لعاب دہن پاک ہے جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔

راوی حدیث : ﴿ عمرو بن خارجہ بن منتفق اسدی ﴾ : بقول بعض اشعری اور بقول شخصے انصاری اور کسی کے بقول جمحی قبیلے سے ہیں۔ ابو سفیان کے حلیف تھے۔ ان کے اسدی ہونے کے بارے میں زیادہ شہرت ہے۔ مشہور صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ شام میں سکونت اختیار کی۔

(٢٥) وعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رسولُ الله ﷺ يَغْسِلُ المَنِيَّ ثُمَّ يَخْرُجُ إِلَى الصَّلاَةِ فِي ذَلِكَ الثَّوبِ وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَى أَثَرِ الغَسْلِ فِيْهِ. متفق عليه.

ولمسلم: «لَقَدْ كُنْتُ أَفْرُكُه مِنْ ثَوبِ رَسولِ اللهِ ﷺ فَرْكاً، فَيُصلِّي فِيْهِ. وَفِي لفظٍ لَهُ: «لَقَد كُنْتُ أَحُكُّهُ يَابِساً بِظُفرِي مِنْ ثَوْبِهِ».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی ﷺ (کپڑے پر لگی ہوئی) منی کو دھویا کرتے تھے۔ پھر اسی کپڑے کو زیب تن فرما کر نماز پڑھ لیتے تھے اور میں دھونے کے نشان اور اثر کو صاف طور پر (اپنی آنکھوں سے) دیکھتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی روایت میں ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے منی کو کھرچ دیا کرتی تھی۔ پھر آپ اسی کپڑے میں نماز ادا فرما لیتے تھے۔

اور مسلم ہی کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جب منی خشک ہو جاتی تو میں اپنے ناخن سے اسے کھرچ کر کپڑے سے اتار دیتی۔

لغوی تشریح: ﴿ افرکہ ﴾ اس میں ضمیر متصل "ہ" سے مراد منی ہے۔ راء کے کبھی پیش سے اور کبھی زیر کے ساتھ۔ باب نصر ینصر اور ضرب یضرب دونوں سے آتا ہے۔ ﴿ الفرک ﴾ کے معنی مل کر صاف کرنا کہ اس کا اثر زائل ہو جائے۔ ﴿ احکہ ﴾ میں بھی ضمیر متصل ہ سے مراد منی ہے۔ "حاء" کے پیش کے ساتھ "حک" سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی بھی ملنا کے آتے ہیں۔ ﴿ یابسا ﴾ حال واقع ہوا ہے جس کے معنی خشک کے ہیں۔

حاصل کلام: اس بارے میں وارد تمام روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ منی کو مطلقاً کپڑے سے دھونا واجب نہیں خواہ وہ خشک ہو یا تر' بلکہ اس کو زائل کرنے کیلئے جبکہ وہ خشک ہو اتنا کافی ہے کہ اسے صاف کر دے ہاتھ سے یا کپڑے کے ٹکڑے سے یا اذخر گھاس سے اور ان دونوں جیسی چیزوں مثلاً لکڑی یا سرکنڈے وغیرہ سے۔ ایک گروہ نے ان احادیث کی روشنی میں یہ استدلال کیا ہے کہ منی پاک ہے۔ مگر اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس پر دلالت کرتی ہو کہ منی پاک ہے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں کہا ہے کہ تعبدا منی کو دھو کر' ہاتھ کے ساتھ صاف کر کے' اسے مل کر' رگڑ کر وغیرہ طریقوں سے زائل کرنا ثابت ہے۔ کسی چیز کا نجس ہونا یہ معنی نہیں رکھتا۔ پس صحیح موقوف اور صائب مسلک یہی ہے کہ منی ناپاک ہے لہٰذا مذکورہ بالا تمام طریقہ ہائے طہارت میں سے کسی ذریعہ سے اس کو پاک کیا جائے۔

مگر علامہ شوکانی نے السیل الجرار اور الدرر البھیھۃ میں منی کو پاک قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی نجاست پر کوئی نص نہیں۔ گویا اس بارے میں ان کی رائے مختلف ہے۔

واضح رہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ انسان کا مادہ منویہ پاک ہے یا ناپاک۔ اس میں دو مکتب فکر پائے جاتے ہیں۔ ایک مکتب فکر کی رائے ہے کہ منی آب بینی اور لعاب دہن کی طرح پاک ہے۔ اس نقطہ نظر کی نمائندگی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' داؤد ظاہری رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ائمہ میں سے اور صحابہ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ' حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کرتی ہیں اور دوسرے مکتب فکر کی نمائندگی ائمہ میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کرتے ہیں لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خشک منی کھرچ دینے سے کپڑا پاک ہو جاتا ہے۔ پانی سے دھونا ضروری نہیں۔ دونوں مکتب فکر کے پاس دلائل ہیں۔ منی کو پاک قرار دینے والوں کی دلیل اسے کھرچ دینا ہے' اس کے بعد چونکہ کپڑا دھویا نہیں گیا اس لئے یہ پاک ہے ورنہ کھرچنے کے بعد اسے دھویا ضرور جاتا اور جس گروہ نے اسے ناپاک کہا ہے ان کی دلیل منی سے آلودہ جگہ کو پانی سے دھونا ہے اگر یہ پاک ہوتی تو دھونے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسے پاک کہنے والوں کا جواب یہ ہے کہ کپڑے کو دھویا تو صرف نظافت کی بنا پر گیا ہے نجاست کی وجہ سے نہیں۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بدائع الفوائد' ص: ۱۱۹۔ ۱۲۶' ج ۳ میں اس پر بڑی نفیس بحث کی ہے۔

راوی حدیث: ﴿عائشۃ صدیقہ بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما﴾: ہجرت مدینہ سے دو سال قبل ماہ شوال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی زوجیت میں لیا اور رخصتی اھ میں ہوئی۔ رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔ ۵۷ھ یا ۵۸ھ کے ماہ رمضان کی ۱۷ تاریخ کو فوت ہوئیں۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن کی گئیں۔ بڑی عالمہ فاضلہ تھیں۔ بکثرت احادیث کی راویہ ہیں۔ اشعار عرب سے بخوبی واقف تھیں۔ آپ کی برأت آسمان سے نازل ہوئی۔ جس کا قرآن مجید کی سورۂ نور میں ذکر ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم انہی کے حجرہ میں مدفون ہیں۔

(٢٦) وعَن أَبِي السَّمْحِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسولُ اللهِ ﷺ: «يُغسَلُ مِنْ بَوْلِ الجَارِيَةِ، وَيُرَشُّ مِنْ بَوْلِ الغُلَامِ». أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسائِيُّ، وَصَحَّحَه الحَاكِمُ.

حضرت ابو السمح رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "لڑکی کے پیشاب سے کپڑا دھویا جائے گا اور لڑکے کے پیشاب سے کپڑے پر پانی کے چھینٹے مارے جائیں گے۔" (اسے ابوداؤد و نسائی اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿من بول الجاریۃ﴾ اس میں "من" تعلیل یعنی علت و وجہ کیلئے ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ کپڑے' بدن وغیرہ پر لڑکی کے پیشاب لگنے کی وجہ سے۔ ﴿الجاریۃ﴾ لڑکی' بچی کے معنی۔ ﴿یرش﴾

"رش" سے ماخوذ ہے اور مجہول کا صیغہ ہے اور معنی اس کے چھڑکنے کے ہیں۔ وہ اس طرح کہ جہاں پیشاب لگا ہو وہاں پانی اتنا چھڑکا جائے کہ اتنے متاثرہ حصہ پر پانی غالب آئے اور متاثرہ جگہ کو ڈھانپ لے مگر اتنی کثیر مقدار میں چھڑکنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ پانی وہاں سے بہہ نکلے اور قطروں کی صورت میں نیچے گرنے لگے۔

حاصل کلام: حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ لڑکے اور لڑکی کے پیشاب میں شرعی حکم الگ الگ ہے۔ لڑکی کے پیشاب سے کپڑے کو دھونے کا اور لڑکے کے پیشاب کیلئے پانی کا چھڑکنا اس وقت تک ہے جب تک دونوں کی غذا دودھ ہے۔ دودھ کے علاوہ غذا کھانے کی صورت میں دونوں کے پیشاب نجاست کے اعتبار سے یکساں حکم رکھتے ہیں۔ بچے کے پیشاب پر پانی چھڑکنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ پاک ہے۔ بس حدیث میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ بچے کے پیشاب کو پاک کرنے میں شریعت نے ذرا نرمی دی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ لڑکی اور لڑکے کے پیشاب میں فرق ہے۔ شیر خوارگی کے ایام میں لڑکی کا پیشاب لڑکے کی بہ نسبت زیادہ ناپاک ہے۔ شیر خوارگی کے بعد دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ' ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ' حضرت علی رضی اللہ عنہ' حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور اسحٰق بن راھویہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکنا کافی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دھونا قرار دیتے ہیں جو صحیح نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابوالسمح ﴾ "سین" پر زبر اور "میم" ساکن۔ ابوالسمح اس کی کنیت ہے۔ ایاد (ھمزہ کے کسرہ کے ساتھ) ان کا نام ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نام اور کنیت ایک ہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور آپؐ کے خادم تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ گم ہوگئے تھے۔ معلوم نہیں کہاں وفات پائی؟ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔

(۲۷) وعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي دَمِ الحَيْضِ يُصِيْبُ الثَّوْبَ: «تَحُتُّهُ، ثُمَّ تَقْرُصُهُ بِالمَاءِ، ثُمَّ تَنْضَحُهُ، ثُمَّ تُصَلِّي فِيهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيهِ.

حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما روایت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حیض کا خون جو کپڑے کو لگ جائے کے متعلق فرمایا۔ "پہلے اسے کھرچ ڈالو پھر پانی سے مل کر دھو لو پھر اس پر کھلا پانی بہاؤ پھر اس میں نماز پڑھ لو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ تحتہ ﴾ "تا" کے فتح "حاء" کے ضمہ اور دوسرے "تا" کے تشدید اور ضمہ کے ساتھ' باب نصر ینصر سے صیغہ مؤنث "حت" سے ماخوذ ہے جس کے معنی تلنا اور کھرچنا ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ کپڑے پر لگے ہوئے خون کو اچھی طرح مل کھرچ کر دور کر دینا اور "ہ" کی ضمیر منصوب "دم" کی جانب راجع ہے۔ ﴿ ثم تقرصہ ﴾ اس میں "ہ" کی ضمیر کپڑے کی طرف راجع ہے "ر" پر ضمہ ہے' باب نصر ینصر سے ہے۔ اس سے مراد ہے کہ کپڑے کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں سے خوب مل کر دھویا

جائے۔ یعنی عورت اس کپڑے پر پانی ڈال کر اچھی طرح بھگو کر تر کر لے پھر اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے اطراف کے ساتھ اچھی طرح مل کر دھوئے' تاکہ خون کا جتنا حصہ کپڑے میں جذب ہو چکا تھا وہ اس سے خارج ہو جائے۔ ﴿ ثم تنضحه ﴾ "ضاد" پر فتحہ اور اسے کسرہ دینا بھی جائز ہے۔ فتح یفتح اور ضرب یضرب سے۔ معنی یہ ہوئے کہ آخر میں اس پر اچھی طرح پانی بہاؤ۔

حاصل کلام: خون کو اولاً خوب رگڑنے کا حکم ہے' تاکہ پانی کے اس میں سرایت کرنے کا راستہ بن سکے پھر اسے دھونے کا حکم ہے' تاکہ خون کا اثر زائل ہو جائے۔ محض دھونے سے ایسی صفائی حاصل ہونا مشکل تھا۔ نضح کا اس مقام پر موقع کی مناسبت سے معنی غسل کیا گیا ہے۔ جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ باب میں غسل کا ذکر کیا ہے اور اس کے تحت جو حدیث نقل کی ہے وہ نضح اور غسل دونوں پر حاوی ہے پس یہ حدیث ہی نضح کے معنی غسل کے لینے کی واضح دلیل ہے۔

خون حیض رگڑنے اور مل کر دھونے کے باوجود اپنے اثرات اور نشانات باقی چھوڑے تو اس میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں۔ ایسے کپڑوں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے جیسا کہ آنے والی حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما ﴾ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی بہن۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی والدہ تھیں۔ مکہ میں ایمان لانے والے قدیم الاسلام مسلمانوں میں سے تھیں۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ ۷۳ھ میں اپنے بیٹے عبداللہ کے قتل کئے جانے کے ایک ماہ بعد مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً سو برس تھی۔ ایسی پیرانہ سالی کے باوجود نہ ان کا کوئی دانت گرا اور نہ ہی عقل میں کسی قسم کا کوئی تغیر پیدا ہوا۔

(۲۸) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه قال: قَالَتْ خَولَةُ: يَا رَسُولَ اللهِ! فَإِن لَمْ يَذْهَبِ الدَّمُ؟ قَالَ: «يَكْفِيكِ المَاءُ، وَلاَ يَضُرُّكِ أَثَرُهُ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَسَنَدُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ خولہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! سے استفسار کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم (اگر خون آلود کپڑے کو اچھی طرح مل کر دھونے کے باوجود) خون کا نشان ختم نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے؟ ارشاد فرمایا "بس تیرا اس پر اچھی طرح پانی بہانا کافی ہے' اس کا نشان تیرے لئے ضرر رساں نہیں۔" (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فان لم یذهب ﴾ یعنی خون آلود کپڑے کو خوب ملنے' رگڑنے اور کھرچنے کے اور اچھی طرح پانی سے دھونے کے بعد بھی اگر خون کا اثر نہ جائے۔ ﴿ یکفیك الماء ﴾ یعنی پانی کے ساتھ دھونا تیرے لئے کافی ہے۔ اس کے بعد کسی تذبذب' تردد اور شک کی ضرورت نہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نجاست عین کو زائل کرنے کے بعد کپڑا پاک ہو جاتا ہے۔ اس کے باقی ماندہ اثرات و نشانات کو دور کرنا کپڑے کی پاکیزگی کیلئے شرط نہیں ہے۔ اس روایت کی سند میں چونکہ ابن لہیعہ ایک ایسا راوی ہے جسے علماء فن رجال نے ضعیف قرار دیا ہے ورنہ جہاں تک حدیث میں مذکورہ مسئلہ کا تعلق ہے وہ معنوی اعتبار سے صحیح ہے۔

راوی حدیث: ﴿ خولہ رضی اللہ عنہا ﴾ خاء کے فتح اور واؤ کے سکون کے ساتھ۔ خولہ سے مراد خولہ بنت یسار ہے۔ مشہور صحابیہ ہیں۔ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے ان سے روایت کیا ہے۔ ابن عبدالبر کا خیال ہے کہ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ خولہ بنت یمان ہوں گی۔ مگر مؤلف نے اس کی تردید کر دی ہے۔ (الاصابہ)

٤ - بَابُ الوُضُوءِ — وضو کا بیان

(٢٩) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه عن رسول اللهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: «لَوْلاَ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ مَعَ كُلِّ وُضُوءٍ». أَخرَجَهُ مَالِكٌ وَأَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ، وَذَكَرَهُ البُخَارِيُّ تَعْلِيقاً.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "اگر مجھے اپنی امت کو مشقت و تکلیف میں مبتلا کرنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دے دیتا۔" (مالک' احمد اور نسائی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اس کو تعلیقاً نقل کیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ باب الوضوء ﴾ "واؤ" کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے۔ لغوی طور پر اس کے معنی ہیں ہاتھوں اور پاؤں وغیرہ کے اطراف کو دھونا۔ مطلقاً اور شرعاً دونوں طرح دھونے کو شامل ہے۔ وضو کا عمل' اس سے سب واقف ہیں اور معروف و مشہور ہے۔ اگر وضو میں "واؤ" کے فتح کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی اس برتن میں موجود پانی کے ہیں جس سے وضو کیا جاتا ہے۔

﴿ لو لا ان اشق ﴾ کا مطلب ہے کہ اگر مجھے یہ خوف لاحق نہ ہوتا کہ میں اپنی امت کو کہیں تکلیف اور مشقت میں مبتلا نہ کر دوں۔ ﴿ لامرتھم ﴾ تو میں ان کو حکم دیتا۔ اس میں امر ایجاب کے حکم میں۔ یعنی میں واجب قرار دیتا۔ ایسا حکم صادر ہے۔ فرمانے سے رکنا رفع مشقت کی مصلحت کے پیش نظر اس کا مقتضی ہے۔ مسواک کرنا مسنون ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب بھی وضو کیا جائے اس کے ساتھ مسواک کرنا مسنون ہے۔ مسلم اور ابوداؤد میں مروی ہے کہ مسواک کرنا منہ کو صاف اور اپنے پروردگار کو راضی کرنے کا موجب ہے۔ مزید یہ کہ مسواک تمام انبیاء و رسل کی سنت ہے۔ مسند امام احمد' ابن خزیمہ' حاکم اور دارقطنی وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جو نماز مسواک کر کے پڑھی گئی ہو اس کا ثواب

بے مسواک نماز سے ستر گنا زیادہ ہے۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے۔ اگر پہلے سے وضو موجود ہو تو نماز کی ادائیگی سے پہلے مسواک کر لینی چاہیے تا کہ اتباع سنت کا تقاضا پورا ہو سکے۔

(۳۰) وعَنْ حُمْرَانَ مَوْلَى عُثْمَانَ رضي الله تعالى عنه: أَنَّ عُثْمَانَ دَعَا بَوَضُوءٍ فَغَسَلَ كَفَّيْهِ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ، ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنَى إِلَى الْمِرْفَقِ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ الْيُسْرَى مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُمْنَى إِلَى الْكَعْبَيْنِ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ الْيُسْرَى مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِي هَذَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْه.

حضرت حمران مولیٰ عثمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضو کا پانی طلب فرمایا۔ پہلے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیاں تین مرتبہ دھوئیں۔ پھر منہ میں پانی ڈال کر کلی کی پھر ناک میں پانی چڑھایا اور اسے جھاڑ کر صاف کیا۔ پھر تین مرتبہ اپنا چہرہ دھویا۔ پھر اپنا دایاں ہاتھ کہنی تک تین مرتبہ دھویا۔ پھر اسی طرح بایاں ہاتھ کہنی تک تین مرتبہ دھویا۔ پھر اپنے سر کا مسح کیا۔ پھر اپنا دایاں اور بایاں پاؤں ٹخنوں تک تین' تین مرتبہ دھویا۔ پھر فرمایا کہ "میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا ہے جس طرح ابھی میں نے وضو کیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بوضوء ﴾ "واؤ" کے فتح کے ساتھ۔ وہ پانی جس سے وضو کیا جائے۔ ﴿ تمضمض ﴾ المضمضہ سے ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ منہ میں پانی داخل کر کے اسے وہیں گردش کرائے۔ پھر باہر پھینک دے۔ ﴿ استنشق ﴾ استنشاق سے ماخوذ ہے۔ پانی کا ناک کے داخلی حصہ میں پہنچا کر بذریعہ سانس سے اوپر چڑھانا۔ ﴿ استنثر ﴾ ناک سے داخل شدہ پانی کو باہر نکالنا۔ ﴿ المرفق ﴾ کسرہ کے ساتھ۔ "ر" ساکن اور "فا" کی فتح کے ساتھ۔ بازو کی ہڈی یعنی کلائی کے جوڑ سے بازو کے اوپر والے حصے کا ہڈی کا جوڑ۔ یعنی کہنی۔ ﴿ الی الکعبین ﴾ ٹخنوں تک۔ پنڈلی اور پاؤں کے ملنے کی جگہ۔ ابھری ہوئی ہڈیاں۔ اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں جنہیں مؤلف نے اختصاراً حذف کر دیا ہے۔ ان کا تعلق وضو سے ہے۔ آپؐ نے فرمایا: من توضا نحو وضوئی هذا ثم صلی رکعتین لایحدث فیها نفسه غفرله ما تقدم من ذنبه۔ کہ "جس شخص نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا' پھر اس نے اپنے دل میں کوئی ایسی بات بھی نہ کی جس کا نماز سے کوئی تعلق نہ ہو تو اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے"۔

حاصل کلام: اس حدیث سے اعضاء وضو میں سے ہاتھ منہ اور پاؤں کا تین تین مرتبہ دھونا ثابت ہوتا

ہے۔ دوسری روایت میں دو' دو مرتبہ اور بعض روایات میں ایک ایک مرتبہ دھونے کا ذکر بھی آیا ہے۔ محدثین فقہاء نے ان روایات میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ ہر عضو کا ایک ایک مرتبہ دھونا واجب اور تین تین مرتبہ دھونا مسنون ہے' دو دو مرتبہ بھی دھو لیا جائے تو بھی کافی ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ واجب تو صرف ایک مرتبہ دھونا ہی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ حمران رضی اللہ عنہ ﴾ "حاء" کے ضمہ اور "میم" کے سکون۔ حمران بن ابان۔ ھمزہ کے فتح کے ساتھ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک غزوہ میں اسے قید کیا۔ جو مسیب بن نجبہ کے حصہ میں آیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسیب سے خرید کر آزاد کر دیا۔ طبقہ ثانیہ سے تعلق رکھتا ہے ثقہ ہے اور ۷۵ھ میں فوت ہوا۔ بعض نے سن وفات ۷۶ھ اور ۷۱ھ بھی ذکر کی ہے۔

﴿ عثمان رضی اللہ عنہ ﴾ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ۔ تیسرے خلیفہ راشد' سابقین اولین میں سے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو لخت جگر رقیہ رضی اللہ عنہا اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا یکے بعد دیگرے ان کی زوجیت میں رہیں۔ اسی وجہ سے ذوالنورین کے لقب سے مشہور و معروف ہوئے۔ جمعہ کے روز جام شہادت نوش کیا۔ یہ ۳۵ھ / ۱۸ ذی الحجہ کا واقعہ ہے۔

(۳۱) وعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِيْ صِفَةِ وُضُوءِ النَّبِيِّ ﷺ - قَالَ: وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ وَاحِدَةً. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ، بَلْ قَالَ التِّرْمِذِيُّ: إِنَّهُ أَصَحُّ شَيْءٍ فِي الْبَابِ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے متعلق بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "آپؐ نے اپنے سر کا مسح ایک مرتبہ کیا۔" (اسے ابوداؤد' نسائی اور ترمذی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے بلکہ ترمذی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اس باب میں یہ حدیث سب سے زیادہ صحیح ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سر کا مسح ایک مرتبہ ہی فرض ہے۔ علماء امت کی غالب اکثریت کا یہی مسلک ہے البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مسح میں تکرار کے قائل ہیں اور دوسرے اعضاء کی طرح تین بار مسح کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال ابوداؤد کی ایک روایت سے ہے لیکن اکثر احادیث (جو صحیحین اور سنن میں مروی ہیں) کی بناء پر جمہور علماء کا مسلک ہی راجح ہے اور اقرب الی الصواب ہے۔

راوی حدیث: ﴿ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ﴾ چوتھے خلیفہ راشد۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ کے والد ماجد اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا زاد بھائی اور داماد تھے۔ ماسوا جنگ تبوک کے تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو منصب خلافت پر فائز ہوئے اور ۱۷ رمضان المبارک ۴۰ھ کو جمعہ کی صبح کوفہ میں ایک شقی القلب عبدالرحمٰن بن ملجم نے پے درپے تین وار کر کے شہید کر دیا۔

(۳۲) وعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ

حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے وضو کے

عَاصِمٍ رضي الله تعالى عنه - فِيْ صِفَةِ الوُضُوءِ - قَالَ: وَمَسَحَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِرَأْسِهِ فَأَقْبَلَ بِيَدَيْهِ وَأَدْبَرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْه.

متعلق مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے سر کا مسح اس طرح کیا کہ دونوں ہاتھ سر کے آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے کی جانب واپس لے آئے۔ (بخاری و مسلم)

وَفِيْ لَفْظٍ لَهُمَا: بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ حَتَّى ذَهَبَ بِهِمَا إِلَى قَفَاهُ، ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتَّى رَجَعَ إِلَى المَكَانِ الَّذِيْ بَدَأَ مِنْهُ.

ایک روایت میں جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اس طرح ہے کہ آپؐ سر کے اگلے حصہ سے شروع کر کے ہاتھوں کو سر کے پچھلے حصہ یعنی گدی تک لے گئے اور پھر اسی طرح دونوں ہاتھوں کو سر کے بالوں کا مسح کرتے ہوئے اسی جگہ واپس لے آئے جہاں سے مسح کا آغاز کیا تھا۔

لغوی تشریح: ﴿ اقبل بیدیہ وادبر ﴾ یعنی مسح دونوں ہاتھوں سے سر کے اگلے حصہ سے شروع کیا اور سر کے آخری حصہ تک لے جا کر واپس اسی مقام پر لے آئے۔ اس کی وضاحت ﴿ بدا بمقدم راسہ ﴾ کا جملہ کرتا ہے۔ ﴿ قفا ﴾ سر کے آخری حصہ کو کہتے ہیں جو گردن کے پیچھے حصہ کے ساتھ ملحق ہے۔ ﴿ رجع ﴾ رجع سے ماخوذ ہے اور یہاں متعدی استعمال ہوا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ سر کے مسح کا آغاز سر کے اگلے حصہ سے کیا جانا چاہئے۔ ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ) کے علاوہ اسحٰق بن راہویہ کی یہی رائے ہے۔ لیکن ترمذی میں منقول ایک روایت جسے ترمذی نے حسن کہا ہے سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کے مسح کا آغاز پچھلے حصہ سے کرنا بھی جائز ہے۔ اس بنا پر بعض اہل کوفہ کا یہی مذہب ہے۔ وکیع بن جراح بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ مگر یہ روایت حسن نہیں اس کا ایک راوی عبداللہ بن محمد بن عقیل متکلم فیہ ہے۔ محدثین کی ایک جماعت نے اس پر حافظے کی وجہ سے جرح کی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ ﴾ انصاری تھے۔ انصار کے قبیلہ بنی مازن بن نجار کے فرد تھے۔ غزوۂ احد میں شریک ہوئے۔ جنگ یمامہ میں وحشی کے ساتھ مل کر مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کو قتل کیا۔ ۶۳ھ میں معرکہ حرہ کے روز شہادت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوئے۔ یہاں یہ شبہ نہ رہے کہ یہ عبداللہ بن زید وہ ہیں، جنہوں نے خواب میں اذان سنی تھی۔ یہ عبداللہ بن زید بن عاصم ہیں اور وہ عبداللہ بن زید بن عبد ربہ تھے۔ گویا دادا دونوں کے الگ الگ تھے۔ ابن عبد ربہ کا ذکر باب الاذان میں آئے گا۔ انشاء اللہ۔

(۳۳) وعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رضي الله تعالى عنهما، فِيْ صِفَةِ

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے وضو کی کیفیت کے بارے میں روایت ہے کہ آپؐ نے اپنے سر کا مسح

الوُضُوءِ قَالَ: ثُمَّ مَسَحَ ﷺ بِرَأْسِهِ وَأَدْخَلَ إِصْبَعَيْهِ السَّبَّاحَتَيْنِ فِي أُذُنَيْهِ، وَمَسَحَ بِإِبْهَامَيْهِ عَلَى ظَاهِرِ أُذُنَيْه. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَه ابْنُ خُزَيْمَةَ.

کیا اور اپنے ہاتھوں کی دونوں شہادت والی انگلیوں کو کانوں میں داخل کیا اور انگوٹھوں سے کانوں کے باہر کا مسح کیا۔ (اس روایت کو ابوداوٗد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿السباحتین﴾۔ "اصبعیه" کی صفت واقع ہو رہا ہے۔ اس کا واحد السباحۃ اس انگلی کو کہتے ہیں جو انگوٹھے اور انگشتِ وسطی کے مابین ہے۔ ﴿عند التسبیح﴾ چونکہ اس سے اشارہ کیا جاتا ہے اس بنا پر اسے سباحۃ کہتے ہیں۔ سباحتین ' اس کا تثنیہ ہے۔ یعنی دونوں ہاتھوں کی انگشتہائے شہادت۔ ﴿الابہام﴾ پانچوں انگلیوں میں پہلے نمبر۔ پانچوں انگلیوں سے زیادہ فائدہ بخش اور رسغ (کٹ) کے زیادہ قریب۔ ﴿ظاهر اذنیه﴾ سے مراد دونوں کانوں کا بالائی حصہ۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کا بین ثبوت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کانوں کے ظاہر اور باطن دونوں پر مسح فرمایا ہے۔ ظاہر سے مراد کان کا وہ حصہ ہے جو سر کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور باطن وہ ہے جو منہ کے قریب ہوتا ہے۔ ترمذی نے کانوں کے ظاہر اور باطن پر مسح کی حدیث بیان کر کے کہا کہ اہل علم کا عمل اسی پر ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبد الله بن عمرو بن العاص بن وائل سہمی قریشی رضی الله عنہما﴾ ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب کعب بن لوی پر جا ملتا ہے۔ اپنے والد سے پہلے اسلام سے مشرف ہوئے۔ اپنے والد محترم سے صرف تیرہ برس چھوٹے تھے۔ بڑے پایہ کے عالم فاضل' حدیث کے حافظ اور عابد تھے۔ بکثرت احادیث نبوی ان سے مروی ہیں۔ یہ ارشادات نبوی ﷺ کو قلم بند کر لیا کرتے تھے۔ ۶۳ھ یا ۷۰ھ میں وفات پائی۔ تدفین کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ مکہ مکرمہ میں' طائف میں اور مصر میں۔

(٣٤) وعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ مَنَامِهِ فَلْيَسْتَنْثِرْ ثَلاَثاً، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَبِيتُ عَلَى خَيْشُومِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْه.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جب کوئی نیند سے بیدار ہو تو تین مرتبہ اپنا ناک جھاڑ کر صاف کرے اس لئے کہ شیطان ناک کے نتھنوں کی ہڈی پر رات بسر کرتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

(٣٥) وعَنْهُ: «إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ نَوْمِهِ فَلاَ يَغْمِسْ يَدَهُ فِي الإِنَاءِ حَتَّى يَغْسِلَهَا ثَلاَثاً، فَإِنَّهُ لاَ يَدْرِي

یہ روایت بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ہے جس میں مذکور ہے کہ "تم میں سے جب کوئی نیند سے بیدار ہو تو تین مرتبہ دھونے سے پہلے اپنا ہاتھ پانی

أَيْنَ بَاتَتْ يَدُهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهَذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ.

کے برتن میں نہ ڈالے۔ کیونکہ اسے یہ معلوم نہیں کہ رات بھر ہاتھ کہاں کہاں گردش کرتا رہا (اور کس کس چیز کو چھوتا اور مس کرتا رہا) " (بخاری و مسلم، مذکورہ بالا حدیث میں مذکورہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ فلا یغمس ﴾ میم کے کسرہ کے ساتھ۔ معنی ہیں کہ داخل نہ کرے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء کے نزدیک یہ حکم استحباب پر مبنی ہے مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اسے واجب قرار دیتے ہیں اور جمہور کی رائے ہی اقرب الی الصواب ہے۔ البتہ جب اسے یقین حاصل ہو جائے کہ اس کا ہاتھ نجاست و گندگی سے آلودہ ہوا ہے تو ہاتھ کا دھونا ضروری ہے۔ نیز یہ مقدمات وضو میں سے بھی ہے۔

حاصل کلام: حدیث میں مذکور لفظ فی الاناء اس پر دلالت کرتا ہے کہ جو شخص شب و روز میں جس وقت نیند سے اٹھے تو اس کیلئے مستحب ہے کہ کسی برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اسے تین مرتبہ دھو لے۔ یہ حکم ہر قسم کے برتن کے لئے ہے البتہ نہر اور بڑا حوض و تالاب اس حکم سے مستثنیٰ ہیں اور ان میں ہاتھ داخل کرنا جائز ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فتح الباری میں یہی رائے بیان کی ہے۔

(٣٦) وعَنْ لَقِيْطِ بْنِ صَبِرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَسْبِغِ الوُضُوءَ، وَخَلِّلْ بَيْنَ الأَصَابِعِ، وَبَالِغْ فِي الاسْتِنْشَاقِ إِلاَّ أَنْ تَكُونَ صَائِماً». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ. وَلِأَبِيْ دَاوُدَ فِي رِوَايَةٍ: «إِذَا تَوَضَّأْتَ فَمَضْمِضْ».

حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وضو اچھی طرح پورا کرو اور انگلیوں کا خلال کرو، ناک میں پانی اچھی طرح چڑھایا کرو مگر روزے کی حالت میں (ایسا نہ کرو)" (اس روایت کو ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے) ابوداؤد کی ایک روایت کے الفاظ ہیں "جب تو وضو کرے تو کلی کر۔"

لغوی تشریح: ﴿ اسبغ ﴾ اسباغ سے فعل امر ہے۔ اسباغ کے معنی ہیں، اعضاء وضو کو پوری طرح اور اچھی طرح دھونا۔ ﴿ خلل ﴾ تخلیل سے فعل امر ہے۔ "خلال" یہ ہے کہ انگلیوں کے درمیان انگلی اس طرح داخل کرے کہ دونوں انگلیوں کا درمیانی حصہ پوری طرح تر ہو جائے۔ ﴿ الا ان تکون صائما ﴾ روزے دار کو پانی اتنا اوپر نہ چڑھانا چاہئے، تاکہ کہیں پانی گلے میں نہ اتر جائے اور روزہ ٹوٹ جائے۔ ناک کے اندرون پانی مبالغہ سے چڑھانا مستحب ہے۔

حاصل کلام: اعضاء وضو کو اچھی اور پوری طرح دھونا۔ ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا، تاکہ کہیں کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔

راوی حدیث: ﴿ لقیط بن صبرۃ رضی اللہ عنہ ﴾ "لام" کے فتحہ اور "قاف" کے کسرہ سے۔ صبرۃ "صاد"

کے فتحہ اور "باء" کے کسرہ کے ساتھ۔ نسب نامہ یوں ہے لقیط بن صبرہ بن عبداللہ بن المنتفق بن عامر العامری رضی اللہ عنہ۔ وفد بنی المنتفق کے قائد تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لقیط بن عامر بن صبرہ ہیں جو ابورزین العقیلی کے نام سے مشہور ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ یہ ایک ہی شخص کے دو نام ہیں اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ دونوں الگ الگ شخصیات ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ امام علی بن مدینی اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے۔ (الاصابہ۔ تہذیب)

(۳۷) وعَنْ عُثْمَانَ رضي الله تعالى عنه: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُخَلِّلُ لِحْيَتَهُ فِي الوُضُوءِ. أَخرَجَهُ التِّرمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ وضو کرتے ہوئے اپنی داڑھی کا خلال کیا کرتے تھے۔ (ترمذی۔ اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: داڑھی کا خلال نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے اور یہ مسنون ہے واجب نہیں۔

(۳۸) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُتِيَ بِثُلُثَيْ مُدٍّ فَجَعَلَ يَدْلُكُ ذِرَاعَيْهِ. أَخرَجَهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دو تہائی مد پانی پیش کیا گیا تو آپؐ نے دھونے کیلئے بازوؤں کو ملنا شروع کیا۔ (احمد نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اتی ﴾ مفعول واقع ہوا ہے۔ ﴿ مد ﴾ میم کے ضمہ اور دال کی تشدید کے ساتھ۔ پانی کا پیمانہ جس میں ایک رطل اور تہائی رطل پانی سمائے۔ آج کل کی اصطلاح میں چھ سو گرام وزن بنتا ہے۔ ﴿ یدلک ﴾ ملتے ہوئے دھونا۔ ﴿ ذراعیہ ﴾ ہتھیلی سے لے کر کہنی تک کے حصہ کو ذراع یعنی ہاتھ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ حضور ﷺ نے اتنی مقدار پانی سے وضو فرمایا۔ یہ کم سے کم پانی ہے جو وضو کے بارے میں نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ نے اتنا پانی وضو میں استعمال کیا۔

حاصل کلام: دو تہائی مد کی مقدار والی حدیث بخاری و مسلم میں ہے کہ حضور ﷺ نے اتنے پانی سے وضو کیا اور ایک روایت میں ایک مد سے وضو کرنے کا ذکر بھی ہے۔ حجازی مد' انگریزی سیر اور کلو سے کچھ زیادہ کا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ زیادہ مقدار میں پانی بلا ضرورت استعمال کرنے سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔

(۳۹) وعَنْهُ: أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يَأْخُذُ لِأُذُنَيْهِ مَآءً خِلَافَ المَاءِ الَّذِيْ أَخَذَهُ لِرَأْسِهِ. أَخرَجَهُ البَيْهَقِيُّ، وَقَالَ:

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو دیکھا آپؐ جو پانی سر کے مسح کیلئے لیتے تھے' کانوں کے مسح کیلئے اس سے الگ

إِسْنَادُهُ صَحِيْحٌ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ أَيْضاً.

لیتے تھے۔ (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور ترمذی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَهُوَ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ هَذَا الوَجْهِ بِلَفْظِ: وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ بِمَآءٍ غَيْرِ فَضْلِ يَدَيْهِ. وَهُوَ المَحْفُوظُ.

اور مسلم کے ہاں اسی سند سے یہ روایت بایں الفاظ منقول ہے کہ "آپ نے سر کا مسح کیا مگر وہ ہاتھوں سے بچا ہوا پانی نہیں تھا" یعنی نیا پانی استعمال کیا اور یہی مسلم کی روایت محفوظ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ وھو عند مسلم ﴾ سے مراد ہے کہ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ ملاحظہ ہو (مسلم کتاب الطہارت باب وضو النبی ﷺ) ﴿ من ھذا الوجه ﴾ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس سند سے بیہقی نے اس کو بیان کیا ہے مسلم میں بھی اسی سند سے بیان ہوئی ہے۔ ﴿ بماء ﴾ ھمزہ مجرور ہے۔ تنوین کے ساتھ۔ گرائمر کے اعتبار سے موصوف واقع ہو رہا ہے اور ﴿ غیر فضل یدیه ﴿ اس کی صفت ہے اور ﴿ الفضل ﴾ کے معنی ضرورت سے زائد بچا ہوا یعنی وضو پوری طرح مکمل کرنے کے بعد جو کچھ باقی بچ جائے۔ پورے جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں ہاتھوں کو دھونے کے بعد جو پانی کی تری ہاتھوں کے ساتھ لگی رہی اس سے سر کا مسح نہیں کیا' بلکہ مسح کیلئے نیا پانی لیا۔ ﴿ وھو المحفوظ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مسلم نے جس سیاق سے روایت بیان کی ہے وہ محفوظ ہے۔ اس میں کسی قسم کا کلام نہیں اور بیہقی کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ کانوں کے مسح کیلئے نیا پانی لینا مشروع ہے مگر مصنف نے اس کے غیر محفوظ ہونے کی جانب اشارہ کر دیا۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے "زاد المعاد" میں پورے یقین و وثوق کے ساتھ کہا ہے کہ نبی ﷺ سے کانوں کیلئے نیا پانی لینا ثابت نہیں۔ البتہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اپنے عمل سے ثابت ہے۔ امام عبدالرحمٰن مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی (ج ا' ص: ۴۹) میں کہا ہے کہ میں کسی مرفوع صحیح حدیث سے واقف نہیں جس میں یہ بیان ہو کہ آپؐ نے کانوں کیلئے نیا پانی لیا اور اس پر کلام نہ ہو۔ ہاں! ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اپنے فعل سے یہ ثابت ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں نافع کے حوالہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنی دونوں انگلیوں سے اپنے کانوں کیلئے نیا پانی لیتے تھے۔

حاصل کلام: امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کی یہی رائے ہے کہ کانوں کے مسح کیلئے نیا پانی لینا چاہئے۔ مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ جب کان سر کے ساتھ شامل ہیں تو پھر سر کے مسح کا پانی ہی کانوں کیلئے کافی ہے۔ بکثرت احادیث صحیحہ اسی رائے کی تائید کرتی ہیں۔ بیہقی' ابن خزیمہ اور ابن حبان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صراحتاً مروی ہے کہ فمسح براسه واذنیه کہ آپؐ نے پانی لیا تو اس سے سر اور دونوں کانوں کا مسح کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(٤٠) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ أُمَّتِي يَأْتُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِينَ مِنْ أَثَرِ الْوُضُوءِ، فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يُطِيلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ”قیامت کے روز میری امت کے لوگ ایسی حالت میں آئیں گے کہ وضو کے اثرات کی وجہ سے ان کے ہاتھ پاؤں چمکتے ہوں گے۔ تم میں سے جو شخص اس چمک اور روشنی کو زیادہ بڑھا سکتا ہو اسے ضرور بڑھانی چاہئے۔“ (بخاری و مسلم اور الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ غرا ﴾ یاتون کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے۔ اعراب اس طرح ہے کہ غین پر ضمہ اور راء پر تشدید ہے اور اغر کی جمع ہے اور ”اغر“ اسے کہتے ہیں جس کے سفیدی ہو اور ﴿ غرة ﴾ دراصل اس سفید چمک کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پیشانی میں ہوتی ہے۔ ﴿ محجلين ﴾ تحجيل سے اسم مفعول واقع ہو رہا ہے اور اس سفیدی کو کہتے ہیں جو گھوڑے کے پاؤں میں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وضو کی چمک کی وجہ سے ان کے چہرے' ہاتھ اور پاؤں دمک اور چمک رہے ہوں گے۔ ﴿ يطيل ﴾ اطالة سے ماخوذ ہے۔ دراز کرنے' لمبا کرنے اور طویل کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ ﴿ غرته ﴾ اپنی چمک' روشنی۔ مطلب یہ ہوا کہ جہاں تک پانی پہنچانا ضروری و لازمی ہو وہاں سے آگے تک پہنچانا۔

حاصل کلام: اس حدیث کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اعضاء وضو کو حد فرض سے زیادہ تک دھونا مثلاً ہاتھوں کو کندھوں تک اور پاؤں کو گھٹنوں تک۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی حدیث نے یہی مفہوم سمجھا اور اسی پر ان کا اپنا عمل تھا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسے مستحب سمجھتے ہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ اسے مستحب نہیں سمجھتے' وہ فرماتے ہیں کہ وضو کی حد متعین ہے اور زیور اپنے مقام پر ہے۔ ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر عضو وضو کو تین' تین مرتبہ دھوئے اور ایک تیسرا مفہوم یہ بھی ممکن ہے کہ وضو موجود ہو مگر ثواب کی نیت سے تازہ وضو کرے اور ہروقت باوضو رہنا بھی مراد ہو سکتا ہے لیکن یہ دونوں مفہوم ظاہر کے خلاف ہیں۔ اس آخری جملہ کے بارے میں راوی کو تردد ہے کہ یہ مرفوع ہے یا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے جیسا کہ مسند امام احمد اور فتح الباری میں ہے۔ اس لئے اس سے مقررہ حد سے زائد حصہ کو دھونے پر استدلال محل نظر ہے۔ (اغاثة اللهفان' ص:۲۰۰' ج ۱)

(٤١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تعالى عنها قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ فِي تَنَعُّلِهِ وَتَرَجُّلِهِ وَطُهُورِهِ، وَفِيْ شَأْنِهِ كُلِّهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ جوتا پہننے' بالوں میں کنگھی کرنے اور وضو کرنے بلکہ ہر کام کیلئے دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ يعجبه التمين ﴾ یعنی آپ ؐ کو دایاں آگے کرنا محبوب و پسندیدہ تھا۔ ﴿ فی تنعله ﴾

جوتا پہننے کے وقت ﴿ وترجله ﴾ بالوں میں کنگھی کرتے وقت۔

حاصل کلام: آنحضور ﷺ ہر اچھے کام میں دائیں جانب کو پسند فرماتے۔ مثلاً مسجد میں داخل ہونے، نماز سے فارغ ہونے کے وقت سلام پھیرنے، اعضاء وضو کو دھونے، کھانے پینے، مصافحہ کرنے، دودھ دوھنے، لباس پہننے، سرمہ لگانے اور مسواک کرنے کے وقت وغیرہ۔ دور جدید کا مسلمان ان گراں مایہ چیزوں کو فراموش کر بیٹھا ہے اور غیروں کی نقالی میں دائیں کی بجائے بائیں کو پسند کرنے لگا ہے۔ بڑی قابل افسوس بات ہے۔

(٤٢) وعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَابْدَءُوا بِمَيَامِنِكُمْ». أَخرَجَهُ الأَرْبَعَةُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم وضو کرنے لگو تو اپنے دائیں جانب سے ابتدا کیا کرو۔" (اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کو دایاں پہلو ہی پسند اور محبوب تھا۔ خود بھی اسی پر عمل پیرا رہے اور امت کو بھی حکم فرمایا کہ دائیں جانب سے ابتدا کرنی چاہیے۔

(٤٣) وعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رضي الله تعالى عنه، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ وَعلَى العِمَامَةِ وَالخُفَّيْنِ. أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے وضو کیا تو اپنی پیشانی کے بالوں، پگڑی اور موزوں پر مسح کیا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بناصيته ﴾ سر کا اگلا حصہ۔ جہاں سے بال کاٹے جاتے ہیں۔ یعنی وہ جگہ جہاں بال اگتے ہیں۔ یہ حصہ پیشانی سے متصل ہوتا ہے۔ ﴿ العمامة ﴾ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو سر پر باندھا جاتا ہے اور سر پر باندھنے کیلئے اسے کئی بل دینے پڑتے ہیں۔ ﴿ الخفين ﴾ خف کا تثنیہ ہے۔ پاؤں میں ٹخنوں تک جو چیز پہنی جائے اسے خف یعنی موزہ کہتے ہیں جو چمڑے سے تیار ہوتا ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ محض پیشانی پر مسح کرنا کافی نہیں اور پگڑی پر مسح کے جمہور قائل نہیں۔ مگر علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں بیان کیا ہے کہ آپؐ کبھی صرف ننگے سر پر مسح فرما لیتے اور کبھی پگڑی پر اور کبھی پگڑی اور پیشانی سمیت دونوں پر اور فقط پیشانی پر مسح کرنا آپؐ سے ثابت نہیں ہے۔ یہ حدیث اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ موزہ پر مسح کرنا جائز ہے اسی طرح یہ حدیث اس کا بھی ثبوت ہے کہ پگڑی پر مسح جائز اور درست ہے۔ اس کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ کچھ مسح سر پر کیا جائے اور کچھ پگڑی پر۔ اس میں اختلاف نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ صرف پگڑی پر مسح کیا جائے۔ ترمذی میں منقول ایک صحیح حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ،

انس رضی اللہ عنہ کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ، حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، مکحول رحمۃ اللہ علیہ، ابوثور رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ، اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ، اسحٰق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ اور وکیع رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اس کے قائل ہیں۔ باقی ائمہ ثلاثہ محض پگڑی پر مسح کو ناکافی سمجھتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ مغیرۃ بن شعبۃ رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ یا ابوعیسیٰ ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ مغیرہ بن شعبہ بن مسعود ثقفی۔ مشہور و معروف صحابیؓ ہیں۔ غزوۂ خندق کے ایام میں مسلمان ہوئے اور ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ صلح حدیبیہ میں شامل ہوئے۔ یہ ان کا پہلا معرکہ تھا جس میں وہ شریک ہوئے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوفہ کے گورنر مقرر ہوئے اور ۵۰ھ میں کوفہ ہی میں وفات پائی۔

(٤٤) وعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رضي الله تعالى عنهما - فِيْ صِفَةِ حَجِّ النَّبِيِّ ﷺ - قَالَ ﷺ: «ابْدَءُوا بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِ». أَخرَجَهُ النَّسَائِيُّ هَكَذا بِلَفظِ الأَمرِ، وَهُوَ عِندَ مُسْلِمٍ بِلَفْظِ الخَبَرِ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آغاز اسی طرح کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے آغاز کیا ہے۔" (نسائی نے امر کے صیغہ کے ساتھ روایت کیا ہے یعنی حکماً فرمایا کہ "ابتدا کرو" جبکہ امام مسلم نے جملہ خبریہ میں اسے بیان کیا ہے یعنی ہم شروع کرتے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ فی صفۃ حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ﴾ دراصل یہ اشارہ ہے اس لمبی حدیث کی طرف جو کتاب الحج میں بیان ہوئی ہے۔ ﴿ ابدو وابما بدا اللہ بہ ﴾ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں پہلے فرمایا ہے۔ اسے عملاً پہلے انجام دیا جائے اور یہ بات معلوم ہے کہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا جب آپؐ نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کا ارادہ کیا اور اس بات کا عزم کیا کہ پہلے صفا سے سعی کا آغاز کیا جائے۔ اس لئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صفا کا ذکر پہلے کیا "ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ" (۲ : ۱۵۸) لیکن مصنف حدیث کا اتنا ٹکڑا وضو کے باب میں اس لئے لائے ہیں کہ لفظ کے عموم کی طرف اشارہ ہو جائے کہ یہ لفظ عام ہے کسی سبب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اگرچہ یہ سعی کے مسئلہ کے بارے میں مخصوص طور پر ذکر کیا ہے لیکن اس کے لفظ کی عمومیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہاں قاعدہ کلیہ کے ضمن میں وضو کی آیت بھی داخل ہے اور وہ ہے: "فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برئوسکم وارجلکم الی الکعبین۔ (۵:۶) اس بنا پر وضو میں چہرہ پہلے دھویا جائے گا اور باقی ماندہ اعضاء علی الترتیب دھوئے جائیں گے اور لفظ الخبر لانے سے مراد ہے کہ ابدئووا کی بجائے نبدئا سے کہنا چاہئے۔ چنانچہ نسائی نے صیغہ امر (ابدووا) کے ساتھ اور مسلم نے جملہ خبریہ یعنی (نبداء) سے نقل کیا ہے۔

حاصل کلام: مصنف اس حدیث کو باب الوضو میں لا کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اعضاء وضو کے دھونے میں

بھی ترتیب ملحوظ رکھنی چاہئے۔ قرآن نے جس عضو کو پہلے دھونے کا حکم دیا ہے اسے پہلے دھویا جائے جس طرح قرآن مجید نے مناسک حج کی ادائیگی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "ان الصفاء والمروۃ" یعنی سعی کا آغاز صفا سے کیا جائے اسی طرح وضو کی آیت میں جو ترتیب مذکور ہے اس کا لحاظ رکھا جائے اور آیت وضو میں چہروں کا دھونا پہلے مذکور ہے ہاتھ اور باقی اعضاء بعد میں ہیں۔ اسی ترتیب سے وضو کیا جانا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ انصار کے قبیلہ "سلم" سے تعلق کی بنا پر انصاری سلمی کہلائے۔ مشہور اور کبار صحابہؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ آخر عمر میں بصارت سے محروم ہوگئے تھے۔ ۷۴ھ میں ۹۴ برس کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ کہا گیا ہے کہ مدینہ منورہ میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی ہیں۔

(٤٥) وعَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ أَدَارَ المَآءَ عَلَى مِرْفَقَيْهِ. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِي بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب وضو کرتے تو اپنی کہنیوں پر اچھی طرح پانی ڈالتے۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اس کی سند ضعیف ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ ادار الما ﴾ پانی بہانا۔ اس حدیث کی سند میں قاسم بن محمد بن عقیل متروک راوی ہے۔

(٤٦) وعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ وُضُوءَ لِمَنْ لَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجه بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. وَالتِّرْمِذِيُّ عَنْ سَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ وَأَبِي سَعِيدٍ نَحْوَهُ. وَقَالَ أَحْمَدُ: لاَ يَثْبُتُ فِيهِ شَيْءٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "وضو کا آغاز کرتے وقت جس نے پہلے بسم اللہ نہ پڑھی اس کا کوئی وضو نہیں۔" (اس حدیث کو احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ نے روایت کیا ہے مگر ان کی بیان کردہ سند ضعیف ہے اور ترمذی نے یہ حدیث سعید بن زید سے روایت کی ہے اور اسی طرح اسے ابوسعید سے بھی روایت کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس بارے میں کوئی چیز ثابت نہیں)

لغوی تشریح: ﴿ لا وضوء ﴾ یہ عبارت اس پر دلالت کرتی ہے کہ بسم اللہ کا پڑھنا وضو کیلئے رکن ہے یا شرط ہے۔ کیونکہ ظاہر عبارت سے کمال کی نفی نہیں بلکہ صحت اور وجود کی نفی مراد ہے۔ جیسا کہ لا (جو نفی جنس پر دلالت کرتا ہے) کی ہوتی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے گویا کہا ہے کہ اس باب میں کوئی چیز ثابت نہیں مگر اس کے مختلف طرق اور کثیر شواہد کی بنا پر حافظ ابن الصلاح، ابن کثیر اور علامہ عراقی وغیرہ نے اسے حسن کہا ہے۔ عصر حاضر میں علامہ البانی حفظہ اللہ نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے۔ اس لئے وضو کی ابتدا میں بھی بہرنوع بسم اللہ پڑھنا چاہئے۔

حاصل کلام: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک وضو کے آغاز میں بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد ظاہری کے نزدیک وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ اسحاق بن راہویہ کا قول ہے کہ جس نے عمداً بسم اللہ نہ پڑھی اس کا وضو نہیں ہوا۔

راوی حدیث: ﴿ سعید بن زید رضی اللہ عنہ ﴾ اس سے مراد سعید بن زید بن عمرو بن نفیل العدوی القرشی ہے ۔ ان کی کنیت ابوالاعور ہے۔ ان خوش قسمت دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جنہیں لسان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ ان کی زوجیت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دائرہ اسلام میں آنے کا یہ دونوں حضرات ذریعہ اور سبب بنے۔ معرکہ بدر کے علاوہ باقی تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۵۱ھ میں وفات پائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

(٤٧) وعَنْ طَلْحَةَ بْنِ مُصَرِّفٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَفْصِلُ بَيْنَ الْمَضْمَضَةِ وَالِاسْتِنْشَاقِ . أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت طلحہ بن مصرف رحمۃ اللہ علیہ اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچشم خود دیکھا ہے آپ ؐ کلی اور ناک کیلئے الگ الگ پانی لیتے تھے۔ (اس روایت کو ابوداؤد نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یفصل ﴾ یفرق کے معنی میں' جس کے معنی فرق کرنا ہے۔ یعنی آپ ؐ کلی کرنے کیلئے پانی الگ لیتے تھے اور ناک میں پانی چڑھانے کیلئے الگ لیتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کلی کے الگ اور ناک کیلئے الگ پانی لینا ثابت ہوتا ہے۔ مصنف نے اس روایت کو سند کے اعتبار سے ضعیف قرار دیا ہے' کیونکہ اس کی سند میں مصرف بن کعب مجہول اور لیث بن ابی سلیم راوی ضعیف ہے۔ اس کے برعکس بخاری اور مسلم کی احادیث میں یہ مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی چلو سے ناک میں بھی پانی چڑھا لیتے اور کلی بھی کر لیتے تھے' جیسا کہ آئندہ حدیث کے تحت آرہا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ طلحہ بن مصرف ﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو عبداللہ ہے۔ مصرف کا اعراب۔ "میم" کا ضمہ اور "راء" پر کسرہ اور تشدید۔ تابعین میں ثقہ شمار کئے گئے ہیں۔ طبقہ خامسہ میں سے ہیں۔ بہترین قاری اور فاضل شخصیت ہیں۔ ۱۱۲ھ میں وفات پائی۔ البتہ ان کے والد مصرف مجہول الحال ہیں۔

﴿ عن جدہ ﴾ ان کا نام کعب بن عمرو یا عمرو بن کعب بن جحدب الیامی رضی اللہ عنہ ہے۔ یمن کے قبائل ہمدان میں مشہور و معروف قبیلہ "یام" کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر یامی کہلاتے ہیں۔ ابن عبدالبر کے قول کے مطابق انہوں نے کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ صحابی ہیں۔ کچھ لوگوں نے ان کی صحابیت سے انکار کیا ہے لیکن انکار کرنے والوں کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

(٤٨) وعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي صِفَةِ الوُضُوءِ -: ثُمَّ تَمَضْمَضَ ﷺ وَاسْتَنْثَرَ ثَلاَثاً، يُمَضْمِضُ وَيَنْثُرُ مِنَ الكَفِّ الَّذِيْ يَأْخُذُ مِنْهُ الْمَاءَ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے وضو کے بیان کے بارے میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین بار کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا۔ آپؐ کلی اور ناک میں پانی اسی ہاتھ سے داخل کرتے جس سے پانی لیتے تھے۔ (ابوداؤد' نسائی)

لغوی تشریح: ﴿ یمضمض وینثر من الکف الذی یاخذ منه الماء ﴾ یعنی چلو بھرپانی لیتے۔ اس میں سے کلی کرنے کیلئے کچھ پانی منہ میں داخل کرتے اور بقیہ پانی ناک میں چڑھاتے۔ یہ عمل آپؐ تین مرتبہ فرماتے۔ یہاں ﴿ ینثر ﴾ سے دراصل استنشاق مراد ہے۔ یعنی پانی ناک میں ڈالنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ایک ہی چلو پانی منہ اور ناک دونوں کیلئے استعمال ہو سکتا ہے اور نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ اس عمل کو حضور ﷺ تین مرتبہ کرتے تھے اور نسائی کی روایت میں صراحت ہے کہ آپؐ ناک بائیں ہاتھ سے جھاڑتے تھے۔ منہ اور ناک میں پانی دائیں ہاتھ سے داخل کرتے۔

(٤٩) وعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ رضي الله تعالى عنه - فِيْ صِفَةِ الوُضُوءِ -: ثُمَّ أَدْخَلَ ﷺ يَدَهُ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفٍّ وَاحِدٍ، يَفْعَلُ ذَلِكَ ثَلاَثاً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے وضو کے سلسلہ بیان میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈالا' پھر کلی کی اور ناک میں پانی چڑھایا' ایک ہی چلو سے' ایسا آپؐ نے تین مرتبہ کیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ من کف واحد ﴾ کف مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مراد ہے پانی کا ایک چلو (چلو بھرپانی) آپؐ نے کلی کرنے کیلئے تھوڑا سا پانی منہ میں ڈالا اور باقی پانی ناک جھاڑنے کیلئے ناک میں چڑھایا۔

حاصل کلام: دونوں احادیث کلی اور ناک میں پانی چڑھانے کیلئے ایک ہی چلو کے کفایت کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ طلحہ بن مصرف کی حدیث علیحدگی اور تفریق کی مقتضی ہے' لیکن وہ مصرف کے مجہول الحال ہونے کی بنا پر ضعیف ہے۔ صاحب السبل نے اپنی رائے اس طرح دی ہے کہ دونوں طرح کی روایات یعنی جمع اور عدم جمع کے بارے میں اقرب بات یہ ہے کہ اختیار دیا گیا ہے' دونوں میں سے جس پر عمل کر لے۔ دونوں مسنون ہیں۔ اگرچہ جمع کرنے کی روایات تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور صحیح بھی ہیں۔ اس لئے انصاف کا تقاضا ہے کہ جو روایات صحیح اور متعدد ہیں وہ راجح اور دوسری مرجوح ہیں۔

(٥٠) وَعَنْ أَنَسٍ رضي الله تعالى حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم

عنه قَالَ: رَأَى النَّبِيُّ ﷺ رَجُلاً وَفِي قَدَمِهِ مِثْلَ الظُّفْرِ لَمْ يُصِبْهُ المَآءُ، فَقَالَ: «ارْجِعْ فَأَحْسِنْ وُضُوءَكَ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

ﷺ کی نظر ایک ایسے آدمی پر پڑی جس کے پاؤں کی ناخن برابر جگہ پر پانی نہ پہنچا یعنی خشک رہ گئی۔ آپؐ نے اسے حکم دیا کہ "واپس جاؤ اور اچھی طرح عمدہ طریق سے وضو کرو۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر واضح دلیل ہے کہ سارا پاؤں دھونا فرض ہے۔ ایک دوسری حدیث میں جسے مسلم نے روایت کیا ہے کہ پاؤں کا جتنا حصہ خشک رہ گیا اس کیلئے آگ ہے۔ ابوداؤد میں بھی خالد بن معدانؒ سے ایک روایت اسی معنی میں منقول ہے کہ آپؐ نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے دیکھا کہ اس کے قدم کی پشت پر تھوڑا سا خشک داغ تھا۔ آپؐ نے اسے حکم دیا کہ جا پہلے تازہ وضو کر اور پھر نماز پڑھ۔ یہ اور اسی قبیل کی دوسری روایات اس پر دال ہیں کہ پاؤں کو دھونا فرض ہے' مسح ناکافی ہے۔ انہی احادیث کی روشنی میں ائمہ اربعہ اہل سنت اور مجتہدین امت نے بالاتفاق پاؤں کے دھونے کو فرض قرار دیا۔ جو لوگ پاؤں کے دھونے کو فرض قرار نہیں دیتے اور مسح کے قائل ہیں۔ ان احادیث سے ان کے نظریئے کی تردید ہوتی ہے۔

(۵۱) وعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ بِالمُدِّ، وَيغْتَسِلُ بِالصَّاعِ إِلَى خَمْسَةِ أَمْدَادٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ "مد" پانی سے وضو اور "صاع" یعنی چار سے پانچ مد تک پانی سے غسل کر لیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الصاع﴾ چار مد کا ہوتا ہے اور مد ۱/۳۔۱ رطل کا ہوتا ہے۔ صاع موجود زمانہ کے پیمانہ کے حساب سے ۲.۵۰ کلوگرام ہوتا ہے۔ حدیث سے ظاہر طور پر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ عموماً غسل کیلئے چار یا پانچ مد پانی استعمال فرماتے تھے۔

حاصل کلام: وضو اور غسل کیلئے حتی الوسع اتنا ہی پانی استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جتنا نبی کریم ﷺ نے کیا ہے۔ بلاوجہ ضرورت سے زائد پانی استعمال کرنا اسراف میں شمار ہوگا۔ جو شریعت کی رو سے پسندیدہ نہیں ہے۔ مسلم میں ایک "فرق" پانی سے آنحضور ﷺ کے غسل کرنے کی روایت بھی منقول ہے۔ فرق ایک برتن ہوتا تھا جس میں تقریباً ساڑھے نو سیر پانی آتا تھا۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ لبالب بھرا ہوا تھا بلکہ ایک روایت میں تو یہ ذکر بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضور ﷺ دونوں ایک فرق" سے غسل فرمالیا کرتے تھے۔ اسی بنا پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ان احادیث میں پانی کی مقدار متعین کرنا مقصود نہیں بلکہ یہ ذکر کرنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اتنے پانی سے وضو یا غسل کرلیا کرتے تھے۔

(۵۲) وعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيُسْبِغُ الوُضُوءَ، ثُمَّ يَقُولُ: أَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، وأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، إِلاَّ فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الجَنَّةِ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَزَادَ: «اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِينَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ».

حضرت عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ وہ وضو کرے اور خوب اچھی طرح کرے پھر یوں کہے کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں' اس کا کوئی ساجھی و شریک نہیں اور نیز میں اس بات کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں' مگر اس کیلئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں کہ اب جس دروازے سے چاہے داخل جنت ہو۔'' (مسلم' ترمذی) اور ترمذی نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ ''اے اللہ مجھے توبہ کرنے اور پاک رہنے والوں میں سے کردے۔''

لغوی تشریح: ﴿ الا فتحت ﴾ یہ الا استثناء کا ہے۔ اس سے مراد کلام اول میں جو حصر ہے اس کی نفی مقصود ہے اور ﴿ فتحت ﴾ صیغہ مجہول ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہیں کہ قیامت کے روز کھولے جائیں گے۔ صیغہ ماضی سے تعبیر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس کا وقوع یقینی اور حتمی ہے جس طرح ماضی کے گزر جانے کا یقین ہوتا ہے اسی طرح اس کا واقع ہونا بھی یقینی اور لابدی امر ہے۔ ﴿ وزاد ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ترمذی نے ﴿ محمدا عبده و رسوله ﴾ نقل کرنے کے بعد ''اللھم اجعلنی .....الخ'' کے الفاظ مزید نقل کئے ہیں اور ﴿ التواب ﴾ میں ''واوٗ'' مشدد ہے جس کے معنی ہیں جو شخص کثرت سے توبہ کرنے والا ہو۔

راوی حدیث: ﴿ عمر رضی اللہ عنہ ﴾ سے مراد عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبدالعزی رضی اللہ عنہ۔ کنیت ابو حفص ہے۔ نادر الوجود شخصیت تھے۔ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ تھے۔ انہوں نے آفاق ارض کو حکم' عدل اور فتوحات سے بھر دیا تھا۔ دور جاہلیت میں قبیلہ قریش کے سفیر تھے۔ ۶ نبوت ذی الحجہ کو دارارقم میں دست نبوت پر بیعت کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان کے قبول اسلام میں ان کے بہنوئی سعید رضی اللہ عنہ اور بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بڑا کردار ہے۔ سارے غزوات میں شریک رہے مگر تبوک میں شرکت نہ کر سکے۔ ان کے عہد خلافت میں فتوحات کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ عراق' فارس' شام اور مصر وغیرہ کے علاقے اسلامی سلطنت کی حدود میں شامل ہوئے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے غلام ابو لولو کے اقدام سے مقام شہادت پر فائز ہوئے۔ یہ شہادت کا واقعہ ۲۴ھ محرم کا ہے۔

٥ - بَابُ المَسحِ عَلَى الخُفَّين۔ موزوں پر مسح کرنے کا بیان

(٥٣) عَنِ المُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَتَوَضَّأَ فَأَهْوَيْتُ لِأَنْزِعَ خُفَّيْهِ، فَقَالَ: «دَعْهُمَا فَإِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ» فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ تھا' آپؐ نے وضو کرنا شروع کیا تو میں آپؐ کے موزے اتارنے کیلئے لپکا۔ آپؐ نے فرمایا "چھوڑ دو میں نے جب یہ موزے پہنے تھے تو میں وضو سے تھا۔" پھر آپؐ نے ان پر مسح فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فاھویت ﴾ میں نے اپنے ہاتھوں سے مدد لی' سہارا لیا یا پھر یہ معنی ہیں' حالت قیام سے نیچے کی طرف بیٹھنے کیلئے جھکا۔ ﴿ لانزع ﴾ اخرج کے معنی میں ہے کہ میں نکالوں۔ ﴿ خفیه ﴾ آپؐ کے موزے پاؤں سے نکالوں۔ ﴿ دعھما ﴾ اترک کے معنی میں آیا یعنی موزوں کو چھوڑ دو۔ ﴿ طاھرتین ﴾ حال واقع ہو رہا ہے معنی یہ ہوئے کہ دونوں پاؤں پاک ہیں۔ اس لئے موزوں کو نہ نکالو اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ میں نے موزوں میں پاؤں جب داخل کئے ہیں اس وقت وہ پاک تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ موزوں پر مسح اسی صورت میں درست اور جائز ہے جبکہ وضو کر کے پہنے گئے ہوں۔ ابوداؤد اور مؤطا امام مالک میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ تبوک کے موقع پر نماز فجر کے وقت پیش آیا۔

(٥٤) وللأَرْبَعَةِ عَنْهُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَسَحَ أَعْلَى الخُفِّ وَأَسْفَلَهُ. وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

نسائی کے علاوہ باقی سنن کی چاروں کتابوں میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ نبی ﷺ نے موزوں کے اوپر اور نیچے دونوں جانب مسح کیا۔ (اس روایت کی سند ضعیف ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موزوں پر مسح اوپر اور نیچے دونوں جانب ہونا چاہئے۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے اور صحیح حسن روایت کے مخالف ہے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آ رہا ہے۔ ابوداؤد' ترمذی اور ابن ماجہ میں منقول اس روایت کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں ثور بن یزید ہے جو رجاء بن حیوۃ کے واسطہ سے بیان کرتا ہے اور امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ثور کا رجاء سے سماع ثابت نہیں۔ اس لئے یہ روایت ضعیف ہے۔

(٥٥) وعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَوْ كَانَ الدِّينُ بِالرَّأْيِ لَكَانَ أَسْفَلُ الخُفِّ أَوْلَى بِالمَسْحِ

حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ "اگر دین کا دارومدار رائے اور عقل پر ہوتا تو پھر موزوں کی نچلی سطح پر مسح اوپر کی بہ نسبت زیادہ قرین قیاس تھا۔ میں

مِنْ أَعْلاَهُ، وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَمْسَحُ عَلَى ظَاهِرِ خُفَّيْهِ. أخرجهُ أبو داوُد بإسْنَادٍ حسَن.

نے خود رسول اللہ ﷺ کو موزے کے بالائی حصہ پر مسح کرتے دیکھا ہے۔" (ابوداؤد نے اس کو حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس کا مطلب یہ ہے کہ احکام دین کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے عقل و رائے پر نہیں۔ اگر عقل پر اس کا انحصار اور دارومدار ہوتا تو موزوں کی بالائی سطح پر مسح کبھی جائز نہ ہوتا' بلکہ نچلی سطح پر ہوتا' کیونکہ گندگی سے آلودہ نچلا حصہ ہوتا ہے۔ لہٰذا نص صحیح کی موجودگی میں عقل اور رائے پر عمل کرنا درست نہیں۔

(٥٦) وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ رضي الله تعالى عنه قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَأْمُرُنا إِذَا كُنَّا سَفْراً أَن لاَّ نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ ولَيَالِيَهُنَّ إِلاَّ مِنْ جَنَابَةٍ، وَلَكِنْ مِنْ غَآئِطٍ وَبُولٍ وَنَوْمٍ. أخرجهُ النَّسائيُّ والتِّرمِذيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وابْنُ خُزَيْمَة وصَحَّحاهُ

حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب ہم مسافر ہوتے تو رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیتے کہ ہم تین دن اور تین راتیں موزے نہ اتاریں' الا یہ کہ حالت جنابت لاحق ہو جائے۔ البتہ بیت الخلاء جانے کی صورت میں' پیشاب اور نیند کی وجہ سے اتارنے کی ضرورت نہیں۔" (اسے نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ ترمذی میں منقول روایت کے ہیں۔ ترمذی اور ابن خزیمہ دونوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿سفرا﴾ یعنی مسافرین سین کے فتح اور "فاء" کے سکون کے ساتھ۔ مسافر کی جمع ہے جیسے "رکب" اور "تجر" راکب اور تاجر کی جمع ہے اور ﴿خفاف﴾ خف کی جمع ہے اور ﴿الامن جنابۃ﴾ اور ﴿ان لا ننزع﴾ میں جو نفی ہے اس سے استثناء ہے۔ جنابت کی حالت لاحق ہونے کی صورت میں موزے اتارنے ضروری ہیں۔ خواہ ابھی مدت پوری نہ ہوئی ہو۔ البتہ بول و براز اور نیند کی وجہ سے موزے اتارنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں تین شب و روز مدت پوری ہونے پر اتارنا پڑیں گے۔

حاصل کلام: موزوں پر مسح بلااختلاف جائز ہے۔ موزوں پر مسح کی روایات بیان کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد اسی (٨٠) کے لگ بھگ ہے۔ جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر نے اس کے ثبوت پر اجماع نقل کیا ہے۔ امام کرخی کی رائے ہے کہ مسح خفین کی احادیث تواتر کی حد تک پہنچتی ہیں۔ انکار کرنے والے کے بارے میں ان کا قول ہے کہ مجھے ان کے کفر کا اندیشہ ہے۔

مقیم اور مسافر کی مدت مختلف ہے مسافر کیلئے تین شب و روز اور مقیم کیلئے ایک دن رات شرعی حد ہے۔ مدت کا آغاز وضو ٹوٹنے کے وقت سے شروع ہوگا' موزہ پہننے کے وقت سے نہیں' مثلاً ایک شخص نماز ظہر کے وقت وضو کر کے موزے پہنتا ہے اور اس کا وضو شام کو جا کر ٹوٹتا ہے تو اس کیلئے آغاز مدت

شام کا وقت ہوگا۔ مسح کا طریقہ اس طرح ہے کہ ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو پانی سے تر کر کے ان کے پوروں کو پاؤں کی انگلیوں سے پنڈلی کے آغاز تک کھینچ لے جائے۔ حدث لاحق ہونے کی صورت میں اگر موزہ اتار لیا جائے تو مسح ٹوٹ جاتا ہے اور اختتام مدت کے بعد بھی مسح ٹوٹ جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ صفوان رضی اللہ عنہ ﴾ "صاد" کی فتحہ اور "فاء" کے سکون کے ساتھ۔ بن عسال عین کے فتح اور سین کی تشدید۔ صفوان بن عسال مرادی الجملی۔ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں لڑے جانے والے ۱۲ غزوات میں شریک ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی۔ کہا جاتا ہے صحابہ کرامؓ میں سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان سے روایت کی ہے۔

(٥٧) وعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ لِلْمُسَافِرِ، وَيوماً وَلَيْلَةً لِلْمُقِيْمِ، يَعْنِيْ فِي المَسْحِ عَلَى الخُفَّيْنِ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافر کیلئے موزوں پر مسح کے لئے تین شب و روز اور مقیم کیلئے ایک دن رات مدت مقرر فرمائی ہے۔ (مسلم)

(٥٨) وعَنْ ثَوْبَانَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: بَعَثَ رَسُولُ اللهِ ﷺ سَرِيَّةً فَأَمَرَهُمْ أَنْ يَمْسَحُوا عَلَى العَصَائِبِ، يَعْنِي العَمَائِمَ، وَالتَّسَاخِيْنَ، يَعْنِي الخِفَافَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ (یعنی چھوٹا لشکر) روانہ فرمایا اور انہیں پگڑیوں اور موزوں پر مسح کرنے کا حکم دیا۔ (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ سریۃ ﴾ سین پر فتح "راء" پر کسرہ اور "یا" پر تشدید۔ چھوٹا سا لشکر جسے دشمن کے علاقہ میں بھیجا جاتا۔ اہل مغازی نے سریہ اس کو قرار دیا ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شامل نہ ہوئے ہوں اور جس میں آپؐ نے شمولیت بصورت قیادت فرمائی اسے علمائے مغازی کی اصطلاح میں غزوہ کہتے ہیں اور اس مقام پر اصطلاحی معنی مراد ہیں۔ ﴿ عصائب ﴾ عصابۃ کی جمع ہے اور ﴿ عمائم ﴾ عمامۃ کی جمع ہے۔ عصابۃ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ سر کو باندھا جاتا ہے اور ﴿ تساخین ﴾ "تاء" کے فتح کے ساتھ تسخان کی جمع ہے۔ جن کے معنی بالترتیب کسی راوی نے پگڑی اور موزہ کے کئے ہیں۔ عصابۃ تو دراصل پٹیوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ اس کے حقیقی معنی نہیں بلکہ مرادی معنی ہیں۔ ابن ارسلان نے کہا کہ التساخین ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جس سے پاؤں سردی سے بچ سکیں خواہ وہ موزہ ہو یا جراب۔

حاصل کلام: پٹیوں سے مراد ایسی پٹیاں بھی ہو سکتی ہیں جو زخمیوں کے زخموں پر باندھی جاتی ہیں یا کسی کا بازو یا ٹانگ ٹوٹنے کی صورت میں لکڑی کی پھٹیاں رکھ کر باندھ دیتے ہیں انہی کو عصائب کہا جاتا ہے۔ جنگ کیلئے روانہ کرتے وقت اس قسم کا حکم دینا بظاہر تو یہی معنی رکھتا ہے کہ معرکہ آرائی کے دوران زخمی حضرات اعضاء وضو دھونے کی بجائے زخم کی پٹیوں ہی پر مسح کر لیا کریں۔ ابوداؤد میں ہے کہ سریہ سے واپسی پر صحابہ کرامؓ نے سردی کی شکایت کی تو آپؐ نے پگڑی اور تساخین پر مسح کا حکم دیا۔

راوی حدیث: ﴿ ثوبان بن بجدد بن جحدر رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ ثوبان کا اعراب۔ "ثاء" پر فتح "واؤ" ساکن۔ اور بجدد میں "با" کے ضمہ جیم ساکن اور دال اول پر ضمہ اور دال ثانی ساکن اور بن جحدار میں جیم پر فتح "حاء" ساکن' دال پر فتح۔ یہ سراۃ کے باشندے تھے جو مکہ و مدینہ کے مابین ایک جگہ کا نام ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ حمیر قبیلہ میں سے تھے۔ زندگی بھر حضر و سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے اور ہر طرح کی خدمت بجا لاتے رہے۔ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید کر آزادی سے ہمکنار کیا تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد شام میں رہائش پذیر ہو گئے۔ شام سے پھر حمص کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ ۵۴ھ میں وفات پائی۔

(٥٩) وعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مَوْقُوفاً، وأنسٍ مَرْفوعاً: «**إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ وَلَبِسَ خُفَّيْهِ فَلْيَمْسَحْ عَلَيْهِمَا، وَلْيُصَلِّ فِيهِمَا، وَلاَ يَخْلَعْهُمَا إِنْ شَاءَ إِلاَّ مِنْ جَنَابَةٍ**». أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موقوف اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ "جب تم میں سے کوئی موزے پہن کر وضو کرے تو ان پر مسح کر لینا چاہئے اور ان کو پہنے ہوئے نماز پڑھ لے۔ اگر چاہے تو ان کو نہ اتارے' الاّ یہ کہ غسل جنابت کی ضرورت پیش آجائے۔" (اسے دارقطنی نے روایت کیا اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ لا یخلعهما ﴾ یعنی موزوں کو نہ کھینچے اور پاؤں سے انہیں نہ نکالے۔

(٦٠) وعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِي الله تَعالى عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهُ رَخَّصَ لِلْمُسَافِرِ ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ، وَلِلْمُقِيمِ يَوْماً ولَيْلَةً، إِذَا تَطَهَّرَ فَلَبِسَ خُفَّيْهِ، أَنْ يَمْسَحَ عَلَيْهِمَا. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپؐ نے مسافر کیلئے (مسح کی مدت) تین دن اور تین راتوں کی رخصت فرمائی ہے اور مقیم کیلئے ایک دن اور ایک رات۔ اس حالت میں کہ اس نے باوضو ہو کر موزے پہنے ہوں تو ان پر مسح کر لینا چاہئے۔ (دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

راوی حدیث: ﴿ ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا نام نفیع (تصغیر نافع کی) بن حارث ہے۔ یہ طائف کے قلعہ سے کچھ نوجوانوں کے ہمراہ چرخی کے ذریعہ باہر آئے۔ اسلام قبول کر لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا۔ یہ کبار و فضلاء صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ۵۱ھ یا ۵۲ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ کثیر الاولاد تھے۔

(٦١) وعَنْ أُبَيِّ بْنِ عِمَارَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَمْسَحُ عَلَى الخُفَّيْنِ؟ قَالَ: **نَعَمْ**، قَالَ: يَوْماً؟ قَالَ: **نَعَمْ**، قَالَ: ويَوْمَيْنِ؟ قَالَ: **نَعَمْ**، قَالَ: وثَلاَثَةَ أَيَّامٍ؟ قَالَ: **نَعَمْ، وَمَا شِئْتَ**. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَقَالَ: لَيْسَ بِالقَوِيِّ.

حضرت ابی بن عمارۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! کیا میں موزوں پر مسح کر سکتا ہوں؟ فرمایا "ہاں کر سکتے ہو" عرض کیا ایک دن؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں ایک دن" عرض کیا دو دن؟ آپ نے فرمایا "ہاں دو دن" میں نے عرض کیا تین دن؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں تین دن اور جب تک تیری مرضی ہو"۔ (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور ساتھ ہی کہا ہے کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کو اس کے ضعیف ہونے کی بنا پر اور صحیح و حسن احادیث جو مدت کی تعیین کرتی ہیں کے خلاف واقع ہونے کی وجہ سے نہیں لیا گیا۔ چونکہ حدیث کی سند صحیح نہیں اور وہ حدیث صحیح ہے جس میں مسافر کیلئے تین دن' تین راتیں اور مقیم کیلئے ایک دن اور ایک رات کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ صحیح اور قوی حدیث کے مقابلہ میں ضعیف کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے تو "شرح المهذب" میں اس حدیث کے ضعیف ہونے پر ائمہ حدیث کا اتفاق نقل کیا ہے اور امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے رجال غیر معروف ہیں۔ ابن الجوزی نے تو اس حدیث کو موضوع گردانا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابی بن عمارۃ رضی اللہ عنہ ﴾ ہمزہ کے ضمہ "باء" کے فتح اور "یاء" پر تشدید۔ عمارۃ عین کے نیچے کسرہ اور کبھی اوپر ضمہ بھی پڑھا گیا ہے۔ مدینہ کے انصار میں سے مشہور صحابی ہیں۔ مصر میں سکونت پذیر ہوئے۔ ابن حبان کا قول ہے کہ یہ وہ صحابی ہیں جنہیں دو قبلوں (بیت المقدس اور بیت اللہ) کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنے کا شرف و فضل حاصل ہے مگر اس کی حدیث و سند پر مجھے اعتماد نہیں ہے۔

٦ - بَابُ نَوَاقِضِ الوُضُوءِ — وضو توڑنے والی چیزوں کا بیان

(٦٢) عَنْ أَنَسٍ رضي الله تعالى عنه قَالَ: كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ الله ﷺ عَلَى عَهْدِهِ يَنْتَظِرُونَ العِشَاءَ. حَتَّى تَخْفِقَ رُءُوسُهُم، ثُمَّ يُصَلُّونَ وَلاَ يَتَوَضَّئُونَ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابہ کرامؓ نماز عشاء کا اتنا انتظار کرتے کہ غلبہ نیند کی وجہ سے ان کے سر جھک جاتے۔ مگر وہ از سر نو وضو کئے بغیر نماز پڑھ لیتے۔ (ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اس کی

الدَّارَقُطْنِيُّ، وَأَصْلُه فِي مُسْلِمٍ.

اصل مسلم میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب نواقض الوضو ﴾ نواقض' ناقض کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چیزیں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ﴿ تخفق ﴾ نیند کے غلبہ کی وجہ سے جھک جاتے۔ ﴿ روسهم ﴾ راس کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں سر۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے جب تک انسان گہری نیند نہ سوئے اس وقت تک اس کا وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس سے پہلے صفوان بن عسال کی روایت گزشتہ باب میں گزر چکی ہے جس میں مطلق نیند سے وضو کے ٹوٹنے پر دلالت ہوتی ہے۔ اس روایت کی روشنی میں اس کو بھی گہری نیند پر محمول سمجھا جائے گا یا یہ کہا جائے گا کہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے نیند سے مراد معمول کی نیند لی ہے اور صحابہ کرام اس نیند سے بھی واقف تھے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس نیند سے بھی جس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس کی وضاحت اور بیان کی ضرورت نہیں۔ بہرصورت یہ بات معلوم ہوئی کہ ٹیک یا تکیہ لگا کر سونے کی صورت میں نیند ناقض وضو ہوگی بصورت دیگر نیند سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ ٹیک لگانے یا تکیہ کا سہارا لینے کی حالت میں جسم انسانی کے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں پیٹ سے ریح کے خروج کا غالب امکان ہوتا ہے' اسی بنیاد پر احتیاط کے پیش نظر وضو نئے سرے سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(٦٣) وعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: جَاءَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ أَبِي حُبَيْشٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي امْرَأَةٌ أُسْتَحَاضُ فَلاَ أَطْهُرُ، أَفَأَدَعُ الصَّلاَةَ؟ قَالَ: **«لاَ، إِنَّمَا ذَلِكِ عِرْقٌ وَلَيْسَ بِحَيْضٍ، فَإِذَا أَقْبَلَتْ حَيْضَتُكِ فَدَعِي الصَّلاَةَ، وإِذَا أَدْبَرَتْ فَاغْسِلِي عَنْكِ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّي»**. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! میں ایسی عورت ہوں جو ہمیشہ استحاضہ کے خون میں مبتلا رہتی ہوں' پاک ہوتی ہی نہیں۔ کیا ایسی حالت میں نماز چھوڑ دوں؟ آپؐ نے فرمایا ”نہیں' یہ تو ایک رگ ہے (جو پھٹ جاتی ہے اور خون بہتا رہتا ہے) حیض کا خون نہیں ہے۔ ہاں جب ایام حیض شروع ہوں تو نماز کو چھوڑ دو اور جب یہ ایام پورے ہو جائیں تو خون دھو کر نماز پڑھو۔“ (بخاری و مسلم)

وَلِلْبُخَارِيِّ: «ثُمَّ تَوَضَّئِي لِكُلِّ صَلاَةٍ». وَأَشَارَ مُسْلِمٌ إِلىٰ أَنَّهُ حَذفَهَا عَمَداً.

اور بخاری میں مزید یہ الفاظ ہیں ”پھر ہر نماز کے لئے وضو کرو“ مسلم نے اشارہ کیا ہے کہ اسے انہوں نے عمداً چھوڑا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ استحاض ﴾ صیغہ مجہول واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ استحاضہ ایام ماہواری کے مقرر اوقات کے علاوہ عورت کے اندام نہانی سے نکلنے والے خون کو کہتے ہیں۔ ﴿ افادع ﴾ اس میں ھمزہ استفہام کا ہے اور "فاء" تعقیب کیلئے ہے اور ﴿ ادع ﴾ ودع سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہے کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ ﴿ انما ذلک ﴾ اس میں "کاف" کے نیچے کسرہ ہے۔ اس لئے کہ مخاطب عورت ہے اور معنی یہ ہیں۔ خون کا بہنا۔ ﴿ عرق ﴾ عین کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ۔ معنی یہ ہوئے رگ سے خون بہنے کی وجہ سے۔ اس رگ کا نام عاذل یا عاذر ہے۔ ﴿ ولیس بحیض ﴾ یہ حیض کا خون نہیں کیونکہ وہ خون رگ کے پھٹنے سے جاری نہیں ہوتا بلکہ عورت کے رحم کے اندر سے خارج ہوتا ہے۔ ﴿ فاذا اقبلت حیضتک ﴾ "حا" پر فتح اور کسرہ بھی جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب حیض کا خون شروع ہو۔ ﴿ فدعی ﴾ چھوڑ دو۔ ﴿ واذا ادبرت ﴾ یہ مؤنث کا صیغہ ہے۔ فاعل واقع ہو رہا ہے اور ضمیر حیض کی جانب راجع ہے۔ مطلب یہ ہے جب خون بند ہو جائے۔ ﴿ ثم توضئی لکل صلاۃ ﴾ پھر ہر نماز کیلئے نیا وضو کرو۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ استحاضہ ایسی ناپاکی ہے جو ناقض وضو ہے۔ اس باب میں اس حدیث کے لانے کی غرض یہی بتانا ہے کہ استحاضہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

حاصل کلام: عورت کو تین طرح کے خون سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک حیض کا خون' یہ خون ہر ماہ عورت کے بالغ ہونے سے لے کر بڑھاپے تک ایام حمل کے علاوہ برابر آتا رہتا ہے۔ اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور دوسرا نفاس کا خون ہے یہ وہ خون ہوتا ہے جو بچہ کی پیدائش کے بعد تقریباً چالیس دن' یا اس سے کم و بیش زچگی میں آتا رہتا ہے۔ تیسرا خون استحاضہ کا ہے' یہ خون متذکرہ دونوں خونوں سے الگ نوعیت کا ہوتا ہے یہ ایک عاذل نامی رگ کے پھٹنے سے جاری ہوتا ہے اور مسلسل جاری رہتا ہے اور بیماری کی صورت اختیار کرلیتا ہے اس کا رنگ سرخ ہوتا ہے اس کے جاری ہونے کا کوئی مقرر و متعین وقت نہیں ہے' ساری عمر بھی جاری رہ سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا ﴾ حبیش۔ حبش کی تصغیر ہے۔ مشہور صحابیہ ؓ ہیں۔ قبیلہ قریش کی شاخ اسد سے تھیں۔ ان کے باپ کا نام قیس بن مطلب بن اسد بن عبدالعزی بن قصی۔ یہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ بڑے رتبے والی تھیں۔ انہوں نے ہجرت بھی کی تھی۔

(٦٤) وعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رضي الله تعالى عنه قَالَ: كُنْتُ رَجُلاً مَذَّاءً فَأَمَرتُ المِقْدَادَ أَن يَسْأَلَ النَّبِيَّ ﷺ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: **فِيْهِ الوُضُوءُ**. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کثرت سے مذی کے خارج ہونے کا مریض تھا۔ میں نے مقداد رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ نبی کریم ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کریں۔ مقداد رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا (کہ اس کی وجہ سے وضو کرنا ہوگا یا غسل جنابت؟) آپ ؐ نے فرمایا "ایسی حالت

میں وضو ہی ہے۔" (بخاری و مسلم' البتہ یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ مذاء ﴾ ذال پر تشدید۔ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے بکثرت مذی خارج ہوتی رہتی ہے۔ مذی کیا ہے؟ مذی سفید' رقیق لیس دار پانی ہے جو بیوی سے چھیڑ چھاڑ کے وقت اور جماع کے ارادے کے وقت مرد کی شرمگاہ سے خارج ہوتی ہے۔ ﴿ فامرت المقداد ﴾ مقداد کو مسئلہ کی بابت پوچھنے کیلئے کہا۔ اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ حیا داری کے پیش نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے براہ راست سوال کرنے سے گریز کیا۔

راوی حدیث: ﴿ مقداد رضی اللہ عنہ ﴾ میم کے کسرہ کے ساتھ۔ مقداد بن عمرو بن ثعلبہ البھرانی الکندی۔ ان کی کنیت ابوالاسود یا ابوعمرو ہے اور مقداد بن اسود کے نام سے مشہور ہیں اور اسود سے مراد اسود بن عبد یغوث الزھری ہے۔ اس لئے کہ اس نے مقداد کو متبنی بنا لیا تھا اور جاہلیت میں اس کے ساتھ حلیفانہ تعلقات و روابط قائم کر لئے تھے۔ اسلام لانے والوں میں ان کا نمبر چھٹا ہے۔ دو مرتبہ ہجرت کے شرف سے شرف یاب ہوئے۔ کبار' فضلاء اور بہترین اوصاف و خصائل کے مالک صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ عہد رسالت میں واقع ہونے والے تمام غزوات میں شریک رہے۔ معرکہ بدر کے روز گھڑ سواروں میں شامل تھے۔ فتح مصر میں حاضر تھے۔ ۳۳ھ میں جوف کے مقام پر جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر واقعہ ہے' وفات پائی۔ ان کی میت کو اٹھا کر مدینہ لائے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبرستان بقیع میں دفن کئے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰ برس کی تھی۔

(٦٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله تعالى عنها، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَبَّلَ بَعْضَ نِسَآئِهِ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَضَعَّفَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی اہلیہ کا بوسہ لیا اور نماز کے لئے نکل گئے اور وضو نہیں فرمایا۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور بخاری نے اسے ضعیف قرار دیا ہے)

حاصل کلام: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ابراہیم تیمی کرتے ہیں مگر ابراہیم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کچھ نہیں سنا۔ اس لئے یہ مرسل اور کمزور ہے۔ مگر بخاری میں ایک حدیث اس کی مؤید ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کی تاریکی میں نماز تہجد ادا فرمایا کرتے تھے۔ میرے پاؤں آپؐ کی سجدہ گاہ میں ہوتے تھے۔ سجدہ کیلئے جانے سے پہلے میرے پاؤں کو آپؐ اپنے ہاتھ سے چھوتے تو میں پاؤں دور کر لیتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے اعضاء جسم میں سے کسی کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح بوسہ لینے اور محض چھونے سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا خواہ شہوت سے چھوئے یا شہوت کے بغیر۔ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کے قائل ہیں اور ائمہ میں

سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

(٦٦) وعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا وَجَدَ أَحَدُكُمْ فِي بَطْنِهِ شَيْئاً فَأَشْكَلَ عَلَيْه، أَخَرَجَ مِنْهُ شَيْءٌ أَمْ لاَ؟ فَلاَ يَخْرُجَنَّ مِنَ المَسْجِدِ، حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتَاً أَوْ يَجِدَ رِيحاً». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی اپنے پیٹ میں ہوا کی حرکت محسوس کرے اور فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ آیا پیٹ سے کوئی چیز خارج ہوئی ہے یا نہیں تو ایسی صورت میں (وضو کرنے کیلئے) وہ مسجد سے باہر نہ جائے' تاوقتیکہ (یقین نہ ہو جائے) ہوا کے خارج ہونے کی آواز یا بدبو سے محسوس کرے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وجدفی بطنه شیئا ﴾ اپنے پیٹ میں کسی چیز کو محسوس کیا۔ گویا ریح گردش کر رہی ہے۔ ﴿ اشکل ﴾ مشتبہ ہو جائے۔ مشکل ہو جائے۔ ﴿ اخرج ﴾ همزہ اس میں استفہام کا ہے۔ یعنی اسے یہ شک میں مبتلا کر دے کہ آیا ریح خارج ہوئی ہے یا نہیں۔ ﴿ فلا یخرجن ﴾ محض شک اور تردد کی بنا پر نماز نہ توڑے۔ ﴿ حتی یسمع ﴾ تاآنکہ وہ ہوا کے بآواز خارج ہونے کو سنے ﴿ اویجدریحا ﴾ یا پھر بے آواز ہوا کا پیٹ سے خارج ہونے والی بدبو محسوس کرے۔ مقصود یہ ہے کہ انسان کو یقین ہو جائے کہ ہوا پیٹ سے خارج ہوئی ہے خواہ ان دو طریقوں کے علاوہ اور کوئی طریقہ ہو۔ ان دو کا بالخصوص ذکر محض اس لئے کیا ہے کہ اس باب میں یہی دو ذرائع غالب ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے صاف معلوم ہوا کہ شک کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس مفہوم کو ذرا وسیع کریں تو اس سے ایک اصول کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے کہ ہر چیز اپنے حکم پر قائم رہتی ہے' تاوقتیکہ اس کے برخلاف یقین و وثوق نہ ہو جائے۔ شک و تردد کوئی قابل اعتبار چیز نہیں۔

(٦٧) وعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: مَسَسْتُ ذَكَرِي، أَوْ قَالَ: الرَّجُلُ يَمَسُّ ذَكَرَهُ فِي الصَّلاَةِ أَعَلَيْهِ وُضُوءٌ؟ فَقَالَ النبي ﷺ: «لاَ إِنَّمَا هُوَ بَضْعَةٌ مِنْكَ». أَخْرَجَهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَقَالَ ابْنُ المَدِيني: هُوَ

حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے کہا میں نے اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگایا ہے یا یوں کہا کہ ایک آدمی نماز میں اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگاتا ہے تو کیا اسے نئے سرے سے وضو کرنا چاہئے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں' وہ تو تیرے اپنے جسم کا ایک ٹکڑا ہے' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔" ابن مدینی کہتے ہیں

أَحْسَنُ مِنْ حَدِيْثِ بُسْرَةَ. بسرہ کی حدیث سے یہ حدیث بہت بہتر ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اوقال ﴾ اس میں فاعل وہ ضمیر ہے جو اس میں مخفی ہے اور جس مرد کا پہلے ذکر آیا ہے اس کی طرف راجع ہے۔ ﴿ الرجل یمس ﴾ مبتداء اور خبر﴿ بضعة ﴾ "باء" پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں اور "ضاد" ساکن ہے معنی اس کے گوشت کا ٹکڑا۔ ﴿ منك ﴾ سے مراد ہے کہ تیرے جسم کا ٹکڑا ہے جس طرح دیگر اعضاء جسم ہیں اسی طرح یہ بھی ہاتھ پاؤں کی طرح گوشت کا ٹکڑا ہے۔ یہ تو معلوم شدہ ہے کہ انسان اپنے جسم کے کسی دوسرے حصہ کو چھو کر وضو نہیں کرتا تو اسی طرح شرم گاہ کو چھو لینے سے بھی وضو کی ضرورت نہیں۔ جو بھی اس کلام پر غور و فکر کرے گا وہ سمجھ جائے گا کہ یہ قیاس و اجتہاد کی بنا پر تھا اور اس وقت شرم گاہ کو چھونے کے بارے میں نفی یا اثبات میں کوئی واضح حکم نہیں دیا تھا۔

حاصل کلام: علی بن عبداللہ جو ابن المدینی کے نام سے مشہور ہیں ۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۲۴ھ میں وفات پائی۔ یہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ابوداؤد کے اساتذہ میں سے ہیں۔ ترمذی نے کہا ہے بہت سے صحابہؓ اور تابعین مس ذکر (یعنی شرمگاہ کو چھونے) سے وضو کے قائل نہ تھے۔ علی بن عبداللہ یعنی ابن المدینی اور ابن المبارک اور اہل کوفہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ دوسری طرف بہت سے صحابہؓ و تابعین مس ذکر سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل ہیں' ان کی دلیل بسرہ کی روایت ہے جو آئندہ آرہی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اسی کے قائل ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ طلق بن علی رضی اللہ عنہ ﴾ ابوعلی ان کی کنیت ہے۔ "طاء" پر فتح' "لام" ساکن ہے۔ نسب نامہ یوں ہے طلق بن علی بن طلق بن عمرو حنفی' سحیمی' یمامی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے اسی وقت یہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسجد نبوی کی تعمیر میں زور و شور اور شوق سے حصہ لیا۔ کہتے ہیں کہ ان سے چودہ احادیث نبویہ مروی ہیں۔

(٦٨) وَعَنْ بُسْرَةَ بِنْتِ صَفْوَانَ رضي الله تعالى عنها أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ». أَخْرَجَهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ، وَقَالَ البُخَارِيُّ: هُوَ أَصَحُّ شَيْءٍ فِي هَذَا البَابِ.

بسرہ بنت صفوان رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگایا اسے وضو کرنا چاہیئے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ امام بخاری کی رائے یہ ہے کہ اس باب میں یہ صحیح ترین حدیث ہے)

لغوی تشریح: ﴿ من مس ذکرہ ﴾ جس نے اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگایا یا ایسی حالت میں جب کہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ ﴿ فلیتوضا ﴾ اسے وضو کرنا چاہیئے یعنی نئے سرے سے نماز کیلئے وضو کرنا چاہیئے۔

حاصل کلام: یہ حدیث صریح طور پر اس پر دلالت کرتی ہے کہ مس ذکر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور یہی راجح قول ہے' اس لئے کہ کلام میں ایک مقرر حکم ہے' اجتہاد کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ متقین

ائمہ جن میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ' ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ' دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ' بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں نے طلق بن علی سے مروی حدیث کو ضعیف اور بسرہ بنت صفوان سے مروی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور جہاں تک ابن مدینی کے اس قول کا تعلق ہے کہ طلق بن علی کی روایت بسرہ کی روایت سے زیادہ بہتر ہے۔ اس رائے کو ائمہ نے قبول نہیں کیا۔ تقریباً اٹھارہ صحابہ کرامؓ سے بسرہ والی حدیث کی تائید میں مروی ہے' مزید برآں یہ کہ بسرہ والی حدیث کی سند کے راوی صحیحین کے راویوں کے ہم پلہ ہیں اور طلق بن علی کی روایت کے سند کے راویوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو صحیحین کے راویوں جیسا ہو اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ان راویوں میں سے ہیں جو مس ذکر سے وضو ٹوٹنے کے قائل ہیں اور راوی حدیث ہیں۔ یہ طلق بن علی کی آمد کے چھ سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ بعد اسلام لائے تھے اور طلق بن علی ابتدا ہی میں (جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تھے اور مسجد نبوی کی تعمیر شروع کی) مدینہ میں آئے تھے پھر اپنے وطن یمامہ کی طرف واپس چلے گئے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ کے آخر میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ بایں صورت بھی بعد میں حاضر ہونے والے صحابی کی روایت راجح ہے۔

راوی حدیث: ﴿ بسرۃ بنت صفوان رضی اللہ عنہا ﴾ بسرۃ کے باء پر ضمہ اور سین ساکن ہے۔ پورا نام بسرہ بنت صفوان بن نوفل بن اسد بن عبدالعزی قرشیہ اسدیہ۔ سابقین صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ پہلے پہل ہجرت کرنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور اقتدار تک بقید حیات رہیں۔

(٦٩) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «**مَنْ أَصَابَهُ قَيْءٌ أَوْ رُعَافٌ أَوْ قَلَسٌ أَوْ مَذْيٌ، فَلْيَنْصَرِفْ فَلْيَتَوَضَّأْ، ثُمَّ لِيَبْنِ عَلَى صَلاَتِهِ، وَهُوَ فِي ذَلِكَ لاَ يَتَكَلَّمُ**». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَه، وَضَعَّفَهُ أَحْمَدُ وَغَيْرُهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کو نماز میں قے آجائے یا نکسیر پھوٹ پڑے یا پیٹ کے اندر کی چیز منہ کے راستہ سے باہر آجائے یا مذی کا خروج ہو جائے تو اسے نماز سے نکل کر وضو کرنا چاہئے اور جہاں سے نماز چھوڑی تھی اسی پر بنا کر لے۔ بشرطیکہ اس دوران میں اس نے گفتگو نہ کی ہو۔" (ابن ماجہ نے اسے روایت کیا ہے اور احمد نے اسے ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ رعاف ﴾ "راء" پر ضمہ۔ ناک کے راستہ سے جو خون نکلتا ہے اسے "رعاف" یعنی نکسیر کہتے ہیں۔ ﴿ قلس ﴾ "قاف" پر فتح اور "لام" ساکن۔ خورد و نوش کی کوئی چیز جو منہ کے راستہ سے باہر آجائے۔ ﴿ لیبن ﴾ اس میں لام' لام امر ہے اور بناء یہ ہے کہ آدمی نے نماز شروع کی ایک یا دو یا زیادہ رکعات پڑھ چکا تھا کہ بے وضو ہوگیا۔ اب تازہ وضو کر کے بغیر کسی قسم کی گفتگو کئے آکر نماز شروع کر دے۔ جتنی پہلے پڑھ چکا تھا انہیں شمار کرے اور باقی ماندہ رکعات پوری کر کے سلام پھیر دے۔ اس بے وضو ہونے سے پہلے کی پڑھی ہوئی رکعات بھی ضائع نہیں جائیں گی اور از سر نو پوری نماز بھی پڑھنا نہیں

پڑے گی۔ ﴿ وهو فی ذلک لا یتکلم ﴾ اور وہ اس دوران میں کسی قسم کی گفتگو نہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کا وضو ٹوٹ گیا تو بناء کیلئے یہ شرط ہے کہ وضو کر کے واپس آنے اور نماز میں شامل ہونے تک کسی قسم کی بات چیت نہ کرے۔ اگر بات چیت کر لی تو بناء نہیں کر سکتا' از سر نو پوری نماز پڑھنا ہوگی۔

حاصل کلام : مذی کے خارج ہونے کی صورت میں فقہاء بالاتفاق وضو کے ٹوٹ جانے کے قائل ہیں البتہ قے آنے' پیٹ میں سے کھانے پینے کی کوئی چیز منہ کے راستہ سے نکلنے اور ناک میں سے خون کے جاری ہونے یعنی نکسیر پھوٹنے کی صورت میں ایک گروہ کا خیال ہے کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے جبکہ دوسرا گروہ اس کا قائل ہے کہ وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح بناء کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ بناء والی حدیث ضعیف ہے اور مرسل ہے۔ نیز احادیث صحیحہ کے معارض و مخالف بھی ہے' لہٰذا اس کے ذریعہ حجت قائم نہیں ہوتی۔

ائمہ و فقہاء کا بناء کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دونوں بناء کے قائل ہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کے قائل نہیں۔ پہلے گروہ کی دلیل یہی حدیث ہے جسے احمد نے ضعیف قرار دیا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں : جب نمازی بے وضو ہوگیا تو نماز نہ رہے گی۔ جب نماز ہی نہ رہی تو بناء کس پر ہوگی۔ اسی طرح نکسیر سے وضو ٹوٹنے کے مسئلہ میں بھی ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ قے اور نکسیر دونوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ نکسیر وغیرہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ صحابہ کرام ؓ میں سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما' جابر بن یزید رضی اللہ عنہ' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما' ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور تابعین میں ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ' مکحول رحمۃ اللہ علیہ اور ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بھی قے اور نکسیر سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل نہیں۔

(٧٠) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَجُلاً سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ: أَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الغَنَمِ؟ قَالَ: إِنْ شِئْتَ. قَالَ: أَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الإِبِلِ؟ قَالَ: نَعَمْ. أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے دریافت کیا' کیا میں بکری کا گوشت کھاؤں تو بعد میں وضو کروں؟ آپ ؐ نے فرمایا "اگر دل چاہے تو کرلو۔" اس شخص نے پھر عرض کیا اور اونٹ کے گوشت سے؟ فرمایا "اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنا چاہئے۔" (مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ فاتوضاء ﴾ ہمزہ استفہام اس جگہ حذف ہے اور یہ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ ﴿ من لحوم الغنم ﴾ یعنی بکری کا گوشت کھانے کی وجہ سے۔

حاصل کلام : یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنا چاہئے۔ عام طور پر اصحاب حدیث کی رائے یہی ہے۔ اس کے گوشت کے ناقض وضو ہونے کی حکمت اور سبب معلوم ہونا

ضروری نہیں کیونکہ تعبدی احکام کی حکمت کا عقل میں آنا ضروری نہیں۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ''اعلام الموقعین'' ج ۱، ص: ۱۴۷ پر اس کی بڑی عمدہ اور معنوی اعتبار سے بڑی معقول وجہ بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر اونٹ کی کوہان پر شیطان ہوتا ہے اور یہ معلوم حقیقت ہے کہ جن کی پیدائش آگ سے کی گئی ہے۔ کھانے والے کی مشابہت کھانے کے ساتھ ہوگی۔ لہٰذا جب اونٹ کا گوشت کھائے گا (اور وہ اس کی خوراک ہوگا) تو اس میں ازخود قوت شیطانیہ پیدا ہوگی۔ اور شیطان کی تخلیق بھی آگ سے ہوئی ہے اور آگ کو پانی کے ذریعہ بجھایا جاتا ہے۔ حدیث مذکور بھی اسی کیفیت کی ترجمان ہے۔ جب بندہ اونٹ کا گوشت کھا کر بعد میں وضو کرے گا تو اس کے وضو میں وہ چیز شامل ہوگی جو اس شیطانی قوت کو بجھائے گی تو ایسی صورت میں یہ فساد انگیز چیز زائل ہو جائے گی۔

اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ائمہ اہل سنت میں اختلاف ہے۔ امام احمد، اسحاق بن راہویہ، ابن منذر، ابن خزیمہ وغیرہ محدثین علماء کا یہی مذہب ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو برقرار نہیں رہتا۔ بیہقی اور تمام اہل حدیث کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس کے برعکس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام کسی بھی حلال جانور کے گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک وضو برقرار رہتا ہے۔ ان کی دلیل ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان وغیرہ کی روایت ہے۔ یہ حضرات اس حدیث سے وضو سے ہاتھ منہ دھونا مراد لیتے ہیں جس طرح خورد ونوش سے فارغ ہو کر ہاتھ منہ دھویا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کے نزدیک وضو کا لغوی معنی مراد ہوگا، اصطلاحی معنی نہیں۔ آخری حکم یہ ہے کہ آگ سے پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کی ضرورت نہیں، مگر یہ بات درست نہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ''امام احمد وغیرہ کا مسلک دلیل کے اعتبار سے مضبوط ہے، ابوداؤد وغیرہ کی حدیث عام ہے اور مسلم کی یہ حدیث خاص اونٹ کے بارے میں ہے اس لئے خاص حکم عام حکم سے مقدم ہے۔'' نیز ایک شرعی لفظ ''وضو'' کو بلا دلیل لغوی معنی پر محمول کرنا بھی درست نہیں۔

راوی حدیث: ﴿جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ﴾ جابر بن سمرہ بن جنادہ مشہور و معروف صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ کوفہ میں رہے۔ غالباً ان سے ایک سو چھیالیس احادیث مروی ہیں۔ ۷۴ھ میں وفات پائی۔

(۷۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «مَنْ غَسَّلَ مَيِّتاً فَلْيَغْتَسِلْ، وَمَنْ حَمَلَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَقَالَ أَحْمَدُ: لاَ يَصِحُّ شَيْءٌ فِي هٰذَا الْبَابِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے میت کو غسل دیا وہ خود بھی غسل کرے اور جس نے میت کو اٹھایا وہ وضو کرے۔'' (اس حدیث کو احمد، نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے اور احمد کا قول ہے کہ اس باب میں کوئی بھی حدیث صحیح ثابت نہیں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ قال احمد ﴾ سے مراد امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ﴿ لا یصح شئی فی ھذا الباب ﴾ اس باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ روایت حسن درجہ سے کم نہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ یہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کی بنا پر منسوخ ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میت کو غسل دینے کی وجہ سے تم پر غسل نہیں ہے۔ صرف ہاتھوں کو دھو لینا ہی کافی ہے۔" (حاکم، بیہقی)

حاصل کلام: صحیح یہ ہے کہ ﴿ من غسل میتا فلیغتسل ﴾ میں حکم استحباب کیلئے ہے یعنی میت کو نہلانے والے کیلئے خود غسل کرنا ضروری نہیں۔ اس کی دلیل سنن دار قطنی اور مسند احمد میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ بیان ہے کہ ہم میت کو غسل دیا کرتے تھے پھر بعد میں بعض لوگ غسل کر لیتے اور بعض نہیں کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ بیہقی اور حاکم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بھی اس کی مؤید ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن عمر رضی اللہ عنہما، عائشہ رضی اللہ عنہا، حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔ البتہ بعض وجوب کے بھی قائل ہیں مگر جنازہ اٹھانے والے پر وضو کے وجوب کا کوئی بھی قائل نہیں۔

(۷۲) وعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ رضي الله تعالىٰ عنهما أَنَّ فِي الكِتَابِ الَّذي كَتَبَهُ رَسولُ اللهِ ﷺ لِعَمْرِو بْنِ حَزْمٍ: أَنْ لاَ يَمَسَّ القُرْآنَ إِلاَّ طَاهِرٌ. رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلاً، وَوَصَلَهُ النَّسَائِيُّ وابْنُ حِبَّانَ، وَهُوَ مَعْلُولٌ.

حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام کی جو تحریر عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو لکھ کر دی تھی اس میں تحریر تھا کہ "قرآن پاک کو پاکیزہ انسان (جس نے وضو کیا ہو) ہی ہاتھ لگائے۔" (امام مالک نے اسے مرسل روایت کیا ہے، نسائی اور ابن حبان نے اس کو موصول بیان کیا ہے، دراصل یہ حدیث معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الا طاھر ﴾ بظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حدث اکبر ہو یا اصغر دونوں سے پاک ہونا چاہئے۔ ﴿ وھو معلول ﴾ مصنف نے اس روایت کو معلول غالباً اس بنا پر کہا ہے کہ ان کے خیال میں یہ روایت سلیمان بن داؤد یمامی سے مروی ہے اور یہ شخص واقعتاً ایسا ہے جس کو ترک کرنے پر سب کا اتفاق ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس روایت کے راوی سلیمان بن داؤد خولانی ہیں اور وہ ثقہ راوی ہے۔ ائمہ حدیث نے اس کی تعریف کی ہے۔ اس لئے حدیث معلول نہ ہوئی۔ (السبل)

حاصل کلام: طہارت دو قسم پر ہے ایک طہارت تو وہ ہے جس کی تعبیر حدث اکبر سے کی جاتی ہے اور دوسری حدث اصغر سے۔ اگر حدث اکبر یعنی جنابت وغیرہ ہو تو ایسی صورت میں قرآن مجید کو چھونا، ہاتھ لگانا ممنوع اور ناجائز ہے۔ محض بے وضو ہونے کی صورت میں اختلاف ہے بہتر ہے کہ باوضو ہاتھ لگایا جائے۔

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما ﴾ یہ عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری،

رضی اللہ عنہ مدنی قاضی ہیں۔ مشہور تابعی ہیں۔ ۱۳۵ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ستر برس کی تھی۔
﴿ عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ ﴾ عمرو بن حزم بن یزید خزرجی نجاری مراد ہیں۔ ابو ضحاک ان کی کنیت ہے۔ غزوۂ خندق میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو نجران کی طرف عامل بنا کر اس لئے بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو دینی احکام و مسائل کی تعلیم سکھائیں۔ قرآن مجید پڑھائیں' لوگوں سے ملاقات کی وصولی کیلئے حسابات و نصابات ان کو تحریر کر کے سپرد کئے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ جو تحریر نبی ﷺ نے ان کو دی تھی اس میں فرائض' سنن' صدقات اور دیات کی تفصیلات تھیں۔ اسی مکتوب کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ۵۰ھ کے بعد مدینہ میں وفات پائی۔

(۷۳) وعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَذْكُرُ اللَّهَ عَلَى كُلِّ أَحْيانِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَعَلَّقَهُ البُخارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا اور بخاری نے اس کو تعلیقاً نقل کیا ہے)

حاصل کلام: مطلب اس کا یہ ہے کہ جماع' بول و براز وغیرہ کی حالت میں ذکر سے اجتناب کرنا ہے باقی اوقات میں ذکر کی اجازت ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنابت کی حالت کے ماسوا قرآن پڑھا کرتے تھے' زبان پاک ہے زبانی ذکر الٰہی ہر وقت کیا جا سکتا ہے۔

(۷٤) وعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ احْتَجَمَ وَصَلَّى، وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. أَخرَجَهُ الدَّارَقُطنِيُّ، وَلَيَّنَهُ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے پچھنے لگوائے اور نیا وضو کئے بغیر نماز ادا کی۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اسے کمزور کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ احتجم ﴾ پچھنے لگوائے۔ حجامت عربی میں سینگ یا کسی دیگر آلہ کے ذریعہ جسم کے حصہ سے خون نکلوانے کو کہتے ہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بول و براز کے دونوں قدرتی راستوں کے علاوہ دوسرے کسی ذریعہ سے اخراج خون سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ جس کی تائید حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ ﴿ لینہ ﴾ تلیین سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی کمزوری و ضعف کے ہیں۔ اس کے ضعف کی وجہ اس روایت کے راویوں میں صالح بن مقاتل ایسا راوی ہے جو قوی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس کو کمزور قرار دیا گیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بول و براز کے قدرتی دونوں راستوں کے علاوہ بدن سے خون کا نکلنا ناقض وضو نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ' ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام اور تابعین عظام کی ایک کثیر جماعت کے علاوہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(٧٥) وعَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «العَيْنُ وِكَاءُ السَّهِ، فَإِذَا نَامَتِ العَيْنَانِ اسْتَطْلَقَ الوِكَاءُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالطَّبَرَانِيُّ، وَزَادَ: «وَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ».

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "آنکھوں کا کھلا رہنا ریح خارج ہونے کا بندھن ہے جب آنکھ سونے کی وجہ سے بند ہو جاتی ہے تو بندھن ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ (کھل جاتا ہے) (مسند احمد' طبرانی) (طبرانی نے اتنا اضافہ بھی اپنی روایت میں بیان کیا ہے کہ "جس شخص کو نیند آجائے وہ از سر نو وضو کرے۔"

وَهَذِهِ الزِّيَادَةُ فِي هَذَا الحَدِيْثِ عِنْدَ أَبِي دَاودَ مِنْ حَدِيثِ عَلِيٍّ دُونَ قَوْلِهِ: «اسْتَطْلَقَ الوِكَاءُ» وَفِي كلا الإِسْنَادَيْنِ ضَعْفٌ.

اتنا اضافہ ابوداؤد کی اس روایت میں بھی ہے جسے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے روایت کیا ہے البتہ اس روایت میں استطلق الوکاء "یعنی بندھن کھل جاتا ہے" والی عبارت نہیں ہے۔ (باعتبار سند دونوں احادیث ضعیف ہیں)

وَلِأَبِي دَاوُدَ أَيْضاً عَنِ ابْنِ عَبَّاس رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا مَرْفُوعاً: «إِنَّما الوُضُوءُ عَلَى مَنْ نَامَ مُضْطَجِعاً». وفي إسناده ضعف أيضاً.

اور ابوداؤد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطہ سے یہ مرفوع روایت بھی مروی ہے "وضو تو اس شخص پر ہے جو لیٹ کر سو جائے۔" (سند کے اعتبار سے یہ حدیث بھی ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ وکاء السه ﴾ الوکاء واؤ پر کسرہ اور کاف پر مد۔ اس دھاگے یا رسی کو کہتے ہیں جس سے مشکیزہ وغیرہ کا منہ باندھا جاتا ہے۔ ﴿ والسه ﴾ سین پر فتح اور "ھا" مخفف۔ دبر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿ استطلق ﴾ کھل جانا۔ ڈھیلا ہونا۔ ﴿ مضطجعا ﴾ پہلو کے بل لیٹ کر۔

حاصل کلام: حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ نیند فی نفسہ ناقض وضو نہیں ہے بلکہ اس سے وضو کے ٹوٹ جانے کا گمان اور ظن پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر دونوں روایتوں کی سندوں میں ضعف ہے کیونکہ ان میں ایک "بقیہ" نامی راوی ہے جس کے بارے میں بہت سے محدثین نے کہا ہے کہ یہ قوی نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ضعف خفیف سا ہے۔ منذری' نووی اور ابن الصلاح نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ لیٹ کر سونے کی حالت میں وضو ٹوٹ جاتا ہے اور ایک روایت میں ہے مطلق نیند سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ دونوں احادیث میں موافقت و تطابق اس طرح ہے کہ پہلو کے بل گہری نیند آتی ہے۔ ایسی حالت میں اعضاء جسم ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اس صورت میں ریح خارج ہونے کا گمان

غالب ہوتا ہے، جبکہ ہلکی نیند میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سیدھا یا چت لیٹ کر گہری نیند کی صورت میں بھی وضو نہیں ٹوٹتا ایسا نہیں۔ گہری جس صورت میں ہو وہ ناقض وضو ہوگی۔ پہلو کے بل عموماً نیند گہری ہوتی ہے اس لئے اس کا خاص ذکر کر دیا۔

راوی حدیث: ﴿معاویہؓ﴾ معاویہ سے مراد معاویہ بن ابی سفیان بن حرب رضی اللہ عنہ ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کا والی مقرر فرما دیا۔ یہ اس ولایت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک رہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے خلافت سے دستبرداری کے اعلان کے بعد ان کی بیعت کی گئی اور بالاتفاق وہ امیر مقرر ہوئے۔ یہ ۴۰ھ کا واقعہ ہے۔ ۶۰ھ ماہ رجب میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۸ برس تھی۔

(٧٦) وعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله تعالى عنهما، أَنَّ رَسُولَ الله ﷺ قَالَ: «**يَأْتِي أَحَدَكُمُ الشَّيْطَانُ فِي الصَّلاَةِ فَيَنْفُخُ فِي مَقْعَدَتِهِ، فَيُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهُ أَحْدَثَ، وَلَمْ يُحْدِثْ، فَإِذَا وَجَدَ ذٰلِكَ فَلاَ يَنْصَرِفْ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتاً أَوْ يَجِدَ رِيحاً**». أَخرَجَهُ البَزَّارُ.

وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيْحَيْنِ مِنْ حَدِيْثِ عَبْدِ اللهِ ابْنِ زَيْدٍ.

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ نَحْوُهُ.

وَلِلْحَاكِمِ عَنْ أبي سَعِيْدٍ مَرْفُوعاً: «**إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الشَّيْطَانُ، فَقَالَ: إِنَّكَ قَدْ أَحْدَثْتَ، فَلْيَقُلْ: إِنَّكَ كَذَبْتَ**». أَخرَجَهُ ابْنُ حِبَّانَ بَلَفْظِ: «فَلْيَقُلْ فِي نَفْسِهِ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "نماز میں تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور اس کی مقعد میں پھونک مارتا ہے اور اس کے ذہن میں یہ خیال ڈال جاتا ہے کہ وہ بے وضو ہو گیا ہے حالانکہ وہ بے وضو نہیں ہوا ہوتا۔ لہٰذا تم میں سے جب کوئی ایسا محسوس کرے تو ریح کے خارج ہونے کی آواز سننے یا اس کی بدبو پانے تک نماز سے نہ پھرے۔" (اسے بزار نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کی اصل بخاری میں عبداللہ بن زید اور مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے موجود ہے) صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ان جیسے ہی الفاظ مروی ہیں۔

اور حاکم نے ابوسعید کے واسطہ سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ "جب تم میں سے کسی کے پاس شیطان آئے اور ذہن میں وسواس ڈالے کہ تو بے وضو ہوگیا تو یہ شخص اسے جواب میں کہے کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔" اس کو ابن حبان نے ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ "وہ شخص اپنے دل میں کہے کہ تو جھوٹا ہے۔"

٧ - بَابُ آدَابِ قَضَاءِ الحَاجَةِ — قضائے حاجت کے آداب کا بیان

(۷۷) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله تعالى عنه قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ الخَلَاءَ وَضَعَ خَاتَمَهُ. أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ، وَهُوَ مَعْلُولٌ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب قضاء حاجت کیلئے تشریف لے جاتے تو انگشتری (اپنے دست مبارک سے) اتار کر الگ رکھ دیتے تھے۔ (اسے ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور یہ روایت معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب آداب قضاء الحاجۃ ﴾ قضاء حاجت۔ بول و براز سے کنایہ ہے۔ ﴿ الخلاء ﴾ "خاء" کے فتحہ اور آخر پر الف ممدودہ۔ خالی جگہ۔ خالی مکان۔ پھر کثرت استعمال میں یہ قضاء حاجت کی جگہ کیلئے بولا جانے لگا۔ (بیت الخلاء) کیونکہ قضاء حاجت کے اوقات کے علاوہ یہ جگہ عموماً خالی رہتی ہے اور اس لئے بھی اسے خلا کہتے ہیں کہ انسان کیلئے اس میں تنہائی میسر آتی ہے۔ ﴿ وضع خاتمہ ﴾ اپنی انگوٹھی اتار کر رکھ دیتے' کیونکہ اس میں "محمد رسول اللہ" منقش تھا اور اس میں تنبیہہ اور خبردار کرنا مقصود ہے کہ گندگی والی جگہوں سے ایسی چیزوں کو دور ہی رکھا جائے جس میں اللہ کا ذکر ہو۔ ﴿ وھو معلول ﴾ معلول اس لئے ہے کہ یہ روایت ھمام' ابن جریج' عن الزھری کے واسطہ سے روایت کرتا ہے' حالانکہ ابن جریج نے یہ روایت زہری سے نہیں سنی' بلکہ اس نے تو زیاد بن سعد کے واسطہ سے زھری سے سنا ہے اور اس کے الفاظ بھی دوسرے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے چاندی کی انگوٹھی بنوائی پھر اسے اتار دیا۔

حاصل کلام: اس روایت کو ابوداؤد نے معلول قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں "ہمام" راوی کو وہم ہوا ہے حالانکہ ابن معین ایسے نقاد حدیث نے اسے ثقہ قرار دیا ہے نیز یہ کہ اس حدیث کو ہمام کے علاوہ اور طرق سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ متن حدیث سے معلوم ہوا کہ بیت الخلاء وغیرہ ناپاک اور گندی جگہوں میں ایسی کوئی چیز لے کر دیدہ دانستہ داخل نہیں ہونا چاہئے جس پر اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ یا آیات قرآن مجید وغیرہ لکھی ہوئی ہوں۔

(۷۸) وعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ الخَلَاءَ قَالَ: «اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الخُبْثِ وَالخَبَائِثِ». أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ قضاء حاجت کیلئے بیت الخلا میں داخلہ کے وقت یہ دعا پڑھتے تھے "اللھم انی اعوذبک من الخبث والخبائث" اے اللہ! میں آپ کی پناہ پکڑتا ہوں' خبیث جنوں اور خبیث جنیوں سے۔ (اس کو ساتوں" یعنی بخاری' مسلم' احمد' ابو داؤد' نسائی' ابن ماجہ اور ترمذی)

لغوی تشریح: ﴿ اذا دخل ﴾ جب بیت الخلاء میں داخل ہونے کا ارادہ کرے۔ ﴿ الخبث ﴾ "خاء" اور

"باء" دونوں پر ضمہ۔ اور "با" پر سکون بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ خبیث کی جمع ہے۔ ﴿ الخبائث ﴾ خبیثۃ کی جمع ہے۔ اول کا معنی نر' شیطان اور ثانی کا معنی مادہ شیطان مراد ہے اور یہ بھی علم میں رہے کہ بیت الخلاء قسم کی جگہیں ایک کنارے یا دور بنائے جاتے ہیں اور متذکرہ دعا کے کلمات دخول سے پہلے پڑھنے چاہئیں بعد میں نہیں۔ ہاں اگر کھلی فضا ہو' تعمیر شدہ مکان میں بیت الخلاء نہ ہو تو رفع حاجت کیلئے نیچے بیٹھنے کیلئے کپڑا اٹھاتے وقت اس دعا کو پڑھنا چاہئے۔

حاصل کلام: گندے مقامات اور جگہوں پر گندگی سے انس رکھنے والے جنات بسیرا کرتے ہیں۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے قضائے حاجت کیلئے بیت الخلاء میں داخلہ سے پہلے دعا سکھائی ہے۔ انسان کی مقعد بھی چونکہ قضاء حاجت کے وقت گندی ہوتی ہے' اس لئے جنات انسان کو اذیت دیتے اور تکلیف پہنچاتے ہیں' ان سے محفوظ رہنے کیلئے دعا کی تعلیم دی۔

(۷۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَدْخُلُ الخَلَآءَ، فَأَحْمِلُ أَنَا وَغُلَامٌ نَحْوِي إِدَاوَةً مِنْ مَّاءٍ، وَعَنَزَةً فَيَسْتَنْجِيَ بِالْمَآءِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ قضاء حاجت کیلئے بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو میں اور ایک میرا ہم عمر لڑکا پانی کا ایک برتن اور ایک چھوٹا سا نیزہ لے کر ہمراہ جاتے۔ اس پانی سے آپؐ استنجا فرمایا کرتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اداوۃ ﴾ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ۔ چمڑے کا بنا ہوا چھوٹا سا برتن جس میں پانی ڈالا جاتا ہے۔ ﴿ من ماء ﴾ پانی سے بھرا ہوا۔ ﴿ وعنزۃ ﴾ منصوب۔ اداوۃ پر عطف کی وجہ سے۔ عین اور نون دونوں پر فتح۔ ایسا لمبا عصا جس کے نیچے لوہے کا پھل لگا ہوتا ہے یا پھر چھوٹا سا تیر بھی اس کے معنی کئے گئے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل نکلتے ہیں مثلاً اپنے سے کم عمر یا کم مرتبے والے سے خدمت لینا۔ پانی کے ساتھ استنجاء کرنا۔ نیز پانی سے استنجا کا افضل ہونا۔ ڈھیلا اور پانی دونوں سے استنجا کرنا تو افضل ترین ہے جیسا کہ جمہور علماء کا مذہب ہے۔

(۸۰) وَعَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُولُ اللهِ ﷺ: خُذِ الإِدَاوَةَ، فَانْطَلَقَ حَتَّى تَوَارَى عَنِّيْ، فَقَضَى حَاجَتَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے مجھے فرمایا "پانی کا برتن (ساتھ) لے چلو۔ چنانچہ آپؐ رفع حاجت کیلئے (اتنی دور) تشریف لے گئے کہ میری نظر سے اوجھل ہوگئے۔ وہاں آپؐ قضائے حاجت سے فارغ ہوئے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ تواری ﴾ چھپ گیا۔ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

حاصل کلام: آنحضرت ﷺ کا فعل اس پر دلالت کرتا ہے کہ قضائے حاجت کرنے والے کو پردہ کا انتظام کرنا چاہئے یا ایسی جگہ ہو جہاں سے اس کو کوئی دیکھ نہ سکے۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ''اگر رفع حاجت کھلی جگہ میں کرنا پڑے اور پردہ پوشی کیلئے کوئی اوٹ وغیرہ نہ ہو تو ریت یا مٹی وغیرہ جو چیز دستیاب ہو اسے اوٹ کیلئے استعمال کرے ورنہ شیطان اس کی مقعد کے ساتھ تمسخر کرے گا۔''

(۸۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اتَّقُوا اللاَّعِنَيْنِ، الَّذِي يَتَخَلَّى فِي طَرِيقِ النَّاسِ، أَوْ فِي ظِلِّهِمْ». رَوَاه مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو لعنت کا سبب بننے والی جگہوں سے اجتناب کرو۔ ایک لوگوں کے راستہ میں' دوسرا (ان کے بیٹھنے آرام کرنے کی) سایہ دار جگہ میں قضاء حاجت کرنے سے۔'' (مسلم)

وَزَادَ أَبُو دَاوُدَ عَنْ مُعَاذٍ: «وَالمَوارِدَ». وَلَفْظُه: «اتَّقُوا المَلاعِنَ الثَّلاَثَةَ، البَرَازَ فِي المَوَارِدِ، وَقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ، والظِّلِّ». ولأحمد عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهما: «أَوْ نَقْعِ مَآءٍ». وَفِيهِمَا ضَعْفٌ.

اور ابوداؤد نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے جو روایت کی ہے' اس میں اس طرح ہے کہ ''لعنت کے تین اسباب سے اجتناب کرو۔ گھاٹوں پر' شاہراہ عام پر اور سایہ کے نیچے رفع حاجت کرنے سے۔'' اور امام احمد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے جو روایت بیان کی ہے اس میں ہے ''جہاں پانی جمع ہوتا ہو وہاں بھی رفع حاجت سے بچنا چاہئے۔'' (یہ دونوں روایتیں ضعیف ہیں)

وَأَخْرَجَ الطَّبْرَانِيُّ: النَّهْيَ عَنْ قَضَاءِ الحَاجَةِ تَحْتَ الأَشْجَارِ المُثْمِرَةِ وَضَفَّةِ النَّهْرِ الجَارِي، مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عُمَرَ بِسَنَدٍ ضَعِيْفٍ.

اور طبرانی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جو روایت بیان کی ہے اس میں ہے کہ ''پھل دار و سایہ دار درخت کے نیچے اور جاری و ساری نہر کے کنارے پر قضاء حاجت نہ کرے۔'' (اس کی سند میں بھی ضعف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اتقوا ﴾ پرہیز کرو' اجتناب کرو۔ ﴿ لاعنین ﴾ لاعن سے تثنیہ ہے۔ مطلب ہے ان دو امور سے اجتناب کرو جو لعنت کا سبب بنتے ہیں۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ لاعن سے مراد صاحب لعن ہو۔ جیسے صاحب ابن کو لابن اور صاحب تمر کو ''تامر'' کہہ دیتے ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لاعن ملعون کے معنی میں ہو۔ ﴿ الذی یتخلی ﴾ جو قضائے حاجت سے فارغ ہوتا ہے۔ ﴿ فی طریق الناس ﴾ لوگوں کے عام آمدورفت کے راستہ میں۔ یہ لعنت زدگی کے اسباب میں سے ایک ہے اور دوسرا ﴿ اوفی ظلھم ﴾ وہ مقام و جگہ جہاں لوگ سایہ حاصل کرتے ہوں اور قیلولہ کیلئے استعمال میں لاتے ہوں اور

اپنے اترنے اور آرام کرنے کیلئے بیٹھنے کے طور پر استعمال کرتے ہوں اور اس سے مطلق سایہ مراد نہیں ہے کیونکہ جس سایہ کی لوگوں کو ضرورت نہ ہو وہاں قضاء حاجت میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں ہے۔ ﴿ الملاعن ﴾ ملعن کی جمع "میم" پر فتح۔ ایسی جگہیں اور مقامات جو لعنت کا موجب ہوں۔ ﴿ الثلاثة ﴾ منصوب ہے' ملاعن کی صفت ہونے کی بنا پر۔ ﴿ البراز ﴾ "باء" پر فتحہ اصل میں تو کھلی اور وسیع جگہ کو کہتے ہیں 'مگر یہ ﴿ الغائط ﴾ یعنی پیٹ سے بذریعہ مقعد خارج ہونے والا فضلہ سے کنایہ ہے۔ اگر البراز کو منصوب پڑھیں تو اس صورت میں ملاعن سے بدل ہوگا اور اگر اسے مرفوع پڑھیں تو پھر یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ ﴿ فی الموارد ﴾ مورد کی جمع ہے۔ اس جگہ یا مقام' چشمہ یا نہروغیرہ کو کہتے ہیں جہاں لوگ پانی پینے یا پلانے یا وضو اور غسل وغیرہ کیلئے حصول پانی کیلئے جاتے ہیں (جنہیں گھاٹ کہتے ہیں) ﴿ قارعة الطریق ﴾ ایسے کھلے راستہ کو کہتے ہیں جہاں سے لوگ گزرتے ہوں اور اپنے جوتے' پاؤں اور چوپایوں کے ذریعے اسے پامال کرتے ہیں۔ ﴿ او نقع ماء ﴾ نون پر فتح اور قاف ساکن۔ جمع شدہ اور روکا ہوا پانی۔ ﴿ فیهما ضعف ﴾ دونوں سے۔ مراد ہے' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی دونوں روایات ضعیف ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت تو اس وجہ سے ضعیف ہے کہ اس کو ابو سعید حمیری' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے حالانکہ وہ ان کو ملا تک نہ تھا' لہٰذا یہ روایت منقطع ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی روایت کے ضعیف ہونے کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی سند میں ایک راوی ابن لھیعہ ہے جب اس کی کتابیں خاکستر ہو گئیں تو اس نے روایات کو خلط ملط کرنا شروع کر دیا اور دوسرا سبب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو راوی روایت کرتا ہے وہ مبہم ہے' اس کا نام نہیں لیا گیا۔ ﴿ تحت الاشجار المثمرة ﴾ پھل دار درختوں کے نیچے گندگی کرنے سے مطلب ہے جو پھل پک کر نیچے گرے وہ گندگی سے ملوث ہو کر گندا ہو جائے گا جو کھانے اور استعمال کرنے کے قابل نہ رہے گا۔ یہاں سے گزرنے والا نادانستگی میں انہیں اٹھائے یا کسی اور ضرورت و حاجت کیلئے یہاں سے گزرے تو ان گندگیوں سے اذیت پائے گا۔ ﴿ ضفة النهر ﴾ ضاد پر فتحہ اور "فاء" پر تشدید۔ کنارے اور ساحل کو کہتے ہیں اور اس کا سبب بھی وہی ہے کہ لوگ اس سے اذیت و تکلیف اٹھائیں گے۔ ﴿ بسند ضعیف ﴾ اس کی سند میں فرات بن سائب متروک راوی ہے۔ اس وجہ سے یہ ضعیف ہے۔

حاصل کلام : ان احادیث میں قضائے حاجت کے آداب کی تعلیم دی گئی ہے۔ پانچ مقامات اور جگہیں ایسی ہیں جہاں رفع حاجت کرنے کی ممانعت ہے وہ یہ ہیں: عام راستہ پر' سایہ دار درخت کے نیچے' پانی کے گھاٹ پر' پھل دار درخت کے نیچے' رواں دواں نہر کے کنارے۔ شارع عام پر عموماً رفع حاجت ممنوع ہے البتہ جو متروک ہو چکا ہو عام گزرگاہ نہ رہی ہو تو وہاں گنجائش ہے۔

راوی حدیث : ﴿ معاذ ﴾ انصاری تھے۔ قبیلہ خزرج سے تعلق تھا' بڑے معزز اور بزرگ فقہاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ بیعت عقبہ اور غزوۂ بدر وغیرہ میں شریک ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کا والی

(گورنر) بنایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے بعد شام کا والی مقرر کیا۔ ۱۷ھ میں طاعون عمواس میں اور ایک قول کے مطابق ۱۸ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۳۸ سال تھی۔

(۸۲) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا تَغَوَّطَ الرَّجُلاَنِ فَلْيَتَوَارَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا عَنْ صَاحِبِهِ، وَلاَ يَتَحَدَّثَا، فَإِنَّ اللَّهَ يَمْقُتُ عَلَى ذَلِكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ السَّكَنِ وَابْنُ القَطَّانِ، وَهُوَ مَعْلُولٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب دو آدمی قضاء حاجت کریں تو ان کو ایک دوسرے سے پردہ میں ہونا چاہئے اور اس حالت میں ایک دوسرے سے باہم گفتگو بھی نہ کریں۔" اس لئے کہ ایسے فعل پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔ (اس روایت کو احمد نے روایت کیا ہے اور ابن سکن اور ابن قطان نے اسے صحیح قرار دیا ہے مگر یہ حدیث معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿ تغوط ﴾ قضاء حاجت کیلئے نکلے اور اپنی حاجت پوری کی۔ ﴿ فليتوار ﴾ اس میں لام امر کا ہے اور "راء" پر فتح ہے۔ معنی ہے کہ چھپنا چاہئے' پردہ میں ہونا چاہئے۔ ﴿ ولا يتحدثا ﴾ قضاء حاجت کے وقت دونوں کو بات چیت نہیں کرنی چاہئے۔ ﴿ يمقت ﴾ مقت سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوتا ہے۔ ﴿ على ذلك ﴾ دونوں کے مابین آڑ اور پردہ کا نہ ہونا اور رفع حاجت کی صورت میں بات چیت کرنا مراد ہے۔ ﴿ وهو معلول ﴾ کہا گیا ہے کہ اس حدیث میں علت یہ ہے کہ اسے عکرمہ بن عمار نے یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کیا ہے۔ عکرمہ منفرد ہے اور اس کی یحییٰ سے روایت میں کلام ہے۔ البتہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے۔

حاصل کلام: علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو عکرمہ بن عمار عن یحییٰ بن ابی کثیر کی وجہ سے معلول قرار دیا ہے' اس لئے کہ یہ راوی ان کے نزدیک معلول ہے' حالانکہ عکرمہ کی روایت کو امام مسلم نے قبول کیا ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس سے استشہادا روایت کی ہے۔ یہ حدیث واضح ثبوت ہے اس کا کہ قابل ستر اعضاء کو چھپانا واجب ہے نیز قضاء حاجت یعنی بول و براز کے وقت باہم گفتگو کرنا حرام ہے۔ اس لئے ایسے فعل پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور بغض شدید کی صورت میں وعید فرمائی گئی ہے اگر یہ فعل بقول بعض کے مکروہ ہوتا تو اتنی سخت وعید کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسے موقع پر حضور ﷺ سے سلام کا جواب چھوڑنا بھی عملاً ثابت ہے جو اس کا مؤید ہے۔

(۸۳) وَعَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: «لاَ يَمَسَّنَّ أَحَدُكُمْ ذَكَرَهُ بِيَمِينِهِ وَهُوَ يَبُولُ، وَلاَ يَتَمَسَّحْ مِنَ الخَلاَءِ

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ "تم میں سے کوئی بھی پیشاب کرتے وقت دائیں ہاتھ سے اپنے عضو مخصوص کو ہرگز نہ چھوئے اور قضاء حاجت کے بعد سیدھے

بِيَمِينِهِ، وَلاَ يَتَنَفَّسْ فِي الإِنَآءِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

ہاتھ سے استنجا بھی نہ کرے نیز پانی پیتے وقت اس میں سانس بھی نہ لے۔" (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ لا یمسن ﴾ مس سے نہی کا صیغہ ہے اور نون ثقیلہ تاکید کیلئے ہے۔ ﴿ ولا یتمسح ﴾ یعنی استنجاء نہ کرا اور ﴿ تمسح ﴾ کے معنی ہیں ہاتھ کو بہنے والی چیز کے ساتھ ملنا یا پھیرنا کہ گندگی دور ہو جائے یا ناپاک چیز سے لتھڑی ہو' اسے ہاتھ سے صاف کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دو مسئلے بیان کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے سیدھے ہاتھ سے اپنے عضو مخصوص کو پیشاب کرتے ہوئے نہ چھوئے اور نہ پکڑے۔ ایسا کرنا حرام بھی ہے اور سوء ادب بھی اور کم ظرفی بھی اور دوسرا کوئی مشروب وغیرہ پیتے وقت برتن میں سانس لینا۔ برتن میں سانس لینا اس لئے ممنوع ہے کہ سانس کے ذریعہ خارج ہونے والے جراثیم پیئے جانے والے مشروب وغیرہ میں شامل ہو کر معدہ میں داخل ہوں گے۔ یہ جراثیم طبی تحقیق کی رو سے صحت کیلئے نقصان دہ اور ضرر رساں ہیں۔ جس حدیث میں سانس لینے کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ پینے والا ایک ہی سانس میں غٹ غٹ نہ چڑھا جائے بلکہ تین دفعہ پیئے اور سانس باہر نکالے۔

(٨٤) وعَنْ سَلْمَانَ رَضِي اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَقَدْ نَهَانَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَن نَسْتَقْبِلَ القِبْلَةَ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ، أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِاليَمِيْنِ، أَوْ أَن نَسْتَنْجِيَ بِأَقَلَّ مِنْ ثَلاَثَةِ أَحْجَارٍ أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيْعٍ أَوْ عَظْمٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا کہ ہم قضاء حاجت اور پیشاب کے وقت قبلہ رخ ہوں یا دائیں ہاتھ سے استنجا کریں یا تین ڈھیلوں سے کم سے استنجا کریں یا گوبر' لید اور ہڈی سے استنجا کریں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ نستنجی ﴾ الاستنجاء سے ماخوذ ہے۔ یعنی پتھر یا پانی سے گندگی کو دور کرنا۔ اور ﴿ النجو ﴾ اس گندگی کو کہتے ہیں جو مقعد سے خارج ہوتی ہے۔ ﴿ الرجیع ﴾ لید یا گوبر۔

راوی حدیث: ﴿ سلمان رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابو عبداللہ ہے۔ اصل میں ان کا تعلق فارس سے تھا۔ دین (حق) کی تلاش میں گھر سے نکلے اور نصرانی (عیسائی) بن گئے۔ پھر مدینہ میں منتقل ہوگئے۔ مدینہ میں آتے ہی نبی ﷺ پر ایمان لے آئے۔ سلمان الخیر ان کا لقب تھا۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اسے بڑی اچھی طرح نبھایا۔ ان کے خلوص اور محبت دین کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان کے حق میں ارشاد فرمایا کہ "سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو مدائن کا والی مقرر کیا۔ محنت مزدوری کر کے جو کچھ کماتے اسے راہ للہ میں خیرات کر دیتے۔ ۳۲ھ کو وفات پائی۔ ان کی عمر ۲۵۰ یا ۳۵۰ برس تھی۔

(٨٥) وَلِلسَّبْعَةِ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

أَيُّوبَ: لاَ تَسْتَقْبِلُوا القِبْلَةَ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ، وَلاَ تَسْتَدْبِرُوهَا، وَلٰكِنْ شَرِّقُوا أو غَرِّبُوا.

"قضاء حاجت اور پیشاب کرتے وقت قبلہ رخ نہ بیٹھو اور نہ اس کی طرف پشت کرو بلکہ مشرق یا مغرب کی جانب کرو۔" اس کو ساتوں (یعنی امام بخاری' مسلم' احمد' ابوداوٗد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لاتستدبروها ﴾ اس کی طرف اپنی پشت بھی نہ کرو۔ ﴿ ولکن شرقوا اوغربوا ﴾ تشریق تغریب سے امر کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قضاء حاجت کے وقت اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرو۔ یہ خطاب اہل مدینہ سے ہے۔ ان کا قبلہ بجانب جنوب پڑتا ہے۔ اہل مدینہ یا اسی طرح کے دوسرے لوگ جن کا قبلہ جنوب یا شمال میں پڑے گا وہ اپنے رخ مشرق یا مغرب کی طرف کریں گے اس طرح استقبال اور استدبار دونوں سے بچ جائے گا اور جن کا قبلہ مشرق یا مغرب ہوگا تو وہ اپنا رخ شمال یا جنوب کی طرف کریں گے۔ استقبال و استدبار قبلہ سے بچنے کیلئے اہل مدینہ کو مشرق اور مغرب کا رخ کرنے کا حکم اسی وجہ سے دیا گیا ہے۔ حکم کا دارومدار اسی پر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ﴿ لا تستقبلوا ولا تستدبروها ﴾ کا حکم نہی ایسی جگہ کیلئے ہے جہاں کوئی اوٹ وغیرہ نہ ہو اور کھلا میدان ہو۔ گھروں میں جہاں آدمی کے سامنے دیوار وغیرہ حائل ہو تو وہاں کیلئے یہ حکم نہیں ہے جیسا کہ مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے واضح ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں اپنی ہمشیرہ حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما کے حجرہ کی چھت پر کسی ذاتی ضرورت کیلئے چڑھا تو (کیا دیکھتا ہوں) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضاء حاجت فرما رہے تھے اور اس وقت آپؐ کا رخ شام کی طرف تھا اور پشت بیت اللہ کی جانب۔ مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قضاء حاجت کے وقت اپنا رخ قبلہ کی طرف نہ کرے اور نہ پشت۔ یہ حکم تو اہل مدینہ کیلئے مخصوص ہے اس لئے کہ ان کیلئے قبلہ جنوب کی طرف پڑتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ ﴾ ابوایوب ان کی کنیت ہے' ان کا نام خالد بن زید بن کلیب ہے۔ مدینہ میں تشریف آوری کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی ان کے دولت کدہ پر فروکش ہوئی تھی۔ آپ کا شمار کبار اور اکابر صحابہ میں ہوتا ہے۔ غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ ارض روم میں جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ (۵۰ھ میں) ان کی قبر دیوار قسطنطنیہ کے زیر سایہ ہے۔

(٨٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تعالى عنها، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: مَنْ أَتَى الغَائِطَ فَلْيَسْتَتِرْ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو قضاء حاجت کیلئے جائے اسے پردہ کر کے بیٹھنا چاہیئے۔" (ابوداوٗد)

(٨٧) وعَنْهَا رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَنَّ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا خَرَجَ مِنَ الغَائِطِ قَالَ: «غُفْرَانَكَ». أَخرَجَهُ الخمسة وصححه أَبُو حَاتِمٍ وَالحَاكِمُ.

جب قضاء حاجت سے فارغ ہو کر بیت الخلاء سے باہر آتے تو "غفرانک" فرماتے (اے اللہ! تیری بخشش اور پردہ پوشی مطلوب ہے) (اس روایت کو پانچوں احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے' ابوحاتم اور حاکم دونوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ غفرانک ﴾ منصوب واقع ہوا ہے' فعل محذوف ہے۔ معنی یہ ہیں کہ میں بخشش طلب کرتا ہوں یا پھر مصدر بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں مجھے بخش دے اچھی طرح بخشنا۔

(٨٨) وعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَتَى النَّبِيُّ ﷺ الغَائِطَ، فَأَمَرَنِي أَنْ آتِيَهُ بِثَلاثَةِ أَحْجَارٍ، فَوَجَدْتُ حَجَرَيْنِ، وَلَمْ أَجِدْ ثَالِثاً، فَأَتَيْتُه بِرَوْثَةٍ، فَأَخَذَهُمَا وَأَلْقَى الرَّوْثَةَ، وَقَالَ: «إِنَّها رِكْسٌ». أَخرَجَهُ البُخَارِيُّ. وَزَادَ أَحْمَدُ وَالدَّارَقُطْنِيُّ «ائتنِي بِغَيْرِها».

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ قضاء حاجت کو چلے تو مجھے حکم دیا کہ میں ان کیلئے تین پتھر لے آؤں۔ مجھے دو پتھر تو مل گئے تیسرا نہ مل سکا۔ میں (مجبوراً گوبر کا ایک خشک ٹکڑا لے آیا۔ آپؐ نے دونوں پتھر تو لے لئے اور گوبر کے خشک ٹکڑے کو دور پھینک دیا اور فرمایا "یہ تو بذات خود پلیدی ہے۔" (اسے بخاری نے روایت کیا ہے) احمد اور دارقطنی نے اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ "اس کی بجائے اور لے آؤ۔"

لغوی تشریح: ﴿ بروثة ﴾ چوپائے جانور کا گوبر یا لید۔ ابن خزیمہ نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ وہ گدھے کی لید تھی۔ ﴿ رکس ﴾ "را" پر کسرہ "کاف" ساکن۔ نجاست اور گندگی و پلیدی۔ ﴿ ائتنی بغیرها ﴾ "اتیان" سے امر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قضاء حاجت کے بعد مقعد کی صفائی کیلئے تین پتھر استعمال کرنا واجب ہے۔ خواہ صفائی اس سے کم ہی سے حاصل ہو جائے اور اگر تین سے بھی مطلوب صفائی حاصل نہ ہو تو پھر مزید بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ البتہ ان کی تعداد طاق ہونی چاہئے۔ (یعنی پانچ' سات علی هذا القیاس) آج کل ٹشو پیپر سے بھی صفائی ہو سکتی ہے۔ اس کی تعداد بھی اتنی ہی ہونی چاہئے۔

حاصل کلام: اس سے ثابت ہوا کہ جو چیز خود ناپاک و نجس ہو اس سے طہارت حاصل نہیں ہو سکتی للذا ان سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ تعداد کے ساتھ صفائی بھی مشروط ہے۔ خواہ تعداد میں اضافہ ہی کرنا پڑے۔

راوی حدیث: ﴿ ابن مسعود ﴾ نام ان کا عبداللہ تھا۔ بزرگ اور نہایت عقلمند و دانش مند فقہاء صحابہ کرامؓ میں شمار ہوتے تھے۔ غزوۂ بدر اور دیگر معرکوں میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کے خادم

خاص تھے۔ حضر و سفر کے ساتھی تھے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ کا تقرب حاصل تھا۔ صاحب النعلین تھے۔ ان کے مناقب و فضائل بے شمار ہیں۔ مدینہ منورہ میں ۳۲ھ میں فوت ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ساٹھ برس کی تھی۔

(۸۹) وعَنْ أَبِيْ هُرَيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهى أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِعَظْمٍ أَوْ رَوْثٍ، وَقَالَ: «إِنَّهُمَا لاَ يُطَهِّرَانِ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَحَّحَهُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ہڈی اور گوبر سے استنجا کرنے سے منع فرمایا ہے' ساتھ ہی فرمایا کہ "یہ دونوں پاک نہیں کر سکتے۔" (دار قطنی نے اسے روایت کیا ہے اور صحیح بھی قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ انهما لا يطهران ﴾ (یہ دونوں پاک نہیں کر سکتے) گوبر اس وجہ سے پاک نہیں کر سکتا کہ وہ خود نجس و ناپاک ہے اور ہڈی میں چکناہٹ ہوتی ہے۔ اس سے نجاست کی صفائی نہیں ہو سکتی اور تری کو خشک نہیں کر سکتی ہے اور ان کے استعمال سے منع کا سبب نبی کریم ﷺ نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ جنوں کا طعام ہے اور ﴿ روث ﴾ ان کے جانور کا چارہ ہے۔ ایک چیز کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں ان میں باہمی کوئی منافات نہیں ہے۔

حاصل کلام: امام بیہقی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ یارسول اللہ! ہڈی اور گوبر سے استنجا نہ کرنے کی کیا حکمت ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نصیبین کے علاقہ سے جنوں کا ایک وفد میرے پاس آیا اور انہوں نے مجھ سے خوراک کے متعلق استفسار کیا۔ تو اللہ رب العزت کے حضور دعا کی کہ یا اللہ! ان کو ہڈیوں اور گوبر وغیرہ سے خوراک دستیاب ہوتی رہے۔ لہٰذا (دعا قبول ہوئی) یہ ان کی خوراک ہے' اسے گندا نہ کرو۔ بظاہر تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہڈی اور لید بذات خود ان کی خوراک ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں بلکہ قدرتی طور پر ان کے اوپر کوئی غیر مرئی کھانے والی چیز پیدا ہوتی ہے جو ان کی خوراک ہوتی ہے جسے یہ جنات کھانے کے طور پر استعمال کرتے ہیں گویا دونوں ان کی خوراک کی پیدائش کا مقام ہیں۔

(۹۰) وعَنْ أَبِي هُرَيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اسْتَنْزِهُوا مِنَ البَوْلِ، فَإِنَّ عَامَّةَ عَذَابِ القَبْرِ مِنْهُ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَلِلْحَاكِمِ: «أَكْثَرُ عَذَابِ القَبْرِ مِنَ البَولِ» وَهُوَ صَحِيْحُ الإِسْنَادِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "پیشاب (کی چھینٹوں) سے بچو۔ اکثر عذاب قبر اسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔" (دار قطنی نے اسے روایت کیا ہے) اور حاکم کی روایت میں ہے اکثر عذاب قبر پیشاب کی وجہ سے ہوتا ہے۔ (اس کی سند صحیح ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ استنزهوا ﴾ اجتناب کرو۔ بچو۔ ﴿ منه ﴾ میں من تعلیلیہ ہے۔ مطلب یہ ہوا۔ پیشاب

سے پرہیز اور اجتناب نہ کرنے کی وجہ سے۔

(۹۱) وعَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: عَلَّمَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي الخَلاَءِ أَنْ نَقْعُدَ عَلَى اليُسْرَى ونَنْصِبَ اليُمْنَى. رَوَاهُ البَيْهَقِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قضاء حاجت کی تعلیم دیتے ہوئے ہمیں فرمایا کہ ”ہم بائیں پاؤں پر وزن دے کر بیٹھیں اور دائیں کو کھڑا رکھیں (اس پر بوجھ کم ڈالیں)“ (اس کو بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿علمنا﴾ تعلیم سے ماخوذ ہے' صیغہ غائب ہے۔ ”نا“ ضمیر متکلم جمع کی ہے اور مفعول واقع ہو رہا ہے۔ ﴿فی الخلاء﴾ قضاء حاجت کے آداب کے بارے میں۔ ﴿ننصب﴾ نصب سے ماخوذ ہے۔ کسی چیز کو کھڑے کرنے' قائم کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ بسند ضعیف اس لئے کہ اس کی سند میں ایک غیر معروف راوی ہے۔

حاصل کلام: حکیم کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہے۔ وہ حکمت خواہ کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے بائیں پاؤں پر بیٹھنے کا حکم دیا ہے اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کا معدہ بائیں طرف ہوتا ہے۔ بائیں پاؤں پر' بیٹھنے سے اخراج فضلہ میں سہولت اور آسانی ہوتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿سراقہ﴾ سین پر ضمہ۔ سراقہ بن مالک بن جعشم' جعشم جیم پر ضمہ' عین ساکن اور شین پر ضمہ۔ قبیلہ مدلج میں سے تھے' اس لئے مدلجی کہلائے۔ ابوسفیان ان کی کنیت تھی۔ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ یہ وہی شخص ہے جو ہجرت کے موقع پر نبی ﷺ کو انعام کے لالچ میں گرفتار کرنے کیلئے آپؐ کے تعاقب میں نکلا اور جب آپؐ کے قریب پہنچا تو اس کا گھوڑا گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا تھا۔ تو اس نے امان طلب کی۔ آپؐ نے امان دے دی۔ ۲۴ھ میں وفات پائی۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔

(۹۲) وَعَنْ عِيسَى بْنِ يَزْدَادَ (يُزْدَادَ) عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا بَالَ أَحَدُكُم فَلْيَنْتُرْ ذَكَرَهُ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ». رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت عیسیٰ بن یزداد نے اپنے والد سے روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے جب کوئی پیشاب کرے تو عضو مخصوص کو تین مرتبہ جھاڑ لے۔“ (اسے ابن ماجہ نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فلینتر﴾ ”نتر“ سے ماخوذ ہے۔ جو کچھ ناک کے اندر ہو اسے جھاڑ کر نکالنا۔ اس کی سند میں ضعف ہے۔ یہ روایت مرسل ہے کیونکہ ”یزداد“ صحابی نہیں بلکہ مجہول راوی ہے اس کا بیٹا عیسیٰ بھی مجہول ہے۔

حاصل کلام: پیشاب سے فراغت کے بعد عضو مخصوص کو تین مرتبہ سونتنا یا جھاڑنا اس لئے ہے کہ اگر قابل

خارج قطرۂ پیشاب کہیں رک گیا ہو تو وہ خارج ہو جائے اور پوری طرح اطمینان ہو جائے۔ یہ روایت گو ضعیف ہے مگر پیشاب کے قطروں سے محفوظ رہنے کی روایت اس کی مؤید ہے۔ جس میں ذکر ہے کہ عذاب قبر اس لئے ہو رہا ہے کہ پیشاب کے قطروں سے بچتے نہ تھے۔

راوی حدیث: ﴿عیسی بن یزداد﴾ یہ دونوں باپ بیٹا مجہول ہیں۔ ابن معین کہتے ہیں کہ عیسیٰ اور اس کے باپ کی کوئی جان پہچان نہیں ہے۔ عقیلی کہتے ہیں۔ ان کی متابعت نہیں کی گئی اور نہ ہی ان کا تعارف ہے۔ یزداد کو باء کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

(۹۳) وعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله تعالى عَنْهما، أَنَّ النَّبيَّ ﷺ سَأَلَ أَهْلَ قُبَآءٍ فَقَالَ: **إِنَّ اللَّهَ يُثْنِي عَلَيكُمْ**. فَقَالُوا: إِنَّا نُتبعُ الحِجارَةَ الماءَ. رَوَاهُ البَزَّارُ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ. وَأَصْلُه فِي أَبِي دَاوُدَ وَالتِّرمِذِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، بِدُوْنِ ذِكْرِ الحِجَارَةِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اہل قباء سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری (پاکیزگی کے بارے میں) بڑی تعریف فرمائی ہے' اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم ڈھیلوں کے استعمال کے بعد مزید طہارت کیلئے پانی بھی استعمال کرتے ہیں۔ (اسے ضعیف سند کے ساتھ بزار نے روایت کیا ہے۔ اس کی اصل ابوداؤد اور ترمذی میں موجود ہے (اسی سلسلے میں) ابن خزیمہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے البتہ اس میں ڈھیلوں کا ذکر نہیں ہے)

لغوی تشریح: ﴿اهل قباء﴾ سال فعل کا مفعول ہے اور قباء قاف پر ضمہ اور آخر پر الف ممدودہ اور کسرہ کے ساتھ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مذکر ہے اور منصرف ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مؤنث غیر منصرف ہے مدینہ کے جنوب میں تین میل کے فاصلہ پر ایک مشہور مقام کا نام ہے۔ ﴿یثنی علیکم﴾ یعنی اللہ رب العزت نے اپنے اس قول کے ساتھ تمہاری تعریف کی ہے کہ ﴿ فیه رجال یحبون ان یتطهروا والله یحب المطهرین ﴾ (۹:۱۰۸) ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو طہارت کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔ ﴿نتبع الحجارة الماء﴾ یعنی پہلے ہم پتھر سے استنجاء کرتے ہیں پھر اس کے بعد پانی سے صفائی حاصل کرتے ہیں اور ﴿نتبع﴾ باب افعال سے ہے اور ﴿الحجارة اس کا مفعول اول ہے ﴿الماء﴾ مفعول ثانی ہے۔ ﴿بسند ضعیف﴾ سے مراد ہے کہ چونکہ بزار نے محمد بن عبدالعزیز زھری سے روایت کیا ہے اور وہ ضعیف ہے اسی طرح اس سند میں عبداللہ بن شبیب بھی ضعیف راوی ہے۔

حاصل کلام: مسند بزار کی روایت اس لئے ضعیف ہے کہ اس کی سند کے دو راوی محمد بن عبدالعزیز اور عبداللہ بن شبیب ضعیف ہیں۔ "قباء" مدینہ طیبہ سے تین میل بجانب جنوب ہے۔ ہجرت کے موقعہ پر آپؐ نے پہلے یہیں قیام فرمایا تھا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ استنجاء میں ڈھیلے کے ساتھ پانی استعمال کرنا افضل ہے۔

٨ - بَابُ الغُسلِ وَحُكْمُ الجُنُبِ غسل اور جنبی کے حکم کا بیان

(٩٤) عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «المَاءُ مِنَ المَاءِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَأَصْلُهُ فِي البُخَارِيِّ.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "پانی کا استعمال خروج پانی سے ہے۔" (یعنی جب تک منی کا خروج نہ ہو اس وقت تک غسل واجب نہیں ہوتا۔) (اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور اصل روایت بخاری میں بھی ہے)

لغوی تشریح: ﴿الماء من الماء﴾ اس میں "من" تعلیل کا ہے اور بعض روایات میں ﴿انما الماء من الماء﴾ کلمہ حصر کے ساتھ۔ پہلے ماء سے معروف پانی مراد ہے اور دوسرے "ماء" سے منی مراد ہے۔ معنی یہ ہے کہ پانی کے ساتھ غسل اس وقت واجب ہوگا جب انزال ہو اور منی خارج ہو جائے۔ کوئی آدمی جب اپنی بیوی کے ساتھ اکٹھے لیٹ جائے اور وہ عمل کرے جس سے منی کا خروج ہو تو غسل ضروری ہوگا اگر اتنے عمل کے باوجود بھی منی کا خروج نہ ہو تو غسل واجب نہیں ہوتا۔ اس میں جماع اور احتلام دونوں شامل ہیں۔ روایات میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ حکم جماع کے بارے میں وارد ہے۔ اس کا مقتضایہ ہے کہ اگر ایک آدمی جماع تو کرتا ہے مگر انزال نہیں ہوا تو اس پر غسل واجب نہیں۔ ابتداء اسلام میں حکم اسی طرح تھا مگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث جو آگے آرہی ہے اور دیگر روایات سے یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ اب صرف جماع سے غسل واجب ہوتا ہے' انزال ہوا ہو یا نہ ہو۔ احتلام کے بارے میں یہ حدیث وارد نہیں ہوئی' مگر الفاظ چونکہ عام ہیں اس لئے یہ بھی اس میں شامل ہے اور وہ یہ کہ احتلام میں بھی جب تک انزال نہ ہو غسل واجب نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: اس حدیث کو احتلام کے بارے میں سمجھا گیا ہے جماع سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کے آغاز میں یہ حکم بھی تھا کہ جماع سے اس وقت غسل فرض ہوتا ہے جب آدمی کو انزال ہو۔ لیکن کچھ مدت بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ قاضی ابن عربی نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ مرد و عورت کے اعضاء مخصوص ایک دوسرے سے ملاپ کرلیں تو غسل واجب ہو جاتا ہے خواہ انزال کی نوبت پیش نہ آئی ہو۔

(٩٥) وعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا جَلَسَ أَحَدُكُمْ بَيْنَ شُعَبِهَا الأَرْبَعِ ثُمَّ جَهَدَهَا، فَقَدْ وَجَبَ الغُسْلُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ: «وَإِنْ لَمْ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کہ جب تم میں سے کوئی عورت کی چار شاخوں کے درمیان میں بیٹھے پھر اپنی پوری کوشش کر لے تو اس پر غسل واجب ہوگیا۔" (بخاری و مسلم) اور مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ

يُنْزِلْ». "خواہ انزال نہ ہوا ہو۔"

لغوی تشریح: ﴿اذاجلس﴾ یعنی مرد جب بیٹھ جائے ﴿بین شعبها﴾ عورت کی شاخوں میں۔ ﴿شعب﴾ شعبہ کی جمع ہے۔ شین پر ضمہ ہے عین پر فتحہ۔ درخت کی شاخ کیلئے استعمال ہوتا ہے یا کسی چیز کا کچھ حصہ بھی اس سے مراد لیا جاتا ہے۔ عورت کی چار شاخوں سے مراد اس کے دو بازو اور دو پاؤں یعنی ٹانگیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد عورت کے پاؤں اور رانیں ہیں اور یہ بھی ایک قول ہے کہ اس سے عورت کی دونوں پنڈلیاں اور دونوں رانیں مراد ہیں۔ جو بھی مراد ہو مقصود اس سے عورت سے جماع سے کنایہ ہے اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ﴿والزق الختان الختان﴾ بھی مروی ہے۔ (عضو مخصوص کے عورت کی شرم گاہ سے ملاپ پر غسل واجب ہو جاتا ہے) ﴿ثم جهدها﴾ اس میں کنایہ ہے مرد کے عضو مخصوص کا عورت کی شرم گاہ میں دخول سے۔

حاصل کلام: مرد کا عضو مخصوص جب عورت کی شرم گاہ میں داخل ہو جائے خواہ حشفہ ہی غائب ہو ایسی صورت میں غسل واجب ہو جاتا ہے۔ خلفاء اربعہ' ائمہ اربعہ کے علاوہ اکثر صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام کا یہی مذہب ہے۔ اس کو جماع پر محمول کیا جائے تو اس حدیث کو پہلی حدیث کا ناسخ سمجھا جائے گا۔

(٩٦) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ أُمَّ سُلَيْمٍ - وَهِيَ امْرَأَةُ أَبِي طَلْحَةَ - قَالَتْ: يا رسولَ اللهِ! إِنَّ اللَّهَ لاَ يَسْتَحيِي مِنَ الحَقِّ، فَهَلْ عَلَى المَرأَةِ مِنْ غُسْلٍ إِذَا احْتَلَمَتْ؟ قَالَ: «نَعَمْ، إِذَا رَأَتِ المَاءَ»، الحديث مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ام سلیم ابوطلحہ کی اہلیہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ (ﷺ)! اللہ تعالیٰ حق بیان کرنے سے حیاء نہیں کرتا تو بتائیں کیا عورت کو جب احتلام ہو جائے تو اس پر بھی غسل فرض ہے؟ فرمایا "ہاں! جب وہ پانی دیکھے" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لا يستحيى من الحق﴾ "حاء" کے بعد دو یاء ہیں "حاء" اس میں ساکن ہے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ حق کے بیان کرنے سے رکتا اور حیا کی بناپر اسے ترک نہیں کرتا۔ اسی طرح جن مسائل کے دریافت کرنے کی مجھے ضرورت و احتیاج ہے ان سے میں رک نہیں سکتی۔ ساتھ ہی مزید کہا۔ ایسے ہی مسائل جن کو دریافت کرنے سے عورتیں عموماً شرماتی ہیں اور عذر پیش کرتی ہیں۔ ﴿اذا احتلمت﴾ جب اسے احتلام ہو جائے ایک دوسری روایت میں ﴿اذارات ان زوجها يجامعها فى المنام﴾ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ یعنی جب وہ دیکھے کہ خواب میں اس کا شوہر اس سے زن و شو کے تعلقات کئے ہوئے ہے۔ ﴿اذرات الماء﴾ جب نیند سے بیدار ہو تو منی دیکھے۔

راوی حدیث: ﴿ام سلیم رضی اللہ عنہا﴾ ان کا نام رمیصاء یا غمیصاء بنت ملحان تھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ فاضلہ و عالمہ خاتون تھیں۔ مالک بن نضر کی زوجیت میں تھیں۔ یہ مسلمان ہو گئیں۔ اس نے اپنے

خاوند کے سامنے اسلام پیش کیا۔ اس وجہ سے ناراض ہو کر شام کی طرف بھاگ گیا اور فوت ہو گیا۔ مالک بن نصر کی وفات کے بعد ابو طلحہؓ نے ان کو پیغام نکاح دیا۔ ابو طلحہؓ ابھی مشرک تھے۔ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے شرط پیش کی کہ اسلام قبول کر لو تو میں تمہارے ساتھ نکاح کر لوں گی۔ اس شرط کو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے قبول کیا اور مسلمان ہو گئے تو ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ان سے نکاح کر لیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔

(۹۷) وعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فِي المَرأَةِ تَرَى فِي مَنَامِها مَا يَرَى الرَّجُلُ، قال: **تَغْتَسِلُ**. مُتَّفَقٌ عَلَيْه، وَزَادَ مُسْلِمٌ: «فَقَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ: وَهَل يَكُونُ هَذا؟ قَالَ: «نَعَمْ، فَمِنْ أَيْنَ يَكُونُ الشَّبَهُ؟».

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کے متعلق فرمایا جو خواب میں وہی کچھ دیکھے جو ایک نوجوان مرد دیکھتا ہے (احتلام) کہ وہ غسل کرے۔ (بخاری و مسلم)
اور مسلم نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کے جواب دینے پر مزید دریافت کیا' کیا ایسا (عورت) کے ساتھ بھی ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں' اگر ایسا نہ ہوتا تو مشابہت کہاں سے ہوتی۔"

لغوی تشریح: ﴿ما یری الرجل﴾ اس سے مراد ہے احتلام۔ ﴿فمن این یکون الشبہ؟﴾ شبہ میں شین پر کسرہ ہے اور "با" ساکن ہے اور دونوں پر فتحہ بھی جائز ہے۔ مماثلت کے معنی ہیں اور اس میں (این) استفہامیہ ہے جو دراصل حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے اس خیال کی تردید کیلئے ہے کہ آیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے۔ گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ بچہ کبھی باپ سے مشابہت رکھتا ہے اور کبھی ماں سے اور ننھیال سے اور یہ اسی صورت میں ہی ہو سکتا ہے کہ شہوت کے وقت عورت کے اندر بھی منی کود کر خارج ہو اور بچہ کی خلقت و ساخت میں حصہ دار بنے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا انکار اس پر دلالت کرتا ہے کہ عورتوں کو احتلام بڑی نادر صورت ہے۔ یعنی بہت کم ہوتا ہے مردوں کی طرح کثرت سے نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: جس طرح مردوں کو احتلام لاحق ہوتا ہے اور ان پر غسل کرنا فرض ہے اسی طرح عورتوں کو بھی یہ صورت لاحق ہوتی ہے ان کو غسل کرنا بھی فرض ہے باقی رہا بچہ کی مشابہت کا مسئلہ تو اس بارے میں حدیث سے ثابت ہے کہ جب مرد کا پانی غالب ہوتا ہے تو نومولود کی مشابہت باپ پر ہوتی ہے اور جب ماں کا پانی غالب ہو تو بچہ کی مشابہت والدہ سے ہوتی ہے۔

(۹۸) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ الله ﷺ يَغْتَسِلُ مِنْ أَرْبَعٍ: مِنَ الجَنَابَةِ،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ چار چیزوں کی وجہ سے غسل فرمایا کرتے تھے۔ جنابت' جمعہ کے روز' سینگی لگوانے کے بعد اور میت

وَيومَ الجُمُعَةِ، وَمِنَ الحِجَامَةِ، وَمِنْ غُسْلِ المَيِّتِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابنُ خُزَيْمَةَ.

کو غسل دینے کی وجہ سے۔ (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں جن چار چیزوں سے غسل کرنے کا ذکر ہے ان میں غسل جنابت بالاتفاق فرض ہے۔ جمعہ کے روز غسل جمہور صحابہ و تابعین اور اکثر ائمہ کے نزدیک مسنون ہے البتہ امام احمد اور امام مالک کا ایک قول یہ ہے کہ وہ فرض ہے۔ امام داؤد ظاہری اور ابن خزیمہ کا بھی یہی مسلک ہے اور حافظ ابن قیم کا زاد المعاد میں اسی طرف رجحان ہے۔ سینگی لگوانے سے غسل مسنون ہے فرض نہیں۔ پہلے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے کہ آپ ؐ نے سینگی لگوائی اور وضو کئے بغیر نماز پڑھی۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ؐ نے غسل تو کیا کبھی وضو بھی سنگی لگوانے کے بعد نہیں کیا۔ رہا میت کو غسل دینے سے غسل، تو پہلے اس کے بارے میں بھی گزر چکا ہے کہ یہ مستحب ہے، فرض نہیں۔ جمہور اہل علم کا یہی فیصلہ ہے۔

(٩٩) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ ثُمَامَةَ بْنِ أُثَالٍ عِنْدَمَا أَسْلَمَ - وَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَغْتَسِلَ. رَوَاهُ عَبدُ الرَّزَّاقِ، وَأَصْلُهُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعہ کے متعلق مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے غسل کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ (عبدالرزاق نے اسے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری و مسلم میں موجود ہے)

حاصل کلام: کافر جب اسلام لانے کیلئے آمادہ ہو تو پہلے اسے غسل کرنا چاہئے۔ یہ غسل واجب ہے یا مسنون و مستحب اس میں بھی علماء کے مابین اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمدؒ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اسے مستحب سمجھتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ثمامہ بن اثالؓ﴾ دونوں لفظوں کے پہلے حرف یعنی "ثا" اور "الف" دونوں پر ضمہ ہے۔ یمامہ کے قبیلہ بنو حنیفہ کے فرد تھے اور سرداری کے منصب پر بھی فائز تھے۔ عمرہ ادا کرنے نکلے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے گشتی شاہ سواروں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ وہ ان کو مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں لائے اور انہیں مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ تین روز بعد نبی ﷺ نے بطور احسان انہیں آزاد فرما دیا۔ اس کے بعد یہ مسلمان ہوگئے اور بہت عمدہ اسلام کا ثبوت دیا۔ جن دنوں لوگ مرتد ہو رہے تھے یہ بڑی مضبوطی اور ثابت قدمی سے اسلام پر ڈٹے رہے۔ جب اس کی قوم کے لوگ مسیلمہ کذاب کے فتنہ کا شکار ہوگئے تو یہ ان کے خلاف بڑے حوصلے اور عزم و ہمت سے ثابت قدم رہے۔

(١٠٠) وعَن أَبِي سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «غُسْلُ يَوْمِ الْجُمُعَةِ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُحْتَلِمٍ». أَخرَجَهُ السَّبْعَةُ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جمعہ کے روز غسل کرنا ہر بالغ پر واجب ہے۔“ (اس کو ساتوں یعنی بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور احمد نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿محتلم﴾ بالغ کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث ان لوگوں کی دلیل ہے جو غسل یوم جمعہ کو واجب قرار دیتے ہیں کیونکہ اس میں ”واجب“ کا لفظ صراحتاً آیا ہے۔ مگر جہاں تک جمہور کا تعلق ہے وہ اسے مسنون قرار دیتے ہیں اور اس میں وجوب کے حکم کو تاکید کیلئے سمجھتے ہیں۔

(۱۰۱) وَعَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ تَوَضَّأَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَبِهَا وَنِعْمَتْ، وَمَنِ اغْتَسَلَ فَالْغُسْلُ أَفْضَلُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جمعہ کے روز جس نے وضو کیا اس نے اچھا اور بہتر کیا اور جس نے غسل کیا تو غسل تو بہرحال افضل ہے اور بہترین ہے۔“ (اس کو پانچوں یعنی احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فبھا﴾ ایک مفہوم اس کا یہ ہے کہ یہ طریقہ مسنون ہے یا پھر اسے رخصت پر محمول کیا گیا ہے کہ ایسا کرنے کی اجازت و رخصت ہے یا یہ بھی معنی کئے گئے ہیں کہ جمعہ کے روز وضو پر اکتفا کرنا ایک اچھی اور عمدہ عادت ہے۔ ﴿ونعمت﴾ کا بھی وہی مفہوم ہے جو ﴿فبھا﴾ کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ طریقہ مسنون بھی ہے یا اچھی اور عمدہ خصلت بھی اور یہ حدیث جمعہ کے روز غسل کے وجوب کے موقف کی تائید کرتی ہے، لیکن جو حدیث اس کے وجوب پر دال ہے وہ زیادہ صحیح اور راجح ہے اور عدم وجوب پر دلالت کرنے والی حدیث سے زیادہ قوی ہے۔ اس لئے زیادہ صحیح، راجح اور قوی کو اختیار کرنا زیادہ محتاط طریقہ ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی روشنی میں معلوم ہوا کہ جمعہ کا غسل واجب نہیں۔ اس لئے کہ واجب کو افضل نہیں کہا جاتا غالباً اسی وجہ سے جمہور علماء نے واجب سے لغوی معنی مراد لئے اصطلاحی نہیں۔ لغوی معنی کو تقویت مسلم کی روایت سے ملتی ہے جو اس کے فرض نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ البتہ نہایت اولیٰ بات یہی ہے کہ مسلمان کو جمعہ کے روز غسل کرنے میں بہت احتیاط ملحوظ رکھنی چاہئے۔ صاحب زاد المعاد علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غسل کیلئے بہت تاکید ہے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ لفظ وجوب وتر کے سلسلہ میں اگر کچھ قوت رکھتا ہے تو غسل جمعہ کیلئے اس سے زیادہ باعث قوت ہے۔

راوی حدیث: ﴿سمرہؓ﴾ سین کے فتحہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ۔ ﴿جندب﴾ جیم کے ضمہ، نون

ساکن اور دال پر ضمہ۔ مشہور صحابی رسول ﷺ ہیں۔ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے اور فزار قبیلہ کے فرد ہونے کی وجہ سے فزاری کہلائے۔ انصار سے حلیفانہ روابط و تعلقات تھے۔ یہ ان حفاظ میں سے تھے جنہیں بکثرت احادیث و قرآن یاد تھا۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ خوارج کے گروہ حروریہ کے سلسلہ میں بڑے سخت تھے۔ ۵۹ھ کے آخر میں وفات پائی۔

(۱۰۲) وعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُقْرِئُنَا الْقُرْآنَ مَا لَمْ يَكُنْ جُنُباً. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَهَذَا لَفْظُ التِّرْمِذِيِّ، وَحَسَّنَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ حالت جنابت کے علاوہ ہر حالت میں ہمیں قرآن مجید پڑھا دیا کرتے تھے۔ (اسے پانچوں احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ ترمذی کے ہیں اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنبی مرد کو غسل سے پہلے قرآن پاک کی تلاوت نہیں کرنی چاہئے۔ جبکہ قرآن کی نیت سے ایک آیت بھی نہیں پڑھنی چاہئے' چنانچہ امام ابویعلیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ؐ نے پہلے وضو کیا اور پھر بعد میں قرآن مجید پڑھا اور ارشاد فرمایا کہ "جس کسی کو جنابت لاحق ہو اس کیلئے مناسب یہی طریقہ ہے (کہ وضو کر کے تلاوت قرآن مجید کرے) اور جنبی نہ پڑھے اگرچہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو"۔

(۱۰۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِذَا أَتَى أَحَدُكُمْ أَهْلَهُ، ثُمَّ أَرَادَ أَنْ يَعُودَ، فَلْيَتَوَضَّأْ بَيْنَهُمَا وُضُوءًا**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، زَادَ الحَاكِمُ: «**فَإِنَّهُ أَنْشَطُ لِلْعَوْدِ**».

وَلِلأَرْبَعَةِ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَنَامُ وَهُوَ جُنُبٌ، مِنْ غَيْرِ أَنْ يَمَسَّ مَآءً. وَهُوَ مَعْلُولٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "جب تم میں سے کوئی اپنی اہلیہ کے پاس جائے (یعنی تعلق زن و شو قائم کرے) پھر دوبارہ لطف اندوز ہونے کا ارادہ ہو تو درمیان میں وضو کر لے۔" (مسلم)

اور حاکم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ (یہ وضو) دوبارہ مباشرت کیلئے زیادہ باعث نشاط ہے یعنی فرحت بخش اور تازگی پیدا کرتا ہے اور سنن اربعہ (یعنی ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حالت جنابت میں پانی کو ہاتھ لگائے بغیر سو جاتے۔ (یہ روایت معلول ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ انشط ﴾ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ بہت نشاط و مسرت اور فرحت و تازگی بخش ہے۔

اطیب اور اجود ہے تروتازگی اور عمدگی لذت طبیعت میں پیدا کرتا ہے۔ ﴿ من غیر ان یمس ماء ﴾ اس جملہ میں جس نفی کا ذکر ہے وہ غسل اور وضو دونوں کو شامل ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ نہ وضو فرماتے اور نہ ہی غسل کرتے۔ اس حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح اور صاف ہوگئی کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ والی روایت میں وضو کرنے کا جو حکم ارشاد ہوا ہے وہ مستحب ہے' واجب نہیں یا جو پہلو زیادہ مفید ہے اس کی جانب اشارہ کرنا مطلوب ہے۔ ﴿ وھو معلول ﴾ اس حدیث کے معلول ہونے کی وجہ محدثین کی نظر میں ابواسحٰق کا ابوالاسود کے واسطہ سے روایت کرنا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ابواسحٰق کا ابواسود سے سماع ثابت نہیں لیکن امام بیہقی نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور انہوں نے اس کا سماع ثابت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی معلول اس لئے کہا کہ ان کے نزدیک بھی ابواسحٰق کا ابو اسود سے سماع ثابت نہیں مگر امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ ثابت کرنے سے کہ ان کا سماع یقینی ہے' حدیث معلول نہیں رہتی۔

حاصل کلام: مسلم کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ خورد و نوش اور مباشرت کیلئے عضو مخصوص دھو کر وضو فرما لیتے تھے۔ اکثر علماء امت کے نزدیک یہ وضو واجب نہیں مستحب ہے۔

(١٠٤) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الجَنَابَةِ يَبْدَأُ فَيَغْسِلُ يَدَهُ، ثُمَّ يُفْرِغُ بِيَمِينِهِ عَلَى شِمَالِهِ فَيَغْسِلُ فَرْجَهُ، ثُمَّ يَتَوَضَّأُ ثُمَّ يَأْخُذُ المَآءَ فَيُدْخِلُ أَصَابِعَهُ فِي أُصُولِ الشَّعْرِ، ثُمَّ حَفَنَ عَلَى رَأْسِهِ ثَلَاثَ حَفَنَاتٍ، ثُمَّ أَفَاضَ عَلَى سَائِرِ جَسَدِهِ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کرتے تو اس طرح آغاز کرتے۔ پہلے ہاتھ دھوتے پھر سیدھے ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے اور اپنا عضو مخصوص دھوتے۔ پھر وضو کرتے' پھر پانی لے کر اپنی انگلیوں کے ذریعہ سر کے بالوں کی تہہ (جڑوں) میں داخل کرتے۔ پھر تین چلو پانی کے بھر کر یکے بعد دیگرے سر پر ڈالتے۔ پھر باقی سارے وجود پر پانی بہاتے (سب سے آخر میں) پھر دونوں پاؤں دھوتے۔ (بخاری و مسلم' متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

وَلَهُمَا فِي حَدِيثِ مَيْمُونَةَ: «ثُمَّ أَفْرَغَ عَلَى فَرْجِهِ وَغَسَلَهُ بِشِمَالِهِ، ثُمَّ ضَرَبَ بِهَا الأَرْضَ».

اور بخاری و مسلم میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس طرح ہے "پھر اپنے عضو مخصوص پر پانی ڈالتے اور اپنے بائیں ہاتھ سے اسے دھوتے اور ہاتھوں کو زمین پر مار کر مٹی سے ملتے اور (صاف کرتے) "

وَفِي رِوَايَةٍ: «فَمَسَحَهَا بِالتُّرَابِ». وَفِي آخِرِهِ: «ثُمَّ أَتَيْتُهُ بِالمِنْدِيلِ

اور ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے۔ "پھر دونوں ہاتھ مٹی سے مل کر اچھی طرح

فَرَدَّهُ»، وَفِيْه: «وجَعَلَ يَنْفُضُ الْمَآءَ بِيَدِهِ». صاف کرتے۔" اس روایت کے آخر میں ہے کہ "میں نے آپؐ کی خدمت میں رومال (تولیہ) پیش کیا مگر آپؐ نے اسے واپس لوٹا دیا اور بدن (پر جو پانی رہ گیا تھا) اسے اپنے ہاتھ سے جھاڑنا شروع کیا۔"

لغوی معنی: ﴿ يفرغ ﴾ افراغ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں پانی چھڑکتے تھے۔ ڈالتے تھے۔ انڈیلتے تھے۔ ﴿ يغسل فرجه ﴾ عضو مخصوص اوراس کے اردگرد کے حصے کو جو رانوں کے ساتھ ملحق ہوتا دھوتے تھے جیسا کہ ابوداؤد میں وارد ﴿ مرافغ ﴾ کے لفظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے۔ ﴿ مرافغ ﴾ مرفغ کی جمع ہے، یعنی شرم گاہ کا اردگرد۔ ﴿ فيدخل ﴾ ادخال سے يدخل بنا ہے۔ باب افعال ہے۔ ﴿ فيدخل اصابعه ﴾ اپنی انگلیوں کو داخل کرتے اپنے سر کے بالوں کی جڑوں تک۔ ﴿ في اصول الشعر ﴾ اپنی انگلیوں سے سر کے دائیں پہلو والے بالوں میں پہلے ڈالتے اور بائیں جانب بعد میں تاکہ بالوں کی جڑوں اور جسم کی کھال تک پانی کی تری پہنچ جائے۔ ﴿ ثم حفن ﴾ دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی بھر کر ڈالتے۔ ﴿ حفنات ﴾ حفنة کی جمع ہے "حاء" اور "فاء" دونوں پر فتحہ ہے۔ ﴿ حفنة ﴾ کے معنی لپ اور چلو کے آتے ہیں یعنی دونوں ہاتھوں کو ملا کر دونوں ہتھیلیوں کو پانی سے بھرنا ﴿ ثم افاض الماء ﴾ پھر پانی بہاتے یا انڈیلتے۔ یعنی کھلا پانی جسم پر بہا دیتے۔

حاصل کلام: حدیث مذکور میں کچھ پہلو وضاحت طلب ہیں۔ مختلف احادیث کے ملانے سے وضاحت ہوتی ہے کہ غسل کرنے سے پہلے آپؐ ہاتھ دھوتے۔ اس میں تعداد کا ذکر نہیں کہ کتنی بار دھوتے۔ ام المومنین میمونہؓ کی روایت میں دو یا تین بار دھونے کا ذکر ہے پھر آپؐ اپنی شرمگاہ کو دھوتے پھر ہاتھ مٹی پر مار کر ہاتھ صاف کرتے پھر اسی طرح غسل کرتے جس طرح نماز کیلئے غسل کیا جاتا ہے۔ پھر سر کے بالوں کا خلال کرتے۔ پہلے سر کے دائیں جانب بالوں میں خلال کر کے پانی کی تری جڑوں تک پہنچاتے پھر بائیں طرف والے بالوں میں اسی طرح کرتے۔ پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے۔ حضرت میمونہؓ کی روایت میں ہے کہ پہلے ایک طرف ہو جاتے پھر دونوں پاؤں دھوتے۔ اسی غسل میں کئے گئے وضو سے نبی کریم ﷺ نے صبح کی دو سنتیں اور نماز فجر کے فرض ادا فرمائے گویا دوبارہ از سر نو وضو کرنے کی ضرورت و حاجت نہیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وضو اور غسل کے بعد چہرے اور ہاتھوں اور باقی بدن پر پانی کے اثرات کو تولئے یا رومال وغیرہ سے صاف کرنا ضروری نہیں کیونکہ بعض روایات میں کپڑے سے پانی خشک کرنے کا ذکر بھی آیا ہے اور وضو کے پانی کو ہاتھ سے جھاڑنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں اور جس روایت میں ہاتھ سے پانی جھاڑنے کی ممانعت آئی ہے وہ حدیث ضعیف ہے۔ صحیح حدیث کی موجودگی میں ضعیف کی کوئی وقعت و حیثیت نہیں۔

(١٠٥) وعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رضي الله حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا

تعالی عنها قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي امْرَأَةٌ أَشُدُّ شَعَرَ رَأْسِي، أَفَأَنْقُضُهُ لِغُسْلِ الجَنَابَةِ؟ وَفِيْ رِوَايَةٍ: وَلِلْحَيْضَةِ؟ فَقَالَ: لاَ، إِنَّمَا يَكْفِيْكِ أَنْ تَحْثِي عَلَى رَأْسِكِ ثَلاَثَ حَثَيَاتٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

یارسول اللہ (ﷺ)! میں اپنے سر کے بال (یعنی مینڈھیوں کی شکل میں) باندھ لیتی ہوں۔ کیا غسل جنابت کے موقع پر ان کو کھولوں؟ اور ایک روایت میں حیض سے فارغ ہو کر غسل کے وقت کے الفاظ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ''نہیں (کھولنے کی ضرورت نہیں) بس تیرے لئے یہی کافی ہے کہ تو اپنے سر پر تین چلو پانی بہا دیا کر۔'' (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اشد ﴾ شد یشد سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ جس کے معنی باندھنا مضبوطی کے ساتھ۔ ﴿ اتحثی ﴾ انڈیل تو' ڈال تو۔ ﴿ حثیات ﴾ خفنات کے معنی میں ہے۔ پانی سے بھرے ہوئے دونوں ہاتھوں کے چلو۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جسے جنابت لاحق ہو جائے اور جسے حیض آیا ہو اس کیلئے غسل کیلئے بالوں کا کھولنا ضروری نہیں البتہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے بالوں کو کھولنے کا حکم فرمایا مگر یہ دونوں روایتیں باہم متعارض نہیں کیونکہ بال کھولنے کا حکم محض استحباب کیلئے ہے جنابت اور غسل حیض میں عورت پر واجب نہیں کہ وہ سر کے بال کھولے صرف بالوں کی جڑ یا سر کا چمڑا تر ہونا چاہئے۔ سارے بال تر ہونا ضروری نہیں۔ مسلم اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کو کسی ذریعہ سے اطلاع ملی کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عورتوں کو غسل جنابت و حیض کے وقت سر کے بال کھولنے کا حکم دیتے ہیں۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے اظہار تعجب فرمایا کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ کو معلوم نہیں کس طرح عورتوں کو بال کھولنے کا حکم دیتے ہیں اس سے تو بہتر ہے کہ وہ عورتوں کو سر منڈوانے کا حکم دیں۔ میں اور آنحضورﷺ ایک ہی ٹب نما برتن میں غسل کر لیا کرتے تھے اور میں سر پر صرف تین بار پانی ڈال لیتی تھی۔ گویا سر کے بال کھولنے کی ضرورت نہیں سمجھتی تھی۔

(١٠٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنِّي لاَ أُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَلاَ جُنُبٍ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''میں حائضہ عورت اور حالت جنابت میں مبتلا مرد کیلئے مسجد میں داخلہ حلال نہیں کرتا (یعنی ان دونوں کو مسجد میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہیں دیتا)'' (اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لا احل المسجد ﴾ احلال سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ میں مسجد میں داخلہ کو حلال

نہیں کرتا۔ یہ صیغہ تحریم کے بارے میں صریح ہے۔
حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حائضہ عورت اور جنبی مرد دونوں مسجد میں نہ قیام کر سکتے ہیں اور نہ عام حالت میں مسجد میں داخل ہو سکتے ہیں البتہ اگر مسجد کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ گزرنے کا نہ ہو تو ائمہ میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسجد میں سے گزرنا جائز ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دونوں کا مسجد میں سے گزرنا ناجائز قرار دیتے ہیں۔ یہ حدیث امام موصوف کی رائے کی تائید کرتی ہے۔ جائز ہونے کی دلیل قرآن مجید کی آیت ﴿ الاعابری سبیل ﴾ ہے 'یعنی جنبی مسجد میں نہ جائے ہاں اگر مسجد میں سے گزرنا پڑے تو مجبوراً گزر سکتا ہے اور حدیث سے مراد ٹھہرنے کی ممانعت ہے۔ نہ کہ گزرنے کی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ تو آثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی بنا پر وضو کے بعد مسجد میں ٹھہرنے کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور جو کوئی آدمی ضرورتاً مسجد میں سو گیا ہو اس حالت میں اسے حالت جنابت لاحق ہو گئی تو ایسے آدمی کیلئے بالاتفاق مسجد سے نکل جانا جائز ہے۔

(۱۰۷) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَرَسُولُ اللهِ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ، تَخْتَلِفُ أَيْدِيْنَا فِيْهِ، مِنَ الجَنَابَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ ابْنُ حِبَّانَ: «وَتَلْتَقِي».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں ایک ہی برتن سے غسل جنابت کر لیا کرتے تھے۔ اس برتن میں ہمارے ہاتھ یکے بعد دیگرے داخل ہوتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور ابن حبان نے اتنا اضافہ مزید نقل کیا ہے کہ بسا اوقات دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے چھو جاتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ تختلف ایدینا فیہ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے بعد برتن میں داخل ہوتے تھے۔ مثلاً پہلے میرا ہاتھ داخل ہوتا تو بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یا پھر پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ داخل ہوتا تو بعد میں میرا۔ ﴿ من الجنابۃ ﴾ جنابت کی وجہ سے۔ اس میں غسل کرنے کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ غسل کس وجہ سے کرتے تھے؟ ﴿ تلتقی ﴾ مل جاتے 'چھو جاتے' ایک دوسرے سے۔ جب ایک ہی برتن میں یکے بعد دیگرے ہاتھ داخل ہوں گے تو ان کا باہمی طور پر دوسرے کے ساتھ چھو جانا غسل کیلئے باعث نقصان نہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ میاں بیوی دونوں اکٹھے ایک برتن سے غسل کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنے میں کوئی قباحت اور مضائقہ نہیں۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ایک برتن کے پانی سے میاں بیوی کا اکٹھے غسل کرنا بھی جائز ہے۔

(۱۰۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ تَحْتَ كُلِّ شَعَرَةٍ جَنَابَةً،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "ہر بال کی تہہ (نیچے) میں جنابت کا اثر ہوتا ہے اس لئے بالوں کو

فَاغْسِلُوا الشَّعْرَ، وَأَنْقُوا الْبَشَرَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَضَعَّفَاهُ، وَلأَحْمَدَ عَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا نَحْوُه، وَفِيْهِ رَاوٍ مَجْهُولٌ.

(اچھی طرح) دھویا کرو اور جسم کو اچھی طرح (مل کر) صاف کیا کرو۔" (ابوداؤد اور ترمذی دونوں نے اسے روایت کیا ہے اور ساتھ ہی ضعیف بھی قرار دیا ہے۔ مسند احمد میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح روایت ہے اور اس میں ایک راوی مجہول الحال ہے)

لغوی تشریح: ﴿ انقوا ﴾ انقاء سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے۔ صاف کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (صاف کرو) ﴿ البشر ﴾ "با" اور شین پر فتحہ۔ انسان کی جلد کا ظاہر۔ آدمی کی جلد و کھال کی اوپر والی سطح۔ ﴿ وضعفاہ ﴾ دونوں (ابوداؤد و ترمذی) نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اس لئے کہ اس کی سند میں ایک راوی حارث ابن وجیہ نامی ضعیف ہے۔ محدثین نے اس کی روایت کو منکر قرار دیا ہے۔

حاصل کلام: حدیث مذکور اس کی دلیل ہے کہ غسل جنابت کی صورت میں سارا جسم دھونا فرض ہے البتہ کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ احناف کے نزدیک یہ بھی فرضیت کے حکم میں شامل ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کا بھی مشہور قول یہی ہے جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ مسنون ہے۔ بہرحال حدیث ہذا کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ غسل جنابت میں سارا بدن حتیٰ کہ بالوں کو خوب اچھی طرح مل کر دھونا چاہئے' ایسا نہ ہو کہ بلا کسی اشد مجبوری کے جسم کا کوئی حصہ بال برابر یا بالوں کے نیچے جگہ خشک رہ جائے۔

***

٩ - بَابُ التَّيَمُّمِ

تیمم کا بیان

(١٠٩) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أُعْطِيتُ خَمْساً لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي، نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِيَ الأَرْضُ مَسْجِداً

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا فرمائی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو بھی نہیں دی گئیں۔ مجھے ایک مہینہ کی مسافت سے (دشمن پر) رعب و دبدبے سے مدد دی گئی ہے۔ ساری زمین میرے لئے سجدہ گاہ اور

وَطَهُوراً، فَأَيُّما رَجُلٍ أَدْرَكَتْهُ الصَّلاَةُ فَلْيُصَلِّ». وذَكَرَ الحَدِيْثَ.

طہارت و پاکیزگی کا ذریعہ بنائی گئی ہے' اب جس آدمی کو (جہاں بھی) نماز کا وقت آجائے اسے نماز پڑھ لینی چاہئے۔" اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔

وَفِيْ حَدِيْثِ حُذَيْفَةَ عِنْدَ مُسْلِمٍ: «وَجُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُوراً إِذَا لَمْ نَجِدِ المَآءَ».

مسلم میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "جب ہمیں پانی دستیاب نہ ہو تو زمین کی مٹی ہمارے لئے حصول طہارت و پاکیزگی کیلئے پاک بنا دی گئی ہے۔"

وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عِنْدَ أَحْمَدَ: «وَجُعِلَ التُّرَابُ لِي طَهُوراً».

مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ "مٹی میرے لئے حصول طہارت کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿ باب التيمم ﴾ تیمم کا لغوی معنی ہے قصد و ارادہ کرنا۔ شرعی اصطلاح میں پاک و صاف مٹی کی طرف قصد و ارادہ کرنا۔ نماز وغیرہ کو مباح کرنے کی غرض سے چہرہ اور دونوں ہاتھوں پر مٹی ملنے کو کہتے ہیں۔ ﴿ اعطيت ﴾ مجھے دی گئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہیں۔ ﴿ خمسا ﴾ پانچ ممیّزات و خصائص۔ ﴿ نصرت ﴾ مدد دیا گیا ہوں صیغہ مجہول ہے۔ ﴿ بالرعب ﴾ "راء" پر ضمہ اور عین ساکن ہے۔ معنی اس کے خوف ہیں۔ ﴿ مسيرة شهر ﴾ مہینہ بھر کی مسافت و دوری سے۔ میرے دشمن پر میرا رعب و دبدبہ پڑ جاتا ہے۔ ممیّزات خمسہ میں سے یہ پہلا امتیاز ہے اور دوسرا ﴿ جعلت لی الارض مسجدا ﴾ کا امتیاز ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی نہیں دیا گیا۔ کیونکہ اس سے پہلے یہود و نصاریٰ صرف اپنے گرجوں اور عبادت گاہوں ہی میں نماز ادا کر سکتے تھے۔ ﴿ وطهورا ﴾ "طاء" پر فتحہ ذریعہ پاکیزگی و طہارت' جنابت اور ناپاکی کو دور کرنے اور زائل کرنے کا ذریعہ۔ اس طرح سے ادائیگی نماز کیلئے جائز ہونے کا موقع پیدا کیا گیا ہے۔ ﴿ ادركته ﴾ اس کا وقت آپہنچے' یعنی نماز کا وقت ہو جائے۔ ﴿ فليصل ﴾ تو اسے نماز پڑھ لینی چاہئے خواہ مسجد نہ ملے اور پانی بھی مہیا نہ ہو سکے۔ ﴿ وذكر ﴾ سے مراد راوی حدیث ہے۔ یعنی راوی نے باقی حدیث بیان کی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سے مصنف نے بالخصوص آپؐ کو عطا کئے جانے والے دو امتیازات و خصائص کا ذکر کیا ہے اور باقی تین یہ ہیں۔ غنائم کا حلال کیا جانا۔ یعنی دوران جنگ دشمن سے جو اموال افواج اسلام کے قبضہ میں آئیں وہ آپؐ کیلئے اور امت مسلمہ کیلئے حلال کئے گئے ہیں۔ نیز شفاعت کبریٰ بھی آپؐ ہی فرمائیں گے۔ یہ امتیاز بھی صرف آپؐ ہی کا طرۂ امتیاز ہے' تاکہ روز محشر کی تکلیف سے لوگوں کو آرام و سکون اور راحت نصیب ہو اور روئے ارض کے تمام انسانوں اور جنوں کیلئے آپؐ کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں آخری تین امتیازات کو حذف کر دیا ہے اور انہی کے ذکر پر اکتفا کیا ہے جن کا تعلق طہارت اور نماز سے ہے۔

پانی کے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں شریعت اسلامیہ نے تیمم کی سہولت بہم پہنچا کر امت مسلمہ

کیلئے بہت بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔ زمین کے تمام اجزاء سے تیمم درست ہے۔ زمین سے نکلنے والی معدنیات جو زمین کا حکم رکھتی ہوں ان سے بھی تیمم کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ یہ معدنیات غبار رکھنے والی ہوں۔

(۱۱۰) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِر رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ فِي حَاجَةٍ، فَأَجْنَبْتُ، فَلَمْ أَجِدِ الْمَاءَ، فَتَمَرَّغْتُ فِي الصَّعِيدِ، كَمَا تَمَرَّغُ الدَّابَّةُ، ثُمَّ أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ، فَذَكَرْتُ لَهُ ذَلِكَ، فَقَالَ: **إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْكَ أَنْ تَقُولَ بِيَدَيْكَ هَكَذَا،** ثُمَّ ضَرَبَ بِيَدَيْهِ الأَرْضَ ضَرْبَةً وَاحِدَةً، ثُمَّ مَسَحَ الشِّمَالَ عَلَى الْيَمِيْنِ وظَاهِرَ كَفَّيْهِ وَوَجْهَهُ. متفق عليه وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے کسی ضرورت و حاجت کے سلسلہ میں بھیجا۔ میں جنبی ہو گیا اور پانی مجھے دستیاب نہ ہو سکا تو میں مٹی میں اس طرح لوٹ پوٹ ہوا جس طرح چوپایہ لوٹ پوٹ ہوتا ہے۔ (ضرورت سے فارغ) ہو کر میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا واقعہ آپؐ سے ذکر کیا۔ آپؐ نے فرمایا ”تجھے اپنے ہاتھ سے اس طرح کر لینا ہی کافی تھا۔“ پھر آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک مرتبہ زمین پر مارا پھر بائیں کو دائیں پر ملا اپنے ہاتھوں کی پشت اور چہرے پر۔ (بخاری اور مسلم، اور متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ «وَضَرَبَ بِكَفَّيْهِ الأَرْضَ، وَنَفَخَ فِيْهِمَا، ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ».

اور بخاری کی روایت میں ہے کہ اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر ماریں اور پھونک مار کر گرد و غبار اڑا دیا پھر ان کو اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مل لیا۔

لغوی تشریح: ﴿فاجنبت﴾ میں جنبی ہو گیا۔ ﴿فتمرغت﴾ لوٹ پوٹ ہوا۔

حاصل کلام: یہ حدیث قول و فعل دونوں اعتبار سے یہ فائدہ دے رہی ہے کہ تیمم کیلئے ایک ضرب ہی کافی ہے اور ہتھیلیوں کی بیرونی اور اندرونی سطح پر مسح کرنا ہے۔ کہنیوں تک نہیں۔ اس باب میں یہ حدیث صحیح ترین ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو دوسری روایات ہیں وہ یا تو ضعیف ہیں یا پھر موقوف جو اس حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمم میں چہرے اور ہاتھوں کیلئے ایک ہی ضرب کافی ہے۔ جمہور محدثین و فقہاء کا یہی مذہب ہے' البتہ احناف اور شافعی دو ضربوں کے قائل ہیں۔ ایک ضرب چہرے کیلئے اور دوسری ہاتھوں کیلئے ہے۔ مذکورہ بالا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ان کی دلیل ہے۔ اس باب میں صحیح ترین روایت ہونے کے اعتبار سے اسی پر عمل ہے۔ نیز عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے پانی نہ ملنے پر اپنی عقل و

دانش سے زمین پر لوٹ پوٹ ہونے کا عمل اختیار کیا کہ جب پانی سے غسل کیا جاتا ہے تو سارا بدن دھویا جاتا ہے اور مٹی بھی چونکہ پانی کے قائم مقام ہے اس لئے سارے جسم پر مٹی لگنی چاہئے۔ نص کا علم نہ ہونے کی بنا پر انہوں نے ایسا عمل کیا ورنہ نص کی موجودگی میں مجتہد کے قیاس کی کوئی حیثیت نہیں' لہٰذا جب نص قیاس کے مخالف ہو تو اس صورت میں کسی کیلئے بھی یہ روا نہیں کہ وہ نص کو چھوڑ کر قیاس پر عمل کرے۔ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے زمین پر اپنی ہتھیلیاں ماریں اور ان پر پھونک دیا۔ لہٰذا ضرب لگانے کے بعد پھونک دینا بھی مسنون ہے۔ ایک جنبی کیلئے پانی کی عدم موجودگی میں اتنا تیمم کر لینا کفایت کر جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ﴾ عین پر فتحہ' میم پر فتحہ اور تشدید۔ ان کی کنیت ابو الیقظان تھی۔ اولین سابقین صحابہ کرامؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ مکہ میں انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں مگر ان کے پایہ ثبات میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔ دونوں ہجرتیں کیں۔ (یعنی ہجرت حبشہ' ہجرت مدینہ) غزوۂ بدر سمیت سارے معرکوں میں شمولیت کی۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا "افسوس اے عمار! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔" ۳۶ھ میں معرکہ صفین کے موقع پر یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفداروں میں سے تھے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکریوں میں سے ایک باغی اور سرکش گروہ نے ان کو قتل کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۳ برس کی تھی۔

(۱۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «التَّيَمُّمُ ضَرْبَتَانِ، ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ، وَضَرْبَةٌ لِلْيَدَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَ الأَئِمَّةُ وَقْفَهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "تیمم دو ضربوں سے (مکمل) ہوتا ہے (تیمم میں دو ضربیں ہیں) ایک ضرب چہرے کیلئے اور ایک ضرب دونوں ہاتھوں کیلئے کہنیوں تک۔" (اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے اور دوسرے ائمہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: ﴿ التیمم ضربتان ..... الخ ﴾ والی حدیث کو حاکم اور بیہقی نے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ ائمہ حدیث نے علی بن ظبیان کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور دیگر علماء نے بھی اس کو ضعیف ہی قرار دیا ہے۔ اس کے اور بھی کئی طرق ہیں مگر سبھی ضعیف شمار کئے گئے ہیں۔

(۱۱۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الصَّعِيدُ وَضُوءُ الْمُؤْمِنِ الْمُسْلِمِ، وَإِنْ لَمْ يَجِدِ الْمَاءَ عَشْرَ سِنِينَ، فَإِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْيَتَّقِ اللَّهَ،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مٹی مومن مسلمان کا وضو ہے خواہ دس برس تک اسے پانی نہ ملے۔ مگر جب پانی دستیاب ہو جائے تو پھر اللہ سے ڈرنا چاہئے اور اسے اپنے جسم پر پانی پہنچانا چاہئے۔" (اس کو بزار نے

وَلْيُمِسَّهُ بَشَرَتَهُ». رَوَاهُ الْبَزَّارُ، وَصَحَّحَهُ ابنُ القَطَّانِ، وَلٰكِن صَوَّبَ الدَّارَقُطْنِيُّ إِرسَالَهُ، وَلِلتِّرمِذِيِّ عَنْ أَبِي ذَرٍّ نَحْوُه، وَصَحَّحَهُ وَالحاكِمُ أَيْضاً.

روایت کیا ہے اور ابن القطان نے صحیح قرار دیا ہے' تاہم دار قطنی نے اس کے مرسل ہونے کو درست اور قرین صواب کہا ہے اور ترمذی میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے جسے ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے اور حاکم نے بھی صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الصعيد ﴾ پاکیزہ مٹی کو کہتے ہیں۔ ﴿ وان لم يجد ﴾ اس میں "ان" وصلیہ ہے۔ ﴿ عشر سنين ﴾ دس برس۔ اس سے مراد مبالغہ ہے وقت و مدت کا تعین مقصود نہیں۔ مطلب ہے کہ جتنی مدت تک پانی دستیاب نہ ہو اس وقت تک تیمم کی اجازت ہے۔ ﴿ فليتق الله ﴾ اللہ سے ڈرنا چاہئے کا مفہوم یہ ہے کہ طہارت و وضو میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہونے پائے اور صرف مٹی پر انحصار نہ کرے۔ ﴿ وليمسه ﴾ امساس سے ماخوذ ہے۔ یعنی پانی پہنچائے۔ ﴿ بشرته ﴾ "با" اور شین دونوں پر فتحہ ہے۔ مراد جسم کی کھال ہے۔ ﴿ صوب ﴾ تصويب سے ماخوذ ہے اور معنی یہ ہوئے کہ اس حدیث کا مرسل ہونا درست اور صحیح ہے۔ یہ حدیث یہ فائدہ دے رہی ہے کہ تیمم کیلئے وقت و مدت کا تعین نہیں اور جب پانی کی دستیابی کی صورت میں عذر باقی نہ رہے تو پھر پانی کا استعمال واجب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں تیمم کو وضو قرار دیا ہے تو گویا تیمم وضو کا قائم مقام اور بدل ہے۔ جب یہ پانی کا بدل ہے تو پھر دونوں کے احکام بھی ایک جیسے ہوں گے۔ یعنی ایک وضو سے جتنی نمازیں پڑھ سکتا ہے تیمم سے بھی اتنی پڑھی جا سکتی ہیں۔ بعض لوگ اس حدیث کی رو سے تیمم سے رفع حدث کے قائل نہیں ان کے نزدیک صرف نماز مباح ہوتی ہے' جب نماز سے فارغ ہو گا تو پھر ویسا ہی جنبی ہو گا جیسا کہ تیمم سے پہلے تھا۔ پہلا مسلک احناف کا ہے ان کے نزدیک ایک تیمم سے جب تک تیمم قائم رہے کئی فرائض ادا ہو سکتے ہیں۔ سعید بن المسیب' حسن بصری' زہری' سفیان ثوری کی بھی یہی رائے ہے مگر امام شافعی رحمہ اللہ' امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تیمم سے طہارت کاملہ حاصل نہیں ہوتی' بلکہ اس سے جو طہارت حاصل ہوتی ہے اس کی حیثیت معذور کی اس طہارت کی طرح ہے جو محض ضرورت کیلئے ایک محدود مدت تک حاصل ہوتی ہے اور اس سے صرف ایک ہی فرض جس کیلئے تیمم کیا گیا ہو ادا ہو سکتا ہے۔

ترمذی میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح حدیث جس کا حوالہ دیا گیا ہے اس طرح ہے "ابوذر رضی اللہ عنہ کو جب مدینہ منورہ کی آب و ہوا راس نہ آئی تو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا آپؐ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو اونٹوں میں رہنے کا حکم فرمایا۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے اونٹوں میں رہنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی ابوذر رضی اللہ عنہ تو تباہ ہو گیا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ "کیا ہوا؟" ابوذرؓ نے عرض کیا جنابت لاحق ہو جاتی ہے اور میرے پاس پانی نہیں ہوتا (کیا کروں؟) ارشاد ہوا "جسے پانی نہ ملے اس کیلئے مٹی پاک کرنے کا ذریعہ ہے اگرچہ دس سال تک یہی حال رہے۔"

راوی حدیث: ﴿ ابوذر رضی اللہ عنہ ﴾ "راء" پر تشدید۔ نام ان کا جندب بن جنادہ تھا۔ جنادہ میں جیم پر ضمہ ہے۔ ان صحابہ کرامؓ میں سے تھے جو زاہد' دنیا سے بے رغبت تھے۔ مکہ میں ابتداء اسلام میں ہی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ پھر اپنی قوم کی طرف واپس چلے گئے۔ مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش ہوئے۔ مقام ربذہ میں رہائش رکھی۔ ۳۲ھ میں وفات پائی۔ بہت متقی' پرہیزگار اور توکل علی اللہ کرنے والے تھے۔

(۱۱۳) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الخُدرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعالَى عَنْهُ، قَالَ: خَرَجَ رَجُلاَنِ فِي سَفَرٍ، فَحَضَرَتِ الصَّلاَةُ، وَلَيْسَ مَعَهُمَا مَآءٌ، فَتَيَمَّمَا صَعِيْداً طَيِّباً، فَصَلَّيَا، ثُمَّ وَجَدَا المَآءَ فِي الوَقْتِ، فَأَعَادَ أَحَدُهُمَا الصَّلاَةَ، وَالوُضُوءَ، وَلَمْ يُعِدِ الآخَرُ، ثُمَّ أَتَيَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، فَذَكَرا ذَلِكَ لَهُ، فَقَالَ لِلَّذِي لَمْ يُعِدْ: **«أَصَبْتَ السُّنَّةَ، وَأَجْزَأَتْكَ صَلاَتُكَ»**، وَقَالَ لِلآخَرِ: **«لَكَ الأَجْرُ مَرَّتَيْنِ»**. رَوَاه أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسائِيُّ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ دو آدمی سفر پر نکلے' نماز کا وقت آگیا مگر ان کے ساتھ پانی نہیں تھا۔ دونوں نے پاک مٹی سے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی۔ پھر پانی بھی دستیاب ہوگیا جبکہ ابھی نماز کی ادائیگی کا وقت باقی تھا ان میں سے ایک صاحب نے وضو بھی کیا اور نماز دوبارہ ادا کرلی مگر دوسرے نے نہ وضو کیا اور نہ ہی نماز دہرائی۔ سفر سے واپسی پر وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ سنایا۔ آپؐ نے اس شخص کو جس نے نماز دوبارہ نہیں پڑھی تھی فرمایا "تو نے سنت کے مطابق کیا اور تیری نماز کافی ہوگئی" اور دوسرے سے فرمایا "تجھے دگنا اجر ملے گا۔" (ابوداود۔ نسائی)

لغوی تشریح: ﴿ اصبت السنۃ ﴾ تو نے شرعی طریقہ پالیا۔ ﴿ اجزاتک ﴾ یعنی تجھے کافی ہوگئی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر تیمم کرکے نماز ادا کرلی گئی ہو اور بعد میں دوران وقت ہی پانی مل گیا ہو تو ایسی صورت میں نماز دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ فقہائے اربعہ کا یہی مذہب ہے۔

جس آدمی نے نماز دوبارہ پڑھی تھی اسے دوگنا اجر ملنے کی توجیہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک اجر تو اسے نماز پڑھنے کا ملا اور دوسرا اجتہاد کرنے کا۔ اجتہاد اگرچہ درست نہیں تھا تاہم غلط اجتہاد پر بھی ایک اجر ملتا ہے۔

(۱۱٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، فِي قَوْلِهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ﴾ قَالَ: إِذَا كَانَتْ بِالرَّجُلِ الجِرَاحَةُ فِي سَبِيلِ اللهِ وَالقُرُوحُ،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وان کنتم مرضی او علی سفر" کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ جب کسی شخص کو راہ خدا میں زخم اور گھاؤ لگے اور اسی حالت میں اسے جنابت لاحق ہو جائے

فَيُجْنِبُ، فَيَخَافُ أَن يَموتَ إِنِ اغْتَسَلَ، تَيَمَّمَ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ مَوْقُوفاً وَرَفَعَهُ البَزَّارُ، وَصَحَّحَهُ ابنُ خُزَيْمَةَ وَالحَاكِمُ.

اور غسل کرنے کی صورت میں مرجانے کا اندیشہ ہو تو وہ تیمم کر لے۔ (اس روایت کو دار قطنی نے موقوف' بزار نے مرفوع اور ابن خزیمہ اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ مرضی ﴾ مریض کی جمع۔ بیمار آدمی ﴿ علی سفر ﴾ علی فی کے معنی میں استعمال ہوا' یعنی مسافر ہو اور بعد کی آیت او جاء منکم من الغائط او لا مستم النساء فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا (٦:٥) کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یوں بیان فرمائی۔ کہ جب کسی انسان کو ایسا زخم لگے جو اسلحہ وغیرہ کا ہو اور ﴿ القروح ﴾ قرح کی جمع ہے جس کے معنی پھوڑے کے ہیں اور قرآنی آیت کی روشنی میں قروح ان زخموں اور گھاؤ کیلئے استعمال ہوتا ہے جو میدان جنگ میں اسلحہ کی وجہ سے لگے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثلہ "اگر (آج) تمہیں زخم لگا ہے تو اسی طرح کا زخم ان لوگوں کو بھی لگ چکا ہے۔"

حاصل کلام: اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو اور تمہیں پانی دستیاب نہ ہو سکے تو تیمم کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب نماز پڑھنا چاہو اور وضو یا غسل میں کوئی امر مانع ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لو۔ اس آیت میں بیماری اور مرض سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد معمولی پھوڑا پھنسی' خارش اور خراش تو بہرحال نہیں ہو سکتے لہٰذا اس سے مراد وہ بیماری ہے جسے عرف عام میں بیماری و مرض سمجھا جاتا ہے اور یہ بیماری کس درجہ کی ہو تو تیمم جائز ہے اس بارے ائمہ کے مابین اختلاف رائے ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایسی بیماری میں تیمم جائز درست ہے جس سے انسان کی موت واقع ہونے کا اندیشہ ہو یا کسی عضو اور حصہ جسم کے ضائع یا عیب دار ہونے کا خوف ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر بیماری کے طول پکڑ جانے کا ڈر ہو تب بھی تیمم جائز ہے۔ اس آیت میں سفر میں ہونے کی صورت میں بھی تیمم کرنے کی اجازت ہے۔ اس سفر سے وہ سفر مراد نہیں ہے جس میں نماز قصر ادا کی جاتی ہے اور روزہ افطار کرنے کی اجازت ہے بلکہ اس سفر سے مطلق سفر مراد ہے اور مقصود اس سے صرف سفر میں پانی کا نہ ہونا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔

محدثین کی اس حدیث کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ اس معاملہ میں دار قطنی کی رائے زیادہ صحیح ہے کیونکہ بزار نے اس روایت کو جریر بن عطاء کے حوالہ سے نقل کیا ہے حالانکہ ابن معین نے کہا ہے کہ جریر کا عطاء سے سماع اس موقع پر ہے جب ان کے حافظہ میں اختلاط پیدا ہو چکا تھا اس اعتبار سے اس کا مرفوع ہونا درست نہ ہوا۔

(١١٥) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: انْكَسَرَتْ إِحْدَى

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میرا گٹ ٹوٹ گیا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وضو کے بارے میں

زَنْدَيَّ، فَسَأَلْتُ رَسولَ اللهِ ﷺ فَأَمَرَنِيْ أَنْ أَمْسَحَ عَلَى الجَبائِرِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ بِسَنَدٍ وَاهٍ جِدًّا.

پوچھا (کہ اب میں کیا کروں؟) تو آپؐ نے ارشاد فرمایا "پٹیوں پر مسح کر لیا کرو۔" (اسے ابن ماجہ نے نہایت ہی کمزور و ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ زندی ﴾ "زاء" پر فتحہ' نون ساکن اور "یا" پر تشدید۔ زندو احد' تثنیہ زندی اور یاء متکلم کی طرف مضاف ہے اور "زند" ہتھیلی کی جانب بازو کا جوڑ جسے ﴿ رسغ ﴾ یعنی گٹ کہتے ہیں الجبائر ﴾ جبیرۃ کی جمع ہے۔ کپڑے کا ٹکڑا یا لکڑی کا جسے ٹوٹی ہوئی ہڈی پر مضبوطی سے لپیٹ کر باندھا جاتا ہے۔ ﴿ واہ ﴾ وھی یھی وھیا سے ماخوذ ہے۔ نہایت کمزور اور ضعیف۔ اس حدیث کے ضعیف ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی عمرو بن خالد الواسطی ہے وہ نہایت جھوٹا اور دروغ گو آدمی ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اس حدیث کے ضعیف ہونے پر حفاظ حدیث کا اتفاق ہے۔

(١١٦) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعالَى عَنْهُ، فِي الرَّجُلِ الَّذِي شُجَّ فَاغْتَسَلَ فَمَاتَ: إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْهِ أَن يَّتَيَمَّمَ وَيَعْصِبَ عَلَى جُرْحِهِ خِرْقَةً ثُمَّ يَمْسَحَ عَلَيْهَا، وَيَغْسِلُ سَائِرَ جَسَدِهِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِسَنَدٍ فِيْهِ ضَعْفٌ، وَفِيْهِ اخْتِلَافٌ عَلَى رَاوِيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس شخص کے بارے میں جس کے سر پر زخم آیا تھا اور اسی حالت میں اس نے غسل کر لیا اور وفات پا گیا' کہ اسے تو تیمم کر لینا ہی کافی تھا۔ اپنے زخم پر پٹی باندھ کر مسح کرتا اور باقی بدن کو دھو لیتا۔ (اس روایت کو ضعیف سند کے ساتھ ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کے راویوں میں بھی اختلاف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ شج ﴾ شج سے ماخوذ ہے' صیغہ مجہول ہے۔ سر میں جو زخم آئے اسے شج کہتے ہیں۔ ابوداؤد نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اس قصہ و واقعہ کو بیان کیا ہے کہ ہم ایک سفر میں نکلے۔ ہم میں سے ایک آدمی کے سر پر پتھر لگا اور وہ زخمی ہو گیا۔ اسی حالت میں اسے احتلام کی نوبت پیش آ گئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ آیا وہ میرے لئے تیمم کی گنجائش و رخصت رکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا جب تمہیں پانی کے استعمال کی طاقت ہے تو ہم تیرے لئے کوئی رخصت نہیں پاتے (یعنی ہم ایسی حالت میں تمہیں تیمم کی اجازت نہیں دے سکتے) اپنے ساتھیوں کے کہنے کی بنا پر اس نے غسل کر لیا اور فوت ہو گیا۔ جب ہم واپس ہوئے تو نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کے فوت ہونے کی اطلاع دی (اور سارا واقعہ بیان کیا) آپؐ نے فرمایا "ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی مار ہو ان پر۔ جب انہیں مسئلہ کی نوعیت کا علم نہیں تھا تو انہوں نے دریافت کیوں نہیں کیا۔ بے خبری اور عدم واقفیت کا علاج دریافت کرنا ہے۔" پھر آپؐ نے مندرجہ بالا ارشاد فرمایا۔ "یہ اس کیلئے کافی ہوتا۔" الخ۔ ﴿ یعصب ﴾ تعصیب سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پٹی کو مضبوطی سے باندھنا۔ زخمی جگہ پر پٹی وغیرہ باندھنے سے پہلے تیمم کرنا۔ جنابت کا اثر زائل کرنے کیلئے ہے' جیسا کہ موزے پہننے سے پہلے پاؤں دھونا طہارت کیلئے

ہوتا ہے' تاکہ حالت طہارت میں موزے پہنے جائیں اور پھر ان پر مسح کیا جاسکے۔

راوی حدیث: ﴿ وفيه اختلاف على راويه ﴾ اس راوی کا نام عطاء ہے۔ اس سے جابر کے حوالہ سے بھی مروی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے بھی اور ایک نسخہ میں ﴿ على رواته ﴾ بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عطاء کے نیچے یعنی عطاء کے شاگردوں میں اختلاف رائے ہے۔

(۱۱۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ أَنْ لاَّ يُصَلِّيَ الرَّجُلُ بِالتَّيَمُّمِ إِلاَّ صَلاَةً وَاحِدَةً، ثُمَّ يَتَيَمَّمُ لِلصَّلاَةِ الأُخْرَى. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ جِدًّا.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ سنت یہی ہے کہ تیمم کرنے والا شخص تیمم سے ایک ہی نماز پڑھے اور دوسری نماز کیلئے ازسرنو تیمم کرے۔ (اس کو دارقطنی نے بہت ہی ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ من السنة ﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقہ۔

حاصل کلام: حدیث ضعیف ہے' اس لئے کہ اس کے راوی حسن بن عمارہ ہیں اور وہ ضعیف ہے اور سابقہ حدیث نمبر ۱۱۳۰ اس کے بظاہر خلاف ہے۔ جس سے عیاں ہوتا ہے کہ تیمم وضو کا قائم مقام ہے۔ اس لئے تیمم سے بھی کئی نمازیں ادا ہو سکتی ہیں۔

۱۰ - بَابُ الحَيْضِ۔ حیض (سے متعلق احکام) کا بیان

(۱۱۸) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: إِنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ أَبِي حُبَيْشٍ كَانَتْ تُسْتَحَاضُ، فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**إِنَّ دَمَ الحَيْضِ دَمٌ أَسْوَدُ يُعْرَفُ، فَإِذَا كَانَ ذٰلِكَ فَأَمْسِكِي عَنِ الصَّلاَةِ، فَإِذَا كَانَ الآخَرُ فَتَوَضَّئِي وَصَلِّي**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَبُو حَاتِمٍ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا استحاضہ کی دائمی مریضہ تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا کہ "حیض کے خون (کی رنگت) سیاہ ہوتی ہے' آسانی سے پہچان ہو سکتی ہے۔ جن ایام میں یہ خون آرہا ہو تو ان ایام میں نماز چھوڑ دو اور جب کوئی دوسرا ہو تو وضو کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔" (ابوداؤد اور نسائی نے اسے روایت کیا ہے ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابوحاتم کے نزدیک یہ منکر ہے)

وَفِي حَدِيثِ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ: وَلْتَجْلِسْ فِي مِرْكَنٍ، فَإِذَا رَأَتْ صُفْرَةً فَوْقَ المَاءِ

ابوداؤد میں مروی اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ ایک ٹب میں بیٹھ جائے اور جب وہ پانی کے اوپر زردی دیکھے تو ظہر اور عصر دونوں نمازوں

فَلْتَغْتَسِلْ لِلظُّهْرِ وَالعَصْرِ غُسْلاً وَاحِداً، وَتَغْتَسِلْ لِلْمَغْرِبِ وَالعِشَآءِ غُسْلاً وَاحِداً، وَتَغْتَسِلْ لِلْفَجْرِ غُسْلاً وَاحِداً، وَتَتَوَضَّأُ فِيْ مَا بَيْنَ ذَلِكَ. کیلئے ایک غسل کر لے اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نماز کیلئے ایک غسل کرلے اور نماز فجر کیلئے الگ سے ایک غسل کرلے اور ان کے درمیان میں وضو کرلے۔

لغوی تشریح : (باب الحیض) حیض اس خون کو کہتے ہیں جو بالغ ہونے پر عورت کے رحم سے ہر مہینہ خارج ہوتا ہے۔ یہ چند مخصوص دن میں ہوتا ہے' ناامیدی کی زندگی تک یہ آتا رہتا ہے۔ یعنی زیادہ عمر ہونے سے یہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ کسی بیماری ی ولادت کی وجہ سے نہیں ہوتا ﴿ یعرف ﴾ معرفت سے ماخوذ ہے۔ صیغہ مجہول۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ خواتین اسے جانتی اور پہچانتی ہیں کہ کون سا خون ہے؟ یہ بھی ایک رائے ہے کہ ﴿ یعرف ﴾ باب افعال سے ہے۔ اس صورت میں "یاء" پر ضمہ اور "راء" مکسور ہوگی۔ معنی یہ ہوں گے کہ خون کی بو ہی بتا دے گی کہ کونسا خون ہے؟ ﴿ فاذا کان ذلک ﴾ کاف کے نیچے کسرہ۔ یعنی جب تیری حالت ایسی ہو۔ ﴿ فامسکی ﴾ امر کا صیغہ ہے۔ واحد مونث۔ معنی نماز سے رک جا۔ ﴿ فاذا کان الاخر ﴾ جب خون کا وصف مذکورہ بالا نہ ہو۔ ﴿ واستنکر ﴾ اسے منکر قرار دیا۔ اس کے منکر ہونے کی وجہ اس حدیث کی سند میں عدی بن ثابت عن ابیہ عن جدہ ہے۔ اس کا دادا غیر معروف آدمی ہے۔ ابوداؤد نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ ﴿ مرکن ﴾ بہت بڑا پیالہ نما برتن (ٹب کی قسم کا) اس میں "میم" پر کسرہ اور "کاف" پر فتحہ ہے۔ ﴿ فاذا رات صفرۃ فوق الماء ﴾ جب وہ پانی پر زردی دیکھے تو اسے جان لینا چاہئے کہ یہ حیض کے جانے اور اس کے اختتام کی علامت ہے۔ ﴿ فلتغتسل للظهر والعصر غسلا واحدا ﴾ تو اسے ظہر اور عصر کی نمازوں کیلئے ایک ہی غسل کر لینا چاہئے۔ اس کی عملی صورت اس طرح ہوگی کہ ظہر کے وقت کو مؤخر کرے اور عصر کے وقت کو ذرا مقدم کرے اس طرح دونوں نمازیں اپنے اصلی وقت میں ادا بھی ہو جائیں گی اور جمع صوری بھی بن جائے گی اور اسی طرح مغرب و عشاء کی نمازوں کیلئے کر لے۔ ﴿ وتتوضا فیما بین ذلک ﴾ ان دونوں (ظہر اور عصر) اور مغرب و عشاء کے درمیان وضو کر لے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ صلاۃ ظہر کے وضو سے نماز عصر ادا نہیں کر سکتی اور اسی طرح مغرب کی نماز کے وضو سے عشاء کی نماز نہیں پڑھ سکتی۔ یہ مستحاضہ عورت کیلئے ہے۔ اگر دو نمازیں مستحاضہ اکٹھی پڑھنا چاہے تو وہ ایک وضو کے ساتھ صرف ایک فرض نماز ہی ادا کرے گی۔

حاصل کلام : نوجوان عورت کو تین طرح کے خون سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک حیض (ایام ماہواری) دوسرا دم نفاس جو بچے کی پیدائش سے لے کر چالیس ایام یا کم و بیش جاری رہتا ہے اور تیسرا دم استحاضہ۔ استحاضہ کا خون اسے کہتے ہیں جو ایام ماہواری اور نفاس کے چالیس یوم کے علاوہ جاری رہے۔ حیض کی اقل مدت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایک دن اور زیادہ سے زیادہ پندرہ دن تک ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں

کہ تین روز سے لے کر دس روز تک ہو سکتا ہے۔ ملکی' موسمی اور عورتوں کی طبائع کے اعتبار سے دونوں ائمہ کی رائے اپنی اپنی جگہ صائب ہو سکتی ہے۔ ویسے ہر عورت کو اپنی طبیعت اور عادت کی روشنی میں علم ہوتا ہے کہ اس کے ایام کی تعداد کتنی ہے۔ اس تعداد سے زیادہ خون جاری رہے تو اسے استحاضہ قرار دے کر اس کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا ﴾ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ۔ اپنے خاوند کے ساتھ ہجرت حبشہ کی۔ وہاں انہیں اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نوازا' جن سے ایک عبداللہ ہے۔ غزوہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اب ان کے بطن سے محمد نے جنم لیا جو محمد بن ابی بکر کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجیت میں لے لیا اور ان کے بطن سے یحییٰ پیدا ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے خوابوں کی تعبیر دریافت فرمایا کرتے تھے۔ ان کی وفات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی۔ (ذہن نشین رہے کہ عمیس عربی قوائد کی رو سے تصغیر ہے)

(۱۱۹) وَعَنْ حَمْنَةَ بِنْتِ جَحْشٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أُسْتَحَاضُ حَيْضَةً كَثِيْرَةً شَدِيْدَةً، فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَسْتَفْتِيْهِ، فَقَالَ: «إِنَّمَا هِيَ رَكْضَةٌ مِنَ الشَّيْطَانِ، فَتَحَيَّضِي سِتَّةَ أَيَّامٍ أَوْ سَبْعَةَ أَيَّامٍ، ثُمَّ اغْتَسِلِي، فَإِذَا اسْتَنْقَأْتِ فَصَلِّي أَرْبَعَةً وَعِشْرِينَ أَوْ ثَلاَثَةً وَعِشْرِينَ، وَصُومِي وَصَلِّي، فَإِنَّ ذَلِكَ يُجْزِئُكِ، وَكَذَلِكَ فَافْعَلِي كُلَّ شَهْرٍ، كَمَا تَحِيضُ النِّسَاءُ، فَإِنْ قَوِيتِ عَلَى أَنْ تُؤَخِّرِي الظُّهْرَ وَتُعَجِّلِي العَصْرَ، ثُمَّ تَغْتَسِلِي حِينَ تَطْهُرِينَ، وَتُصَلِّينَ الظُّهْرَ وَالعَصْرَ جَمِيعاً، ثُمَّ تُؤَخِّرِينَ المَغْرِبَ وَتُعَجِّلِينَ العِشَاءَ، ثُمَّ تَغْتَسِلِينَ وَتَجْمَعِينَ بَيْنَ الصَّلاَتَيْنِ،

حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سخت قسم کے عارضہ استحاضہ میں مبتلا رہتی تھی۔ میں نبی ﷺ کی خدمت میں استفسار کیلئے حاضر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا "یہ تو شیطان کی چوک (مار) ہے۔ لہٰذا تو چھ یا سات روز ایام حیض شمار کر کے پھر نہا لے' جب تو اچھی طرح پاک و صاف ہو جائے تو پھر چوبیس یا تیئس روز نماز پڑھ اور روزہ بھی رکھ۔ یقیناً یہ تیرے لئے کافی ہے پس ہر ماہ اسی طرح کر لیا کر جیسا کہ حیض والی خواتین کرتی ہیں۔ پھر اگر تم میں ظہر کو ذرا مؤخر کرنے اور عصر کو ذرا مقدم کرنے کی ہمت و طاقت ہے تو پھر غسل کر لے جب پاک و صاف ہو جائے تو ظہر اور عصر دونوں کو اکٹھا لا کر پڑھ لے۔ پھر مغرب کو مؤخر اور عشاء کو ذرا مقدم کر کے غسل کر لے اور جمع صلاتین کر لے۔ تو ایسا کر لے (یعنی ایسا کرنے کی اجازت ہے) اور صبح کی نماز کیلئے الگ غسل کر لے اور نماز پڑھ لے۔" پھر فرمایا "دونوں

فَافْعَلِي، وَتَغْتَسِلِينَ مَعَ الصُّبْحِ وَتُصَلِّينَ، قَالَ: وَهُوَ أَعْجَبُ الأَمْرَيْنِ إِلَيَّ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ البُخَارِيُّ.

باتوں میں سے مجھے یہ زیادہ پسند اور محبوب ہے۔" (اس کو نسائی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اسے حسن کہا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ استفتیه ﴾ میں نے آپؐ سے فتویٰ پوچھا۔ ﴿ رکضة ﴾ چوک مارنا وغیرہ۔ ﴿ فتحیضی ستة ایام او سبعة ایام ﴾ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ کچھ عورتوں کو حیض چھ روز آتا ہے اور کسی کو سات روز۔ اس میں عمر اور مزاج کو بھی دخل ہے۔ ﴿ فاذا استنقات ﴾ جب تو پاک صاف ہو جائے۔ ﴿ صومی وصلی ﴾ روزہ رکھ' نماز پڑھ' فرض ہو یا نفلی جو جی میں آئے ﴿ وھو اعجب الامرین الی ﴾ الامرین سے مراد ہر نماز کیلئے الگ الگ وضو کرنا اور دن رات میں تین مرتبہ نہانا اور غسل کرنا (یعنی میرے نزدیک پسندیدہ عمل شب و روز میں تین مرتبہ غسل کرنا ہے)

حاصل کلام : اس حدیث سے حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کو دن رات میں تین مرتبہ غسل کرنے کا حکم دیا۔ ایک ظہر اور عصر کیلئے دوسرا مغرب اور عشاء کیلئے اور تیسرا نماز فجر کیلئے۔ اس سے پہلی حدیث میں فاطمہ بنت ابی حبیش کو ہر نماز کیلئے وضو کا حکم دیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ استحاضہ کے مرض میں مبتلا عورت پر غسل واجب نہیں ہے البتہ ہر نماز کیلئے از سرنو وضو فرض ضرور ہے۔ غسل بس مستحب ہے وہ بھی صحت اور موسم اگر ساتھ دیں ورنہ چنداں ضرورت نہیں۔

راوی حدیث : ﴿ حمنه بنت جحش ﴾ حمنہ میں "حا" اور جحش کی جیم دونوں پر فتح ہے اور "میم" اور "حا" دونوں ساکن ہیں۔ یہ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش کی بہن تھیں۔ پہلے یہ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ غزوۂ احد میں مصعب شہید ہو گئے تو یہ طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں آگئیں۔

(۱۲۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ أُمَّ حَبِيْبَةَ بِنْتَ جَحْشٍ شَكَتْ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ الدَّمَ، فَقَالَ: «اُمْكُثِي قَدْرَ مَا كَانَتْ تَحْبِسُكِ حَيْضَتُكِ، ثُمَّ اغْتَسِلِي»، وَكَانَتْ تَغْتَسِلُ لِكُلِّ صَلاَةٍ. رواه مسلم.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام حبیبہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے دم استحاضہ کا شکوہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ "تمہارے ماہواری کے ایام جس قدر پہلے سے متعین ہیں اتنے ایام میں (نماز' روزہ) چھوڑ دے۔ اس کے بعد نہا دھو کر نماز ادا کرو۔" ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اس کے بعد ہر نماز کیلئے تازہ غسل کیا کرتی تھیں۔ (مسلم)

وَفِيْ رِوَايَةِ البُخَارِيِّ «وَتَوَضَّئِي

اور بخاری کی روایت میں ہے کہ "پھر ہر نماز کیلئے

لِكُلِّ صَلَاةٍ». وَهِيَ لأَبِيْ دَاوُدَ وَغَيْرِهِ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ. ازسر نو وضو کر لیا کر۔" ابوداؤد وغیرہ محدثین نے اس حدیث کو دوسرے طریقے سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ تحبسک ﴾ تیری ادائیگی نماز میں مانع ہو۔ رکاوٹ کا باعث بنے۔ چنانچہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ہر نماز کیلئے غسل سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسا کرنے کا نبی ﷺ نے حکم دیا تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث اور اس باب میں بیان شدہ احادیث کا ماحصل یہ ہے کہ مستحاضہ' استحاضہ کے خون اور حیض کے خون کو ان کی تین علامات میں سے کسی کی بنیاد پر دونوں میں فرق کرے گی۔ جہاں تک دونوں خونوں میں تمیز کا تعلق ہے تو اس طرح ہے کہ ایام ماہواری کا خون سیاہ رنگت کا اور گاڑھا ہوتا ہے اس کی بو بھی بڑی کریہ ہوتی ہے اور استحاضہ کے خون کی رنگت سرخ ہوتی ہے اور وہ رقیق یعنی پتلا ہوتا ہے یا پھر خون استحاضہ کے جاری ہونے سے پہلے اس عورت کی معمول بہ عادت کی طرف رجوع کیا جائے گا کہ کتنے روز تک ایام ماہواری جاری رہتے تھے یا پھر دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی ہم عمر اور ہم مزاج خواتین پر اس کو قیاس کیا جائے گا کہ ایسے مزاج اور اتنی عمر کی خواتین کو کتنے دن ایام ماہواری آسکتے ہیں یا آیا کرتے ہیں اور اگر مستحاضہ میں ایک سے زائد علامات جمع ہو جائیں تو پھر زیادہ قوی طریقے اور واضح دلیل سے اس کا تعین ہو سکے گا۔ دو یا تین علامات اگر باہم متعارض ہوں تو پھر بغیر تردد و شک کے حیض کے خون کے سیاہ رنگ کو مقدم رکھا جائے گا اور عقل بھی اس کو مقدم رکھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر عادت کا لحاظ رکھا جائے گا پھر ہم عمر اور ہم مزاج عورتوں کا خیال رکھا جائے گا۔ مندرجہ بالا مذکورہ علامتوں میں امتیاز و فرق کرنا نہایت آسان اور سہل ہے۔ عقلمند اور کند ذہن عورت اس فرق کو بآسانی اخذ کر سکتی ہے اور جس کی طرف فقہاء کی جماعت بالخصوص احناف گئے ہیں وہ بحث بڑی دقیق' گنجلک اور مغلق ہے۔ وہ عورتوں کے فہم و عقل سے بعید ہے بلکہ بہت ہی دور ہے اور یہ احادیث بھی اس مفہوم کا انکار کرتی ہیں۔ شریعت بیضاء جو سہل الفہم ہے وہ بھی اس کی طرف توجہ نہیں کرتی۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ہر نماز کیلئے غسل فرمایا کرتی تھیں۔ اس غسل کی نوعیت جمہور کے نزدیک تطوع کی ہے۔ ورنہ شریعت نے مستحاضہ پر ہر نماز کیلئے ازسر نو غسل کرنا فرض و واجب قرار نہیں دیا۔ فتح الباری میں علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی رائے کی تائید کی ہے۔ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ کسی صحیح حدیث سے مستحاضہ کیلئے ہر نماز کے وقت نیا غسل کرنا ثابت نہیں۔ مستحاضہ اپنے مقرر ایام ماہواری پورے ہونے کے بعد غسل کرے۔ اس کے بعد ہر نماز کیلئے استنجا کر کے وضو کرے اور نماز ادا کرے۔ مذکورہ حدیث دلیل ہے اس کی کہ مستحاضہ کو کسی نہ کسی شناخت کرانے والی علامت کی جانب توجہ کرنا چاہئے۔ پھر جس علامت سے اس کو پہچان ہو جائے' اسی پر کاربند ہو جائے۔

راوی حدیث: ﴿ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ﴾ بعض کا خیال ہے اس سے حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا ہی مراد ہے۔ ایسا نہیں

بلکہ صحیح اور درست یہ ہے کہ یہ ان کی بہن تھیں۔ یہ عبدالرحمٰن بن عوف کے نکاح میں تھیں۔ مسلم کی روایت کی رو سے انہیں مسلسل سات سال تک استحاضہ کا مرض لاحق رہا۔ ۴۴ھ میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہا
بعض نے کہا کہ جحش کی تین بیٹیاں تھیں۔ تینوں عارضہ استحاضہ کا شکار تھیں۔ ایک ام المومنین زینب' دوسری حمنہ اور تیسری ام حبیبہ۔ مگر صحیح یہ ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اس عارضہ سے محفوظ تھیں۔ کہتے ہیں کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں دس خواتین ایسی تھیں جو مستحاضہ کے عارضہ میں مبتلا رہتی تھیں۔

(۱۲۱) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنَّا لاَ نَعُدُّ الْكُدْرَةَ وَالصُّفْرَةَ بَعْدَ الطُّهْرِ شَيْئاً. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ہم (ایام ماہواری کے اختتام پر) نہادھو کر پاک و صاف ہونے کے بعد گدلے اور زرد رنگ کی چیز کو (اس چیز کے خارج ہونے کو) کوئی اہمیت نہیں دیتی تھیں (یعنی ایسے مادہ کے خروج کو حیض تصور نہیں کرتی تھیں۔)

(بخاری' ابوداؤد۔ متن حدیث کے الفاظ ابوداؤد کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ الکدرۃ ﴾ میل کچیل سے آلودہ رنگت والا پانی۔ ﴿ والصفرۃ ﴾ زنگ والی رنگت۔ جس پر زردی غالب ہو۔ ﴿ بعد الطھر ﴾ ایام حیض سے پاک و صاف ہونے کے بعد۔ ﴿ شیئا ﴾ یعنی ہم اسے حیض تصور نہیں کرتی تھیں۔ حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ حیض کے خون کے بعد جاری رہنے والے پانی کو جبکہ ایام ماہواری کی مدت پوری ہو جاتی تو ہم حیض شمار نہیں کرتے تھے۔

حاصل کلام: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زرد اور گدلے رنگ کے پانی کو حیض سمجھا اور شمار کیا جاتا تھا اور حدیث مذکور میں ہے کہ ہمارے نزدیک ایسے پانی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ بظاہر ان احادیث میں اختلاف معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت ذرا سا غور کرنے سے یہ اختلاف دور ہو جاتا ہے اگر مذکورہ بالا رنگت کا پانی دوران ایام حیض میں خارج ہو تو اسے حیض شمار کیا جائے اور مدت ایام کے بعد اس قسم کے پانی کی کوئی اہمیت نہیں۔ حدیث میں مذکور ﴿ بعد الطھر ﴾ کے الفاظ بھی اس طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عورتیں ایام ماہواری کے بعد حصول طہارت کے بعد رحم وغیرہ سے گدلے یا زرد رنگ کے پانی کو کوئی اہمیت نہ دیتی تھیں اور نہ اسے شمار کرتی تھیں۔ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم تھا۔ آپؐ کی اس پر خاموشی' تقریری حدیث کہلاتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ام عطیہ رضی اللہ عنہا ﴾ ان کا اسم گرامی نسیبہ تھا۔ کعب کی بیٹی تھیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حارث کی بیٹی تھیں۔ یہ بزرگ ترین مرتبہ کی صحابیات میں سے تھیں۔ غزوات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتی تھیں۔ مریضوں کی تیمارداری اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ غزوۂ احد میں بہادر مردوں کی طرح لڑیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے غسل کے وقت یہ موجود تھیں۔ انہوں نے بڑی صفائی سے ان کو

نہلایا۔ بصرہ کے ایام مقام میں ان سے علماء و تابعین کی کثیر تعداد نے احادیث اخذ کیں۔ ان کی اصل حدیث غسل میت کے بارے میں ہے اور ان کا شمار بصریوں میں ہوتا ہے۔

(١٢٢) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ الْيَهُودَ كَانُوا إِذَا حَاضَتِ الْمَرْأَةُ فِيهِمْ لَمْ يُؤَاكِلُوهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «اصْنَعُوا كُلَّ شَيْءٍ إِلاَّ النِّكَاحَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہودیوں کے ہاں جب کسی عورت کو حیض آتا تو وہ اس عورت کے ساتھ کھانا پینا ترک کر دیتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "(اے مسلمانو!) تم ہم بستری کے علاوہ ہر قسم کا فعل عورت کے ساتھ کر سکتے ہو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لم یواکلوھا﴾ یعنی اس (ایام ماہواری میں مبتلا) عورت کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے نہ تھے۔ ﴿الا النکاح﴾ نکاح یہاں جماع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حاصل کلام: نبی آخر الزماں ﷺ کے ارشاد کی روشنی سے مسلمانوں کیلئے حائضہ عورت کے ساتھ بیٹھنا' لیٹنا' کھانا اور پینا سب جائز ہے صرف تعلق زن و شو سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ یہ چھوت چھات کی بیماری ہنود و یہود کے ہاں ہے مسلمانوں کیلئے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

(١٢٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَأْمُرُنِي فَأَتَّزِرُ، فَيُبَاشِرُنِيْ وَأَنَا حَائِضٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مجھے تہبند مضبوطی سے باندھنے کا حکم فرماتے پھر میرے ساتھ چمٹ کر لیٹ جاتے حالانکہ میں اس وقت حالت حیض میں ہوتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فاتزر﴾ باب افتعال سے صیغہ واحد متکلم ہے جس کے معنی ہیں میں ازار پہن لیتی۔ ﴿فیباشرنی﴾ میرے ساتھ اپنا جسم لگاتے اور یہ جماع کے علاوہ ہوتا تھا۔ یعنی مباشرت جماع کے معنی میں نہیں ہے۔

حاصل کلام: ﴿باشر یباشر مباشرۃ﴾ ایک دوسرے کے ساتھ اپنا جسم لگانا۔ یہ اس کے لغوی معنی ہیں مجازی طور پر اس سے جماع کے معنی بھی لئے جاتے ہیں۔ ستم ظریفی دیکھئے منکرین حدیث کی کہ انہوں نے عوام کو احادیث نبویہؐ سے بدظن اور متنفر کرنے کیلئے اس کا معنی کیا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضور ﷺ حالت حیض میں اپنی بیویوں سے مباشرت (جماع) کر لیتے تھے جب کہ قرآن مجید میں اس کی صریحاً ممانعت ہے۔ نتیجہ اس سے یہ برآمد کرتے ہیں کہ احادیث جھوٹی ہیں' یہ قابل اعتبار نہیں حالانکہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ مباشرت کے معنی جسم کے ساتھ جسم لگانا ہے تو اس سے جماع کے معنی کرنا بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے۔ شریعت نے زیر ناف کے علاوہ عورت کے جسم سے لذت حاصل کرنا جائز قرار دیا ہے۔

(١٢٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللهِ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایسے آدمی کے بارے میں بیان کیا ہے جو

ﷺ، فِيْ الَّذِيْ يَأْتِي امْرَأَتَهُ وَهِيَ حَائِضٌ، قَالَ: «**يَتَصَدَّقُ بِدِيْنَارٍ أَوْ بِنِصْفِ دِيْنَارٍ**». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ وَابْنُ القَطَّانِ، وَرَجَّحَ غَيْرُهُمَا وَقْفَهُ.

اپنی بیوی کے پاس ایسی حالت میں جائے جبکہ وہ حالت حیض میں ہو "وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ و خیرات کرے۔" (اس حدیث کو پانچوں نے روایت کیا ہے۔ حاکم اور ابن قطان دونوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ان دونوں کے علاوہ دوسرے محدثین نے اسے موقوف کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یاتی امراتہ ﴾ کا معنی ہے کہ اپنی بیوی سے جماع کرے اور جہاں تک دینار یا نصف دینار خیرات کرنے کا تعلق ہے تو ایک گروہ نے اسے جائز رکھا ہے جبکہ دوسروں نے حدیث میں اضطراب اور عدم صحت کی وجہ سے کفارے کا حکم نہیں دیا۔ پھر جو لوگ کفارہ کے قائل ہیں ان میں سے کسی نے کہا ہے کہ دینار یا نصف بیان کرنا راوی کا تردد ہے اور ان میں سے کسی نے یہ تاویل کی ہے کہ یہاں نوعیت بتانا مقصود ہے کہ اگر حیض کا آغاز ہو تو ایسی حالت میں جماع کرنے والا ایک دینار صدقہ کرے اور دوسری کوئی نوعیت ہو تو نصف دینار خیرات کرے۔ ان میں سے کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں اختیار دیا گیا ہے خواہ دینار صدقہ کرے خواہ نصف دینار۔ بہرحال یہاں امروجوب کیلئے نہیں ہے بلکہ مندوب و مستحب ہے۔ باعتبار دلیل یہی رائے قابل ترجیح ہے۔

(١٢٥) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتِ المَرْأَةُ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ؟**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "کیا عورت جب حالت حیض میں ہوتی ہے تو نماز اور روزہ چھوڑ نہیں دیتی؟" (بخاری، مسلم۔ یہ لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الیس ﴾ اس میں ہمزہ انکار کے معنی میں استعمال ہوا ہے جب نفی کا انکار ہو تو اثبات ثابت ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوئے کہ شریعت میں تو ایسی عورت کیلئے ترک صلاۃ و صوم ثابت ہے (البتہ روزے دوسرے ایام میں قضا کرے گی۔ (دلائل سے یہ ثابت ہے) جبکہ نماز کی قضا نہیں۔ اس لئے اس کا قضا کرنا عورت کے بس میں نہیں ہے۔

(١٢٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: لَمَّا جِئْنَا سَرِفَ حِضْتُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «**افْعَلِي مَا يَفْعَلُ الحَاجُّ، غَيْرَ أَنْ لاَ تَطُوْفِي**

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب مقام سرف میں آئے تو مجھے ایام ماہواری شروع ہوگئے (میرے بتانے پر) نبی ﷺ نے فرمایا "مناسک حج تم بھی اسی طرح ادا کرو جس طرح دوسرے حاجی کرتے ہیں

بِالْبَيْتِ حَتَّى تَطْهُرِي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِيْ حَدِيثٍ طَوِيلٍ.

البتہ طواف بیت اللہ ایام سے فارغ ہو کر نہا دھو کر کرنا۔" (بخاری و مسلم یہ لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لما جئنا﴾ جب ہم آئے۔ یہ دراصل حجۃ الوداع کے دوران سفر کا واقعہ ہے۔ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حالت احرام میں تھیں۔ ﴿سرف﴾ سین پر فتحہ اور "راء" پر کسرہ۔ غیر منصرف ہے دو اسباب کی وجہ سے ایک علمیت یعنی جگہ کا نام اور دوسرے تانیث کی وجہ سے۔ مکہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ تقریباً دس میل کے فاصلہ پر۔ ﴿حضت﴾ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ مجھے ایام ماہواری شروع ہوگئے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے حائضہ عورت بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ طواف کیلئے پاکیزگی شرط ہے۔ حالت حیض میں عورت چونکہ ناپاک ہو جاتی ہے۔ ناپاک عورت تو مسجد میں داخل بھی نہیں ہو سکتی خانہ کعبہ تو افضل المساجد ہے۔ اس لئے طواف بدرجہ اولیٰ نہیں کر سکتی۔ بلکہ ایسی حالت میں تو وہ نماز بھی نہیں پڑھ سکتی۔ اسی لئے مصنف نے اس حدیث کو اس باب میں ذکر کیا ہے۔

(۱۲۷) وَعَنْ مُعَاذِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ، مَا يَحِلُّ لِلرَّجُلِ مِنَ امْرَأَتِهِ وَهِيَ حَائِضٌ؟ فَقَالَ: «مَا فَوْقَ الإِزَارِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَضَعَّفَهُ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ جب عورت ایام ماہواری میں ہو تو عورت کی اپنے شوہر کیلئے کیا کیا چیز حلال ہے؟ آپؐ نے فرمایا "پاجامہ یا تہ بند میں جسم کا جتنا حصہ ہے اسے چھوڑ کر باقی حصہ اس کیلئے حلال ہے۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الازار﴾ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو ازار سے مراد جماع و باہم ہم بستری یعنی شوہر کیلئے جماع کے علاوہ باقی سب کچھ کر گزرنا جائز ہے اور دوسرا معنی پاجامہ و تہ بند کی جگہ یعنی ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھوڑ کر باقی حصہ جسم سے مباشرت حلال ہے اور دوسرے معنی کی رو سے تو یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ۱۴۱ کے الفاظ ﴿اصنعوا كل شئى الا النكاح﴾ کہ جماع کے علاوہ ہر قسم کا کام اس سے کرو۔ کیونکہ سابقہ حدیث سے صرف جماع کی ممانعت ہے اور اس میں ناف سے گھٹنے تک کے سارے حصہ سے استمتاع کی ممانعت ہے مگر اولاً تو یہ روایت ضعیف ہے۔ ثانیاً اس سے مراد صرف جماع اور وطی ہے جس سے یہ پہلی روایت کے معارض نہیں رہتی۔

(۱۲۸) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَتِ النُّفَسَاءُ تَقْعُدُ على عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ بَعْدَ

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں عورتیں بچے کی ولادت کے بعد چالیس روز تک ناپاک بیٹھی رہتی تھیں۔ (نسائی

نِفَاسِهَا أَرْبَعِيْنَ يَوْماً. رَوَاهُ الخَمْسَةُ إلاَّ النَّسَآئِيُّ، وَاللَّفْظُ لِأبِي دَاوُدَ.

(نسائی کے علاوہ پانچوں نے اسے روایت کیا ہے اور متن حدیث کے الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔)

وَفِيْ لَفْظٍ لَهُ: وَلَمْ يَأْمُرْهَا النَّبِيُّ ﷺ بِقَضَآءِ صَلاَةِ النِّفَاسِ. وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

اور اس کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایام نفاس میں چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کا حکم نہیں دیا۔ (اسے حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿نفساء﴾ نون پر ضمہ' فا اور سین پر فتحہ۔ ان عورتوں کو کہتے ہیں جنھوں نے بچے کو جنم دیا ہو۔ نفاس اس خون کو کہتے ہیں جو ولادت کے بعد عورت کے رحم سے عموماً چالیس روز تک خارج ہوتا رہتا ہے۔ ﴿اربعین یوما﴾ چالیس روز نفاس کی کثیر مدت ہے۔ ابن ماجہ میں ایک روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے بایں الفاظ بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حالت نفاس میں مبتلا عورتوں کیلئے مدت نفاس چالیس روز مقرر فرمائی' البتہ اگر وہ چالیس روز سے پہلے پاک ہو جائے تو (اس کی مدت یہی شمار ہوگی)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نفاس والی خواتین کی اکثر مدت چالیس روز ہے۔ اس کی کم از کم مدت کوئی نہیں' ہاں اگر چالیس روز سے تجاوز کر جائے تو پھر وہ حالت استحاضہ شمار ہوگی۔ اس حالت میں نماز' روزہ ترک نہ کئے جائیں گے۔ تعلق زن و شو بھی قائم ہو سکتے ہیں۔ البتہ نفاس کا حکم تو حیض کی طرح ہے۔ نفاس والی عورت' نماز روزہ ترک کر سکتی' مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی۔ طواف کعبہ بھی نہیں کر سکتی۔ تلاوت قرآن اور قرآن کو چھونے سے اجتناب کرے گی۔ اس دوران جتنے روزے چھوٹ گئے تھے ان کی دوسرے ایام میں قضا ضرور دے گی۔ نماز کی قضا نہیں دے گی۔

٢ـ كِتَابُ الصَّلاَةِ

نماز کے احکام

١ - بَابُ المَوَاقِيتِ

اوقات نماز کا بیان

(١٢٩) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ الله تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «وَقْتُ الظُّهْرِ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ، وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطُولِهِ، مَا لَمْ يَحْضُرِ العَصْرُ، وَوَقْتُ العَصْرِ مَا لَمْ تَصْفَرَّ الشَّمْسُ، وَوَقْتُ صَلاَةِ المَغْرِبِ مَا لَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ، وَوَقْتُ صَلاَةِ العِشَاءِ إِلَى نِصْفِ اللَّيْلِ الأَوْسَطِ، وَوَقْتُ صَلاَةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوعِ الفَجْرِ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "نماز ظہر کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور نماز عصر کے وقت کے آغاز تک رہتا ہے' اور عصر کا وقت جب آدمی کا اصل سایہ اس کے قد کے برابر ہو جائے (تب شروع ہوتا ہے) اور نماز عصر کا آخری وقت سورج کی رنگت زرد ہو جانے تک رہتا ہے اور نماز مغرب کا وقت (غروب آفتاب کے ساتھ ہی شروع ہوتا اور) شفق کے غائب ہونے تک رہتا ہے۔ عشاء کی نماز کا وقت رات کے درمیانے نصف تک ہے اور نماز فجر کا وقت صبح صادق کے آغاز سے شروع ہو کر طلوع شمس تک رہتا ہے۔" (مسلم)

وَلَهُ مِنْ حَدِيْثِ بُرَيْدَةَ فِي العَصْرِ: «وَالشَّمْسُ بَيْضَاءُ نَقِيَّةٌ» وَمِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ مُوسَى: «وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ».

اور اسی (یعنی مسلم) میں بریدہ رضی اللہ عنہ سے عصر کے بارے میں مروی ہے کہ "سورج سفید اور بالکل صاف حالت میں ہو" اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "آفتاب بلند ہو۔"

لغوی تشریح: ﴿کتاب الصلاۃ﴾ صلاۃ کے لغوی معنی دعا کے ہیں اور اصطلاح شرع میں معروف

عبادت کو کہتے ہیں۔ ﴿ باب المواقیت ﴾ مواقیت' میقات کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ وقت محدود ہے جو کسی کام کیلئے مقرر کیا گیا ہو۔ بلحاظ زمانہ یا مکان۔ یہاں اس سے مراد نمازوں کی ادائیگی کیلئے اللہ تعالیٰ کا مقرر و متعین فرمایا ہوا وقت ہے۔ ﴿ اذا زالت الشمس ﴾ جب سورج زوال پزیر ہو۔ یعنی آسمان کے عین درمیان سے جب بجانب مغرب سورج ڈھل جائے۔ ﴿ وکان ظل الرجل کطولہ ﴾ اور انسان کا سایہ اپنے قد کے برابر ہو۔ یعنی عصر کا وقت تب تک رہتا ہے جب تک کہ ہر چیز کا سایہ اصل چیز کے قد کے برابر ہو جائے۔ ﴿ مالم یحضر العصر ﴾ تاوقتیکہ نماز عصر کا وقت آجائے۔ یعنی آدمی کا (اصلی) سایہ اس کے قد کے برابر ہونا۔ ﴿ الشفق ﴾ غروب آفتاب کے بعد افق آسمان پر جو سرخی نمودار ہوتی ہے۔ ﴿ الی نصف اللیل الاوسط ﴾ یہاں لفظ اوسط نصف کی صفت بن رہی ہے اور اس سے مراد رات کا پہلا حصہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رات کو دو حصوں میں تقسیم کریں تو پہلا نصف حصہ اوسط کہلائے گا' اب پہلے نصف حصہ رات تک نماز عشاء کا وقت رہتا ہے۔ ﴿ نقیۃ ﴾ فعیلۃ کے وزن پر آیا ہے۔ صاف ستھرا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایسا صاف و شفاف جس میں زرد رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ ﴿ مرتفعۃ ﴾ آسمان میں بلند و بالا ہو اور مغرب کی جانب مائل نہ ہو۔ حدیث بالا میں نماز کی ادائیگی کے اوقات بیان کئے گئے ہیں۔ نماز عشاء کا آخری وقت کون سا ہے؟ اس میں مختلف آراء ہیں۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ یہ طلوع فجر تک ہے۔ اس حدیث میں جو بیان ہوا ہے اس سے مراد مختار وقت ہے اور بعض کا یہ بھی قول ہے کہ آدھی رات کو عشاء کی نماز کا وقت ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ظہر کا وقت ایک مثل تک ثابت ہوتا ہے اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ ائمہ ثلاثہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مذہب ہے' ایک روایت کی رو سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے بھی اسی طرح ہے لیکن ان کی طرف جو مشہور روایت منسوب ہے وہ دو مثل کی ہے۔ علمائے احناف نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت کو قبول نہیں کیا۔ کسی صحیح مرفوع حدیث سے بھی دو مثل تک ظہر کا وقت ثابت نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ نماز ظہر ایک مثل کے درمیان ہی میں ادا کر لی جائے۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے دونوں شاگرد قاضی ابویوسف اور امام محمد کا بھی یہی فیصلہ ہے۔ اس حدیث سے ایک مسئلہ شفق کا بھی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ غروب آفتاب کے بعد افق آسمان پر سرخی نمودار ہوتی ہے اس کے معاً بعد جو سفیدی ظاہری ہوتی ہے شفق سے وہ سفیدی مراد ہے۔ اس کے برعکس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ سرخی ہے جو غروب شمس کے ساتھ افق آسمان پر نمایاں ہوتی ہے۔ قرین قیاس بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

اس حدیث میں طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت نماز پڑھنا ممنوع ہے یعنی جب سورج طلوع ہونے لگے تو نماز بند کر دینی چاہئے۔ اس لئے کہ اس وقت سورج شیطان کے دو سینگوں میں طلوع ہوتا ہے اور وہ آفتاب پرستوں کا مخصوص وقت ہے۔ اس لئے عین غروب شمس کے وقت نماز پڑھنی شروع

نہیں کرنی چاہئے۔ اس حدیث سے اوقات صلاۃ خمسہ بھی معلوم ہوتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کیلئے اول اور آخر وقت یہی ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ دھوپ کے زردی مائل ہو جانے اور دو مثل سایہ کے بعد عصر کا وقت اور آدھی رات کے بعد عشاء کا وقت رہتا بھی ہے یا نہیں۔ اس حدیث سے یہی ثابت ہو رہا ہے کہ نہیں رہتا۔ البتہ کسی خاص مجبوری اور عذر کی حالت میں دھوپ کے زرد ہونے کے بعد عصر کا وقت اور نصف شب کے بعد عشاء کا وقت ہوتا ہے' بہرحال مختار وقت تو نہیں رہے گا۔ نیز بغیر عذر معقول کے سورج کے زرد ہونے کے بعد نماز پڑھنے والے کو حدیث میں منافق شمار کیا گیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿بریدہؓ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ اور بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ نام ہے۔ بریدہ اور حصیب دونوں تصغیر ہیں۔ قبیلہ اسلم سے ہونے کی وجہ سے اسلمی کہلائے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت مدینہ کے دوران اس کے پاس سے گزرے تو اس موقع پر جو اسی آدمی مسلمان ہوئے ان میں یہ بھی شامل تھے۔ غزوۂ احد کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ بیعت رضوان میں حاضر تھے۔ بصرہ کی طرف چلے گئے تھے پھر وہاں سے خراسان کی جانب جہاد کیلئے نکل گئے اور مرو میں قیام پذیر ہوئے۔ وہیں ان کی وفات ہوئی۔ ۶۲ھ یا ۶۳ھ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

﴿ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ﴾ اس سے مراد عبداللہ بن قیس اشعری رضی اللہ عنہ ہیں۔ جلیل القدر صحابہؓ میں ان کا شمار ہے۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ زبید اور عدن پر عامل مقرر ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یہ کوفہ اور بصرہ کے والی مقرر ہوئے۔ ان کے ہاتھوں تستر فتح ہوا اور دیگر بہت سے شہر بھی انہوں نے فتح کئے۔ ۴۲ھ میں وفات پائی۔

(۱۳۰) وَعَنْ أَبِيْ بَرْزَةَ الأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي العَصْرَ، ثُمَّ يَرْجِعُ أَحَدُنَا إِلَى رَحْلِهِ فِي أَقْصَى المَدِيْنَةِ وَالشَّمْسُ حَيَّةٌ، وَكَانَ يَسْتَحِبُّ أَنْ يُؤَخِّرَ مِنَ العِشَاءِ، وَكَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالحَدِيْثَ بَعْدَهَا، وَكَانَ يَنْفَتِلُ مِنْ صَلاَةِ الغَدَاةِ حِيْنَ يَعْرِفُ الرَّجُلُ جَلِيْسَهُ، وَكَانَ يَقْرَأُ بِالسِّتِّيْنَ إِلَى المِائَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبرزہ اسلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر (ایسے وقت) میں پڑھتے کہ ہم میں سے کوئی ایک مدینہ کی آخری حدود تک چلا جاتا پھر آفتاب زندہ (روشن' صاف) ہوتا اور آپؐ نماز عشاء کو تاخیر سے پڑھنا پسند فرماتے تھے۔ نماز عشاء سے پہلے سونے اور بعد از نماز عشاء (غیر ضروری) باتیں کرنے کو ناپسند اور مکروہ خیال فرماتے اور نماز فجر سے ایسے وقت فارغ ہوتے جب نمازی اپنے ساتھ والے شخص کو پہچان لیتا (عموماً) ساٹھ سے سو آیات کی تعداد تک تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

وَعِنْدَهُمَا مِنْ حَدِيْثِ جَابِرٍ: «وَالعِشَآءُ أَحْيانًا يُقَدِّمُهَا، وَأَحْيانًا يُؤَخِّرُهَا، إِذَا رَآهُمُ اجْتَمَعُوا عَجَّلَ وَإِذَا رَآهُمْ أَبْطَؤُوا أَخَّرَ، وَالصُّبْحُ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيْهَا بِغَلَسٍ.

اور جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے' کہ آپؐ نماز عشاء کبھی جلدی پڑھ لیتے اور کبھی تاخیر سے۔ اس کی صورت یہ ہوتی کہ آپؐ دیکھتے کہ نمازی جمع ہو چکے ہیں تو جلد پڑھا دیتے اور اگر دیکھتے کہ نمازی دیر سے آتے ہیں تو تاخیر کرتے (البتہ صبح کی نماز آپؐ اندھیرے ہی میں پڑھتے) (بخاری و مسلم)

وَلِمُسْلِمٍ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي مُوْسَى: «فَأَقَامَ الفَجْرَ حِيْنَ انْشَقَّ الفَجْرُ، وَالنَّاسُ لاَ يَكَادُ يَعْرِفُ بَعْضُهُمْ بَعْضاً».

مسلم میں ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صبح کی نماز صبح صادق طلوع ہوتے ہی شروع فرما دیتے یہاں تک کہ اندھیرے کی وجہ سے صحابہ ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے تھے۔

لغوی تشریح : ﴿ رحلہ ﴾ "راء" پر فتحہ "حاء" ساکن' جائے سکونت۔ ﴿ فی اقصی المدینۃ ﴾ گرائمر کے اعتبار سے یہ رحل سے حال واقع ہو رہا ہے۔ مدینہ کی انتہائی اور دور ترین جگہ۔ ﴿ والشمس حیۃ ﴾ اس میں "واؤ" ﴿ یرجع ﴾ کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے۔ معنی یہ ہیں' نماز سے فراغت کے بعد جانے والا آدمی سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اپنی جائے رہائش پر پہنچ جاتا (یعنی عصر کی نماز اتنی جلدی ادا کی جاتی تھی) اور سورج کے زندہ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ابھی سورج کی سفیدی باقی ہوتی تھی۔ اور ﴿ من العشاء ﴾ میں من تبعیضیہ ہے مطلب یہ ہے عشاء میں تھوڑی بہت تاخیر آپؐ کو پسند تھی۔ ﴿ ینفتل ﴾ ینصرف کے معنی' میں فارغ ہوتے' پھرتے ﴿ الغداۃ ﴾ فجر' صبح ﴿ بالستین ﴾ ساٹھ آیات سے۔ ﴿ الی المائۃ ﴾ سو تک۔ یعنی آیات اگر لمبی ہوتیں تو ساٹھ تک تلاوت فرماتے اور اگر آیات چھوٹی چھوٹی ہوتیں تو سو تک پڑھتے۔ نماز فجر میں ساٹھ آیات تلاوت فرماتے اور اگر آیات چھوٹی چھوٹی ہوتیں تو سو تک پڑھتے۔ نماز فجر ایسے وقت میں پڑھتے کہ ایک ساتھی بھی دوسرے ساتھی کو (اچھی طرح) پہچان نہ سکتا تھا۔ اتنی طویل قرأت اس بات کی دلیل ہے کہ نماز فجر اول وقت میں پڑھتے تھے ﴿ الغلس ﴾ اول وقت ہوتی ہے اسے غلس کہتے ہیں۔ ﴿ انشق ﴾ پھٹنا' تاریکی شب سے سپیدۂ صبح کا ظہور ہونا۔

حاصل کلام : اس حدیث میں لفظ "غلس" سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نماز فجر اول وقت اندھیرے میں پڑھتے تھے اور صبح کی نماز میں آپؐ ساٹھ سے سو آیات تک تلاوت فرمایا کرتے تھے اور وہ بھی ترتیل سے ٹھہر ٹھہر کر۔ اس سے بھی اندازہ کر لیجئے کہ آپؐ نماز کا آغاز کس وقت میں کرتے ہوں گے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ نماز فجر اول وقت اندھیرے میں پڑھنی چاہئے مگر صبح صادق کا اچھی طرح نمایاں ہونا ضروری ہے' اس لئے کہ اس سے پہلے تو نماز کا وقت ہی نہیں ہوتا۔

راوی حدیث : ﴿ ابوبرزہ اسلمی رضی اللہ عنہ ﴾ ابوبرزہ ان کی کنیت ہے۔ نفلہ بن عبید نام ہے۔ قدیم الاسلام صحابہؓ میں سے ہیں۔ فتح مکہ اور بعد والے غزوات میں شریک رہے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی پھر بعد میں خراسان میں چلے گئے اور ایک قول کے مطابق مرو میں ۶۰ھ میں وفات پائی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا سن وفات ۶۴ھ ہے۔

(۱۳۱) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّي الْمَغْرِبَ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَيَنْصَرِفُ أَحَدُنَا وَإِنَّهُ لَيُبْصِرُ مَوَاقِعَ نَبْلِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نماز مغرب نبی کریم ﷺ کے ساتھ پڑھتے پھر ہم میں سے کوئی نماز سے فارغ ہو کر واپس ہوتا (تو اتنی روشنی ابھی باقی ہوتی تھی) کہ تیر کے گرنے کی جگہ دیکھ لیتا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ مواقع نبلہ ﴾ موقع کی جمع۔ تیروں کے گرنے کی جگہیں۔ ﴿ والنبل ﴾ نون پر فتحہ اور "با" ساکن۔ ان لفظوں میں اس کا واحد استعمال نہیں ہوتا۔ اس کے معنی ہیں تیر۔

حاصل کلام : نماز مغرب میں زیادہ تاخیر جائز نہیں۔ اس کے ادا کرنے میں جلدی ہی بہتر ہے جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

راوی حدیث : ﴿ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ کم عمری و صغر سنی کی وجہ سے غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ غزوۂ احد اور بعد کے غزوات میں برابر شریک رہے۔ ۷۳ھ یا ۷۴ھ میں ۸۶ برس کی عمر میں وفات پائی۔

(۱۳۲) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَعْتَمَ النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ بِالعِشَآءِ، حَتَّى ذَهَبَتْ عَامَّةُ اللَّيْلِ، ثُمَّ خَرَجَ فَصَلَّى، وَقَالَ: «إِنَّهُ لَوَقْتُهَا، لَوْلاَ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي»، رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شب نماز عشاء اتنی تاخیر سے پڑھی کی رات کا اول حصہ زیادہ تر گزر گیا تھا۔ آپؐ نماز کیلئے تشریف لائے اور نماز پڑھی اور فرمایا کہ اگر میری امت پر (یہ وقت) گراں نہ ہوتا تو میں نماز عشاء کا یہی وقت مقرر کرتا۔" (مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ اعتم ﴾ تاخیر کی' دیر کی اعتام سے ماخوذ ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ ﴿ عتمۃ ﴾ میں داخل ہوئے۔ عتمۃ ' شفق کے غائب ہونے کے بعد' یا مطلق تاریکی کے غائب ہونے کے بعد رات کے تیسرے حصے کے گزر جانے کو کہتے ہیں اور ایک قول کے مطابق یہ ﴿ العتم ﴾ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی تاخیر اور دیر کے ہیں۔ ﴿ عامۃ اللیل ﴾ رات کا اکثر حصہ۔ ﴿ انہ لوقتھا ﴾ اس سے مختار وقت بھی مراد ہو سکتا ہے اور افضل وقت بھی۔

حاصل کلام : یہ حدیث اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نماز عشاء تاخیر سے پڑھنا افضل ہے۔ تاخیر سے

ادائیگی کی صورت میں افضلیت کا ثواب صرف اسی نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی نماز کے ساتھ نہیں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس نماز کیلئے کبھی نمازیوں کی آمد کا انتظار بھی کر لیا کرتے تھے اگر دیر سے جمع ہوتے تو نماز میں بھی تاخیر فرما لیتے اور اگر نمازی جلد جمع ہو جاتے تو جلدی جماعت کرا دیتے۔ تو گویا آنحضور ﷺ اپنی امت کا خیال رکھتے جو چیز افراد امت کیلئے مشقت اور دشواری کا باعث ہوتی اسے آسان اور سہل بنانے کی کوشش فرماتے۔

(١٣٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِذَا اشْتَدَّ الحَرُّ فَأَبْرِدُوا بِالصَّلاَةِ، فَإِنَّ شِدَّةَ الحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْه.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب گرمی کی شدت ہو تو اس وقت (ٹھنڈے وقت میں) نماز پڑھو (یعنی ذرا انتظار کر لو کہ وقت ذرا ٹھنڈا ہو جائے) کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی سانس کی لپیٹ سے پیدا ہوتی ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فابردوا ﴾ ابراد سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھنڈے وقت میں داخل ہو جاؤ۔ ﴿ بالصلاۃ ﴾ سے مراد نماز ظہر ہے یعنی نماز ظہر کو ٹھنڈے اور سرد وقت میں ادا کرو۔ ﴿ من فیح جھنم ﴾ فیح کی "فا" پر فتحہ اور "یا" ساکن ہے۔ جہنم کی گرمی و حرارت کی لپیٹ اور اس کے پھیلاؤ کی وسعت اور جہنم کے سانس کو بھی فیح کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موسم گرما میں نماز ظہر ذرا تاخیر سے پڑھنی چاہئے۔ مگر اس تاخیر کی حد کیا ہونی چاہئے' اس بارے میں ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ موسم گرما میں اتنی تاخیر کرتے کہ سایہ تین قدم سے لے کر پانچ قدم تک ہو جاتا۔ مگر علامہ خطابی نے کہا کہ یہ بھی تمام ممالک کیلئے قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ طول بلد و عرض بلد کے اعتبار سے اس کا حساب بھی مختلف ہوگا۔ بہرحال موسم گرما میں نماز ظہر ذرا تاخیر سے پڑھنی مستحب ہے یہی جمہور اہل علم کی رائے ہے۔

(١٣٤) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**أَصْبِحُوا بِالصُّبْحِ، فَإِنَّهُ أَعْظَمُ لِأُجُورِكُمْ**». رَوَاهُ الخَمْسَةُ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز فجر صبح کے خوب واضح ہونے پر پڑھا کرو۔ یہ تمہارے اجر میں اضافہ کا موجب ہوگی۔" (اس کو پانچوں احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اصبحوا بالصبح ﴾ اور ایک دوسری روایت میں ﴿ اصبحوا بالصبح ﴾ کے بجائے ﴿ اسفروا بالفجر ﴾ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ نماز فجر

اس وقت پڑھو جب صبح خوب روشن اور واضح ہو جائے۔ مگر اس معنی کے اعتبار سے یہ حدیث غلس والی حدیث کے معارض ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ نماز کا آغاز تاریکی اور اندھیرے میں کیا جائے اور قرأت لمبی کی جائے کہ صبح خوب روشن اور واضح ہو جائے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو ترجیح دی ہے مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے "اسفار" کا مفہوم یہ بتلایا ہے کہ فجر واضح ہونے میں کوئی شک نہ رہے۔

حاصل کلام: احناف نے اسی حدیث کی روشنی میں اسفار کو افضل قرار دیا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی عمل، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے عمل کی بناء پر یہ استدلال وزنی نہیں رہتا۔ ابوداؤد میں حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک بار نماز فجر غلس (تاریکی) میں پڑھی اور ایک بار اسفار میں بھی پڑھی۔ بعد ازاں وفات تک ہمیشہ غلس ہی میں پڑھتے رہے۔ حدیث کا مطلب صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ صبح واضح اور صاف طور پر معلوم ہونے لگے۔ کسی قسم کا شک باقی نہ رہے جیسا کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے فرمایا ہے۔

(١٣٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الصُّبْحِ رَكْعَةً قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ، وَمَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ العَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ العَصْرَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "طلوع آفتاب سے پہلے جس نے نماز فجر کی ایک رکعت پالی اس نے صبح کی نماز پالی اور جس نے غروب آفتاب سے قبل نماز عصر کی ایک رکعت پالی اس نے عصر کی نماز پالی۔"

(بخاری و مسلم)

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا نَحْوُه، وَقَالَ: «سَجْدَةً» بَدْلَ «رَكْعَةً» ثُمَّ قَالَ: وَالسَّجْدَةُ إِنَّمَا هِيَ الرَّكْعَةُ.

مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں بھی اسی طرح بیان ہے مگر اس میں رکعۃ کی جگہ (سجدۃ) کا لفظ ہے پھر کہا کہ (سجدۃ) سے مراد تو رکعت ہی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لا صلاۃ ﴾ یعنی کوئی نماز۔ اس سے نفل نماز مراد ہے۔ ﴿ بعد الصبح ﴾ یعنی نماز فجر کے بعد کوئی نفلی نماز جائز نہیں۔ ﴿ من ادرک رکعۃ ﴾ جس نے ایک رکعت پالی۔ یعنی مکمل ایک رکعت، قیام، قراءۃ فاتحہ اور رکوع و سجود پالئے۔ ﴿ قبل ان تطلع الشمس ﴾ یعنی آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے ﴿ فقد ادرک الصبح ﴾ تو اس نے صبح پالی۔ یعنی اس کی نماز ادا ہوگئی۔ (قضاء نہیں ہوئی)

حاصل کلام: عین طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت نماز کا آغاز ممنوع ہے لیکن اگر کسی نے نماز پہلے شروع کرلی پھر طلوع یا غروب آفتاب کا موقع آگیا تو نمازی کو چاہئے کہ دوسری رکعت پوری کرلے

اس کی نماز ہو جائے گی۔

(١٣٦) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسولَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: «**لَا صَلَاةَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ وَلَا صَلَاةَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتَّى تَغِيبَ الشَّمْسُ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَفْظُ مُسْلِمٍ: «لَا صَلَاةَ بَعْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ».

وَلَهُ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ: ثَلَاثُ سَاعَاتٍ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَنْهَانَا أَنْ نُصَلِّيَ فِيْهِنَّ وَأَنْ نَقْبُرَ فِيْهِنَّ مَوْتَانَا: حِيْنَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ بَازِغَةً حَتَّى تَرْتَفِعَ، وَحِيْنَ يَقُوْمُ قَائِمُ الظَّهِيْرَةِ حَتَّى تَزُوْلَ الشَّمْسُ، وَحِيْنَ تَتَضَيَّفُ الشَّمْسُ لِلْغُرُوبِ.

وَالْحُكْمُ الثَّانِيْ عِنْدَ الشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى مِنْ حَدِيْثِ أَبِي هُرَيْرَةَ بِسَنَدٍ ضَعِيْفٍ وَزَادَ: «إِلَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ» وَكَذَا لِأَبِيْ دَاوُدَ عَنْ أَبِي قَتَادَةَ نَحْوُهُ.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ "صبح کی نماز ادا کر لینے کے بعد طلوع آفتاب تک کوئی نماز (جائز) نہیں اور اسی طرح نماز عصر ادا کر چکنے کے بعد غروب آفتاب تک کوئی دوسری نماز (جائز) نہیں۔ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کے الفاظ ہیں کوئی نماز' نماز فجر کے بعد نہیں۔ اور مسلم میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تین اوقات ایسے ہیں جن میں نماز پڑھنے اور میت کی تدفین سے رسول اللہ ﷺ ہمیں منع فرمایا کرتے تھے۔ اول یہ کہ جب آفتاب طلوع ہو رہا ہو تاآنکہ وہ بلند ہو جائے۔ دوم جب سورج نصف آسمان پر ہو تاوقتیکہ وہ ڈھل نہ جائے اور سوم جس وقت سورج غروب ہونا شروع ہو۔ دوسرا حکم (یعنی نصف النہار کے وقت نماز کی ادائیگی ممنوع ہونا) امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ضعیف سند سے روایت کیا ہے' مگر اس میں (الا یوم الجمعۃ) کے الفاظ زیادہ ہیں۔ (یعنی نصف النہار کے وقت نماز نہ پڑھو مگر جمعہ کے روز پڑھ سکتے ہو) اور ابوداؤد نے بھی حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مانند روایت نقل کی ہے (جس میں جمعہ کے دن کا استثناء ہے)

لغوی تشریح: ﴿لاصلاۃ﴾ یعنی نفلی نماز نہیں ﴿بعد الصبح﴾ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد اور اس سے صبح کی سنتوں کے علاوہ نماز مراد ہے کیونکہ ان دونوں کی قضا جائز ہے یہ نہی مطلق نفل نماز کی ہے۔ ﴿نقبر﴾ "با" پر ضمہ اور کسرہ۔ دونوں درست ہیں۔ معنی ہیں کہ ہم تدفین عمل میں لائیں ﴿موتانا﴾ موتی میت کی جمع ہے۔ اپنے مرنے والوں کو۔۔ ﴿بازغۃ﴾ چمکتے ہوئے۔ روشن ﴿الظہیرۃ﴾ نصف

النہار یعنی آدھے دن کا وقت۔ جب سورج چند ساعت کیلئے سیدھا قائم ہوتا۔ اس وقت ہر چیز کا سایہ بالکل اس چیز کی سیدھ میں ہوتا ہے۔ ادھر' ادھر' مشرق اور مغرب کی جانب جھکا ہوا نہیں ہوتا۔ ﴿ تـزول ﴾ آسمان کے وسط (درمیان) سے دوسری جانب مائل ہونا۔ ﴿ تـتـضـيـف ﴾ بھی مائل کے معنی میں استعمال ہوا ہے ﴿ والحكم الثانى ﴾ سے مراد عین نصف النہار کا وقت ہے کیونکہ حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ حکم دوسرے نمبر پر آیا ہے۔ ﴿ وكـذا لابى داود ﴾ ابوداؤد میں ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح ہے کہ بروز جمعہ نصف النہار کے وقت نماز کی اجازت ہے۔ جس طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ممنوع اوقات میں جو کام ممنوع ہیں ان کا ذکر ہے۔ ان میں پہلا یہ کہ ہم میت کو ان تین اوقات میں دفن نہ کریں۔ یہاں تدفین سے مراد نماز جنازہ بھی ہے کہ اس ممنوع وقت میں نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور نہ میت کو دفن کیا جائے۔ البتہ اگر کوئی عذر ہو تو پھر جائز ہے۔ اور دوسرا حکم یہ کہ دوپہر کا وقت ہے۔ جب سورج عین وسط آسمان پر قائم ہو' مغرب کی جانب زوال پذیر نہ ہوا ہو تو ایسے وقت میں بھی نماز پڑھنا یا نماز جنازہ پڑھنا اور میت کو دفن کرنا ممنوع ہے۔ لیکن جمعہ کا دن ایسا ہے کہ جس میں زوال کے وقت نوافل ادا کئے جا سکتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اسی کے قائل ہیں۔ جمعہ کے روز زوال کے وقت نماز جمعہ بھی ادا کی جا سکتی ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں جمعہ کے دن کا استثناء صراحت کے ساتھ منقول ہے اور تیسرا حکم یہ ہے کہ غروب آفتاب کے وقت بھی نماز جنازہ یا میت کو دفن کرنا ممنوع ہے اور حدیث میں جو طلوع آفتاب کے بعد "ترتفع" کا ذکر ہے کہ وہ بلند ہو جائے تو' اس بلندی سے کیا مراد ہے؟ ابوداؤد اور نسائی وغیرہ کی روایت میں اس اونچائی کا اندازہ ایک نیزہ یا دو نیزہ مذکور ہے جب سورج مشرق کے افق پر ایک نیزہ یا دو نیزہ برابر اونچا ہو جائے تو پھر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عـقـبـه بـن عـامـر جـهـنـى رضی اللہ عنہ ﴾ عین پر ضمہ اور "قاف" ساکن۔ ان کی کنیت ابوحماد یا ابوعامر ہے۔ قدیم الہجرت تھے۔ صحابیت کے شرف سے مشرف تھے۔ کتاب اللہ کے قاری اور علم میراث اور فقہ کے مشہور عالم تھے۔ فقیہہ ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ معرکہ صفین میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ تین سال مصر کے والی رہے۔ نیز غزوۃ البحر کے امیر رہے۔ مصر میں ۵۸ھ میں وفات پائی۔ اور مقطم میں دفن ہوئے۔

(۱۳۷) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ لاَ تَمْنَعُوا أَحَداً طَافَ بِهَذَا الْبَيْتِ، وَصَلَّى أَيَّةَ سَاعَةٍ شَآءَ مِنْ لَيْلٍ أَوْ

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے عبد مناف کی اولاد! بیت اللہ کا طواف کرنے والے کسی کو مت منع کرو (کہ وہ طواف نہ کرے) اور نہ کسی نماز پڑھنے والے کو (نماز پڑھنے سے منع کرو) خواہ وہ شب و روز کی

نَهَارٍ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ. کسی گھڑی میں یہ کام کرے۔" (اسے پانچوں (احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے اور ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ یا بنی عبد مناف ﴾ عبد مناف کی اولاد کو مخاطب اس لئے کیا ہے کہ یہ اس وقت کعبہ کے متولی تھے۔ ﴿ وصلی ایۃ ساعۃ شاء ...... الخ ﴾ یہ الفاظ ممنوعہ تین اوقات میں بھی نماز پڑھنے کی اجازت پر دلالت کرتے ہیں۔ جن احادیث میں ممانعت ہے یہ حدیث اس عام حکم کو بیت اللہ کی وجہ سے خاص قرار دیتی ہے کہ بیت اللہ میں یہ ممانعت نہیں۔

حاصل کلام : اس حدیث میں مذکورہ کونسی نماز ہے جسے ادا کرنے کی اجازت حکماً دی جا رہی ہے۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد طواف کعبہ کے بعد پڑھے جانے والے نوافل ہیں۔ عام نوافل اس سے مراد نہیں مگر ابوداؤد میں مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عام نوافل مراد ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی ہے۔ جن تین اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے جمہور علماء اسے خانہ کعبہ میں پڑھے جانے والے نوافل پر منطبق نہیں کرتے۔ وہ اس حدیث سے ان اوقات میں بھی بیت اللہ شریف میں پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔

راوی حدیث : ﴿ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو امیہ تھی۔ جبیر تصغیر ہے جابر سے۔ پورا نام جبیر بن مطعم بن عدی بن نوفل قرشی تھا۔ بڑے حلیم الطبع اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ خاندان قریش کے نسب نامے کو جانتے تھے۔ فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کر کے مدینہ تشریف لے آئے۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ۵۴ھ' ۵۷ھ یا ۵۹ھ کو فوت ہوئے۔

﴿ عبد مناف ﴾ مناف کا غلام۔ مناف مشہور بت تھا۔ والدہ نے اس کا خادم بنا دیا تھا اس وجہ سے عبد مناف کہلائے۔ ورنہ ان کا نام تو مغیرہ تھا' کنیت ابوعبد شمس تھی۔ بنو مخزوم اور بنو عبد مناف دونوں سے تعلق تھا۔ یاد رہے یہ عبد مناف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد تھے۔ قریش کے ذی وقار سردار شمار ہوتے تھے۔

(۱۳۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «الشَّفَقُ الحُمْرَةُ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَغَيْرُهُ وَقْفَهُ. حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "شفق سے مراد سرخی ہے۔" (دار قطنی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ وغیرہ نے کہا ہے صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے)

لغوی تشریح : ﴿ الشفق الحمرۃ ﴾ شفق سے مراد سرخی ہے (جو غروب آفتاب کے ساتھ ہی افق آسمان پر نمودار ہوتی ہے) بلوغ المرام کی شرح سبل السلام میں ہے کہ لغوی بحث کیلئے اہل لغت کی طرف رجوع کیا جائے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما اہل لغت میں سے ہیں۔ ان کی بات دلیل و حجت ہے خواہ موقوف ہی

کیوں نہ ہو۔ لغت کی مشہور کتاب "القاموس" میں شفق کا معنی وہ سرخی ہے جو غروب آفتاب سے لے کر عشاء تک یا اس کے قریب تک آسمان پر نمودار رہتی ہے۔

حاصل کلام: شفق سے وہ سرخی مراد ہے جو سورج کے غروب ہونے کے بعد نمودار ہوتی ہے۔ اس تعریف پر تمام آئمہ اور اہل لغت متفق ہیں مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تنہا اس کے خلاف شفق سے وہ سفیدی مراد لیتے ہیں جو سرخی کے غائب ہونے کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دو شاگردان رشیدان نے بھی سرخی ہی مراد لی ہے۔ موجودہ احناف کا فتویٰ بھی غالباً صاحبین کے قول پر ہے۔

(۱۳۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ:
«الفَجْرُ فَجْرَانِ، فَجْرٌ يُحَرِّمُ الطَّعَامَ وَتَحِلُّ فِيهِ الصَّلَاةُ، وَفَجْرٌ تَحْرُمُ فِيهِ الصَّلَاةُ، أَيْ صَلَاةُ الصُّبْحِ، **وَيَحِلُّ فِيهِ الطَّعَامُ»**. رَوَاهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالحَاكِمُ، وَصَحَّحَاهُ، وَلِلْحَاكِمِ مِنْ حَدِيثِ جَابِرٍ نَحْوُهُ، وَزَادَ فِي الَّذِي يُحَرِّمُ الطَّعَامَ: إِنَّهُ يَذْهَبُ مُسْتَطِيلاً فِي الأُفُقِ. وَفِي الآخَرِ: «إِنَّهُ كَذَنَبِ السِّرْحَانِ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "فجر کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ فجر جس میں کھانا حرام ہے اور نماز ادا کرنا جائز و حلال اور ایک وہ فجر ہے جس میں نماز پڑھنا حرام ہے اور کھانا جائز و حلال۔" (اسے ابن خزیمہ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دونوں نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے)
اور مستدرک حاکم میں جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے اس میں اتنا اضافہ ہے کہ "جس صبح میں کھانا حرام ہے وہ آسمان کے کناروں اور اطراف میں پھیل جاتی ہے اور دوسری بھیڑیئے کی دم کی طرح اونچی چلی جاتی ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿ يحرم الطعام ﴾ کھانا حرام کرتی ہے روزے دار کیلئے ﴿ وتحل فيه الصلوة ﴾ اور اس میں نماز جائز و حلال ہے یعنی نماز فجر۔ اس سے مراد صبح صادق ہے۔ ﴿ زاد ﴾ یعنی حاکم نے یہ بات زائد ذکر کی ہے۔ ﴿ فی الذی ﴾ اس فجر میں جس میں کھانا حرام ہو جاتا ہے (اس کی نشانی اور علامت یہ ہے) کہ وہ آسمان پر پھیل جاتی ہے یعنی مشرقی کنارے پر اور "افق" آسمان کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو زمین کے ساتھ ملتا ہوا محسوس و معلوم ہوتا ہے اور بخاری کی ایک روایت میں تو اس طرح بھی منقول ہے کہ آپؐ نے اپنے دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا کر سمجھایا۔ ﴿ وفی الاخر ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس سے وہ فجر مراد ہے جس میں صبح کی نماز ادا کرنا حرام ہے اور روزے دار کیلئے کھانا حلال ہے۔ یہ وہی صبح ہے جسے صبح کاذب کہا جاتا ہے۔ ﴿ کذنب السرحان ﴾ کاف برائے تشبیہ اور ذنب میں ذال اور نون پر فتحہ۔ معنی بھیڑیئے کی دم۔ ﴿ والسرحان ﴾ سین پر کسرہ اور "راء" ساکن۔ بھیڑیے کو کہتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ یہ فجر جب نمودار ہوتی ہے تو یہ ستون کی طرح بالکل سیدھی آسمان میں اوپر چڑھتی معلوم ہوتی

ہے۔ اطراف و اکناف میں پھیلی ہوئی نہیں ہوتی۔ صبح صادق اور صبح کاذب۔ دونوں کے مابین کچھ وقفہ اور فاصلہ ہوتا ہے۔

(١٤٠) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَفْضَلُ الأَعْمَالِ الصَّلاَةُ فِي أَوَّلِ وَقْتِهَا». رَوَاهُ التِّرمِذِيُّ وَالحَاكِمُ، وَصَحَّحَاهُ، وَأَصْلُه فِي الصَّحِيحَيْنِ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اول وقت نماز پڑھنا سب اعمال سے افضل ہے۔" (اسے ترمذی اور حاکم نے روایت کیاہے اور دونوں نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے۔ اس حدیث کی اصل بخاری و مسلم میں موجود ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں نماز کو اول وقت پر پڑھنا تمام اعمال سے افضل بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسری احادیث میں ایمان' صدقہ اور جہاد کو افضل اعمال بتایا گیا ہے۔ ساری احادیث اپنے اپنے مفہوم میں صحیح ہیں' ان میں موافقت اور تطابق اس طرح ہوگا۔ ایمان کا تعلق قلب و ضمیر سے ہے لہٰذا ایمان قلبی اعمال میں سب سے افضل ہے اور نماز کا تعلق بدنی عبادت سے ہے' یہ بدنی اعمال میں سب سے افضل ہے اور صدقہ کا تعلق مالیات سے ہے' مالی اعمال میں سب سے افضل صدقہ ہے اور جہاد جوانی و توانائی' صحت کا سب سے بہترین اور افضل عمل ہے۔ اس طرح ان میں باہمی منافات نہیں رہتی۔ یہ حدیث عام ہے مگر اس سے عشاء کی نماز خارج ہے کہ اسے تاخیر سے پڑھنا افضل ہے۔

(١٤١) وَعَنْ أَبِي مَحْذُورَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَوَّلُ الوَقْتِ رِضْوَانُ اللهِ، وَأَوْسَطُهُ رَحْمَةُ اللهِ، وَآخِرُهُ عَفْوُ اللهِ». أَخرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ جِدًّا وَلِلتِّرْمِذِيِّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ نَحْوُهُ دُوْنَ الأَوْسَطِ وَهُوَ ضَعِيفٌ أَيْضاً.

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اول وقت میں (نماز پڑھنا) رضاء الٰہی کا موجب ہے اور درمیانی وقت میں (ادائیگی نماز) رحمت الٰہی کا سبب ہے اور اس کو آخر وقت میں ادا کرنا اللہ تعالیٰ سے معافی کا موجب ہے۔" (دار قطنی نے اسے نہایت ہی ضعیف سند سے روایت کیا ہے اور ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی اسی طرح ہے لیکن اس میں لفظ وسط مذکور نہیں اور وہ ضعیف بھی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ دون الاوسط ﴾ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں درمیانی وقت کا ذکر نہیں۔ اس میں تو صرف اول اور آخر کا ذکر ہے۔ یہ دونوں احادیث انتہائی ضعیف ہیں۔ ان پر اعتماد مناسب نہیں۔ جہاں تک دار قطنی کی روایت کا تعلق ہے تو وہ روایت یعقوب بن ولید کے واسطہ سے مروی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا ان کے بارے میں قول ہے کہ بڑے بڑے دروغ گو لوگوں میں سے ہے اور ابن معین نے بھی اسے جھوٹا اور کذاب قرار دیا۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے تو اسے نظر انداز ہی کر دیا ہے اور ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ حدیث

وضع کیا کرتا تھا اور اس کی سند میں ابراہیم بن زکریا بجلی بھی موجود ہے' جسے متہم قرار دیا گیا ہے۔ رہی ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت تو اس میں بھی یعقوب بن ولید موجود ہے۔ محدثین ناقدین کی نقد و جرح کے بعد حدیث قابل اعتنا ہی نہیں رہتی۔

راوی حدیث: ﴿ابومحذورہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام سمرہ یا اوس تھا۔ مؤذن رسول تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ مکہ میں قیام پذیر ہوگئے۔ نماز پنج گانہ کی اذان دیتے تھے۔ ۵۹ھ میں وفات پائی۔

(۱۴۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**لاَ صَلاَةَ بَعْدَ الفَجْرِ إِلاَّ سَجْدَتَيْنِ**». أَخرَجَهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "فجر کی (فرض نماز) کے بعد صرف دو سنتوں کے علاوہ اور کوئی (نفل) نماز نہیں۔" (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے)

وَفِي رِوَايَةِ عَبْدِ الرَّزَّاقِ: «**لاَ صَلاَةَ بَعْدَ طُلُوعِ الفَجْرِ إِلاَّ رَكْعَتَيِ الفَجْرِ**» وَمِثْلُهُ لِلدَّارَقُطْنِيِّ عَنِ ابْنِ عَمْرِو بْنِ العَاص.

اور عبدالرزاق کی روایت میں ہے کہ "طلوع فجر کے بعد صرف فجر کی دو رکعات ہیں اور دارقطنی میں ابن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

لغوی تشریح: ﴿لا صلوۃ بعد الفجر﴾ بعد الفجر سے مراد طلوع فجر ہے۔ ﴿الا سجدتین﴾ یہاں سجدتین کا معنی رکعتیں ہے (دو رکعتیں) اور ایک نسخہ میں رکعتین ہے سجدتین کی جگہ۔ ان دو رکعتوں سے فجر کی دو سنتیں مراد ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی بناء پر طلوع فجر کے بعد صبح کی دو سنتوں کے علاوہ نوافل پڑھنا ممنوع و مکروہ ہے۔

(۱۴۳) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: صَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ العَصْرَ، ثُمَّ دَخَلَ بَيْتِيْ، فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، فَسَأَلْتُهُ فَقَالَ: شُغِلْتُ عَنْ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الظُّهرِ فَصَلَّيْتُهُمَا الآنَ. قُلْتُ: أَفَنَقْضِيهِمَا إِذَا فَاتَتَا قَالَ: «لاَ». أَخرَجَهُ أَحْمَدُ، وَلأَبِي دَاوُدَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا بِمَعْنَاهُ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز عصر پڑھ کر میرے حجرے میں تشریف لائے اور دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ میں نے عرض کیا یہ دو رکعت کیسی ہیں؟ آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا "ظہر کے فرائض کے بعد کی دو سنتیں پڑھ نہیں سکا تھا وہ اب میں نے پڑھی ہیں"۔ میں نے پھر عرض کیا کہ اگر یہ دو سنتیں قضا ہو جائیں تو کیا ہم بھی ان کی قضاء دیا کریں۔ فرمایا "نہیں۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی

طرح کی روایت ہے)

لغوی تشریح: ﴿ شغلت ﴾ صیغہ مجہول۔ اس کا معنی ہے کہ مجھے روک دیا گیا۔ اس طرف سے توجہ پھیر دی گئی۔ مانع یہ تھا کہ قبیلہ عبدالقیس کے کچھ لوگوں کی آمد نیز صدقہ کا مال بھی پہنچ گیا تھا۔ تقسیم مال اور ان سے گفتگو کرتے رہنے کی وجہ سے ظہر کی دو سنتیں رہ گئی تھیں وہ میں نے ابھی پڑھی ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ ہم بھی چھوٹ جانے کی صورت میں اس وقت قضا کریں؟ جواب میں ارشاد فرمایا کہ "تم اس وقت انہیں قضا ہونے کی صورت میں ادا نہ کرو"۔ علامہ الیمانی نے کہا ہے کہ اس سے ثابت ہوا نماز عصر کے بعد ان سنتوں کی قضا نبی ﷺ کی خصوصیت ہے کسی بھی دوسرے کیلئے یہ جائز نہیں ہے اور ایک دن کے عمل کے بعد ہمیشہ انہیں نماز عصر کے بعد ادا کرتے رہنا اس بنا پر تھا کہ نبی کریم ﷺ کی عادت تھی کہ جب ایک عمل ایک مرتبہ کر لیا تو اسے ہمیشہ انجام دیتے تھے۔ تو گویا یہ بھی آپؐ کی خصوصیت تھی۔

حاصل کلام: حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کے بعد ظہر کی چھوٹی ہوئی سنتوں کی قضا رسول اللہ ﷺ کا خاصہ اور امتیاز تھا جیسا کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ الیمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے مگر امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس روایت کا آخری حصہ "افنقضیهما اذا فاتتا لم قال لا" کہ کیا جب رہ جائیں تو ہم ان کی قضاء دیں؟ تو آپؐ نے فرمایا "نہیں" ضعیف اور غیر محفوظ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عصر کے بعد قضاء نماز فرض ہو یا سنت ادا ہو سکتی ہے۔ جس کی تفصیل "اعلام اهل العصر" میں شارح ابوداؤد شیخ شمس الحق محدث ڈیانوی نے خوب بیان کی ہے۔

٢ - بَابُ الأَذَانِ

اذان کا بیان

(١٤٤) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدِ بنِ عَبْدِ رَبِّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: طَافَ بِي - وَأَنَا نَائِمٌ - رَجُلٌ، فَقَالَ: تَقُولُ «اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ» فَذَكَرَ الأَذَانَ بِتَرْبِيعِ التَّكْبِيرِ بِغَيْرِ تَرْجِيعٍ، وَالإِقَامَةَ فُرَادَى، إِلاَّ «قَدْ قَامَتِ الصَّلاَةُ» قَالَ: فَلَمَّا أَصْبَحْتُ أَتَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ، فقال: «**إِنَّهَا لَرُؤْيَا حق**»، الحديث. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خواب میں مجھے ایک آدمی ملا جس نے مجھے کہا کہ کہو اللہ اکبر' اللہ اکبر پھر اس نے ساری اذان کہی' چار مرتبہ اللہ اکبر کہا۔ بغیر ترجیع کے اور اقامت میں صرف ایک ایک مرتبہ کہا' مگر (قد قامت الصلاۃ) کو دو مرتبہ کہا۔ صبح جب بیدار ہوا تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا (اور اپنا خواب آپؐ کو سنایا) آپؐ نے فرمایا "یقیناً یہ خواب سچا ہے۔" (اس حدیث کو احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَزَادَ أَحْمَدُ فِي آخِرِهِ قِصَّةَ قَوْلِ بِلاَلٍ فِيْ أَذَانِ الفَجْرِ «الصَّلاَةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ». وَلاِبْنِ خُزَيْمَةَ عَنْ أَنَسٍ قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ إِذَا قَالَ المُؤَذِّنُ فِي الفَجْرِ «حَيَّ عَلَى الفَلاَحِ» قَالَ: «الصَّلاَةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ».

احمد نے اس روایت کے آخر میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی فجر کی اذان میں (الصلاہ خیر من النوم) کا قصہ بھی مزید بیان کیا ہے اور ابن خزیمہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہے کہ انہوں نے فرمایا سنت ہے کہ جب موذن صبح کی اذان میں حی علی الفلاح کہے تو وہ کہے (الصلاۃ خیر من النوم)

لغوی تشریح: ﴿ بتربیع التکبیر ﴾ اللہ اکبر کی تکبیر کو چار مرتبہ کہنا۔ ﴿ بغیر ترجیع ﴾ ترجیع کا معنی ہے کہ اذان میں ﴿ اشھد ان لا الہ الا اللہ ﴾ کو پہلے پست آواز (آہستہ آواز) سے ادا کرنا' دوبارہ دو مرتبہ بآواز بلند ادا کرنا ﴿ والاقامۃ ﴾ اس سے مراد کلمات اقامت ہیں ﴿ فرادی ﴾ اقامت میں ہر کلمہ صرف ایک ایک مرتبہ ادا کرنا البتہ ﴿ قد قامت الصلاۃ ﴾ دو مرتبہ ﴿ لرئویا حق ﴾ "لام" اس میں برائے تاکید ہے اور رؤیا حق کی طرف مضاف ہے یا مراد ہے وہ خواب جو عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما نے دیکھا حق ہے۔ اس کی تین حالتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ اسے مرفوع پڑھا جائے تو اس صورت میں یہ مبتداء ہوگا اور اس کی خبر محذوف تصور ہوگی اور وہ لفظ ﴿ بتمامہ ﴾ ہو سکتا ہے یا پھر دوسری صورت میں اسے منصوب پڑھا جائے (الحدیث) تو اس صورت میں "اقرا الحدیث و تممہ" ہوگا اور تیسری صورت میں اسے مجرور بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں ﴿ الی آخر الحدیث ﴾ ہوگا۔ ﴿ زاد احمد فی آخرہ ﴾ حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ احمد نے عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما کی مذکورہ بالا حدیث میں ان الفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے۔ حالانکہ یہ اضافہ حدیث بلال (رضی اللہ عنہ) میں ہے' تاکہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما کی حدیث میں مراد یہ امام احمد رحمہ اللہ نے اذان کے بارے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کرتے ہوئے صبح کی اذان میں ﴿ الصلاۃ خیر من النوم ﴾ کا اضافہ کیا ہے۔

حاصل کلام: مدینہ طیبہ میں ہجرت کے پہلے سال آپ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ نماز باجماعت کیلئے بلانے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے۔ بعض نے کہا نماز کیلئے ناقوس (گھڑیال) بجایا جائے۔ بعض نے بلندی پر آگ روشن کرنے کا مشورہ دیا۔ بعض نے "بوق" (بگل) سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ اسی دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ نمازوں کی طرف بلانے کیلئے اذان دی جائے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو باواز بلند "الصلاۃ جامعۃ" کہنے کا حکم دیا۔ اسی اثناء میں عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما جو مذکورہ بالا حدیث کے راوی ہیں' نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی ناقوس اٹھائے ہوئے ہے۔ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما نے اس سے دریافت کیا اللہ کے بندے کیا ناقوس فروخت کرتے ہو؟ اس نے پوچھا تم اس سے کیا کرو گے؟ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما نے کہا ہم اس کے ذریعہ (لوگوں کو) نماز باجماعت کیلئے بلائیں گے۔ اس شخص نے کہا میں

تمہیں اس سے کہیں بہتر طریقہ سے آگاہ نہ کر دوں؟ عبداللہ بن زید عنہما نے کہا ہاں (ضرور بتائیں) تو اس نے (موجودہ) اذان اور اقامت کے الفاظ انہیں سکھائے۔ یہی خواب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا جسے آپؐ نے سچا اور صادق قرار دیا۔ اذان میں ترجیع مسنون ہے یا نہیں۔ اس بارے میں ائمہ کی آراء مختلف ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ ترجیع ثابت ہے' اہلحدیث حضرات کی رائے یہی ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ ترجیع جس صحابی سے ثابت کی جاتی ہے اس صحابی کو تعلیم دینا مقصود تھا اس لئے کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ جنہیں آپؐ نے یہ تعلیم دی' نے پہلی مرتبہ اذان میں شہادتین "اشھد ان لا الہ الا اللہ" "اشھد ان محمدا رسول اللہ" کو دھیمی اور پست آواز میں ادا کیا تھا' حالانکہ یہ درست نہیں۔ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد بھی مکہ مکرمہ میں اذان ترجیع سے ہوتی رہی۔ اس لئے اس کا انکار محض مجادلہ ہے' البتہ اذان ترجیع اور بغیر ترجیع دونوں طرح جائز ہے مگر صحیحین کی روایات کی بناء پر راجح یہ ہے کہ ترجیع کے ساتھ اقامت اکہری کہی جائے۔

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہما ﴾ ابو محمد ان کی کنیت تھی۔ انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق کی وجہ سے انصاری خزرجی کہلائے۔ غزوۂ بدر کے علاوہ باقی غزوات میں بھی شریک رہے۔ ہجرت مدینہ کے پہلے سال میں انہوں نے خواب میں موجودہ اذان کی کیفیت دیکھی تھی اور یہ واقعہ مسجد نبویؐ کی تعمیر کے بعد کا ہے۔ انہوں نے ۳۲ھ میں ۶۴ برس کی عمر میں وفات پائی۔

﴿ بلال رضی اللہ عنہ ﴾ یہ قبیلہ تیم کے آزاد کردہ غلام بلال بن رباح تھے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ ان کو راہ حق میں بہت اذیتیں اور تکالیف دی گئیں۔ ان کو بھی غزوات بدر و احد' احزاب وغیرہ سبھی میں شرکت کا شرف حاصل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انہوں نے اذان کہنا بند کر دی تھی اور مدینہ طیبہ چھوڑ کر دمشق میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۷ھ یا ۱۸ھ میں ساٹھ سال سے اوپر عمر پا کر فوت ہوئے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

(١٤٥) وَعَنْ أَبِي مَحْذُوْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَهُ الأَذَانَ، فَذَكَرَ فِيْهِ التَّرْجِيْعَ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَلٰكِن ذَكَرَ التَّكْبِيْرَ فِي أَوَّلِهِ مَرَّتَيْنِ فَقَطْ، وَرَوَاهُ الخَمْسَةُ فَذَكَرُوْهُ مُرَبَّعاً.

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اذان سکھائی۔ اس میں انہوں نے ترجیع کا ذکر کیا ہے۔ (مسلم نے روایت کیا ہے لیکن اس میں پہلی دفعہ اللہ اکبر کو صرف دو مرتبہ کہنے کا ذکر ہے۔ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو پانچوں نے روایت کیا ہے اور انہوں نے اللہ اکبر کو پہلی دفعہ چار مرتبہ کہنے کا ذکر کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ علمہ الاذان ﴾ علم' تعلیم سے ماخوذ ہے۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں ذکر ہے کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اذان کی تعلیم دی جیسا کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان ہے کہ فتح مکہ کے بعد حنین کی طرف جانے کیلئے ہم نو ساتھی مکہ سے نکلے۔ جب ان نوجوانوں نے اذان سنی تو

مسلمانوں کا مذاق اور استہزاء اڑانے کیلئے انہوں نے اذان کہنا شروع کر دی۔ نبی ﷺ نے فرمایا ”میں نے ان لوگوں میں ایک خوش الحان آدمی کی اذان سنی ہے۔“ پھر ہماری طرف کسی کو بھیج کر ہمیں اپنے پاس بلایا اور ہم میں سے فرداً فرداً اذان کہلوا کر سنی۔ میں سب سے آخری آدمی تھا جس نے اذان کہی۔ میری اذان سن کر آپؐ نے مجھے اپنے پاس بلایا اور اپنے روبرو بٹھا کر میری پیشانی پر دست مبارک پھیرا اور تین مرتبہ برکت کی دعا فرمائی۔ پھر فرمایا ”جاؤ اور مسجد حرام کے پاس کھڑے ہو کر اذان کہو۔“ میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! مجھے پہلے اذان تو سکھائیں۔ پھر انہوں نے حدیث اذان بیان کی۔ ﴿ فذكر الترجيع ﴾ اس میں ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے ترجیع کا بھی ذکر کیا' یعنی کلمہ شہادتین کو دو' دو مرتبہ دہرایا۔ جمہور علماء نے اس سے ترجیع اذان (دوہری آذان) کی مشروعیت پر استدلال کیا ہے اور یہ ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جس سے انکار کی مجال نہیں۔ ﴿ فذكروه ﴾ انہوں (پانچوں) نے اذان کے آغاز میں تکبیر (مربعاً) کو چار مرتبہ کہنے کا ذکر کیا ہے۔ ”مربعا“ تربیع سے ہے۔ جس کے معنی ہیں چار مرتبہ۔ صاحب السبل شارح بلوغ المرام نے کہا ہے یہ جملہ (یعنی چار بار تکبیر) ثقہ راویوں سے محفوظ ہے۔

حاصل کلام: حدیث مذکور اس بات کی دلیل ہے کہ اذان کے آغاز میں اللہ اکبر دو دفعہ نہیں بلکہ چار مرتبہ کہنا ہی صحیح ہے اور اذان کیلئے مؤذن ایسا منتخب اور مقرر کیا جائے جس کی آواز اچھی اور بلند ہو۔ اس سلسلہ میں انتخاب کیلئے مقابلہ اذان کا ثبوت ملتا ہے۔

(١٤٦) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أُمِرَ بِلاَلٌ أَن يَشْفَعَ الأَذَانَ، وَيُوتِرَ الإِقَامَةَ إِلاَّ الإِقَامَةَ. يَعْنِيْ إِلاَّ قَوْلَهُ. قَدْ قَامَتِ الصَّلاَةُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَمْ يَذْكُرْ مُسْلِمٌ الاسْتِثْنَاءَ، وَلِلنَّسَائِيِّ: أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِلاَلاً.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کے کلمات دو' دو مرتبہ اور تکبیر (قد قامت الصلاة) کے علاوہ باقی جملہ کلمات کو ایک ایک مرتبہ کہنے کا حکم دیا گیا۔ (بخاری و مسلم)

البتہ مسلم نے (قد قامت الصلاة) کے استثناء کا ذکر نہیں کیا اور نسائی میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا۔

لغوی تشریح: ﴿ امر ﴾ صیغہ مجہول ہے۔ اس میں حکم صادر فرمانے والے خود نبی کریم ﷺ ہیں۔ نسائی میں اس کی صراحت موجود ہے۔ ﴿ ان يشفع الاذان ﴾ یعنی ہر کلمہ کو دو' دو مرتبہ ادا کرنا۔ ﴿ ويوتر الاقامة ﴾ اقامت میں ہر کلمہ ایک ایک مرتبہ کہنا ﴿ الا الاقامه ﴾ بجز اقامت کے یعنی ﴿ قد قامت الصلاة ﴾ کے۔ اسے دو' دو مرتبہ کہنا ہے۔ ﴿ ولم يذكر مسلم الاستثناء ﴾ اور مسلم نے الا الاقامه کا استثناء نقل نہیں کیا۔

(١٤٧) وَعَنْ أَبِيْ جُحَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ بِلاَلاً

حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دیتے دیکھا کہ وہ اپنا چہرہ' ادھر ادھر

يُؤَذِّنُ، وَأَتَتَبَّعُ فَاهُ هٰهُنَا وَهٰهُنَا، وَإِصْبَعَاهُ فِيْ أُذُنَيْهِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

پھیرتے تھے۔ اس وقت ان کی دونوں انگلیاں (انگشت ہائے شہادت) ان کے کانوں میں تھیں۔ (احمد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَلِابْنِ مَاجَهْ: وَجَعَلَ إِصْبَعَيْهِ فِي أُذُنَيْهِ. وِلأَبِي دَاوُدَ: لَوَى عُنُقَهُ لَمَّا بَلَغَ «حَيَّ عَلَى الصَّلاَةِ» يَمِيْناً وَشِمَالاً، وَلَمْ يَسْتَدِرْ. وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيْحَيْنِ.

ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں داخل کرلیں اور ابوداؤد میں ہے کہ جب (حی علی الصلاۃ) کہتے تو اپنے دائیں بائیں ذرا رخ موڑ لیتے بالکل گھومتے نہیں تھے۔ اس کی اصل صحیحین میں ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ اتتبع فاه ﴾ تتبع باب تفعل سے ہے۔ مطلب ہے کہ میں ان کے چہرے کی طرف نظریں لگائے ہوئے تھا اور ان کے منہ کو بغور ملاحظہ کر رہا تھا ﴿ ھھنا ﴾ دائیں جانب ﴿ وھھنا ﴾ اور بائیں جانب۔

حاصل کلام: اذان قبلہ رخ کھڑے ہو کر کہنا مسنون ہے۔ اسی طرح حی (علی الصلاۃ ' حی علی الفلاح) کہتے وقت دائیں' بائیں اپنے چہرے کی حد تک پھیرنا مسنون ہے۔ اذان کہتے ہوئے کانوں میں انگلیاں داخل کرنے کے دو فائدے ہیں۔ کانوں میں انگلیاں ڈالنے سے آواز بلند ہو جاتی ہے۔ کوئی بہرہ آدمی مؤذن کو ایسی حالت میں دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ نماز کیلئے اذان کہی جا رہی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ ﴾ ابوجحیفہ کنیت ہے۔ وھب بن عبداللہ سوائی نام ہے۔ جحیفہ میں جیم پر ضمہ ہے اور تصغیر ہے۔ سوائی میں سین پر ضمہ ہے۔ سوائی عامری مشہور ہیں۔ صغار صحابہ ؓ میں شمار کئے گئے ہیں۔ کوفہ میں پہنچ کر قیام کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بیت المال پر عامل مقرر کیا۔ تمام مشاھد و غزوات میں شریک ہوئے۔ کوفہ میں ۷۴ھ میں وفات پائی۔

(١٤٨) وَعَنْ أَبِي مَحْذُوْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَعْجَبَهُ صَوْتُه فَعَلَّمَهُ الأَذَانَ. رَوَاهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ان کی آواز بہت پسند آئی۔ چنانچہ آپؐ نے اسے (ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو) اذان کی تعلیم خود دی۔ (اذان سکھائی) (ابن خزیمہ)

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ مؤذن کے انتخاب اور چناؤ اور تقرر میں آواز کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اچھی آواز دلوں پر جادو کا اثر رکھتی ہے۔ اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

(١٤٩) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ العِيْدَيْنِ، مِنْ غَيْرِ مَرَّةٍ وَلاَ مَرَّتَيْنِ، بِغَيْرِ أَذَانٍ وَلاَ إِقَامَةٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَنَحْوُهُ فِي المُتَّفَقِ عَلَيْهِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَغَيْرِهِ.

ایک مرتبہ نہیں، دو مرتبہ نہیں متعدد مرتبہ نبی ﷺ کے ساتھ نماز عیدین پڑھی ہے۔ اس کیلئے نہ اذان کہی جاتی تھی اور نہ ہی اقامت۔ (اس روایت کو مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دور رسالت مآب ﷺ میں نماز عیدین باجماعت ادا کی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود نہ ان کیلئے اذان کہی جاتی تھی اور نہ اقامت اور امت کا بھی اس پر عمل ہے۔

(۱۵۰) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ فِي الحَدِيْثِ الطَّوِيْلِ فِي نَوْمِهِمْ عَنِ الصَّلاَةِ: ثُمَّ أَذَّنَ بِلاَلٌ، فَصَلَّى النَّبِيُّ ﷺ كَمَا كَانَ يَصْنَعُ كُلَّ يَوْمٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ (ایک لمبی حدیث جس میں دوران سفر غلبہ نیند اور تھکاوٹ سفر کی وجہ سے سو جانے کا ذکر ہے) سے مروی ہے، جب نیند سے بیداری ہوئی تو پھر بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی اور نبی ﷺ نے اسی طرح نماز پڑھی جس طرح روزانہ پڑھتے تھے۔ (مسلم)

وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى المُزْدَلِفَةَ، فَصَلَّى بِهَا المَغْرِبَ وَالعِشَاءَ بِأَذَانٍ وَاحِدٍ وَإِقَامَتَيْنِ.

اور مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ مزدلفہ میں پہنچے تو وہاں آپؐ نے مغرب اور عشاء کی نماز ایک اذان اور دو اقامتوں سے پڑھی

وَلَهُ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا: جَمَعَ النَّبِيُّ ﷺ بَيْنَ المَغْرِبِ وَالعِشَاءِ بِإِقَامَةٍ وَاحِدَةٍ. وَزَادَ أَبُو دَاوُدَ: «لِكُلِّ صَلاَةٍ» وَفِي رِوَايَةٍ لَه: وَلَمْ يُنَادِ فِي وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا.

اور مسلم ہی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مغرب اور عشاء دونوں نمازیں جمع کر کے ایک ہی اقامت کے ساتھ ادا فرمائیں اور ابوداؤد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ ہر نماز کیلئے تکبیر کہی گئی اور اسی کی ایک روایت میں منقول ہے کہ ان دونوں نمازوں میں سے کسی کے لئے بھی اذان نہیں کہی گئی۔

لغوی تشریح: ﴿فی نومهم عن الصلاة﴾ سونے کا واقعہ نماز فجر کا ہے۔ واقعہ کی نوعیت کچھ اس طرح آئی ہے کہ آپؐ خیبر سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ رات کے آخری حصہ میں کہیں پڑاؤ کیا۔ نبی ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بیدار رہنے کا حکم ارشاد فرمایا کہ جب طلوع فجر ہو تو وہ انہیں جگا دیں۔ نبی کریم ﷺ سو گئے اور بلال رضی اللہ عنہ پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ بھی سوگئے۔ پس طلوع آفتاب کے بعد آنکھ کھلی تو

(یہ صورتحال ملاحظہ فرما کر) نبی ﷺ نے اس وادی سے نکلنے کا حکم دیا (تعمیل حکم میں) سب صحابہؓ اس وادی سے نکل گئے (اور آگے دوسری جگہ پڑاؤ ڈالا) تو نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی اور آپؐ نے نماز پڑھائی۔ ﴿ مزدلفة ﴾ یہ ایک مقام کا نام ہے جو منیٰ اور عرفات کے مابین واقع ہے۔ یہ حج کے مشہور شعائر میں سے ہے۔ عرفات میں وقوف کے بعد دسویں ذی الحجہ کی شروع رات کو حجاج کرام اس جگہ آتے ہیں۔ ﴿ ولم يناد في واحد منهما ﴾ ان دونوں میں سے کسی کیلئے بھی منادی (اذان) نہیں کہی گئی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ نیند کی وجہ سے نماز کا وقت فوت ہو جائے اور نماز باجماعت کا ارادہ ہو تو پھر نماز کیلئے اذان کہنی چاہئے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث اور جابر رضی اللہ عنہ سے مروی پہلی حدیث باہم متعارض معلوم ہوتی ہیں کیونکہ یہ حدیث مزدلفہ کے قیام میں مغرب و عشاء دونوں کو جمع کر کے پڑھنے کی صورت میں اذان کہنے کی نفی کرتی ہے جبکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ "ایک اذان اور دو اقامتیں کہی گئیں۔ مگر یہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ اولیٰ ہے کیونکہ مثبت کو منفی پر مقدم تسلیم کیا گیا۔

(١٥١) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَعَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمْ، قَالاَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ «إِنَّ بِلاَلاً يُؤَذِّنُ بِلَيْلٍ، فَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يُنَادِيَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ، وَكَانَ رَجُلاً أَعْمَى لاَ يُنَادِي حَتَّى يُقَالَ لَهُ: أَصْبَحْتَ أَصْبَحْتَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي آخِرِهِ إِدْرَاجٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دونوں سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بلال (رضی اللہ عنہ) رات کو اذان کہتا ہے تم لوگ ابن ام مکتوم (رضی اللہ عنہ) کی اذان تک کھا پی لیا کرو۔" ابن ام مکتوم (رضی اللہ عنہ) نابینا آدمی تھے جب تک لوگ انہیں یہ نہ کہتے کہ (صبح ہوگئی' صبح ہوگئی) وہ اذان نہ کہتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ يوذن بليل ﴾ رات کو اذان کہنے کا مطلب ہے کہ طلوع فجر سے قبل اذان کہتا ہے۔ ﴿ فكلوا واشربوا ﴾ کھاؤ پیو سے مراد ہے کہ اگر تم روزہ رکھنے کا ارادہ رکھتے ہو تو سحری کا وقت باقی ہے کھا پی سکتے ہو۔ ﴿ ادراج ﴾ راوی کا اپنی طرف سے اضافہ (تشریح و توضیح) کی صورت میں داخل کرنا۔ ادراج سے مراد یہاں ﴿ وكان رجلا اعمى ﴾ کا فقرہ ہے جو ابن عمر رضی اللہ عنہما یا زہری کی طرف سے اضافہ شدہ ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ اول وقت سے اذان کو مؤخر کیا جائے' کیونکہ اطلاع دینے والا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو یا تو فجر کے طلوع ہونے کے قریب وقت اطلاع دیتا (کہ فجر ہوگئی ہے) یا جب فجر کا کچھ حصہ نمودار ہو جاتا (اس وقت اسے مطلع کرتا)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طلوع فجر سے پہلے بھی اذان کہنا مشروع ہے۔ لیکن یہ اذان اس غرض کیلئے نہیں ہوتی جس غرض کیلئے معمول کی اذان دی جاتی ہے بلکہ اس سے مقصود سوئے ہوئے

لوگوں کو بیدار کرنا کہ وہ اٹھیں اور نماز کی تیاری کریں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک مسجد میں نماز کی اذان دینے کیلئے دو موذن رکھنا درست ہے۔

(١٥٢) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما: أَنَّ بِلاَلاً أَذَّنَ قَبْلَ الفَجْرِ، فَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَرْجِعَ فَيُنَادِيْ: **أَلاَ إِنَّ العَبْدَ نَامَ**. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَضَعَّفَهُ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ (ایک روز) بلال رضی اللہ عنہ نے طلوع فجر سے پہلے ہی اذان کہہ دی تو نبی کریم ﷺ نے انہیں دوبارہ اذان کہنے کا حکم دیا (تو بلال رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ کہہ کر منادی کی) **"خبردار! سنو بندہ کو نیند آگئی تھی۔"** (ابوداؤد نے اسے روایت کیا اور ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اذن قبل الفجر ﴾ طلوع فجر سے قبل اذان کہی' اس گمان کی بنا پر کہ فجر طلوع ہو چکی ہے (حالانکہ طلوع نہیں ہوئی تھی) یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ قبل طلوع فجر اذان دینا مشروع نہیں تھا۔ ﴿ وضعفه ﴾ ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو یہ کہہ کر ضعیف قرار دیا ہے کہ ایوب سے صرف حماد بن سلمہ ہی روایت کرتا ہے اور امام ابن مدینی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ غیر محفوظ ہے اور حماد بن سلمہ نے اس میں خطا کھائی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث ضعیف ہے لیکن تسلیم کرلی جائے تو پھر یہ روایت اس موقع پر محمول ہو گی جب ابتداء میں صرف حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہی اذان کہتے تھے۔ پھر جب ان کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو بھی مقرر کیا گیا تو بلال رضی اللہ عنہ پہلی اذان صبح سے پہلے دیتے اور ابن مکتوم رضی اللہ عنہ صبح ہونے کے بعد' جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا نام عمرو یا عبد اللہ بن قیس قرشی عامری تھا' جن کا ذکر سورہ عبس کے شان نزول کے سلسلہ میں مفسرین نے بیان کیا ہے۔ قدیم الاسلام تھے۔ ہجرت بھی کی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی عدم موجودگی میں ان کو تیرہ مرتبہ مدینہ میں اپنا نائب (قائم مقام) مقرر فرمایا کہ لوگوں کی امامت کے فرائض انجام دے۔ جنگ قادسیہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ اس روز جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا۔

(١٥٣) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِذَا سَمِعْتُمُ النِّدَاءَ فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ المُؤَذِّنُ**» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم اذان سنو تو تم بھی اسی طرح کہتے جاؤ جس طرح مؤذن کہہ رہا ہے۔" (بخاری و مسلم)

وَلِلْبُخَارِيِّ عَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلُهُ.

بخاری میں معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔ اور مسلم نے عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے جو

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، فِي فَضْلِ القَوْلِ كَمَا يَقُولُ المُؤَذِّنُ كَلِمَةً كَلِمَةً سِوَى الحَيْعَلَتَيْنِ، فَيَقُولُ: لاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ.

مؤذن کے جواب میں اسی طرح ایک ایک کلمہ کہنے کی فضیلت کے بارے میں ہے بجز (حی علی الصلاۃ) اور (حی علی الفلاح) کے کہ ان کلمات کی جگہ (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) کہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے جس طرح مؤذن کلمات اذان کہے' سننے والا اسی طرح کہتا جائے اور یہ جواب ہر حالت میں مشروع ہیں خواہ انسان پاک ہو یا ناپاک۔ البتہ بول و براز وغیرہ میں مصروف ہو تو جواب دینا جائز نہیں اور (حی علی الصلاۃ ' حی علی الفلاح) کے جواب میں (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) کہا جائے اور جس روایت میں یہ آیا ہے کہ جس طرح مؤذن کہے تم بھی اسی طرح کہو۔ تو یہ حکم عام ہے' (حی علی الصلاۃ) اور (حی علی الفلاح) کے جواب میں "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کہنے کا حکم خاص ہے اور یہ طے شدہ اصول ہے کہ خاص کو عام پر اور مقید کو مطلق پر ترجیح دی جائے گی۔ جمہور علماء کے نزدیک یہی مسنون ہے۔

(١٥٤) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي العَاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! اجْعَلْنِيْ إِمَامَ قَوْمِي، فَقَالَ: «**أَنْتَ إِمَامُهُمْ وَاقْتَدِ بِأَضْعَفِهِمْ، وَاتَّخِذْ مُؤَذِّناً لاَ يَأْخُذُ عَلَى أَذَانِهِ أَجْراً**». أَخْرَجَهُ الخَمْسَةُ وَحَسَّنَهُ التِّرمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! مجھے میری قوم کا امام مقرر فرما دیں۔ ارشاد ہوا "تم ان کے امام ہو (تمہیں تمہاری قوم کا امام مقرر کر دیا گیا) ان میں کمزور و ضعیف لوگوں کا خیال رکھو اور مؤذن ایسے آدمی کو مقرر کرو جو اذان کہنے کی اجرت نہ طلب کرے۔" (اس کو احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ واقتد باضعفهم ﴾ اقتداء سے فعل امر ہے۔ یعنی اپنے نمازیوں میں سے ضعیف و کمزور نمازیوں کا خیال رکھنا' ان کی منشاء کا' ان کے احوال کا خیال رکھنا گویا کہ تم انہی کو نماز پڑھا رہے ہو۔

حاصل کلام: مؤذن کا اذان کی اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا ناجائز۔ اس بارے میں اختلاف ہے۔ اس حدیث سے معاوضہ کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ البتہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر معاوضہ لئے اذان کہنا مندوب و مستحسن ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر حال میں نمازیوں کی رعایت ملحوظ رکھنی چاہئے اور دیگر ارکان و واجبات کو اتنا لمبا نہ کرے کہ کمزور و ناتواں لوگ اکتا جائیں اور نماز باجماعت سے محروم رہ جائیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مؤذن کو اذان کی اجرت نہ لینی چاہئے۔ اکثر فقہاء کے نزدیک یہ مکروہ ہے حرام نہیں بلکہ متاخرین علماء نے ناگزیر وجوہ کی بناء پر معاوضہ لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بھلائی اور نیکی کے کام میں امامت کی طلب جائز ہے۔ اس کے آداب و شرائط کماحقہ پورا کرنے کی صورت میں اس کا حاصل کرنا بھی جائز ہے۔

راوی حدیث : ﴿ عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ ﴾ ابوعبداللہ ان کی کنیت تھی۔ طائف سے جو وفد نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا یہ ان میں سب سے کم عمر تھے۔ نبی ﷺ نے ان کو وفد پر عامل مقرر فرمایا۔ انہوں نے اپنی قوم کو مرتد ہونے سے بچایا اور وہ اسلام پر ثابت قدم رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو بحرین اور عمان پر عامل مقرر فرمایا۔ بصرہ میں ۵۱ھ میں فوت ہوئے۔

(١٥٥) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لَنَا النَّبِيُّ ﷺ: «**إِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ، فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ**» الحَدِيثَ، أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ.

حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہم سے ارشاد فرمایا کہ "جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے کوئی ایک آدمی تمہیں بلانے کیلئے اذان کہے" پھر پوری حدیث بیان کی۔ (اسے ساتوں احمد، بخاری و مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

راوی حدیث ﴿ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوسلمان تھی۔ نبی ﷺ کی خدمت میں حصول تعلیم دین کیلئے آئے تھے۔ بیس روز تک آپؐ کے پاس قیام کیا جب واپس جانے لگے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ "راستہ میں جب وقت نماز آجائے تو تم میں سے کوئی اذان کہے اور جو تم میں سے عمر میں بڑا ہو وہ جماعت کرائے۔" اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ مسافروں کو بھی اذان اور جماعت کا اہتمام کرنا چاہئے۔ انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کو برتری اور فضیلت حاصل ہے۔ ۷۴ھ کو بصرہ میں وفات پائی۔

(١٥٦) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ لِبِلَالٍ: «**إِذَا أَذَّنْتَ فَتَرَسَّلْ، وَإِذَا أَقَمْتَ فَاحْدُرْ، وَاجْعَلْ بَيْنَ أَذَانِكَ وَإِقَامَتِكَ قَدْرَ مَا يَفْرُغُ الآكِلُ مِنْ أَكْلِهِ،**» الحديث. رَوَاهُ التِّرمِذِيُّ، وَضَعَّفَهُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا "جب اذان کہو تو ٹھہر ٹھہر کر کہو اور تکبیر ذرا جلدی جلدی کہو۔ اذان اور اقامت کے مابین اتنا وقفہ ہونا چاہئے کہ کھانا کھانے والا اپنے کھانے سے فارغ ہو کر جماعت میں شریک ہو سکے۔" (پھر حدیث پوری بیان کی۔ اسے ترمذی نے روایت

وَلَهُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لاَ يُؤَذِّنُ إِلاَّ مُتَوَضِّىءٌ». وَضَعَّفَهُ أَيْضاً.

کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے)

اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وضو کے بغیر کوئی اذان نہ کہے" (ترمذی نے اسے بھی ضعیف قرار دیا ہے۔)

وَلَهُ عَنْ زِيَادِ بْنِ الحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «وَمَنْ أَذَّنَ فَهُوَ يُقِيمُ». وَضَعَّفَهُ أَيْضاً.

اور ترمذی نے زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اذان کہے وہی اقامت کہے۔ اسے بھی ضعیف قرار دیا ہے

وَلأَبِيْ دَاوُدَ من حَدِيْثِ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ، أَنَّهُ قَالَ: أَنَا رَأَيْتُهُ، يَعْنِي الأَذَانَ، وَأَنَا كُنْتُ أُرِيْدُه، قَالَ: فَأَقِمْ أَنْتَ. وَفِيْهِ ضَعْفٌ أَيْضاً.

اور ابوداؤد میں عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ میں نے اذان کو خواب میں دیکھا تھا۔ میری تمنا تھی کہ مجھے مؤذن مقرر کیا جائے آپؐ نے فرمایا "تو تکبیر کہا کر۔" اس میں بھی ضعف ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ فترسل ﴾ ترسل سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی ٹھہر ٹھہر کر آرام سے کلمات اذان ادا کر۔ جلدی اور تیزی نہ کر۔ ﴿ فاحدر ﴾ نصر ینصر باب سے امر کا صیغہ ہے۔ جس کا معنی جلدی جلدی ادا کرنا۔ اس حدیث کی سند میں عبدالمنعم نامی راوی ہے۔ جسے محدثین نے متروک کہا ہے۔ ﴿ وضعفه ایضا ﴾ اس کو بھی اس نے ضعیف قرار دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معاویہ بن یحییٰ یہ حدیث زھری سے روایت کرتے ہیں اور زھری حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور معاویہ ضعیف ہے اور زھری کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ہی ثابت نہیں۔ اس اعتبار سے یہ روایت منقطع ہے اور اس لئے بھی کہ معاویہ بن یحییٰ راوی زھری کے حوالہ سے ضعیف ہے۔ ﴿ ومن اذن ﴾ ما قبل پر عطف ہے اور وہ نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے ﴿ ان اخاصداء اذن ﴾ یعنی صداء قبیلہ کے ایک شخص نے اذان کہی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا (ومن اذن فھو یقیم) کہ "جو اذان کہے وہی اقامت کہے"۔ اس حدیث سے مصنف رحمہ اللہ نے یہ ٹکڑا حذف کر دیا۔ مکمل حدیث اس طرح ہے کہ زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے قبیلہ صداء کے آدمی! اذان کہو۔" میں نے اذان کہی۔ جب آپؐ نماز پڑھانے لگے تو بلال رضی اللہ عنہ نے اقامت کہنا چاہی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "صدائی بھائی نے اذان کہی ہے اور جو اذان کہے وہی اقامت کہے گا۔" ﴿ صداء ﴾ کے "صاد" پر ضمہ ہے۔ ایک قبیلہ کا نام ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اس کا ضعف اس وجہ سے ہے کہ اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم افریقی ہے' امام قطان وغیرہ نے اسے ضعیف کہا لیکن ثوری رحمہ اللہ نے اسے اچھا کہا ہے اور بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ حدیث کے قریب رہنے والا ہے۔ ابن حبان نے اسے ثقہ کہا ہے اور درست بات بھی یہی ہے کہ وہ ثقہ ہے۔ طبرانی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں اس کی تائید ہوتی ہے جس کے الفاظ ہیں۔ اقامت کہنا اسی کا حق ہے جس

نے اذان کہی لیکن یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں اہل علم کی اکثریت کے نزدیک اسی پر عمل ہے کہ جو اذان کہے وہی اقامت کا حقدار ہے۔ ہاں یہ حدیث عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث کے معارض ہے جو ۱۹۸ نمبر پر ہے۔ احادیث میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اس معاملہ میں وسعت ہے دوسرا بھی تکبیر کہہ سکتا ہے۔ ﴿ وفیه ضعف ایضا ﴾ بیہقی نے بیان کیا ہے کہ اس حدیث کی سند اور متن میں اختلاف پایا جاتا ہے اور فرمایا ہے کہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ اور "الصدائی" رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں احادیث اگر صحیح ہوں تو صدائی کی حدیث راجح ہے کیونکہ وہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بعد کی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ ﴾ صداء قبیلہ کے فرد تھے۔ یہ یمن کا ایک قبیلہ تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہوئی تھی۔ آپؐ کے روبرو اذان دی۔ بصریوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۱۵۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**الْمُؤَذِّنُ أَمْلَكُ بِالأَذَانِ، وَالإِمَامُ أَمْلَكُ بِالإِقَامَةِ**». رَوَاهُ ابْنُ عَدِيٍّ، وَضَعَّفَهُ، وَلِلْبَيْهَقِيِّ نَحْوُهُ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِنْ قَوْلِهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مؤذن اذان کا زیادہ حقدار ہے اور امام تکبیر کہنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔" (اسے ابن عدی نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے اور بیہقی میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح منقول ہے)

لغوی تشریح: ﴿ رواه ابن عدی و ضعفه ﴾ ابن عدی نے اسے ضعیف اس بناء پر قرار دیا ہے کہ شریک قاضی تنہا اسے روایت کرتا ہے لیکن ابن معین نے کہا شریک صدوق، ثقہ ہے۔ البتہ اگر اس کی مخالفت ہو تو پھر ہمیں دوسرا محبوب ہے اور نسائی نے کہا ﴿ لیس به باس ﴾ (اس میں کوئی حرج نہیں۔) اور احمد نے کہا کہ وہ عاقل اور صدوق ہے۔ امام مسلم نے اس سے متابعتاً روایت لی ہے۔ **حاصل کلام:** مؤذن اذان کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے کیونکہ اس کو اذان کے وقت کا محافظ بنایا گیا ہے لہٰذا مؤذن کو اذان دینے میں تاخیر یا تقدیم پر مجبور کرنے کا کوئی بھی مجاز نہیں اور امام، تکبیر کہلانے میں حقدار ہے، یعنی اس کے اشارہ و اجازت کے بغیر تکبیر نہ کہی جائے۔

(۱۵۸) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لاَ يُرَدُّ الدُّعَاءُ بَيْنَ الأَذَانِ وَالإِقَامَةِ**». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "اذان اور اقامت کے درمیانی وقفہ میں دعا مسترد نہیں کی جاتی۔" (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: ترمذی میں حدیث کے آخر میں اتنا اضافہ بھی منقول ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! تو پھر ہم (اس وقت) کیا دعا کریں؟ فرمایا "سلوا الله العفو والعافیة فی الدنیا والاخرة

کہ اللہ تعالیٰ سے عفو و بخشش اور دنیا و آخرت میں عافیت کا سوال کرو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مقبولیت دعا کیلئے یہ وقت نہایت موزوں اور مناسب ہے۔

(١٥٩) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ قَالَ حِينَ يَسْمَعُ النِّدَاءَ: اللَّهُمَّ رَبَّ هَذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَةِ، وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ، آتِ مُحَمَّداً الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ، وَابْعَثْهُ مَقَاماً مَحْمُوداً الَّذِيْ وَعَدتَّهُ حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جس آدمی نے اذان سن کر یہ دعا کی تو اس کے لئے قیامت کے روز میری شفاعت حلال ہو گئی۔ ''اے اللہ! اے اس کامل دعا و پکار اور قائم ہونے والی نماز کے مالک! محمد ﷺ کو وسیلہ (مقام محمود) اور فضیلت عطا فرما اور مقام محمود پر جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے پہنچا دے (کھڑا فرما دے) تو اس کیلئے قیامت کے روز میری شفاعت حلال ہو گئی۔''

(اس کو ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ چاروں نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ نداء ﴾ بمعنی اذان۔ رب منصوب ہے منادی سے بدل ہونے کی وجہ سے یا پھر دوسرے منادی سے اور وہ مضاف ہے۔ ﴿ هذه الدعوة التامة ﴾ کے قول کی طرف۔ اس دعوت سے مراد توحید کی دعوت ہے۔ اس کے مکمل ہونے کی وجہ سے اسے ﴿ تامة ﴾ کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے اس لئے کہ رب ہی توحید کا ملیت اور تمامیت کا استحقاق رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ سب کچھ نقص اور فساد کی زد میں ہے ﴿ والصلوة القائمة ﴿ قیامت تک باقی رہنے والی۔ ﴿ الوسيلة ﴾ اس کی وضاحت خود نبی کریم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمادی ہے کہ وہ جنت میں ایک مقام ہے۔ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو وہ لائق ہے اور مجھے توقع ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں گا ﴿ والفضيلة ﴾ اس مرتبہ کو کہتے ہیں جو ساری مخلوق سے برتر ہو ﴿ وابعثه ﴾ اس کو وہاں پہنچا دے' بھیج دے ﴿ مقاما محمودا ﴾ یہ وہ مقام ہے جہاں نبی کریم ﷺ رب کائنات کے حضور سجدہ ریز ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی ان کلمات کے ساتھ حمد و ستائش کریں گے جو اس موقع پر انہیں الہام کئے جائیں گے۔ اس سے پہلے ان کا علم آپؐ کو نہیں ہوگا اور اسی دعا و درخواست کی وجہ سے آپؐ کو شفاعت کبریٰ کی اجازت ہوگی۔ ﴿ حلت ﴾ واجب ہو جائے گی۔ میری شفاعت کا مستحق قرار پائے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اذان سننے کے بعد اس دعا کا پڑھنا مسنون ہے اور اس کی فضیلت بھی بڑی ہے۔ اس سے بڑا شرف اور فضل کیا ہوگا کہ پڑھنے والے کیلئے نبی کریم ﷺ کی بروز قیامت شفاعت ہوگی۔ جس کی آپؐ نے سفارش فرمائی وہ بالآخر جنت میں چلا ہی جائے گا۔ ''مقام محمود'' کا ذکر قرآن مجید کی سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ ﴿ عسى ان يبعثك ربك مقاما محمودا ﴾ یعنی امید

ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر پہنچا دے گا۔

٣ - بَابُ شُرُوطِ الصَّلَاةِ

شرائط نماز کا بیان

(١٦٠) عَنْ عَلِيِّ بْنِ طَلْقٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ ﷺ: «إِذَا فَسَا أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ، فَلْيَنْصَرِفْ، وَلْيَتَوَضَّأْ وَلْيُعِدِ الصَّلَاةَ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت علی بن طلق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دوران نماز جب تم میں سے کسی کی ہوا خارج ہو جائے تو وہ واپس جائے' ازسرنو وضو کرے اور نماز دوبارہ پڑھے۔" (اسے احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب شروط الصلاۃ﴾ شرط اسے کہتے ہیں جو اصل چیز سے خارج ہو اور اس حیثیت سے اس کیلئے لازمی اور ضروری ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں وہ بھی نہیں رہتی۔ یعنی اس کا ہونا اس چیز کے ساتھ لازم ہے۔ بالفاظ دیگر شرط اس کام کو کہتے ہیں کہ جس کے نہ ہونے سے شرط والا کام نہ ہو۔ "اذافات الشرط فات المشروط" جب شرط نہ رہے تو مشروط بھی معدوم ہو جاتا ہے۔ ﴿فسا﴾ فسو سے ماضی کا صیغہ ہے۔ مقعد سے بغیر آواز کے جو ہوا خارج ہوتی ہے۔ ﴿ولیعد الصلاۃ﴾ ولیعد میں یعد اعادہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی لوٹانا' دوبارہ ادا کرنا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نماز میں جس کا وضو ٹوٹ جائے اسے ازسرنو دوبارہ نماز پڑھنا واجب ہے۔ پہلی نماز پر بنا کسی صورت بھی صحیح نہیں۔ یہ اس حدیث کے معارض ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نواقض الوضو کے باب میں پہلے گزر چکی ہے جس میں مذکور ہے کہ حالت نماز میں بے وضو آدمی نیا وضو کرے اور اپنی نماز پر بنا کرے۔ لیکن جیسا پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ لہٰذا اس حدیث کا باب مذکور کی حدیث سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا راجح اور قابل ترجیح یہی بات ہے کہ غیر مشروط طور پر نماز نئے سرے سے پڑھی جائے۔

راوی حدیث: ﴿علی بن طلق رضی اللہ عنہ﴾ پورا نام علی بن طلق (طاء پر فتحہ' لام ساکن) بن المنذر بن قیس سحمی' یمامی حنفی' بنو حنیفہ کی طرف نسبت کی وجہ سے حنفی ہیں' صحابی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ طلق بن علی کے والد ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے نام ہے۔

(١٦١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِخِمَارٍ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جسے حیض آتا ہے (یعنی وہ عورت جو بالغہ ہے) اللہ تعالیٰ اس کی نماز دوپٹہ کے بغیر قبول نہیں کرتا۔" (اسے بجز نسائی کے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ حائض ﴾ اس سے بالغ و نوجوان عورت مراد ہے۔ ﴿ الخمار ﴾ "خاء" کے نیچے کسرہ' اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے عورت اپنا سر اور گردن ڈھانپتی اور چھپاتی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ نماز کے وقت بالغ و نوجوان عورت کا سارا جسم چھپا ہوا ہونا چاہئے حتیٰ کہ سر کے بال بھی چھپے ہوئے ہوں۔

(١٦٢) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُ: «**إِنْ كَانَ الثَّوْبُ وَاسِعاً فَالتَحِفْ بِهِ، يَعْنِي فِي الصَّلاَةِ**». وَلِمُسْلِمٍ: **فَخَالِفْ بَيْنَ طَرَفَيْهِ، وَإِنْ كَانَ ضَيِّقاً فَاتَّزِرْ بِهِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا "جب کپڑا بڑا اور فراخ ہو تو (نماز میں) کپڑا خوب (جسم پر) لپیٹ لو" اور مسلم کی روایت میں ہے کہ کپڑا کشادہ ہو تو کپڑے کے دونوں کناروں کو کندھوں پر دونوں طرف ڈال لو اور اگر کپڑا تنگ اور چھوٹا ہو تو اسے تہبند کی صورت میں باندھ لو۔ (بخاری و مسلم)

وَلَهُمَا مِنْ حَدِيْثِ أَبِي هُرَيْرَةَ: «**لاَ يُصَلِّي أَحَدُكُمْ فِي الثَّوْبِ الوَاحِدِ، لَيْسَ عَلَى عَاتِقِهِ مِنْهُ شَيْءٌ**».

اور بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "تم میں سے کوئی ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھے جب تک کہ اس کپڑے کا کوئی حصہ اس کے کندھوں پر نہ ہو۔"

لغوی تشریح: ﴿ فالتحف ﴾ التحاف سے امر کا صیغہ ہے۔ چادر کے اوڑھنے یا پہننے کو کہتے ہیں۔ جس کی وضاحت اگلا جملہ کر رہا ہے۔ ﴿ فخالف بین طرفیه ﴾ اس کی صورت یہ ہوگی کہ دونوں بغلوں کے نیچے سے کپڑا نکال کر کندھوں پر ڈال دے۔ دائیں طرف کا بائیں کندھے پر اور بائیں طرف کا دائیں کندھے پر اور گدی کے پاس دونوں کونوں کو گانٹھ دے لے (یعنی گرہ لگا لے۔) ﴿ فاتزر ﴾ باب افتعال سے اتزر امر کا صیغہ ہے اور تہبند باندھنے کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازی کے کندھے بھی نماز میں ننگے نہیں ہونے چاہئیں۔

(١٦٣) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّهَا سَأَلَتِ النَّبِيَّ ﷺ: أَتُصَلِّي المَرْأَةُ فِي دِرْعٍ وَخِمَارٍ بِغَيْرِ إِزَارٍ؟ قَالَ: «**إِذَا كَانَ الدِّرْعُ سَابِغاً يُغَطِّي ظُهُورَ قَدَمَيْهَا**». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ،

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا کوئی عورت تہبند کے بغیر محض کرتے اور اوڑھنی میں نماز پڑھ سکتی ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "کرتا اگر اتنا لمبا ہو کہ قدم کی پشت تک پہنچ جاتا ہے تو جائز ہے۔" (اسے ابوداؤد

وَصَحَّحَ الأَئِمَّةُ وَقْفَهُ.

نے روایت کیا ہے اور ائمہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ درع ﴾ دال پر کسرہ "راء" ساکن۔ قمیص ﴿ سابغا ﴾ اتنی لمبی چوڑی اور فراخ کہ پورے جسم کو ڈھانپ لے ﴿ یغطی ﴾ تغطیۃ سے ماخوذ ہے۔ پردہ پوشی کرتا ہے' ڈھانپتا ہے ﴿ ظھور قدمیہ ﴾ پاؤں کا اوپر والا حصہ۔ پاؤں کی بالائی سطح۔

حاصل کلام: عورت کو نماز کی ادائیگی کیلئے سارا جسم مستور کرنا ضروری ہے۔ ایک لمبے چوڑے کرتے اور ایک سربند یعنی دوپٹہ کے ساتھ بھی نماز پڑھ سکتی ہے بشرطیکہ کرتہ اتنا دراز ہو کہ پاؤں کی بالائی سطح بھی چھپ جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو اپنے پاؤں چھپانے ضروری ہیں گویا پاؤں کا ڈھانپنا بھی عورت کیلئے شرط ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں بعض علماء نے عورت کے پاؤں کو بھی ستر میں شمار کیا ہے۔ اس حدیث کے موقوف ہونے کو ائمہ نے صحیح قرار دیا ہے مگر امام حاکم نے اس کا مرفوع ہونا بخاری کی شرائط کے مطابق کہا ہے۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ ایک ایسی حدیث جو موقوف ہے اور اس کے مضمون میں اجتہاد کا دخل نہ ہو تو ایسی حدیث محدثین کے نزدیک مرفوع کے حکم میں شمار ہوتی ہے۔ اس لئے اگر اسے موقوف تسلیم کرلیا جائے تو یہ حکماً مرفوع ہے۔

(١٦٤) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِيْ لَيْلَةٍ مُظْلِمَةٍ، فَأَشْكَلَتْ عَلَيْنَا الْقِبْلَةُ، فَصَلَّيْنَا، فَلَمَّا طَلَعَتِ الشَّمْسُ إِذَا نَحْنُ صَلَّيْنَا إِلَى غَيْرِ الْقِبْلَةِ، فَنَزَلَتِ الآيَةُ ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ﴾ أَخْرَجَهُ التِّرمِذِيُّ، وَضَعَّفَهُ.

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک تاریک و اندھیری رات میں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے' قبلہ کا رخ شناخت کرنا ہم پر دشوار و مشکل ہوگیا۔ ہم نے (اندازاً قبلہ کا رخ متعین کر کے) نماز پڑھ لی۔ جب آفتاب طلوع ہوا تو معلوم ہوا کہ ہم نے تو غیر قبلہ کی جانب رخ کرکے نماز پڑھی تھی۔ پس پھر یہ آیت نازل ہوئی "فاینما تولوا فثم وجہ اللہ" "پس جدھر تم رخ کرو گے اسی طرف اللہ کی ذات موجود ہے۔" (اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ مظلمۃ ﴾ میم پر ضمہ اور لام پر کسرہ۔ تاریک رات ﴿ فاشکلت ﴾ مشتبہ ہوگئی ﴿ تولوا ﴾ رخ کرو گے۔ ﴿ فثم ﴾ "ثا" پر فتحہ اور میم پر تشدید اور فتحہ۔ یہاں کے معنی میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عدم واقفیت' ابر آلودگی یا دیگر کسی سبب کے باعث سمت قبلہ صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکے اور آدمی اپنی دانست کے مطابق غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کرکے نماز پڑھ لے کہ قبلہ اس جانب ہوگا مگر دراصل قبلہ اس رخ پر نہ ہو تو صحیح سمت قبلہ معلوم

ہونے پر اس نماز کا اعادہ ضروری نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقت نکلنے سے پہلے اور بعد میں ہر صورت میں اعادہ واجب ہے کیونکہ قبلہ رخ ہونا فرض ہے۔ اس حدیث کو وہ ضعیف کہتے ہیں۔ ترمذی نے اس حدیث کو اس بنا پر ضعیف کہا ہے کہ اس روایت کی سند میں اشعث بن سعید راوی ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس کی تائید حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ اسی لئے اکثر علماء کے نزدیک اعادہ کی ضرورت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ﴾ قبیلہ عنز بن وائل میں سے تھے۔ بکر اور تغلب جو وائل کے بیٹے تھے ان کے بھائی تھے۔ قدیم الاسلام صحابی تھے۔ ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ دونوں سے شرف یاب ہوئے۔ غزوۂ بدر اور دیگر تمام معرکوں میں داد شجاعت دیتے رہے۔ ان کی سن وفات میں اختلاف ہے۔ **۳۲ھ، ۳۳ھ یا ۳۵ھ میں سے کسی سن میں وفات پائی۔**

(١٦٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ**». أَخْرَجَهُ التِّرمِذِيُّ، وَقَوَّاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ **"مشرق اور مغرب کے مابین قبلہ ہے۔"** (ترمذی نے روایت کیا ہے اور بخاری نے قوی قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿مابین المشرق والمغرب قبلۃ﴾ یہ اہل مدینہ اور اسی سمت پر واقع دوسرے لوگوں کیلئے ہے۔ اس لئے کہ مدینہ مکہ کے شمال میں واقع ہے۔ جب مدینہ والے اپنا رخ جنوب کی جانب کرتے ہیں تو اس صورت میں مغرب ان کے دائیں طرف اور مشرق بائیں طرف پڑتا ہے لہٰذا ان کا قبلہ ان دونوں سمتوں کے درمیان ہوا۔ مقصد یہ ہے کہ جب نمازی قبلہ سے دور دراز فاصلہ پر ہو تو اس کیلئے عین قبلہ رخ ہونا لازمی نہیں کیونکہ ایسا اس کیلئے بڑا مشکل اور دشوار ہے۔ بس اس کیلئے اپنا چہرہ اور رخ ادھر کرنا کافی ہے۔ دیگر شہروں کیلئے بھی یہ وسعت اسی طرح ہے جس طرح اہل مدینہ کیلئے ہے۔

(١٦٦) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُصَلِّي عَلَى رَاحِلَتِهِ حَيْثُ تَوَجَّهَتْ بِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، زَادَ الْبُخَارِيُّ: يُوْمِیءُ بِرَأْسِهِ، وَلَمْ يَكُنْ يَصْنَعُهُ فِي الْمَكْتُوبَةِ.

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی اونٹنی پر نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اونٹنی جس طرف بھی رخ کرتی آپ نماز پڑھتے رہتے۔ (بخاری و مسلم) اور بخاری نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ آپ اپنے سر مبارک سے اشارہ کے ساتھ (نماز ادا) فرما رہے تھے۔ فرض نماز میں ایسا نہ کرتے تھے

وَلِأَبِيْ دَاوُدَ مِنْ حَدِيْثِ أَنَسٍ: وَكَانَ إِذَا سَافَرَ فَأَرَادَ أَنْ يَتَطَوَّعَ

اور ابوداؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آپ سفر کرتے اور نماز نفل پڑھنا چاہتے تو (ایک مرتبہ) اپنی

اسْتَقْبَلَ بِنَاقَتِهِ القِبْلَةَ، فَكَبَّرَ ثُمَّ صَلَّى حَيْثُ كَانَ وَجْهُ رِكَابِهِ. وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ.

اونٹنی کا رخ قبلہ کی طرف موڑ دیتے' اس کے بعد پھر سواری کا رخ جس جانب بھی ہو جاتا' نماز پڑھتے رہتے۔ (اس حدیث کی سند حسن ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یومی براسه ﴾ اپنے سر سے رکوع و سجود کیلئے اشارہ کرتے اور سجدہ کیلئے رکوع کے بہ نسبت ذرا زیادہ جھکتے ﴿ المکتوبة ﴾ مکتوب لکھی ہوئی یعنی فرض نماز ﴿ الرکاب ﴾ "را" کے نیچے کسرہ اور کاف مخففہ۔ سواری' اونٹنی یا پھر ہر وہ چیز جس سے سواری کا کام لیا جائے۔ یہاں مراد سواری اور اونٹنی ہی ہے۔

حاصل کلام: حدیث ہذا سے معلوم ہوا کہ سفر کی حالت میں نفلی نماز سواری پر ادا کی جا سکتی ہے۔ ایک دفعہ سواری کا رخ یا اپنا رخ قبلہ رو کر کے شروع کر لے پھر اگر سواری کا رخ کسی دوسری جانب ہو جائے تب بھی نماز درست ہے۔ اسی طرح دور حاضر میں ریل گاڑی' ہوائی جہاز اور بحری جہاز پر نماز پڑھنا جائز ہے۔ ان کا حکم کشتی کا ہوگا۔ کشتی میں نماز پڑھنا ثابت ہے اور تمام فقہاء بھی اس کے جواز پر متفق ہیں۔

(١٦٧) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «الأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ إِلاَّ المَقْبَرَةَ وَالحَمَّامَ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَلَهُ عِلَّةٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "قبرستان اور حمام کے ماسوا ساری زمین مسجد ہے (جہاں چاہے نماز پڑھ لے)" (ترمذی)

لغوی تشریح: ﴿ وله علة ﴾ وہ علت یہ ہے کہ حماد نے اسے موصول روایت کیا ہے جبکہ ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مرسل روایت کیا ہے اور امام ثوری کی روایت صحیح ہے۔ امام دارقطنی اور بیہقی نے کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل سند سے ہی محفوظ ہے۔ بعض حضرات نے اس کا موصول ہونا صحیح قرار دیا ہے اور اس کی تائید دیگر احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبرستان اور حمام میں نماز پڑھنی درست نہیں۔ حمام میں اس لئے کہ وہ جگہ ناپاک ہے اور قبرستان میں ممانعت کا سبب سد ذرائع کے طور پر شرک سے بچنے کیلئے ہے۔

(١٦٨) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهما قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَن يُصَلَّى فِي سَبْعَةِ مَوَاطِنَ: المَزْبَلَةِ، وَالمَجْزَرَةِ، وَالمَقْبَرَةِ، وَقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ، وَالحَمَّامِ،

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سات مقامات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ کوڑا کرکٹ (ڈالنے) کی جگہ' ذبح خانہ' قبرستان' شارع عام' حمام' اونٹ باندھنے کی جگہ (باڑا) اور بیت اللہ کی چھت پر۔ (ترمذی نے اسے

وَمَعَاطِنِ الإِبِلِ، وَفَوْقَ ظَهْرِ بَيْتِ اللهِ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَضَعَّفَهُ.

ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿المزبلة﴾ "میم" اور "با" پر فتحہ۔ وہ جگہ جہاں گوبر اور لید وغیرہ ڈالے جاتے ہوں۔ ﴿المجزرة﴾ "جیم" اور "زا" پر فتحہ جہاں جانور کو ذبح اور نحر کیا جاتا ہے ﴿معاطن﴾ معطن کی جمع ہے۔ میم پر فتحہ اور "طاء" کے نیچے کسرہ اونٹوں کے باندھنے کی جگہ (باڑا) یعنی حوض کے اردگرد ان کے بیٹھنے کی جگہ ﴿وضعفه﴾ اس روایت کی سند میں ایک راوی زید بن جبیرہ ہے' اس کے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ متروک ہے۔

حاصل کلام: حدیث میں روئے زمین کو مسجد قرار دینے کے باوجود کچھ مقامات اور جگہیں ایسی ہیں جہاں نماز پڑھنا شرعاً ممنوع ہے۔ جہاں لوگ کوڑا کرکٹ ڈالتے ہیں' ظاہر ہے وہ جگہ پاک تو نہیں رہ سکتی۔ اس لئے جگہ ہی جب ناپاک ہوگئی تو نماز کیسے ہوگی کیونکہ جگہ کا پاک ہونا نماز کیلئے شرط ہے۔ اسی طرح مذبح خانہ جہاں جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ خون اور دوسری گندگیاں اس جگہ کو پاک نہیں رہنے دیتیں اس لئے یہ جگہ بھی نماز کی ادائیگی کیلئے درست نہیں۔ شارع عام جو عام لوگوں کی گزرگاہ ہو۔ جو راستہ تنگ ہوگا جہاں گزرنے کی پہلے ہی 'دقت اور دشواری ہو وہاں نماز پڑھنا لوگوں کیلئے موجب اذیت ہے' توجہ اور خشوع و خضوع بھی نہیں رہ سکتا۔ خانہ کعبہ کی چھت پر نماز اس لئے ممنوع ہے کہ نماز میں بیت اللہ کی طرف متوجہ ہونا بھی شرط ہے۔ چھت پر نماز پڑھنے کی صورت میں ایسا ناممکن ہے۔ جب شرط ہی نہ پائی گئی تو نماز کیسے ہوگی۔

(١٦٩) وَعَنْ أَبِي مَرْثَدٍ الغَنَوِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «لاَ تُصَلُّوا إِلَى القُبُورِ، وَلاَ تَجْلِسُوا عَلَيْهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ قبروں کو سامنے (رکھ کر) نماز نہ پڑھو اور نہ ان پر بیٹھو۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ بعض حضرات بزرگوں کی قبروں کے پاس اس لئے مسجدیں تعمیر کرتے ہیں کہ بزرگوں کی ارواح سے فیض حاصل ہوگا۔ اس کی بھی ممانعت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں بالکل واضح طور پر یہ ارشاد نبوی ہے کہ اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ ان لوگوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ (مسجد) بنا لیا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو افعال مساجد میں اللہ تعالیٰ کیلئے انجام دیئے جاتے ہیں انہیں قبروں پر نہ کرے اور ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قبروں کو سامنے رکھ کر نماز نہ پڑھی جائے۔ اس سے شرک کا شبہ پڑ سکتا ہے۔

اور قبروں پر بیٹھنے کے بھی دو مفہوم ممکن ہیں' ایک تو یہ کہ قبر کو بطور تکیہ استعمال کیا جائے جس طرح تکیہ پر ٹیک لگاتے ہیں اسی طرح قبر کو تکیہ بنانا ممنوع ہے اور دوسرا یہ کہ قبروں پر مجاور بن کر بیٹھنا نیز قبروں پر قضاء حاجت کیلئے بیٹھنا بھی ممنوع و حرام ہے۔

راوی حدیث : ﴿ ابومرثد غنوی رضی اللہ عنہ ﴾ ابو مرثد کنیت ہے۔ کناز نام ہے۔ کاف پر فتحہ اور نون پر تشدید۔ کناز بن حصین بن یربوع الغنوی۔ غنوی غین اور نون دونوں پر فتحہ۔ قبیلہ غطفان کے ایک شخص غنی بن یعصر کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر غنوی کہلائے۔ بدری صحابی ہیں۔ حمزہ بن عبدالمطلب کے حلیف تھے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۱۲ھ میں ۶۶ برس کی عمر پا کر وفات پائی۔ مرثد میم پر فتحہ' "راء" ساکن "ثا" پر فتحہ "دال" ساکن۔

(۱۷۰) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَنْظُرْ فَإِنْ رَأَى فِي نَعْلَيْهِ أَذىً أَوْ قَذَراً فَلْيَمْسَحْهُ، وَلْيُصَلِّ فِيهِمَا». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "تم میں سے جب کوئی مسجد میں آئے تو (مسجد میں داخل ہونے سے پہلے) اسے چاہئے کہ (اپنی جوتی) دیکھ لے۔ اگر اپنی جوتی میں گندگی یا ناپاک چیز لگی ہوئی دیکھے تو اسے چاہئے کہ اسے صاف کرے اور اس میں نماز پڑھ لے"۔ (ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ اذی ﴾ طبائع جس سے اذیت محسوس کریں۔ ﴿ قذر ﴾ طبائع جسے گندہ تصور کریں اور اس سے نفرت کریں۔ مراد اس سے نجاست و گندگی ہے ﴿ اذی او قذر ﴾ بول کر' راوی نے اپنے شک کا اظہار کیا ہے۔

حاصل کلام : یہ حدیث اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ جوتے پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ جوتے پاک و صاف ہوں۔ نیز یہ کہ جوتے پر لگی ہوئی نجاست کو رگڑ کر صاف کرنے سے جوتا پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ حدیث کے بظاہر ہر لفظ سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ نجاست خشک ہو یا تر دونوں کا حکم یکساں ہے۔ اس ارشاد نبوی ؐ کا سبب یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ ؐ نے جوتا پہنے ہوئے نماز ادا فرمائی۔ آپ ؐ کو اس کا علم نہیں تھا کہ جوتا ناپاک ہے اور اس کے نیچے گندگی اور نجاست لگی ہوئی ہے' دوران نماز ہی جبریل امین ؑ نے آپ ؐ کو مطلع فرمایا کہ آپ ؐ کے جوتے نجاست آلودہ ہیں۔ آپ ؐ نے نماز ہی میں جوتے اتار دیئے اور نماز جاری رکھی۔ مقتدیوں نے امتثال فعل نبوی ؐ میں اپنے جوتے بھی اتار دیئے اور نماز پڑھتے رہے۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ ؐ نے صحابہ ؓ سے جوتے اتارنے کی وجہ دریافت فرمائی' انہوں نے جواب میں عرض کیا ہم نے آپ ؐ کی اتباع میں جوتے اتارے ہیں۔ پھر آپ ؐ نے اپنا جوتا اتارنے کی وجہ بتائی۔ اس حدیث

سے یہ معلوم ہوا کہ نمازی کو اگر نماز کے آغاز کے وقت اس کا علم نہ ہو سکا ہو کہ اس کے کپڑے یا جوتے وغیرہ پر نجاست لگی ہوئی ہے اور دوران نماز کسی طرح علم ہو جائے تو وہ نمازی اس ناپاک چیز کو اسی حالت میں اتار کر نماز کو پورا کرلے۔ نماز بالکل صحیح ہوگی۔

(١٧١) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا وَطِئَ أَحَدُكُمُ الأَذَى بِخُفَّيْهِ فَطَهُورُهُمَا التُّرَابُ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی ایک اپنے موزوں سے گندگی پر چلے تو بے شک مٹی اسے پاک و صاف کرنے والی ہے۔" (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿وطئی احدکم الاذی﴾ نجاست کو اپنے پاؤں سے پامال کرے اور اس پر سے گزرے اور چلے وطئی باب سمع یسمع سے ہے۔ ﴿بخفیه﴾ خف کا تثنیہ ہے۔ ضمیر کی طرف مضاف ہے۔ اس میں "باء" حرف جر ہے۔ یہ اور پہلے گزری ہوئی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جوتے' موزے اور ایسی دوسری چیزیں مٹی سے رگڑنے سے پاک ہو جاتے ہیں' خواہ نجاست خشک ہو یا تر۔

حاصل کلام: جوتوں اور موزوں پر اگر کسی قسم کی نجاست خواہ وہ خشک ہو یا تر' مرئی ہو یا غیر مرئی' خفیف ہو یا غلیظ' لگ جائے تو وہ پاک مٹی پر اچھی طرح رگڑنے سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں۔ دھونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک اس کے برعکس ہے البتہ احناف نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کو صحیح مانا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک روایت کی رو سے' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی رائے دی ہے کہ نجاست خشک ہو یا تر صرف زمین پر جوتا یا موزہ اچھی طرح رگڑنے سے پاک و صاف ہو جاتا ہے' پانی سے دھو کر پاک و صاف کرنے کی ضرورت نہیں۔

(١٧٢) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ هَذِهِ الصَّلاَةَ لاَ يَصْلُحُ فِيهَا شَيْءٌ مِنْ كَلاَمِ النَّاسِ إِنَّمَا هو التَّسْبِيحُ وَالتَّكْبِيرُ وَقِرَاءَةُ الْقُرْآنِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز میں انسانی گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں۔ نماز میں تو صرف تسبیح (سبحان اللہ) تکبیر (اللہ اکبر) اور تلاوت قرآن ہونی چاہئے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ دوران نماز ایک نمازی نے چھینک ماری اس نے (الحمد لله) کہا اس کے جواب میں نماز ہی میں ہوتے ہوئے معاویہ رضی اللہ عنہ نے (یرحمك الله) کہہ دیا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے مندرجہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں دوسرے کو مخاطب کر کے بات کرنا حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا شمار اہل حجاز میں ہوتا ہے۔ مدینہ میں سکونت اختیار کی اور بنی سلیم میں رہنے لگے۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔

(۱۷۳) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ قَالَ: إِنْ كُنَّا لَنَتَكَلَّمُ فِي الصَّلاَةِ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ: يُكَلِّمُ أَحَدُنَا صَاحِبَهُ بِحَاجَتِهِ، حَتَّى نَزَلَتْ ﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلاَةِ الوُسْطَى وَقُومُوا للهِ قَانِتِينَ﴾ فَأُمِرْنَا بِالسُّكُوتِ، وَنُهِينَا عَنِ الكَلاَمِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں دوران نماز ہم ایک دوسرے سے بات چیت کر لیا کرتے اور اپنی ضرورت و حاجت ایک دوسرے سے بیان کر دیتے تھے تاآنکہ "حافظوا علی الصلوات والصلوہ الوسطی وقوموا للہ قانتین" آیت نازل ہوئی تو ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور نماز میں گفتگو اور کلام کرنے سے منع کر دیا گیا۔ (بخاری و مسلم۔ اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ وان کنا ﴾ ان ۔ یہ نون ثقیلہ ہے جو اس جگہ نون مخففہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس کا اسم محذوف ہے یعنی انا یا انہ اور کنا اس کی خبر ہے۔ ﴿ والصلاۃ الوسطی ﴾ "واوٴ" اس جگہ تخصیص کیلئے ہے یعنی خاص طور پر صلاۃ وسطی پر محافظت کرو اور صحیح احادیث کی روشنی میں اس سے نماز عصر مراد ہے۔ ﴿ قانتین ﴾ ڈرتے' سہمے اور خاموش رہتے ہوئے۔ قنوت کے معنی متعدد ہیں اور صحابہ کرام ؓ نے سکوت کا معنی یہی لیا ہے۔ یہ یا تو انہوں نے قرائن کی بنا پر اخذ کیا ہے یا نبی ﷺ کی تفسیر کی روشنی میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں کسی قسم کی گفتگو اور بات چیت ممنوع ہے۔ آغاز اسلام میں کلام کی اجازت تھی جسے بعد میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔

راوی حدیث: ﴿ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ﴾ انصار کے قبیلہ خزرج میں سے تھے۔ ابوعمرو ان کی کنیت ہے۔ غزوۂ خندق میں پہلی مرتبہ شامل ہوئے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ سترہ غزوات میں شریک ہوئے۔ معرکہ صفین کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفداروں میں تھے بلکہ ان کے مخصوص اصحاب ؓ میں شامل تھے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور ۶۶ھ میں فوت ہوئے۔

(۱۷٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «التَّسْبِيحُ لِلرِّجَالِ وَالتَّصْفِيقُ لِلنِّسَاءِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، زَادَ مُسْلِمٌ: «فِي

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "(نماز میں ضرورت کے وقت) مردوں کیلئے تسبیح (سبحان اللہ کہہ کر امام کو مطلع کرنا) اور عورتوں کیلئے تالی بجانا ہے۔) (بخاری و مسلم نے

الصَّلاَةِ». اسے روایت کیا ہے اور مسلم نے "فی الصلاۃ" یعنی نماز میں کا اضافہ کیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ التسبیح للرجال ﴾ جب نمازی امام کو درپیش ناگہانی صورتحال سے مطلع اور متنبہ کرنا چاہے تو وہ سبحان اللہ کہہ کر امام کو اس کی غلطی پر مطلع کرے اور اگر عورت ہو تو وہ تالی بجائے' بایں صورت کہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ کے اوپر (الٹی جانب پر) مارے۔

حاصل کلام: جب امام نماز میں بھول جائے تو اسے متوجہ کرنے کیلئے مرد مقتدی سبحان اللہ کہہ کر اسے غلطی پر خبردار کرے اور اگر مقتدی عورت ہو تو وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر مطلع کرے گی۔ زبان سے سبحان اللہ وغیرہ کچھ نہیں کہے گی۔ عیسیٰ بن ایوب نے تالی پیٹنے کی صورت اس طرح بیان کی ہے کہ اپنے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں اپنے بائیں ہاتھ کے باطن یعنی الٹی جانب پر مارے۔ عورت کو تالی بجا کر مطلع کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس کی آواز غیر مرد نہ سنیں گویا عورت کی آواز بھی پردہ ہے۔ اس پر دور حاضر کی آزاد منش خواتین کو صد بار غور کرنا چاہئے۔ نیز اس میں اس کی بھی تردید ہے کہ بعض نادان لوگ سبحان اللہ کی بجائے اللہ اکبر کہہ کر امام کو متوجہ کرتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سنت سے یہ ثابت نہیں ہے۔

(۱۷۵) وَعَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ الشِّخِّيرِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُصَلِّي وَفِي صَدْرِهِ أَزِيزٌ كَأَزِيزِ المِرْجَلِ، مِنَ البُكَاءِ. أَخْرَجَهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ ابْنَ مَاجَه، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت مطرف اپنے باپ عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے اس وقت آپؐ کے سینہ مبارک سے گریہ و زاری کی وجہ سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے جوش کھاتی ہوئی ہنڈیا سے آواز آتی ہے۔ (اسے احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ازیز ﴾ ھمزہ پر فتحہ اور زا پر کسرہ۔ جوش مارتے وقت ہنڈیا سے جو آواز آتی ہے۔ ﴿ المرجل ﴾ میم کے نیچے کسرہ "راء" ساکن اور جیم پر فتحہ۔ ہنڈیا کے معنی میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوران نماز خوف الٰہی سے رونا نماز کیلئے موجب فساد نہیں ہے۔ اس سے نماز میں کسی قسم کا نقص واقع نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿ مطرف ﴾ میم پر ضمہ اور را پر تشدید اور کسرہ۔ بن عبداللہ بن شخیر۔ شخیر۔ شین پر کسرہ اور "خاء" پر تشدید حرشی عامری بصری مشہور ہیں۔ کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ ثقہ ہیں' عبادت گزار اور فاضل آدمی تھے۔ ان کے مناقب بے شمار ہیں۔ ۹۵ھ میں فوت ہوئے۔

﴿ عن ابیہ ﴾ اس سے مراد ہے عبداللہ بن شخیر بن عوف بن کعب الحرشی العامری رضی اللہ عنہ شرف صحابیت

سے سرفراز ہیں۔ بنی عامر کا جو وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا ان میں یہ بھی نمایاں فرد تھے۔ بصریوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۱۷۶) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ لِيْ مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ مَدْخَلاَنِ ، فَكُنْتُ إِذَا أَتَيْتُهُ وَهُوَ يُصَلِّي، تَنَحْنَحَ لِيْ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے میرے دو اوقات تھے۔ جب میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپؐ نماز ادا فرما رہے ہوتے تو مجھے مطلع کرنے کیلئے کھنکار دیتے۔ (نسائی' ابن ماجہ)

لغوی تشریح: ﴿ مدخلان ﴾ "میم" اور "خاء" دونوں پر فتحہ اور درمیان میں واقع دال ساکن ہے۔ آپؐ کی خدمت میں حاضری کے دو اوقات۔ ﴿ تنحنح ﴾ حلق میں آواز کو گردش دینا۔ کھنکھارنا (اخ' اخ کرنا)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوران نماز ضرورت کے وقت ایسی آواز نکالنا جس میں حروف کی ادائیگی نہ ہو نماز کیلئے موجب فساد نہیں۔

(۱۷۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قُلْتُ لِبِلاَلٍ: كَيْفَ رَأَيْتَ النَّبِيَّ ﷺ يَرُدُّ عَلَيْهِمْ حِيْنَ يُسَلِّمُونَ عَلَيْهِ، وَهُوَ يُصَلِّي؟ قَالَ: يَقُوْلُ هٰكَذَا وَبَسَطَ كَفَّهُ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت (عبداللہ) ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ نماز پڑھتے وقت جب لوگ نبی ﷺ کو سلام کرتے تو آپؐ ان کو کیسے جواب دیتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس طرح کرتے اور اپنا ہاتھ پھیلایا۔ (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یرد علیھم ﴾ علیھم میں ھم ضمیر سے اہل قباء مراد ہیں ﴿ یقول ھکذا ﴾ عملاً کرتے یا اشارہ فرماتے۔ قول یہاں فعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کلام عرب میں ایسا اکثر اوقات ہوتا ہے۔ ﴿ وبسط کفہ ﴾ دراز کیا' پھیلایا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ نماز میں سلام کا جواب اشارے سے دینا مشروع ہے۔ بہت سے لوگوں کی یہی رائے ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو نماز میں سلام کا جواب دینا ممنوع سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب نماز میں جواب دینا جائز تھا۔ جب بعد میں نماز کی حالت میں گفتگو اور کلام کرنا حرام کر دیا گیا تو اسی وقت سے سلام کا جواب بھی حرام ہوگیا۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ تو اس موقع کی بات ہے جبکہ نماز میں سلام کا جواب جائز تھا تو پھر اشارہ سے سلام کے جواب کی کیا ضرورت و حاجت رہ جاتی ہے۔ گفتگو کی ممانعت اور اشارہ سے سلام کا جواب تو اس بات کی دلیل ہے کہ

جب نماز میں بات چیت کرنا حرام تھا اس وقت اشارہ سے جواب جائز تھا۔ صحیح بات یہی ہے کہ بلاریب و تردد نماز کی حالت میں اشارہ سے سلام کا جواب جائز ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے نمازی کو سلام کہنا درست اور جائز ہے۔ البتہ جواب کلام سے نہیں بلکہ اشارہ سے دینا جائز ہے۔ اس اشارہ کی نوعیت کیا تھی تو اس بارے میں روایات مختلف ہیں۔ مسند احمد میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنی انگلی سے اشارہ کیا۔ جعفر بن عون نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس طرح بیان کیا ہے کہ آپؐ نے اپنا ہاتھ لمبا کیا یعنی ہاتھ اوپر اٹھایا کہ ہاتھ کی پشت اوپر اور پیٹ نیچے تھا اور بیہقی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قصہ میں یہ ذکر کیا ہے کہ آپؐ نے اپنے سر مبارک سے اشارہ فرمایا تھا۔ ان احادیث سے مترشح ہوا کہ سر سے اشارہ کرے یا ہاتھ پھیلا کر یا انگشت سے اشارہ کرے۔ تینوں صورتوں میں جواب دینا جائز ہے۔

(۱۷۸) وَعَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّيْ، وَهُوَ حَامِلٌ أُمَامَةَ بِنْتَ زَيْنَبَ، فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا، وَإِذَا قَامَ حَمَلَهَا . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: «وَهُوَ يَؤُمُّ النَّاسَ فِي الْمَسْجِدِ».

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھاتے ہوئے (اپنی نواسی) امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کو گود میں لیے رہتے' جب سجدہ میں جاتے تو اسے گود سے نیچے اتار دیتے اور سجدہ کر کے کھڑے ہوتے تو اسے (دوبارہ) گود میں اٹھا لیتے۔ (بخاری و مسلم) مسلم میں اتنا اضافہ ہے کہ آپؐ لوگوں کو نماز پڑھاتے ہوئے یہ عمل کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ حامل ﴾ مرفوع اور تنوین کے ساتھ ہے۔ ﴿ امامۃ ﴾ حامل کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿ وھو یوم الناس ﴾ ام یوم نصر ینصر' لوگوں کی امامت کراتے۔ یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ وہ نماز فرضی نماز تھی۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نماز میں خواہ وہ نماز فرض ہو یا نفل ضرورت کے وقت نمازی بچے کو گود میں اٹھا سکتا ہے اور یہ "عمل کثیر" ایسا نہیں کہ اس سے نماز باطل ہو جائے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا نماز میں اگر سر سے پگڑی (یا ٹوپی وغیرہ) گر جائے تو اسے اٹھا کر سر پر رکھ سکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ نے تین سال کی بچی امامہ بنت زینب کو اٹھا لیا تھا تو پگڑی یا ٹوپی وغیرہ گرنے کی صورت میں اٹھا لینے میں آخر کیا مضائقہ ہے۔ یعنی اٹھا لینا جائز ہے۔ اتنا عمل' عمل کثیر نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا ﴾ امامہ حضور ﷺ کی لخت جگر زینب رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے والد کا نام ابوالعاص بن ربیع تھا۔ فاطمہؓ کی وصیت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد ان سے نکاح کر لیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مغیرہ بن نوفل رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا اور ان کے ہاں ہی انہوں نے وفات پائی۔

(۱۷۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اُقْتُلُوا الأَسْوَدَيْنِ فِي الصَّلاَةِ: الحَيَّةَ وَالعَقْرَبَ». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "نماز میں دو سیاہ فام جانوروں سانپ اور بچھو کو مار دیا کرو۔" (اس حدیث کو چاروں ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الحیۃ ﴾ سانپ' ﴿ العقرب ﴾ بچھو۔ دونوں اسودین کا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ اسودین سے مراد سانپ اور بچھو دونوں ہیں۔ خواہ ان کا رنگ کوئی سا بھی ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ لازماً ان کی رنگت سیاہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ نماز کی حالت میں سانپ' بچھو کو مارنے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ان دونوں موذی جانوروں کا مارنا بھی ضروری ہے۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے کہ نماز کے دوران سانپ' بچھو کو مارنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بعض لوگوں سے اس کی کراہت بھی نقل کی ہے مگر دلائل کی روشنی میں جمہور کا فیصلہ ہی صحیح ہے۔

٤ - بَابُ سُتْرَةِ المُصَلِّي — نمازی کے سترے کا بیان

(۱۸۰) عَنْ أَبِي جُهَيْمِ بْنِ الحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَوْ يَعْلَمُ المَارُّ بَيْنَ يَدَيِ المصَلِّي مَاذَا عَلَيْهِ مِنَ الإِثْمِ، لَكَانَ أَنْ يَقِفَ أَرْبَعِينَ خَيْراً لَهُ مِنْ أَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. وَوَقَعَ فِي البَزَّارِ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ: «أَرْبَعِيْنَ خَرِيْفاً».

حضرت ابو جہیم بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ ایسا کرنے کا کتنا گناہ ہے تو اس کو نمازی کے آگے سے گزرنے کے مقابلے میں چالیس (برس) تک وہاں کھڑا رہنا زیادہ پسند ہو۔" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ یہ حدیث (مسند) بزار میں ایک دوسری سند سے ہے اس میں چالیس سال کا ذکر ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب سترۃ المصلی ﴾ سترہ۔ سین پر ضمہ اور "تاء" ساکن۔ جسے نمازی اپنی سجدہ گاہ کے آگے نصب کر لے یا کھڑا کرے خواہ دیوار ہو' ستون ہو' نیزہ ہو یا لکڑی وغیرہ' تاکہ یہ سترہ گزرنے والے اور اس نمازی کے درمیان حائل رہے۔ ﴿ المار ﴾ مرور سے اسم فاعل ہے۔ گزرنے والا ﴿ خریفا ﴾ سال کو کہتے ہیں نیز خریف ربیع کے بالمقابل ایک فصل کا بھی نام ہے اور یہ سال بھر میں ایک ہی مرتبہ وصول ہوتی ہے۔ یہاں جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے۔ یہ مجاز مرسل ہے اور یہی مجاز مرسل کی شان ہے۔

راوی حدیث : ﴿ ابوجھیم بن حارث رضی اللہ عنہ ﴾ کہا گیا ہے کہ ان کا نام عبداللہ تھا۔ حارث بن صمہ انصاری کے بیٹے تھے جو خزرج قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مشہور و معروف صحابی تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت تک زندہ رہے۔ جھیم جھم سے تصغیر ہے اور (الصمۃ) صاد کے نیچے کسرہ اور میم پر تشدید ہے۔

(۱۸۱) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سُئِلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ عَنْ سُتْرَةِ الْمُصَلِّي، فَقَالَ: «مِثْل مُؤْخِرَةِ الرَّحْلِ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے سترہ کے متعلق پوچھا گیا (کہ اس کی لمبائی کتنی ہونی چاہئے؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا "اونٹ کے پالان کے پچھلے حصہ کی اونچائی کے برابر ہونا چاہئے۔" (مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ فی غزوۃ تبوک ﴾ ۹ھ رجب کے مہینہ میں رومیوں کے خلاف یہ غزوہ واقع ہوا مگر لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ تبوک حجاز کے شمال میں فلسطین کے قریب ایک جگہ ہے ﴿ موخرۃ ﴾ میم پر ضمہ واو ساکن "خاء" پر فتحہ اور نیچے کسرہ بھی ہو سکتا ہے اور ھمزہ پر فتحہ اور "خاء" پر تشدید اور فتحہ اور کسرہ دونوں اور میم پر فتحہ اور واؤ پر سکون بھی جائز ہے اور ھمزہ کے بغیر بھی ہے اور "خا" کے نیچے کسرہ۔ یہ وہ لکڑی ہوتی ہے جس پر سوار ٹیک لگاتا ہے ﴿ الرحل ﴾ کجاوے وغیرہ کا وہ حصہ جو اونٹ کی پشت پر رکھا جاتا ہے۔

حاصل کلام : احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جنگل میں سترہ کھڑا کرنا چاہئے۔ سترہ اتنا بلند اور لمبا ہونا چاہئے جتنی اونٹ کے کجاوے کے پچھلے حصے کی لکڑی ہوتی ہے۔

(۱۸۲) وَعَنْ سَبْرَةَ بْنِ مَعْبَدٍ الْجُهَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لِيَسْتَتِرْ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلاَةِ وَلَوْ بِسَهْمٍ». أَخرَجَهُ الحَاكِمُ.

حضرت سبرہ بن معبد جھنی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز (ادا کرتے وقت) تم میں سے ہر ایک کو سترہ ضرور ہی قائم کرنا چاہئے اگرچہ تیر ہی سہی۔" (مستدرک حاکم)

لغوی تشریح : ﴿ ولو بسھم ﴾ اگرچہ تیر ہی سہی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ سترہ خواہ موٹا ہو یا باریک و پتلا۔ بس اونٹ کے کجاوے کے پچھلے حصہ کی لکڑی کی اونچائی اور لمبائی جتنا ہو۔

راوی حدیث : ﴿ سبرہ بن معبد جھنی رضی اللہ عنہ ﴾ مدنی صحابی ہیں۔ ذی المروۃ میں رہائش اختیار کی۔ ان کی کنیت ابو ثریہ تھی (ثاء) پر ضمہ (راء) پر فتحہ اور "یاء" پر تشدید۔ پہلا غزوہ جس میں شامل ہوئے غزوۂ خندق تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی طرف سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس اہل شام سے بیعت لینے کیلئے بھیجا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے آخر دور حکومت میں وفات

پائی۔

(۱۸۳) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَقْطَعُ صَلَاةَ الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ - إِذَا لَمْ يَكُنْ بَيْنَ يَدَيْهِ مِثْلُ مُؤَخِّرَةِ الرَّحْلِ - الْمَرْأَةُ وَالْحِمَارُ وَالْكَلْبُ الْأَسْوَدُ». الْحَدِيثَ. وَفِيهِ: «الْكَلْبُ الْأَسْوَدُ شَيْطَانٌ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مسلمان مرد کی نماز کو جب کہ اس کے آگے پالان کے پچھلے حصہ کے برابر سترہ نہ ہو عورت، گدھا اور کالا کتا توڑ دیتا ہے۔ اس حدیث میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں کہ "کالا کتا شیطان ہوتا ہے" (مسلم)

وَلَهُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ نَحْوُهُ دُونَ الْكَلْبِ، وِلأَبِي دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ نَحْوُهُ دُونَ آخِرِهِ، وَقَيَّدَ الْمَرْأَةَ بِالْحَائِضِ.

اور اس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ہے مگر اس میں کتے کا ذکر نہیں ہے۔ نیز ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے مگر اس میں حدیث کا آخری حصہ نہیں ہے اور عورت کے متعلق حائضہ ہونے کی قید لگائی ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ یقطع صلاۃ المرء ﴾ اس فقرے کا مطلب ہے کہ نماز کی برکت کم ہو جاتی ہے المراۃ فاعل ہے۔ مطلب یہ ہے عورت کا نمازی کے سامنے سے گزرنا نماز کو توڑ دیتا ہے۔ ﴿ وفیہ ﴾ یعنی اس حدیث کا آخری حصہ۔ ﴿ الکلب الاسود شیطان ﴾ کالے کتے کو شیطان قرار دینے کی وجہ سے اس کی خباثت اور انتہائی برے منظر والا ہونا۔ ﴿ ولہ ﴾ میں ہ ضمیر راجع ہے۔ مسلم کی طرف یعنی مسلم میں۔ ﴿ عن ابی ھریرۃ نحوہ دون الکلب ﴾ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں کلب کا لفظ نہیں ہے۔ اس میں صرف عورت اور گدھے کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے لیکن مسلم کے تمام نسخوں میں لفظ کلب موجود ہے تو پھر مصنف کا یہ کہنا کہ دون الکلب کے علاوہ باقی روایت اسی طرح ہے اور ﴿ دون الکلب ﴾ کے معنی مصنف کی نظر میں یہ ہیں کہ اس روایت میں کتے کی صفت کا ذکر نہیں ہے مطلق کتے کا ذکر ہے یعنی الکلب الاسود شیطان کا ذکر نہیں ہے۔ ﴿ ولابی داود .... نحوہ ﴾ ابوداؤد اور نسائی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے (دون آخرہ) سوائے آخری حصہ کے یعنی حدیث ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت کے آخر میں جو ﴿ الاسود الکلب شیطان ﴾ ہے وہ ابوداؤد، نسائی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں نہیں۔ نحوہ اور آخرہ دونوں میں "ضمیر" کا مرجع حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے باوجودیکہ ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت دور ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت قریب ہے کیونکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس کتاب میں اصالۃ ذکر کی گئی ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی متابعت کے طور پر۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا آخری حصہ مذکور نہیں۔ ﴿ قید ﴾ تقید سے ماضی کا صیغہ ہے۔ حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے الفاظ میں کہ حائضہ عورت اور کتا نماز کو توڑ دیتے ہیں۔ (عون المعبود مطبوعہ ہند۔ ج ا‘ ص: ۲۵۹)

حاصل کلام: سترہ کی مشروعیت کی حکمت کیا ہے۔ اچھی طرح جان لو کہ جب بندہ نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو رحمت الٰہی اس کے سامنے ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ جب نمازی سترہ اپنے سامنے قائم کر لیتا ہے تو یہ سترہ حد فاصل کا کام دیتا ہے۔ اس کی حدود میں داخل ہونے والے کے بالمقابل ہو جاتا ہے‘ کیونکہ پس پردہ مقابل کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر سترہ کے آگے سے کوئی گزرتا ہے تو رحمت اس کے مزاحم نہیں ہوتی۔ تو پھر کسی قسم کا نماز میں خلل اور نقص واقع نہیں ہوتا اور جب نمازی اپنے آگے کوئی سترہ قائم نہیں کرتا تو کوئی معین حد مقابلے میں نہیں ہوتی۔ پھر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ رحمت سجدہ کی جگہ تک دراز ہوتی ہے کہ اب اگر کوئی ان جگہوں میں گزرتا ہے تو رحمت اس سے مزاحمت کرتی ہے تو یہ نماز کی برکت میں نقص اور چہرے کے سامنے رحمت کے نزول کے انقطاع کا سبب بن جاتی ہے۔ جونہی آپ اس حکمت میں ذرا تامل سے کام لیں گے اور غور کریں گے تو حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی اور حق واضح ہو جائے گا۔ سترہ کے مسائل۔ ان بڑے بڑے مسائل میں سے ہیں جن کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ پس اتنی گفتگو اور بحث سے یہ واضح ہوگیا کہ نماز کے ٹوٹنے سے مراد‘ نماز سرے سے باطل ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم و معنی یہ ہے کہ نماز کی برکت اور ثواب میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور جس آدمی نے سترہ قائم کئے بغیر نماز پڑھی اور اس کے آگے سے اتنے فاصلہ سے کوئی گزر گیا جتنا فاصلہ ایک چٹکی کے ذریعہ پھینکے ہوئے سنگریزے کا ہوتا ہے تو گزرنے والا نماز کی برکت اور ثواب کو قطع کرنے کا موجب و باعث نہیں بن سکتا اور نہ وہ گناہ گار ہی ہوگا اس لئے کہ وہ رحمت کے نزول کے مقامات اور مواقع کے درمیان خلل انداز نہیں ہوا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ امام غیر مشروط طور پر مقتدی کیلئے سترہ کا کام دیتا ہے خواہ اس کے آگے سترہ ہو یا نہ ہو کیونکہ رحمت الٰہی کے متوجہ ہونے کی جگہ ان کیلئے ہے اور وہ ان مقتدیوں اور امام کے درمیان ہے اور یہ بات کہ عورت‘ کتا اور گدھا کا خاص کر ذکر کیوں کیا گیا؟ کیا ان کے علاوہ اور کسی چیز سے نماز نہیں ٹوٹتی؟ ایسا نہیں ہے کہ ان کے علاوہ کوئی دوسری چیز نماز کی برکت کو قطع نہیں کرتی۔ اگر یہ بات ہوتی تو پھر نمازی کے آگے سے گزرنے والے مرد کیلئے گناہ گار ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ آگے سے گزرنے کے گناہ والی حدیث پہلی گزر چکی ہے۔ درحقیقت بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ تینوں چیزیں وجود شیطان اور اس کی فتنہ انگیزی کی جگہیں گمان کی جاتی ہیں۔ دوسروں کی بہ نسبت ان سے نماز کے فاسد ہونے کی وجہ سے زیادہ شدید‘ زیادہ گھناؤنی ہے۔ ترمذی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت نقل کی ہے کہ عورت چھپائے جانے والی چیز ہے۔ پس جب یہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس پر جھانکتا اور تاکتا ہے اور مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ عورت آتی ہے تو بصورت شیطان آتی ہے اور جب واپس جاتی ہے تب بھی شیطان کی صورت میں جاتی ہے اور گدھے کی آواز کے متعلق وارد ہے کہ گدھا شیطان کو دیکھ کر ہینگتا ہے اور جہاں تک

کتے کا تعلق ہے تو اس کے متعلق تو حدیث میں الکلب الاسود شیطان کی وضاحت موجود ہے۔ مطلق کتے کی خباثت بھی جانی پہچانی ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے وہاں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے اور جس شخص نے کتا پالا جب کہ شرع میں دی گئی اجازت کے مطابق نہ ہو تو اس نے ہر روز اپنے اجر و ثواب میں دو قیراط کی کمی واقع کر لی۔

(١٨٤) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: **إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ إِلَى شَيْءٍ يَسْتُرُه مِنَ النَّاسِ، فَأَرَادَ أَحَدٌ أَنْ يَجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَلْيَدْفَعْهُ، فَإِنْ أَبَى فَلْيُقَاتِلْهُ، فَإِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِيْ رِوَايَةٍ: فَإِنَّ مَعَهُ القَرِيْنَ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی سترہ قائم کر کے نماز پڑھنے لگے اور کوئی آدمی اس کے سامنے (یعنی سترہ اور نمازی کے درمیان فاصلہ) سے گزرنے لگے تو (نمازی کو چاہئے کہ) وہ اسے روکنے کی کوشش کرے اگر وہ (گزرنے والا پھر بھی) باز نہ آئے تو اس سے لڑائی کرے کیونکہ وہ شیطان (بصورت انسان) ہے۔" (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے ساتھ اس کا ساتھی ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ یجتاز ﴾ گزرتا ہے ﴿ بین یدیه ﴾ اس کے آگے سے' سامنے سے۔ یعنی نمازی اور قائم شدہ سترہ کے درمیانی جگہ سے گزرتا ہے۔ بظاہر دونوں حکم یعنی دفع کرنا اور لڑنا وجوب پر دلالت کرتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واجب نہیں مندوب ہے ﴿ فانما هو شیطان ﴾ اس کا یہ عمل شیطانی اکساہٹ کی وجہ سے ہے ﴿ القرین ﴾ ساتھی' مراد وہ شیطان ہے جو ہر لحہ انسان کے ساتھ چمٹا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ شیطان اس گزرنے والے کو اکساتا اور ابھارتا رہتا ہے' تاکہ نمازی حصول برکت اور رحمت سے محروم رہ جائے۔

حاصل کلام: نمازی کے سامنے سے گزرنا جب کہ اس نے سترہ قائم کیا ہو مکروہ ہے اور گزرنے والے کو روکنا واجب ہے یا مستحب و مندوب۔ ظاہر ہے کہ نزدیک تو بزور اسے روکنا واجب ہے۔ انہوں نے حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور یہی حدیث ان کی دلیل ہے۔ باقی سب کے نزدیک یہ مستحب ہے۔ نمازی گزرنے والے کو اشارہ سے روکنے کی کوشش کرے' اس کے باوجود اگر وہ گزرنے پر بضد ہو تو ذرا سختی سے دھکا دے کر روکے پھر بھی وہ باز نہ آئے تو اسے مارے۔ بس اتنی لڑائی اس سے مراد ہے' دھینگا مشتی مراد نہیں۔ یہ اسی صورت میں ہے جبکہ نمازی نے اپنے سامنے سترہ قائم کر رکھا ہو۔ اگر سترہ قائم نہیں تو پھر اس نمازی کا قصور ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران نماز اتنے عمل سے بھی نماز نہیں ٹوٹتی۔

(۱۸۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَجْعَلْ تِلْقَاءَ وَجْهِهِ شَيْئاً، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيَنصِبْ عَصاً، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فَلْيَخُطَّ خطاً، ثُمَّ لاَ يَضُرُّهُ مَنْ مَرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ». أَخرَجَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّان، وَلَمْ يُصِبْ مَنْ زَعَمَ أَنَّهُ مُضطَرِبٌ بَلْ هُوَ حَسَنٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے لگے تو اپنے سامنے کوئی چیز گاڑ لے یا قائم کر لے اگر کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکے تو اپنی لاٹھی ہی کھڑی کر لے۔ اگر لاٹھی بھی ممکن نہ ہو سکے تو (زمین پر) خط ہی کھینچ لے۔ اب آگے سے گزرنے والا نمازی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔" (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور جس کسی نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ حدیث مضطرب ہے اس نے صحیح نہیں کہا (وہ غلطی پر ہے) بلکہ یہ حدیث حسن کے مرتبہ کی ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ فلینصب ﴾ نصب سے ماخوذ ہے باب ضرب یضرب ہے۔ زمین میں کسی چیز کو گاڑنا' قائم کرنا' کھڑا کرنا وغیرہ۔ ﴿ لم یصب ﴾ اصابۃ سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ صواب کو بھی نہیں پہنچ سکا' نہیں پا سکا' حاصل نہیں کر سکا۔ سترہ قائم کرنے کی بجائے صرف خط کھینچنے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ تو اسے منع کرتا ہے اور ایک جماعت اس کی قائل ہے۔ سترہ کیلئے جب کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکے تو ایسی صورت میں خط کھینچنے کو کافی سمجھا ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف رائے ہے کہ سترہ کی کیفیت کیسی ہو؟ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک وہ ہلالی صورت کا ہونا چاہئے (چاند کی شکل کا) یعنی محراب کی طرح قوس دار اور بعض نے کہا ہے قبلہ رخ لمبا خط کھینچا جائے اور یہ بھی رائے ہے دائیں' بائیں کھینچا جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سترہ ہر چیز کا ہو سکتا ہے۔ کوئی چیز میسر نہ ہو تو خط بھی کھینچا جا سکتا ہے۔ اس حدیث کو مضطرب کہنے والے ابن الصلاح ہیں۔ مصنف نے النکت علی بن الصلاح میں تفصیل سے اس پر نقد کیا ہے۔

(۱۸۶) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَيَقْطَعُ الصَّلاَةَ شَيْءٌ، وَادْرَءُوا مَا اسْتَطَعْتُمْ». أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَفِي سَنَدِهِ ضَعفٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز کو کوئی چیز نہیں توڑتی (البتہ سامنے سے) گزرنے والے کو حتی الوسع روکنے کی کوشش کرو۔" (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے' اس کی سند میں ضعف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لا یقطع الصلاۃ ﴾ اس کی نماز کو باطل نہیں کرتی ﴿ ادرءوا ﴾ دفع کرو' ہٹاؤ' دور کرو۔

اس کی سند میں "مجالد" نامی راوی ہے جس کے متعلق کلام کیا گیا ہے۔ یعنی اکثر ائمہ جرح و تعدیل نے ضعیف کہا ہے۔

٥ - بَابُ الحثّ عَلَى الخُشُوعِ فِي الصَّلاَةِ

نماز میں خشوع و خضوع کی ترغیب کا بیان

(١٨٧) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُصلِّيَ الرَّجُلُ مُخْتَصِراً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ، وَمَعْنَاهُ أَنْ يَجْعَلَ يَدَهُ عَلَى خَاصِرَتِهِ.

وَفِي البُخَارِيِّ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا: «أَنَّ ذَلِكَ فِعْلُ اليَهُودِ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں اپنے دونوں کولھوں (پہلوؤں) پر ہاتھ رکھ کر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری اور مسلم۔ الفاظ حدیث مسلم کے ہیں)

اور بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ یہ یہودیوں کی نماز کا طریقہ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ باب الحث ﴾ حث یحث حثا ترغیب دلانا' ہمت دلانا' نشاط ابھارنا ﴿ الخشوع ﴾ تذلل اور سکون ظاہری اور باطنی طور پر۔ یعنی تمام اعضاء انسانی آنکھ' دل' ہاتھ' پاؤں وغیرہ کی ہر قسم کی حرکت صرف اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہو۔ ﴿ مختصرا ﴾ اختصار سے اسم فاعل ہے۔ اس کی تفسیر خود مصنف نے بیان کی ہے یعنی کولھوں (پہلوؤں) پر اپنا ہاتھ رکھنا۔ خاصرہ انسان کے جسم کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو سرین کے اوپر سے پسلیوں کے نیچے تک ہوتا ہے۔

حاصل کلام: نماز چونکہ خالص اللہ کیلئے پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ ادا کرنی چاہئے۔ ایسی ہیئت' حرکت اور فعل سرزد نہیں ہونا چاہئے جو نماز کے اس وصف کے منافی ہو۔ دست بستہ کھڑا ہونا ہی ادب ہے۔ پہلو پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہونا متکبرانہ فعل ہے جو عاجزی و انکساری کے خلاف ہے۔ نماز میں تو عجز و انکسار اور فروتنی و مسکین صورت و ہیئت ہونی چاہئے جو اللہ کو پسند ہے۔ تکبر و نخوت کی حالت ناپسندیدہ ہے۔ اس لئے نماز میں "اختصار" کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ ہیئت یہود کی ہے اس لئے ان کے ساتھ مشابہت سے اجتناب بھی ضروری ہے۔

(١٨٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ: قَالَ: «إِذَا قُدِّمَ العَشَاءُ فَابْدَءُوا بِهِ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب شام کا کھانا پیش کیا گیا ہو تو مغرب کی نماز ادا کرنے سے پہلے کھانا' کھالو۔"

قَبْلَ أَنْ تُصَلُّوا المَغْرِبَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ قدم ﴾ تقدیم سے مجہول کا صیغہ ہے۔ معنی ہے حاضر کیا گیا' پیش کیا گیا ﴿ العشاء ﴾ عین اور شین پر فتحہ اور مدرات کا کھانا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے اگر کھانا تیار ہو چکا ہو (اور بھوک لگی ہو) تو پہلے کھانا تناول کر لینا چاہئے' تاکہ نماز کے خشوع میں نقص پیدا نہ ہو جائے کہ دھیان اور توجہ کھانے کی طرف رہے۔

(١٨٩) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ فَلَا يَمْسَحِ الحَصَى، فَإِنَّ الرَّحْمَةَ تُوَاجِهُهُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ، وَزَادَ أَحْمَدُ: «وَاحِدَةً أَوْدَعْ». وَفِي الصَّحِيحِ عَنْ مُعَيْقِيبٍ نَحْوُهُ بِغَيْرِ تَعْلِيلٍ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی شخص نماز ادا کر رہا ہو تو (سجدہ گاہ) سے سنگریزوں (کنکریوں) کو اپنے ہاتھ سے نہ ہٹائے۔ کیونکہ (اس وقت) رحمت خداوندی نمازی کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔" (اسے پانچوں احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

مسند احمد میں اتنا اضافہ ہے کہ اگر کنکریاں ہٹانا ہی ہیں تو ایک مرتبہ ہٹا دو یا چھوڑ دو اور صحیح بخاری میں حضرت معیقیب سے یہی روایت مروی ہے اس میں سبب کا بیان نہیں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فلا یمسح ﴾ یعنی پیشانی رکھنے کی جگہ یا سجدہ کرنے کی جگہ (سے کنکریاں نہ ہٹائے) ﴿ والحصی ﴾ الحصبۃ چھوٹے سنگریزے' چھوٹی چھوٹی کنکریاں ﴿ زاد احمد فی روایتہ ﴾ احمد نے اپنی روایت میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ اگر کنکریوں کے ہٹانے کی اشد ضرورت ہو تو پھر ایک مرتبہ ہٹا لے ورنہ چھوڑ دے ہاتھ بھی نہ لگائے۔ ﴿ بغیر تعلیل ﴾ یعنی اس میں علت بیان نہیں کی یعنی اس روایت میں یہ نہیں ہے کہ رحمت الٰہی اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث ہمیں راہ نمائی کرتی ہے کہ نماز میں سجدہ گاہ کو ہموار اور صاف نہیں کرنا چاہئے اگر ضرورت اس بات کی متقاضی ہو تو آغاز نماز سے پہلے یہ عمل کر لیا جائے۔ اس ممانعت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نماز میں' نماز کے ماسوا دوسری کسی چیز کا خیال نہ رہے۔ اگر سجدہ کی وجہ سے پیشانی خاک آلود ہو جائے تو دوران نماز اسے ہاتھ یا کپڑے سے صاف نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ اس موقع پر رحمت خداوندی نمازی کی جانب متوجہ ہوتی ہے' اگر نمازی ایسا فعل انجام دے گا تو رحمت سے محروم رہ جانے کا اندیشہ ہے البتہ شدید ضرورت کے لاحق ہونے کی صورت میں جائز ہے۔ راوی حدیث: ﴿ معیقیب رضی اللہ عنہ ﴾ میم پر ضمہ اور عین پر فتحہ۔ معیقیب بن ابی فاطمہ (ابوفاطمہ کے بیٹے) قبیلہ دوس سے تعلق رکھنے کی

وجہ سے دوسی کہلائے۔ مکہ میں قدیم الاسلام صحابہؓ میں سے ہیں۔ حبشہ کی ہجرت ثانیہ میں شامل تھے۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ نبی ﷺ کی مہر نبوت پر متعین تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بیت المال کا عامل مقرر کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں وفات پائی۔

(۱۹۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنِ الالتِفَاتِ فِي الصَّلاَةِ، فَقَالَ: «هُوَ اخْتِلاَسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطَانُ مِنْ صَلاَةِ العَبْدِ». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

وَلِلتِّرمِذِيِّ عَنْ أَنَسٍ - وَصَحَّحَهُ - : «إِيَّاكَ وَالالتِفَاتَ فِي الصَّلاَةِ، فَإِنَّهُ هَلَكَةٌ، فَإِنْ كَانَ لاَ بُدَّ فَفِي التَّطَوُّعِ».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے آنکھوں کے گوشوں سے نماز کے دوران ادھر ادھر دیکھنے کے بارے میں دریافت کیا۔ ارشاد فرمایا "یہ تو شیطان کا جھپٹا ہے جس کے ذریعہ شیطان انسان کی نماز کو جھپٹ لیتا ہے۔" (بخاری)

ترمذی کی حدیث (جسے اس نے صحیح قرار دیا ہے) میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "نماز میں التفات (ادھر ادھر نظر دوڑانے) سے بچنے کی کوشش کرو یہ موجب ہلاکت ہے۔ اگر شدید اور ناگزیر مجبوری لاحق ہو تو نوافل میں ایسا کیا جا سکتا ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿ الالتفات ﴾ دائیں بائیں نظر کرنا ﴿ الاختلاس ﴾ کسی چیز کو سلب کرنا۔ جلدی سے کسی سے چیز چھین لینا۔ ﴿ ایاک ﴾ کاف پر فتحہ۔ مرد کو خطاب ہے اور ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا بیٹے! نماز میں اپنے آپ کو التفات سے بچاؤ ایاک منصوب ہے تحذیر یعنی ڈرانے اور خوف دلانے کیلئے۔ مطلب یہ ہوا کہ ڈرو اور التفات سے بچنے کی کوشش کرو۔ ﴿ هلکه ﴾ "ھاء" اور "لام" اور "کاف" تینوں پر فتحہ۔ معنی ہلاکت کے ہیں کیونکہ یہ تو شیطان کی اطاعت و فرمان برداری ہے اور وہی اس پر برانگیختہ کرتا ہے۔

حاصل کلام: شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے وہ کوئی موقع انسان کو نقصان اور ضرر پہنچانے کا ضائع نہیں کرتا' حتیٰ کہ نماز میں بھی اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح نماز سے غافل کر دے اور کچھ نہیں تو کم از کم نمازی کی توجہ منتشر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ادھر ادھر نظر پھیرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ نمازی نماز کے کسی نہ کسی جزء سے غافل اور بے پرواہ ہو جائے اور پورے ثواب سے محروم رہ جائے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے نمازی کو ہوشیار اور محتاط رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ شدید اور سخت ضرورت کے وقت التفات کی اجازت ہے بشرطیکہ گردن گھومنے اور گردش نہ کرنے پائے صرف آنکھوں کے کونوں سے دیکھا جائے۔

(۱۹۱) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی نماز میں ہوتا

ﷺ: «إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلاَةِ فَإِنَّهُ يُنَاجِي رَبَّهُ فَلاَ يَبْصُقَنَّ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلاَ عَنْ يَمِينِهِ، وَلَكِنْ عَنْ شِمَالِهِ تَحْتَ قَدَمِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ: «أَوْ تَحْتَ قدَمِه».

ہے تو اپنے آقا و پروردگار سے باتیں کر رہا ہوتا ہے (لہٰذا ایسی حالت میں) اپنے سامنے کی طرف اور دائیں جانب نہ تھوکے بلکہ اپنی بائیں جانب پاؤں کے نیچے (تھوکے)" (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ بائیں طرف یا اپنے پاؤں کے نیچے۔

لغوی تشریح: ﴿ يناجی ﴾ مناجاۃ سے ماخوذ ہے۔ خفیہ طور پر گفتگو اور بات چیت کرنے کو کہتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ بندے کی طرف توجہ فرماتا ہے۔ ﴿ فلا یبصقن ﴾ پس مت تھوکے۔ یہ ممانعت تھوک وغیرہ کو شامل ہے ﴿ ولا عن یمینہ ﴾ دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت کا سبب دائیں جانب کی تعظیم و تکریم ہے اور حدیث میں اس کا سبب یہ بھی مذکور ہے کہ دائیں جانب فرشتہ ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے دوران تھوک یا ناک وغیرہ آجائے تو سامنے اور دائیں جانب تھوکنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اگر نمازی مسجد میں ہو اور یہ ضرورت پیش آجائے تو کسی رومال یا کپڑے وغیرہ پر لے کر اسے مل دینا چاہئے۔ اگر کوئی چیز اس وقت دستیاب نہ ہو تو پھر تھوک وغیرہ اپنی بائیں جانب پاؤں کے نیچے پھینک دے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب مسجد میں قالین وغیرہ نہ ہوں۔ پھر نماز سے فارغ ہوتے ہی اس جگہ کو صاف بھی کرے اور مزید برآں وہاں کوئی خوشبو چھڑک دے' تاکہ اثر زائل ہو جائے اور اس کی مجبوری کے گناہ کا کفارہ بھی بن جائے۔ بہرحال نماز میں قبلہ رو تھوکنا نہیں چاہئے۔ بعض صحابہؓ و تابعین رحمہم اللہ نماز سے باہر بھی اس کا اہتمام کرتے تھے۔ ادب و احترام اور پاکیزگی کا یہی تقاضا ہے۔ ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک امام کو نماز کے دوران قبلہ رخ تھوکنے کی وجہ سے منصب امامت سے معزول فرما دیا تھا۔

(١٩٢) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ قِرَامٌ لِعَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، سَتَرَتْ بِهِ جَانِبَ بَيْتِهَا، فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ ﷺ: «أَمِيطِي عَنَّا قِرَامَكِ هَذَا، فَإِنَّهُ لاَ تَزَالُ تَصَاوِيرُهُ تَعْرِضُ لِي فِي صَلاَتِي». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک زیبائشی چادر (برائے پردہ) تھی جو انہوں نے اپنے حجرے کے ایک طرف لٹکا رکھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "زیبائشی چادر کو ہمارے سامنے سے ہٹا دو کیونکہ اس کی تصویریں میری نماز میں میرے سامنے (آکر) نماز میں خلل اندازی اور خرابی کا باعث بنتی ہیں۔" (بخاری)

وَاتَّفَقَا عَلَى حَدِيْثِهَا فِيْ قِصَّةِ

بخاری اور مسلم دونوں ابو جہم کی چادر انبجانیہ کے

أَنْبِجَانِيَّةِ أَبِي جَهْمٍ، وَفِيْهِ: «فَإِنَّهَا أَلْهَتْنِي عَنْ صَلاَتِيْ».

قصہ میں متفق ہیں اس میں ہے کہ اس چادر نے مجھے میری نماز سے غافل کر دیا۔"

لغوی تشریح: ﴿ قرام ﴾ قاف کے نیچے کسرہ۔ راء پر تخفیف۔ مختلف رنگوں والا باریک کپڑا ﴿ امیطی ﴾ مجھ سے دور کر دو۔ ﴿ تصاویرہ ﴾ اس کی علامات اور نقوش۔ ضروری نہیں کہ یہ نقوش حیوانات کے ہوں کہ جس سے حیوان اور انسان کی تصویر کے جواز کی دلیل بنا لی جائے۔ ﴿ تعرض ﴾ ظاہر اور نمایاں ہوتے ہیں۔ ﴿ فی قصة انبجانية ﴾ ہمزہ مفتوح، نون ساکن "با" کے نیچے کسرہ اور جیم مخفف۔ الف کے بعد والا نون مکسورہ اور یاء نسبتی پر تشدید یعنی "اونی چادر بغیر نقوش کے" قصہ اس کا یہ ہے کہ ابو جہم رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک چادر تحفہ کے طور پر پیش کی۔ اس چادر میں کچھ نقوش و اعلام تھے اور وہ چادر تھی بھی باریک۔ آپؐ نے اسے پہن کر یا اوڑھ کر نماز ادا فرمائی تو آپؐ کی نظر بھی اعلام و نقوش کی جانب مبذول ہو گئی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی فرمایا "اس چادر کو ابو جہم رضی اللہ عنہ کے پاس ہی لے جاؤ اور اس سے مجھے ﴿ انبجانية ﴾ لا دو۔" آپؐ نے ابو جہم رضی اللہ عنہ کی خمیصہ (نقش دار چادر) کے بدلہ میں بغیر نقوش والی ﴿ انبجانية ﴾ اسی سے طلب فرمائی تاکہ ایسا نہ ہو کہ ابو جہم رضی اللہ عنہ کے دل کو چوٹ لگے کہ اس کے تحفہ کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس فرما دیا۔ ﴿ فانها الهتنی عن صلاتی ﴾ یعنی ابو جہم رضی اللہ عنہ کی چادر نے مجھے غافل اور مشغول کر دیا ﴿ الهتنی لهی یلهی ﴾ "ھا" کے نیچے کسرہ بمعنی غفلت، غافل کر دینا اور یہ ﴿ لهالهوا ﴾ جس کے معنی کھیلنے کے آئے ہیں سے ماخوذ نہیں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہر وہ چیز جس سے نمازی کی توجہ نماز سے ہٹ کر اس کی طرف ہو جانے کا اندیشہ ہو اسے دور کر دینا چاہئے، تاکہ وہ نماز میں خلل انداز نہ ہو۔ اگر اسے دور کرنا اور ہٹانا بس میں نہ ہو تو خود سامنے سے ہٹ جانا چاہئے، تاکہ خشوع و خضوع اور توجہ میں کمی پیدا نہ ہو۔

راوی حدیث: ﴿ ابوجهم رضی اللہ عنہ ﴾ یہ ابن حذیفہ بن غانم قرشی العدوی ہیں۔ عدی قبیلہ میں سے ہونے کی وجہ سے عدوی کہلائے۔ ان کا اصل نام عامر یا عبید ہے۔ فتح مکہ کے سال اسلام قبول کیا۔ عمر رسیدہ لوگوں میں سے تھے۔ جب قریش نے کعبہ کو تعمیر کیا، اس موقع پر موجود تھے اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے تعمیر خانہ کعبہ کے وقت بھی۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ابتدائی ایام میں وفات پائی۔

(١٩٣) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ يَرْفَعُونَ أَبْصَارَهُمْ إِلَى السَّمَاءِ فِي الصَّلاَةِ، أَوْلاَ تَرْجِعُ إِلَيْهِمْ» رَوَاهُ مُسْلِمٌ

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مسلمان قوم نماز میں اپنی نظریں آسمان کی جانب اٹھانے سے باز آجائیں ورنہ ایسا نہ ہو کہ پھر ان کی نظریں واپس ہی نہ آئیں۔ (یعنی نابینا ہو جائیں)" (مسلم)

اور مسلم ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے

عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «لاَ صَلاَةَ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ، وَلاَ وَهُوَ يُدَافِعُهُ الأَخْبَثَانِ».

کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جب کھانا حاضر ہو اور قضائے حاجت درپیش ہو تو نماز نہیں ہوتی۔

لغوی تشریح: ﴿ لينتهين ﴾ انتہاء سے ماخوذ ہے اور اس میں لام قسم محذوف کا جواب ہے۔ آخر میں نون مشددہ تاکید کیلئے ہے اور یہ خبر ہے امر کے معنی میں۔ یعنی رک جائیں' باز آجائیں' منع ہو جائیں ﴿ اولا ترجع ﴾ یعنی واپس نہیں لوٹیں گی ان کی نظریں ﴿ اليهم ﴾ ان کی طرف۔ یعنی وہ نابینا ہو کر رہ جائیں گے۔ دونوں میں سے ایک کا وقوع لازمی ہے یا تو لوگ آسمان کی طرف اوپر نماز میں اپنی نظریں اٹھانے سے باز آجائیں گے یا پھر بطور سزا اللہ تعالیٰ ان کی نظروں کو اچک لے گا۔ ﴿ ولا وهو يدافعه الاخبثان ﴾ یعنی اس وقت نماز نہیں ہوتی جب نمازی پیشاب یا پاخانہ روک کر نماز پڑھے

حاصل کلام: نماز کے دوران آسمان کی جانب اوپر نظریں اٹھانا حرام ہے۔ ابن حزم رحمہ اللہ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ایسا کرنے والے کی نماز ہی نہیں رہتی۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں کہا ہے کہ اس میں سخت نہی اور وعید ہے آسمان کی طرف دیکھنے کی۔ انہوں نے اس نہی کے تحریمی ہونے پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔ نماز شروع کرنے سے پہلے قضائے حاجت کی اگر شدید حاجت ہو تو اسے روک کر نماز ادا نہ کرنی چاہئے۔ ایسی نماز نہیں ہوگی۔ پیشاب' پاخانہ کی جب شدید حاجت ہو تو اس وقت یہ دونوں نمازی کو ان سے فراغت کی جانب بزور کھینچ لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے نماز میں یکسوئی نہیں رہتی۔

(١٩٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ: قَالَ: «التَّثَاؤُبُ مِنَ الشَّيْطَانِ فَإِذَا تَثَاءَبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَكْظِمْ مَا اسْتَطَاعَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَزَادَ: «فِي الصَّلاَةِ».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جمائی کا آنا شیطانی حرکت ہے۔ تم میں سے اگر کسی کو جمائی آجائے تو حتیٰ الوسع اسے روکنے کی کوشش کرے۔" (مسلم اور ترمذی۔ ترمذی نے اپنی روایت میں "نماز میں" کا اضافہ نقل کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ التثاوب ﴾ ھمزہ کے ساتھ۔ التثاوب کے معنی دل کے عضلات میں جو بخارات اور گیسیں جمع ہو جاتی ہیں ان کو خارج کرنے کیلئے منہ کا کھولنا کہ وہ خارج ہو جائیں التثاوب کہلاتا ہے۔ ﴿ من الشيطان ﴾ اس کا مطلب ہے کہ تثاوب (جمائی) معدہ کا خوب پر ہونا' بدن کا بوجھل اور بھاری ہونا۔ ان حواس کا مکدر ہونا جو سوء فہم اور سستی اور نیند کا موجب ہوتا ہے' کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں شیطان کو مرغوب اور پسندیدہ ہیں۔ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ جمائی شیطانی حرکت ہے ﴿ فليكظم ﴾ یاء مضارع پر فتحہ اور "ظاء" کے نیچے کسرہ یعنی اس کو روکے' باز رکھے' اسے روکنے کیلئے دونوں ہونٹوں کو بند رکھے یا منہ پر ہاتھ رکھ لے۔

حاصل کلام: جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ جمائی نتیجہ ہوتی ہے سستی' کاہلی اور معدہ کو خوب پر کرنے کا۔

ایسی حالت میں بندے کو دیکھ کر شیطان خوش ہوتا ہے۔ اس خوشی کو اس کی طرف منسوب کر دیا ہے "فی الصلاۃ" کی زیادتی بخاری میں بھی مروی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ جمائی کے دوران آواز نہیں نکالنا چاہئے۔

٦ - بَابُ الْمَسَاجِدِ — مساجد کا بیان

(١٩٥) عَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِبِنَآءِ الْمَسَاجِدِ فِي الدُّوْرِ. وَأَنْ تُنَظَّفَ وَتُطَيَّبَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَ إِرْسَالَهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گھروں میں جائے نماز متعین کرنے اور ان کو صاف ستھرا رکھنے کا حکم دیا تھا۔ (اسے احمد' ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کے مرسل ہونے کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب المساجد ﴾ مساجد مسجد کی جمع ہے۔ مسجد میں واقع جیم پر کسرہ ہے وہ جگہ جسے نماز پڑھنے کیلئے مخصوص کر لیا گیا ہو اور جیم پر فتحہ بھی جائز ہے اس صورت میں اس کا معنی سجدہ کرنے کی جگہ۔ ﴿ فی الدور ﴾ دور' دار کی جمع ہے جس کے معنی گھر "دور" سے مراد محلّہ یا قبیلہ ہے اس لئے کہ محلّہ اور قبیلہ میں بہت سے گھر ہوتے ہیں یا گھر میں نماز پڑھنے کی جگہ مراد ہے۔ پہلا معنی زیادہ عمدہ اور قریب الفہم ہے ﴿ وان تنظف ﴾ تنظیف سے ماخوذ ہے صیغۂ مجہول ہے۔ گندگیوں اور ناپاکیوں سے صاف کیا جائے ﴿ وتطیب ﴾ تطیب سے ماخوذ ہے اور صیغۂ مجہول ہے اور اس میں خوشبو از قسم بخور وغیرہ لگائی یا جلائی جائے۔

حاصل کلام: مسجد اور نماز پڑھنے کی جگہوں کو صاف ستھرا اور پاکیزہ رکھنا چاہئے اور ان میں خوشبو لگانی چاہئے۔ اس حدیث میں "دور" سے مراد محلے ہیں۔ محلوں میں چھوٹی چھوٹی مسجدیں ضرور ہونی چاہئے۔ انہیں خوشبو کی دھونی دے کر معطر رکھنا چاہئے۔ ذاتی گھروں میں بھی نماز پڑھنے کی جگہ مخصوص ہونی چاہئے جہاں سنن و نوافل ادا کئے جا سکیں اور خواتین نماز ادا کر سکیں۔

(١٩٦) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُودَ، اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ: «وَالنَّصَارَى».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ یہودیوں کو غارت و برباد کرے انہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔" (اسے بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے اور مسلم نے نصاریٰ کے لفظ کا اضافہ بھی نقل کیا ہے)

وَلَهُمَا مِنْ حَدِيْثِ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا: **كَانُوا إِذَا مَاتَ**

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ "جب ان میں صالح آدمی فوت ہو جاتا ہے تو یہ

فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِداً. وَفِيهِ: أُولٰئِكَ شِرَارُ الخَلْقِ. اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیتے۔" اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "یہ بد ترین مخلوق ہیں۔"

لغوی تشریح: ﴿ قاتل ﴾ لعن اور اھلک کے معنی میں استعمال ہوا ہے' جس کے معنی ہیں اللہ کی لعنت ہو اور اللہ انہیں تباہ و برباد کرے۔ قبروں کو مساجد بنا لینے کی وجہ سے ملعون قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ فعل حرام ہے ﴿ زاد مسلم والنصاری ﴾ مسلم نے یہود کے بعد لفظ نصاریٰ کا اضافہ نقل کیا ہے (یعنی اس فعل کے نصاریٰ بھی مرتکب ہوتے ہیں) ﴿ شرار ﴾ شر کی جمع ہے جو اسم تفضیل اشر کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس کے معنی بدترین اور شریر ترین کے ہیں اور خلق مخلوق کے معنی میں استعمال ہوا ہے کہ اللہ کی تمام قسم کی مخلوقات میں بدترین مخلوق ہے۔

حاصل کلام: قرآن کے بیان کے مطابق یہ اہل کتاب ہیں جنہیں آسمانی کتب دی گئیں۔ مگر ان بدبختوں نے اپنے انبیاء کرام ؑ کی وفات کے بعد ان کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔ اپنی حاجات طلب کرنا شروع کر دیں۔ اس فعل حرام کا ارتکاب جس طرح یہودیوں نے کیا اسی طرح عیسائیوں نے بھی کیا۔ اس طرح یہ شرک جلی کے مرتکب ہوئے جو خالق کائنات کی نظر میں سنگین ترین اور ناقابل معافی جرم ہے۔ اب نام کے مسلمانوں کو غور کرنا اور سوچنا چاہئے کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنا کر کن گمراہ لوگوں کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور جس جرم بدتر کا ارتکاب کر کے شرار الخلق کے زمرہ میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہ فعل بت پرستی کے مشابہ ہے۔ یہی کام غیر کرے تو قابل صد لعنت اور اگر مسلمان کہلانے والا کرے تو باعث اجر و ثواب۔ یہ اپنے آپ کو فریب اور دھوکہ میں مبتلا کرنے کے سوا اور کیا ہے۔ اس قبر پرستی کے جو نتائج آج برآمد ہو رہے ہیں وہ سب کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہیں کہ بت پرستوں کی تہذیب غالب آرہی ہے' ان کا تمدن ہر سو چھایا ہوا ہے' ان کے طور طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے افعال قبیح سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مسجدوں کو سجدہ گاہ بنانے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ جو افعال مساجد میں صرف خدا کیلئے انجام دیئے جاتے ہیں وہی قبروں پر انجام دیئے جائیں مثلاً سجدہ' رکوع کیا جائے یا دو زانو ہو کر ہاتھ باندھ کر تعظیماً ان کے سامنے قیام کیا جائے یا قبروں کے نزدیک مساجد تعمیر کی جائیں۔ میت کی تعظیم و تکریم کی بنا پر یا دوسری مساجد سے انہیں متبرک سمجھا جائے۔ یہ شرعاً درست نہیں۔

(۱۹۷) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: بَعَثَ النَّبِيُّ ﷺ خَيْلاً، فَجَاءَتْ بِرَجُلٍ، فَرَبَطُوْهُ بِسَارِيَةٍ مِنْ سَوَارِ الْمَسْجِدِ»، الحَدِيْثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مختصر سا دستہ کسی طرف روانہ کیا۔ یہ لوگ ایک (مشرک) کو گرفتار کر کے آپ ؐ کی خدمت میں لائے اور اس قیدی کو مسجد (نبوی) کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا (قید

کر دیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ خیلا ﴾ گھوڑ سواروں کا دستہ۔ جماعت ﴿ فربطوه ﴾ اس کو باندھ دیا (مضبوطی کے ساتھ) ﴿ بسارية ﴾ ستون کے ساتھ ساریہ کی جمع سواری آتی ہے۔ یہ قیدی جسے یہ دستہ گرفتار کر کے لایا' ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ تھے۔ گرفتاری کے موقع پر یہ کافر تھے۔ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت مشرک کا مسجد میں داخل ہونا جائز ہے نیز ضرورتاً مسجد کو جیل قرار دینا بھی ثابت ہوتا ہے۔ حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ کافر و مشرک مسجد میں مسلمانوں کے ارکان اسلام میں سے نماز کو ادا کرتے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں' تلاوت قرآن سنیں' صف بندی سے اتفاق و اتحاد اور یگانگت کا مظاہرہ دیکھیں۔ امیر و غریب کو ایک ہی صف میں دست بدستہ کھڑے دیکھیں اور ان سے تاثر قبول کریں۔ قیدی ہو کر آنے والا یمامہ کا سردار ثمامہ بن اثال تھا۔ عمرہ کی غرض سے آرہا تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ مسجد نبویؐ میں اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز تک ستون سے باندھے رکھا آخر کار وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

(١٩٨) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ عُمَرَ مَرَّ بِحَسَّانَ يُنْشِدُ فِي المَسْجِدِ، فَلَحَظَ إِلَيْهِ، فَقَالَ: قَدْ كُنْتُ أُنْشِدُ فيه، وَفِيْهِ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنْكَ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گزر حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے پاس سے ہوا' وہ مسجد میں اشعار پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف گھور کر دیکھا (اس پر) حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا (گھورتے کیوں ہو؟) میں تو اس وقت مسجد میں شعر پڑھا کرتا تھا جب مسجد میں وہ ذات گرامی موجود ہوتی تھی جو تم سے افضل تھی (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ ينشد ﴾ انشاد سے ماخوذ ہے "یاء" پر ضمہ اور "شین" پر کسرہ۔ اشعار پڑھنا ﴿ فلحظ اليه ﴾ دیکھنا۔ ناپسندیدہ نگاہوں سے ﴿ فقال ﴾ سے مراد حضرت حسان رضی اللہ عنہ ہیں۔ ﴿ وفيه ﴾ "واؤ" حالیہ ہے یعنی جبکہ وہ مسجد میں تھے۔ ﴿ من هو خير منك ﴾ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث کی رو سے مسجد میں اشعار پڑھنا جائز ہے مگر ایسے اشعار نہ ہوں جو توحید کے خلاف ہوں' جن میں سے شرک کی بو آتی ہو' جو مذموم اور برے اشعار ہوں یا نمازیوں کیلئے دخل اندازی کا باعث ہوں کہ نماز میں توجہ منتشر کر دیں۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ مسجد میں ایسے اشعار پڑھتے تھے جن میں کفار کی ہجو ہوتی تھی۔ آپؐ سن کر فرماتے تھے "روح القدس تیری مدد فرمائے۔ تمہارے اشعار کفار کو تیر کی طرح لگتے ہیں۔"

راوی حدیث: ﴿ حسان رضی اللہ عنہ ﴾ حسان بن ثابت انصار کے قبیلہ خزرج میں سے تھے۔ شاعر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب سے مشہور تھے۔ ابوعبیدہ کا قول ہے کہ عرب متفق ہیں کہ شہری شعراء میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سب سے بڑے شاعر تھے۔ ۵۴ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ بعض کے نزدیک ۵۵ھ میں فوت ہوئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔

(۱۹۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ سَمِعَ رَجُلاً يَنْشُدُ ضَالَّةً فِي الْمَسْجِدِ فَلْيَقُلْ: لاَ رَدَّهَا اللَّهُ عَلَيْكَ، فَإِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهَذَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ جو کوئی یہ سنے کہ کوئی آدمی مسجد میں اپنی گم شدہ چیز تلاش کر رہا ہے تو سننے والا اسے یہ کہے کہ اللہ کرے وہ چیز تمہیں واپس نہ ملے۔ مسجدیں اس مقصد کیلئے تو نہیں بنائی گئی ہیں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ینشد ﴾ "یاء" پر فتحہ اور "شین" پر ضمہ۔ باب نصر ینصر کے وزن پر۔ تلاش و طلب کرنا۔ ڈھونڈنا یا تلاش کرنے کیلئے اونچی آواز سے پکارنا ﴿ ضالۃ ﴾ گم شدہ حیوان۔ اصلی معنی تو یہی ہیں پھر غیر حیوان کو بھی اسی پر قیاس کر لیا جاتا ہے ﴿ لاردھا اللہ علیک ﴾ بظاہر تو لا اس میں نافیہ معلوم ہوتا ہے اور نفی فعل پر وارد ہوئی ہے۔ دراصل یہ بددعا ہے گم شدہ چیز کے تلاش کرنے والے کیلئے کہ خدا کرے وہ چیز جس کی وہ تلاش کر رہا ہے اسے نہ ملے۔ کیونکہ وہ مسجد میں ایسے کام کا ارتکاب کر رہا ہے جو اس مقام پر کرنا جائز نہیں ہے۔ ﴿ لم تبن ﴾ بناء سے ماخوذ ہے۔ صیغہ مجہول ہے یعنی اس غرض کیلئے ان کی تعمیر نہیں کی گئی۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جو ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ ہے اس سے مقصود لوگوں کو اس بات سے باز رکھنا ہے کہ باہر کہیں اس کی کوئی چیز گم ہو جائے اور وہ مسجد میں آکر اس کی تلاش شروع کر دے۔ یہ آداب مسجد کے خلاف ہے۔ آج کل مسجدوں میں جو اعلانات کی بھرمار ہے وہ بھی اصلاح طلب ہے۔ البتہ مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر آنے جانے والوں سے دریافت کرنے کی گنجائش ہے۔ اس حدیث میں جانور کا بطور خاص ذکر ہے کیونکہ جانور مسجدوں میں آکر گم تو نہیں ہوتے۔ تو پھر ان کی تلاش یہاں کیا معنی رکھتی ہے۔

(۲۰۰) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يَبِيعُ أَوْ يَبْتَاعُ فِي الْمَسْجِدِ فَقُولُوا: لاَ أَرْبَحَ اللَّهُ تِجَارَتَكَ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب تم کسی شخص کو مسجد میں خرید و فروخت کرتے دیکھو تو اسے کہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاروبار و تجارت میں نفع نہ دے۔" (اس حدیث کو ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یبتاع ﴾ یشتری کے معنی میں، جس کے معنی خریدنا ہے ﴿ لا اربح الله تجارتک ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تیری اس تجارت کو سود مند اور منافع بخش نہ بنائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے مساجد میں بیع و شراء، خرید و فروخت کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ مسجدیں تجارتی منڈیاں نہ بنالی جائیں۔ مسجدیں تو صرف عبادت الٰہی کیلئے تعمیر کی جاتی ہیں اگر ان میں بھی تجارت شروع ہو جائے تو یہ اپنا مقصد تعمیر کھو بیٹھیں گی۔ ان کو صرف یاد الٰہی کیلئے ہی مخصوص ہونا چاہیے۔

(۲۰۱) وَعَنْ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لاَ تُقَامُ الحُدُودُ فِي المَسَاجِدِ، وَلاَ يُسْتَقَادُ فِيهَا**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مساجد میں نہ تو حدود قائم کئے جائیں اور نہ ہی ان میں قصاص (خون کا بدلہ) لیا جائے۔" (اس حدیث کو ابوداؤد اور احمد نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لاتقام ﴾ اقامہ سے ماخوذ ہے نہ نافذ کی جائیں نہ جاری کی جائیں۔ ﴿ الحدود ﴾ وہ سزائیں جن کی اللہ تعالیٰ نے سزا مقرر فرما دی ہے کہ فلاں جرم کی فلاں سزا ہے اور اتنی ہے ﴿ ولا یستقاد ﴾ صیغہ مجہول۔ قصاص لیا جائے ﴿ بسند ضعیف ﴾ ضعیف سند سے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور یہی بات درست ہے کہ اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔ (مرعاۃ)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجدوں میں حدود قائم نہ کی جائیں اور قصاص بھی نہ لیا جائے۔ اس بات کا احتمال ہے کہ سزا پانے والے کا خون یا گندگی پیٹ سے خارج ہو جائے اور مسجد گندی ہو جائے۔

راوی حدیث: ﴿ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ ﴾ حزام "حاء" کے نیچے کسرہ۔ ان کی کنیت ابو خالد تھی۔ قبیلہ قریش کے اسد قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھائی کے بیٹے (بھانجے) تھے۔ اشراف قریش میں شمار ہوتے تھے۔ واقعہ فیل سے ۱۳ سال پہلے خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ ۵۴ھ میں یا اس کے بعد مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔ ساٹھ برس دور جاہلیت میں گزرے اور ساٹھ سال اسلام میں۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ چاروں کو صحابیت کا شرف حاصل تھا۔ خود بھی نہایت شریف القدر صحابی تھے۔

(۲۰۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أُصِيْبَ سَعْدٌ يَوْمَ الخَنْدَقِ، فَضَرَبَ عَلَيْهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ خَيْمَةً فِي المَسْجِدِ، لِيَعُودَهُ مِنْ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ غزوۂ خندق کے روز حضرت سعد رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے تھے رسول اللہ ﷺ نے ان کیلئے مسجد میں خیمہ لگوا دیا تھا، تاکہ قریب سے ان کی تیمارداری (بآسانی) کر سکیں۔

تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وتر ہے اور طاق ہی کو پسند کرتا ہے۔ طبی اعتبار سے بھی ایک ایک کو خوب اچھی طرح چبا چبا کر لعاب دہن شامل کر کے نگلتے' تا کہ نظام انہضام میں معاون و مددگار ثابت ہو۔

(۳۸۸) وَعَنِ ابْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لاَ يَخْرُجُ يَوْمَ الفِطْرِ حَتَّى يَطْعَمَ، وَلاَ يَطْعَمُ يَوْمَ الأَضْحَى حَتَّى يُصَلِّيَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نماز عید فطر کیلئے کچھ نہ کچھ کھائے بغیر نہ نکلتے تھے البتہ عید قربان کے دن جب تک نماز ادا نہ فرما لیتے کچھ تناول نہ فرماتے تھے۔ (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ولا يطعم يوم الاضحى حتى يصلى ﴾ آپؐ عیدالاضحیٰ کو نماز سے پہلے کچھ نہیں کھاتے تھے۔ بیہقی نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا کہ نماز سے فراغت کے بعد واپسی پر آپؐ اپنی قربانی کی کلیجی اور جگر وغیرہ تناول فرماتے۔

حاصل کلام: یہ حدیث بتاتی ہے کہ عید الفطر کے روز نماز سے پہلے کچھ کھانا اور عید قربان کے روز بغیر کچھ کھائے نماز ادا کرنا سنت رسول مقبول ﷺ ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کھانے میں کسی خاص چیز کی ہدایت نہیں ہے۔ البتہ کھجوروں' چھواروں کو مسنون سمجھ کر کھائے تو سونے پر سہاگہ ہے۔

(۳۸۹) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أُمِرْنَا أَنْ نُخْرِجَ العَوَاتِقَ والحُيَّضَ فِيْ العِيْدَيْنِ، يَشْهَدْنَ الخَيْرَ وَدَعْوَةَ المُسْلِمِيْنَ، وَتَعْتَزِلُ الحُيَّضُ المُصَلَّى. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم جوان لڑکیوں اور حائضہ عورتوں کو بھی عیدین میں ساتھ لے کر نکلیں تا کہ وہ بھی مسلمانوں کے امور خیر اور دعاؤں میں شریک ہوں۔ البتہ حائضہ عورتیں عید گاہ کے کنارے پر رہیں۔ (نماز میں شامل نہ ہوں صرف دعا میں شرکت کریں) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ امرنا ﴾ صیغہ مجہول ہے۔ مجہول کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا کہ حکم دینے والے کا علم ہو سکے اور وہ رسول اللہ ﷺ ہی ہیں اور بخاری کی ایک روایت تو صاف طور پر امرنا نبینا کے الفاظ ہیں۔ یعنی ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا ﴿ "ان نخرج" ﴾ اخراج سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم انہیں لے کر عید گاہ کی طرف نکلیں۔ ﴿ العواتق ﴾ نوجوان بالغ لڑکیاں۔ جو بالغ ہونے کی عمر کے قریب پہنچ چکی ہوں اور یہ عاتق کی جمع ہے اور نخرج کا مفعول واقع ہو رہا ہے۔ ﴿ والحيض ﴾ "حا" پر ضمہ اور "یا" پر فتحہ اور تشدید' حائض کی جمع ہے۔ وہ عورتیں مراد ہیں جنہیں ایام حیض آ رہے ہوں۔

عواتق پر اس کا عطف ہے۔ ﴿ یشھدن الخیر ﴾ اس روز کی برکت اور بھلائی اور فضیلت میں حاضر ہو کر حصہ دار بنیں۔ ﴿ ودعوۃ المسلمین ﴾ دعوت کا یہاں معنی دعا کے ہیں کہ سب عورتیں مسلمانوں کی دعا میں شامل ہوں۔ ﴿ وتعتزل ﴾ الگ رہیں۔ جائے نماز سے۔

حاصل کلام: نماز عید کیلئے خواتین کا گھروں سے نکل کر جانا اس حدیث کی رو سے ثابت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی ازواج مطہرات اور اپنی بیٹیوں کو عید گاہ میں لے جاتے تھے۔ حضرات ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ خواتین کا نماز عید میں حاضر ہونا واجب سمجھتے تھے۔

احناف نے اس حدیث کی تاویل کی ہے اور اسے ابتداء اسلام کا واقعہ بتایا ہے' تاکہ اہل اسلام کی تعداد زیادہ معلوم ہو اور کثرت تعداد اہل کفر و شرک کیلئے باعث اذیت ہو اور مسلمانوں کی دھاک بیٹھے۔ مگر یہ تاویل جس پر علامہ طحاوی نے بڑا زور قلم صرف کیا ہے' قابل لحاظ معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما گواہی دیتے ہیں کہ ازواج مطہرات وغیرہ عید پڑھنے جاتی تھیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کم عمر کے تھے ظاہر ہے کہ ان کی یہ گواہی فتح مکہ کے بعد کی ہے جس وقت اظہار قوت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس لئے عورتوں کو عید گاہ میں بہر نوع حاضر ہونا چاہیے۔

(۳۹۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَبُو بَكْرٍ وَعُمَرَ يُصَلُّونَ العِيْدَيْنِ قَبْلَ الخُطْبَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ عیدین کی نماز خطبہ عیدین سے پہلے پڑھتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عیدین میں نماز پہلے ادا کی جائے اور خطبہ بعد میں۔ بنو امیہ کے دور میں مروان وہ پہلا حکمران ہے جس نے نماز سے پہلے خطبہ پڑھنے کی بدعت کا آغاز کیا۔ اسی وقت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے اس پر احتجاج کیا اور برملا کہا کہ تو نے سنت کے خلاف کیا ہے۔ (صحیح مسلم)

(۳۹۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى يَوْمَ العِيْدِ رَكْعَتَيْنِ، لَمْ يُصَلِّ قَبْلَهُما وَلاَ بَعْدَهُمَا. أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے روز دو ہی رکعتیں ادا فرمائیں نہ پہلے کچھ پڑھا اور نہ بعد میں کوئی نماز پڑھی۔ (اسے ساتوں (احمد' بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے عید گاہ میں سوائے دو رکعت نماز کے اور کوئی نماز پہلے یا بعد پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ البتہ واپس جب گھر تشریف لاتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

(۳۹۲) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ نبی

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى العِيْد بِلاَ أَذَانٍ وَلاَ إِقَامَةٍ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَأَصْلُهُ فِي البُخَارِيِّ.

ﷺ نے نماز عید بلا اذان و اقامت ادا فرمائی۔ (اسے ابوداوٗد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز عید بغیر اذان و اقامت کے ادا کی جائے گی بلکہ عیدین کیلئے اذان و اقامت کو بدعت کہا گیا ہے۔ اذان اور اقامت کی قائم مقام کوئی دوسری صورت بھی غیر مسنون ہے۔

(۳۹۳) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لاَ يُصَلِّيْ قَبْلَ العِيْدِ شَيْئاً، فَإِذَا رَجَعَ إِلَى مَنْزِلِهِ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نماز عید سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ البتہ جب واپس گھر تشریف لے آتے تو دو رکعت نماز نفل ادا فرماتے۔ (اسے ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عیدگاہ میں نہیں البتہ گھر میں دو رکعت نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

(۳۹٤) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَخْرُجُ يَومَ الفِطْرِ وَالأَضْحَى إِلَى المُصَلَّى، وَأَوَّلُ شَيْءٍ يَبْدَأُ بِهِ الصَّلاَةُ، ثُمَّ يَنْصَرِفُ، فَيَقُومُ مُقَابِلَ النَّاسِ - وَالنَّاسُ عَلَى صُفُوفِهِمْ - فَيَعِظُهُمْ وَيَأْمُرُهُمْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبی ﷺ عیدالفطر اور عید قربان کیلئے عیدگاہ کی طرف تشریف لے جاتے اور پہلی چیز جس کا آپؐ آغاز فرماتے وہ نماز ہوتی۔ ادائیگی نماز کے بعد رخ پھیر کر لوگوں کی طرف کھڑے ہوتے لوگ اس وقت اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے اور آپؐ ان کو وعظ و نصیحت فرماتے اور نیکی کا حکم کرتے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں (۱) عیدین کی نماز سے پہلے کوئی عمل آپؐ سے ثابت نہیں۔ (۲) خطبہ نماز کے بعد ہونا چاہئے۔ (۳) خطیب کا رخ سامعین کی طرف ہونا چاہئے۔ (۴) خطبہ کھڑے ہو کر دینا چاہئے نیز خطیب کو اپنے خطاب میں وعظ و نصیحت کرنا چاہئے۔ ادھر ادھر کے بے فائدہ قصے کہانیاں بیان نہیں کرنے چاہئیں۔ (۵) سامعین کو اپنی صفوں میں بیٹھے رہنا چاہئے اور رخ امام کی جانب ہونا چاہئے۔ (٦) نماز عیدین مسجد میں نہیں بلکہ عیدگاہ میں پڑھنی مسنون ہے۔ آج کل بلاعذر مسجدوں میں پڑھنے کا عام رواج ہوگیا ہے جو بہرحال ختم ہونا چاہئے۔ (۷) حضور ﷺ نے نماز عید میں منبر استعمال نہیں فرمایا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ سب سے پہلے مروان نے عیدگاہ میں منبر رکھوا دیا اور اس پر خطبہ دیا۔ البتہ نبی کریم ﷺ نے ابن حبان کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ اونٹنی پر بیٹھ کر خطبہ عید ضرور ارشاد

فرمایا ہے۔ جس سے سواری پر بیٹھ کر خطبہ دینا جائز ثابت ہوتا ہے۔

(۳۹۵) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ نَبِيُّ اللهِ ﷺ: «التَّكْبِيرُ فِي الفِطْرِ سَبْعٌ فِي الأُولَى، وَخَمْسٌ فِي الأُخْرَى، وَالقِرَاءَةُ بَعْدَهُمَا كِلْتَيْهِمَا». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَنَقَلَ التِّرْمِذِيُّ عَنِ البُخَارِيِّ تَصْحِيحَهُ.

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”عیدالفطر کی نماز کی پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری میں پانچ ہیں۔ دونوں رکعتوں میں قراءت تکبیرات کے بعد ہے۔“ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے امام بخاری رحمہ اللہ سے اس کی صحت نقل کی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ سبع فی الاولی ﴾ پہلی رکعت میں سات تکبیریں ہیں اور دعاء افتتاح خواہ تکبیرات سے پہلے پڑھے یا بعد میں دونوں طرح جائز ہے۔ ﴿ وخمس فی الاخرۃ ﴾ اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں اور قیام کی تکبیر ان کے علاوہ' اس طرح چھ تکبیریں ہوئیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عیدین کی بارہ تکبیریں زائد ہیں۔ مگر اس کی سند میں بعض محدثین نے کلام کیا ہے کہ عن ابیہ عن جدہ سے اگر عمرو کا باپ شعیب اور عمرو کا دادا محمد بن عبداللہ مراد ہے تو یہ روایت مرسل ہے کیونکہ محمد بن عبداللہ تابعی ہیں اور اگر شعیب کے دادا عبداللہ مراد ہیں تو شعیب کا ان سے سماع ثابت نہیں۔ اس لئے یہ روایت منقطع ہے۔ لیکن یہ بات غلط ہے' امام دارقطنی وغیرہ نے تردید کی ہے کہ شعیب کا اپنے دادا سے سماع ثابت ہے اور یہاں ”جدہ“ سے مراد شعیب ہی کا دادا ہے۔ جمہور ائمہ جرح و تعدیل اس سند کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ' امام علی بن مدینی رحمہ اللہ' امام اسحق رحمہ اللہ' امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ' امام بخاری رحمہ اللہ' امام دارقطنی رحمہ اللہ' امام دارمی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ بلکہ فقہاء اربعہ بھی اس سند سے استدلال کرتے اور اسے صحیح کہتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ سے جو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے اس کے بارے میں صاحب سبل السلام نے کہا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع میں عمرو بن شعیب کی روایت ہی نقل نہیں کی۔ معلوم نہیں امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہاں نقل کیا ہے۔ مگر مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری نے وضاحت کر دی ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی ”العلل الکبیر“ میں یہ روایت نقل کی ہے۔ حافظ زیلعی نے ”نصب الرایہ' ص ۲۱۷' ج ۲“ میں بھی اسی کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ اس حدیث کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا' حضرت سعد رضی اللہ عنہ' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایات سے بھی ہوتی ہے مگر ان میں کلام ہے۔ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین اور فقہاء مدینہ کے علاوہ امام احمد رحمہ اللہ' امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کا بھی اسی حدیث کے مطابق عمل ہے۔ شارح ترمذی رحمہ اللہ علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری کا اس سلسلے میں مستقل رسالہ ”القول السدید فیما یتعلق بتکبیرات العید“ قابل دید ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض

دیگر فقہاء کوفہ چھ تکبیروں کے قائل ہیں۔ تین پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے اور تین دوسری رکعت میں رکوع جانے سے پہلے۔ مگر اس بارے میں کوئی صحیح مرفوع روایت ثابت نہیں۔ جمہور صحابہؓ و تابعین کا عمل ہی راجح اور دلیل کے اعتبار سے قوی ہے۔ امام ابن المنذر رحمہ اللہ اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عیدین کی زائد تکبیروں میں بھی رفع الیدین مسنون ہے۔

(۳۹۶) وَعَنْ أَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْرَأُ فِي الأَضْحَى وَالفِطْرِ بِـ «قٓ، وَاقْتَرَبَتْ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر کی نماز میں سورۂ ق اور سورۂ اقتربت الساعۃ تلاوت فرماتے تھے۔ (مسلم)

حاصل کلام: عیدین کی نمازوں میں ان سورتوں کو پڑھنا مسنون ہے۔ دوسری سورتیں پڑھنا بھی جائز ہے۔

(۳۹۷) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا كَانَ يَوْمُ العِيْدِ خَالَفَ الطَّرِيْقَ. أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ، وَلِأَبِي دَاوُدَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ نَحْوُهُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید کے روز عید گاہ کیلئے جانے اور واپسی کیلئے راستہ تبدیل کرتے تھے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح روایت ہے)

لغوی تشریح: ﴿ خالف الطریق ﴾ مطلب اس کا یہ ہے کہ عیدگاہ کو جاتے وقت ایک راستہ اختیار کیا جائے اور واپسی کیلئے دوسرا راستہ۔ نبی ﷺ کی اقتداء میں مسلمانوں کو بھی راستہ تبدیل کر کے آنا جانا چاہئے' تاکہ اس سے مختلف مقامات ان کی عبادت کے گواہ بنیں اور شوکت اسلام کا مظاہرہ بھی ہو۔

(۳۹۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَدِمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ المَدِيْنَةَ، وَلَهُمْ يَوْمَانِ يَلْعَبُونَ فِيهِمَا، فَقَالَ: قَدْ أَبْدَلَكُمُ اللَّهُ بِهِمَا خَيْراً مِّنْهُمَا: يَوْمَ الأَضْحَى، وَيَوْمَ الفِطْرِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو اہل مدینہ کے دو روز کھیل کود کیلئے مقرر تھے۔ آپؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے تمہارے ان دونوں کے بدلہ میں ان سے بہتر دو دن عنایت فرما دیئے ہیں۔ ایک عیدالاضحیٰ کا دن اور دوسرا عیدالفطر کا۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اس کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ولھم ﴾ ان کیلئے' سے مراد اہل مدینہ ہیں۔ ﴿ یومان ﴾ دو دن' عید کے۔ فرحت اور مسرت کیلئے۔ اہل مدینہ جو دو دن کھیل کود کر مناتے تھے وہ یوم نیروز اور یوم مہرجان۔ یہ دونوں کلمے فارسی

سے معرب کئے گئے ہیں۔ دراصل پہلا نو روز یعنی نیا اور جدید دن۔ اصل ہیئت کے نزدیک یہ شمسی سال کا پہلا دن ہوتا۔ اور پہلا دن وہ ہے جس روز سورج برج حمل میں منتقل ہوتا ہے اور دوسرے کلمے کی اصل مہرگان ہے یعنی گاف کے ساتھ۔ اس سے مراد وہ دن ہے جب سورج برج میزان میں منتقل ہوتا ہے اور اہل فارس نے اس مہینے کا اس نام کے ساتھ نام موسوم کر دیا ہے۔ یہ دونوں دن نہایت معتدل ہوتے ہیں' نہ ان میں گرمی ہوتی ہے اور نہ سردی۔ شب و روز بھی ان دونوں میں مساوی ہوتے ہیں اور یہ دونوں دن فارسیوں کے عید کے روز تھے بلکہ ہنوز بھی عید کے دن ہیں۔ بعض عربوں نے اس بارے میں فارسیوں کی تقلید اور نقالی کی ہے۔ مگر شارع علیہ السلام ان دنوں کی عید منانے سے منع فرماتے ہیں کیونکہ کفار کی عید کی تعظیم مکروہ یا حرام ہے بلکہ بعض نے مبالغہ میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ کفر ہے یا پھر کفر کے بالکل قریب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عیدین کے روز کھیلنا کودنا' اظہار مسرت و فرحت کرنا جائز ہے۔ البتہ مشرکوں اور کافروں کی عیدوں پر خوشی اور مسرت و انبساط کا اظہار کرنا مکروہ ہے یا بقول بعض حرام ہے۔

(۳۹۹) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ أَنْ يَخْرُجَ إِلَى العِيْدِ مَاشِياً. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عید گاہ کی جانب پیدل **چل کر جانا سنت ہے۔** (اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ **ثابت** ہوا کہ عید گاہ میں پیدل چل کر جانا مسنون ہے۔ جتنے قدم اٹھیں گے اتنی نیکیاں زیادہ لکھی جائیں گی۔ اگر عید گاہ دور ہو تو سواری پر جانا بھی ناجائز نہیں۔

(٤٠٠) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُمْ أَصَابَهُمْ مَطَرٌ فِي يَوْمِ عِيْدٍ، فَصَلَّى بِهِمُ النَّبِيُّ ﷺ صَلاَةَ العِيْدِ فِي الْمَسْجِدِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ لَيِّنٍ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ **ایک موقع** پر عید کے روز **مسلمانوں کو بارش نے آلیا تو نبی** ﷺ نے **انہیں نماز عید مسجد میں پڑھائی۔** (اسے ابوداؤد نے کمزور سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معقول شرعی عذر کی وجہ سے مسجد میں نماز عید پڑھی جا سکتی ہے۔ آپؐ عموماً نماز عید باہر عید گاہ میں جا کر ہی پڑھتے تھے۔ باران رحمت کی وجہ سے مسجد میں پڑھائی۔ مسئلہ کی نوعیت اپنے مقام پر ہے مگر اس کی سند میں ایک راوی عیسیٰ بن عبدالاعلیٰ بن ابی فروہ مجہول ہے۔ اس وجہ سے یہ روایت باعتبار سند کمزور ہے۔ علماء میں اختلاف ہے کہ نماز عید وسیع و کشادہ مسجد میں پڑھنا افضل ہے یا باہر نکل کر عید گاہ میں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وسیع و فراخ اور کشادہ مسجد میں پڑھنا افضل ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے زندگی بھر نماز عید باہر عید گاہ میں ادا فرمائی ہے

ہاں ایک مرتبہ بارش کی وجہ سے عذر پیش آگیا تو آپؐ نے نماز عید مسجد میں پڑھائی۔ اس لئے عیدگاہ میں پڑھنا افضل ہے۔ یہ بھی معلوم حقیقت ہے کہ حضور ﷺ نے حتیٰ الوسع ہمیشہ افضل کام پر مداومت و محافظت فرمائی ہے۔ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ نماز عید کیلئے عیدگاہ تشریف لے گئے اور فرمایا کہ اگر باہر نکل کر نماز عید پڑھنا مسنون نہ ہوتا تو میں مسجد میں پڑھتا۔ اس لئے عیدگاہ میں نماز پڑھنا ہی مسنون اور افضل ہے۔

١٥ - بَابُ صَلَاةِ الْكُسُوفِ

نماز کسوف کا بیان

(گرہن والی نماز)

(٤٠١) عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: انْكَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ يَوْمَ مَاتَ إِبْرَاهِيمُ، فَقَالَ النَّاسُ: انْكَسَفَتِ الشَّمْسُ لِمَوْتِ إِبْرَاهِيمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ الشَّمْسَ وَالقَمَرَ آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللهِ، لاَ يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلاَ لِحَيَاتِهِ، فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُمَا فَادْعُوا اللَّهَ وَصَلُّوا، حَتَّى تَنْكَشِفَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: «حَتَّى تَنْجَلِيَ».

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں جس روز ابراہیم کی وفات ہوئی اس دن سورج گرہن لگا۔ لوگوں نے کہا کہ سورج گرہن ابراہیم کی وفات کی وجہ سے لگا ہے۔ جس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "شمس و قمراللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ ان کو گرہن کسی کی موت و حیات کی وجہ سے نہیں لگتا۔ چنانچہ جب تم (ان کو) اس حالت میں دیکھو تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور نماز پڑھو یہاں تک کہ سورج گرہن کھل جائے۔" (بخاری و مسلم) اور بخاری کی ایک روایت میں ہے' "نماز پڑھتے رہو تاوقتیکہ وہ روشن ہو جائے۔"

وَلِلْبُخَارِيِّ مِنْ حَدِيثِ أَبِي بَكْرَةَ: «فَصَلُّوا، وَادْعُوا، حَتَّى يَنْكَشِفَ مَا بِكُمْ».

اور بخاری میں ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ "نماز پڑھو' دعا مانگو تاآنکہ وہ کیفیت تمہارے سامنے سے دور ہو جائے۔"

لغوی تشریح: ﴿باب صلاة الكسوف﴾ کسوف کہتے ہیں رنگت کی سیاہی مائل تبدیلی کو۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ﴿كسفت الشمس وانكسفت﴾ یعنی سورج بالکل سیاہ ہوگیا اس کی شعاعیں غائب ہوگئیں اور خسوف کے بھی یہی معنی ہیں۔ اہل لغت نے کہا ہے سورج گرہن کیلئے کسوف اور چاند گرہن کیلئے خسوف کا لفظ بولنا زیادہ فصیح ہے۔ اگرچہ ایک دوسرے کیلئے ان الفاظ کا استعمال بھی صحیح ہے۔ ﴿يوم مات

ابراھیم ﴾ ابراھیم نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے کا نام ہے۔ ۱۰ھ کے ۲۹ ویں شوال کا واقعہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں جو سورج گرہن تھا وہ اسی روز صبح ساڑھے آٹھ بجے لگا تھا۔ ﴿ انکسفت لموت ابراھیم ﴾ یہ ان کے دور جاہلیت کے نظریہ و تخیل کے مطابق تھا کہ کسوف و خسوف دونوں کسی عظیم انسان کی موت یا اس کی ولادت کے موقع پر لگتا ہے۔ ﴿ آیتان ﴾ نشانیاں' علامات۔ ﴿ من آیات اللہ ﴾ اللہ کی وہ نشانیاں جو اس کی قدرت' وحدانیت اور عظمت پر دلالت کرتی ہیں یا اپنے بندوں کو ڈرانے' خوف دلانے کیلئے یا یہ نشانیاں اس پر دال ہیں کہ دونوں کو اس نے اپنی قدرت و طاقت سے مسخر کیا ہوا ہے۔ جب یہ دونوں اپنے نفع و نقصان اور دفع ضرر کے مالک و مختار نہیں تو پھر دوسروں کو کیا نفع و نقصان اور ضرر پہنچا سکیں گے۔ ﴿ حتی تنکشف ﴾ یہاں تک صاف ہو جائیں اور روشن ہو جائیں کہ ان پر چھائی ہوئی سیاہی اور بے نور پن دور ہو جائے۔ حتیٰ یکشف صیغۂ مجہول ہے یعنی بلند ہو جائے اور اس پر وارد کیفیت گرہن دور ہو جائے' زائل ہو جائے۔ ﴿ حتی تنجلی ﴾ یہاں تک صاف اور روشن ہو جائے۔ ﴿ حتی یکشف ﴾ صیغۂ مجہول ہے' یعنی بلند ہو جائے اور ڈھل جائے۔

حاصل کلام: آفتاب و ماہتاب کا گرہن اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو عظیم نشانیاں ہیں۔ اپنی قدرت کے اظہار اور بندوں کے خوف اور ڈرانے کیلئے اتنی بڑی مخلوق کو خدا کے حضور پر مارنے اور جنبش کرنے کی مجال نہیں نہ وہ اپنی آزاد مرضی سے طلوع ہو سکتے ہیں اور نہ غروب۔ وہ ضابطۂ خداوندی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس ضابطہ سے سرمو انحراف ان کے بس میں نہیں۔ جب ان کی بے بسی کا یہ عالم ہے تو پھر یہ نفع و ضرر کے مالک کیسے بن سکتے ہیں؟ یہ دور جاہلیت کے نظریہ و خیال کی تردید ہے۔

اس موقع پر نماز و دعا مسنون ہے نماز کی دو رکعتیں جماعت کے ساتھ آپؐ سے ثابت ہیں ہر رکعت میں دو رکوع (واذا رایتموھا) اور جب تم انہیں دیکھو کے حکم سے معلوم ہوا کہ یہ نماز اوقات مکروہہ میں بھی پڑھنا جائز ہے۔ اس صورت کے علاوہ نماز کسوف و خسوف کی اور بھی کئی صورتیں منقول ہیں۔ یہ نماز سنت ہے یا واجب۔ اس بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ سنت ہے اور دوسری رائے ہے کہ یہ واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وجوب کے قائل ہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک جیسا کہ آئندہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دو ہی رکعتیں ہیں اور ہر رکعت میں دو قیام' دو مرتبہ قراءت اور دو رکوع پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے پڑھنے میں اتفاق ہے مگر دوسرے قیام میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو دوسرے قیام میں بھی فاتحہ پڑھنا واجب قرار دیتے ہیں ورنہ ان کے نزدیک نماز صحیح نہیں ہوگی۔

رہا یہ مسئلہ کہ قراءت بلند آواز سے کی جائے گی یا آہستہ آواز سے۔ اس میں بھی چار اقوال ہیں۔ ایک قول کی رو سے بلند آواز سے پڑھی جائے گی۔ اس رائے کے حق میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ' اسحٰق بن راھویہ رحمۃ اللہ علیہ' امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ' ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہیں۔ ایک دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں میں آہستہ پڑھ لی جائے یہ رائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے۔ ایک تیسرا قول ہے کہ دونوں میں اختیار ہے جس طرح چاہے پڑھ لی جائے اور ایک چوتھا قول یہ ہے کہ آفتاب کو گرہن لگے تو آہستہ

پڑھی جائے اور اگر ماہتاب کو گرہن لگے تو بلند آواز سے پڑھنی چاہیے۔

راوی حدیث: ﴿ ابراھیم رضی اللہ عنہ ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے۔ ان کی والدہ کا نام ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ۔ اسکندریہ اور مصر کے حکمران نے انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ" دیا تھا۔ آپؐ کے بیٹے ابراھیمؓ جمادی الاولیٰ ۹ھ کو پیدا ہوئے اور اٹھارہ ماہ کے بعد ۲۹ شوال ۱۰ھ کو وفات پائی۔ بقیع میں دفن ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جنت میں ایک دودھ پلانے والی نے اس کی مدت رضاعت کو پورا کیا ہے۔"

(٤٠٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَهَرَ فِي صَلاَةِ الْكُسُوفِ بِقِرَاءَتِهِ، فَصَلَّى أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ، فِي رَكْعَتَيْنِ وَأَرْبَعَ سَجَدَاتٍ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهَذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ.

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: فَبَعَثَ مُنَادِياً يُنَادِيْ «اَلصَّلاَةُ جَامِعَةٌ».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گرہن کی نماز میں قرائت بلند آواز سے پڑھی اور دو رکعتوں میں چار رکوع اور چار ہی سجدے کئے۔ (بخاری و مسلم) اور اس حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے منادی کرنے والے کو بھیجا جو "الصلاۃ جامعۃ" کی منادی کرتا تھا۔

لغوی تشریح: ﴿ اربع رکعات ﴾ رکعات سے یہاں رکوع مراد ہیں ﴿ فی رکعتین ﴾ ہر رکعت میں دو رکوع ﴿ واربع سجدات ﴾ منصوب ہے اس وجہ سے کہ اس کا عطف اربع رکعات پر ہے۔ یہ اس بات پر متنبہ کرنے کیلئے ذکر کیا گیا ہے کہ سجود میں اضافہ و زیادتی نہیں ان کی تعداد ہر رکعت میں دو ہی رہے گی ﴿ الصلاۃ جامعۃ ﴾ دونوں مرفوع واقع ہو رہے ہیں' اس لئے کہ ایک مبتداء اور دوسرا اس کی خبر واقع ہو رہا ہے اور منصوب ہونے کی صورت میں پہلا فعل محذوف کا مفعول ہو گا جو احضروا ہو سکتا ہے اور دوسرا پھر حال واقع ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اذان کے علاوہ نماز کسوف کیلئے کسی اور طرح اعلان کرنا مستحب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کسوف میں قراءت بلند آواز سے فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایک مرفوع روایت جہری (بلند) آواز سے قراءت کی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ نماز عام نمازوں کی طرح نہیں ہے بلکہ رکوع کا اضافہ ہے۔ اس روایت کی رو سے آپؐ ایک رکعت میں دو رکوع فرماتے۔ ظاہر ہے ہر رکوع سے اٹھ کر نئے سرے سے قراءت کی ہوگی۔ اس طرح قراءت کا بھی اضافہ ہوا۔ نیز اس کا خاص وقت مقرر و متعین نہیں ہے' جب آفتاب کو گرہن ہو گا اسی وقت نماز پڑھی جائے گی۔ عام نمازوں کیلئے تو اذان مقرر ہے اور صلاۃ کسوف و خسوف کیلئے "الصلاۃ جامعۃ" کہنا مشروع ہے۔ نماز کیلئے یہ کہنا ثابت نہیں ہے۔

(٤٠٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: انْخَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَصَلَّى، فَقَامَ قِيَاماً طَوِيْلاً نَحْواً مِّنْ قِرَاءَةِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعاً طَوِيْلاً، ثُمَّ رَفَعَ، فَقَامَ قِيَاماً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُوْنَ الْقِيَامِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعاً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الأَوَّلِ، ثُمَّ سَجَدَ، ثُمَّ قَامَ قِيَاماً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُوْنَ الْقِيَامِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعاً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُوْنَ الرُّكُوعِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَفَعَ، فَقَامَ قِيَاماً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُونَ الْقِيَامِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعاً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ، ثُمَّ سَجَدَ، ثُمَّ انصَرَفَ، وَقَدِ انْجَلَتِ الشَّمْسُ، فَخَطَبَ النَّاسَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں سورج گرہن ہوا۔ آپؐ نے نماز کسوف ادا فرمائی' اس میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کے برابر قیام کیا۔ پھر رکوع بھی بہت لمبا کیا۔ پھر کھڑے ہوئے تو قیام بھی طویل کیا مگر پہلے قیام سے کم۔ پھر لمبا رکوع کیا لیکن پہلے رکوع سے کم' پھر سجدہ ریز ہوئے (اس کے بعد) پھر لمبا قیام کیا اور وہ پہلے قیام سے کچھ کم تھا پھر ایک لمبا رکوع کیا جو پہلے رکوع سے کچھ کم تھا پھر (رکوع سے) اپنا سر مبارک اٹھایا اور ایک لمبا قیام کیا جو پہلے قیام سے کچھ کم تھا اس کے بعد پھر ایک اور لمبا رکوع کیا جو پہلے رکوع سے کچھ کم (لمبا) تھا' پھر اپنا سر مبارک (رکوع سے) اٹھایا۔ پھر سجدہ کیا پھر آخر کار سلام پھیر دیا تو (اس دوران) سورج روشن ہو چکا تھا۔ پھر آپؐ نے لوگوں کو وعظ بھی کیا۔ (بخاری و مسلم اور الفاظ مسلم کے ہیں)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ: صَلَّى حِيْنَ كُسِفَتِ الشَّمْسُ ثَمَانِيَ رَكَعَاتٍ فِيْ أَرْبَعِ سَجَدَاتٍ.

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے سورج گرہن کے موقع پر آٹھ رکوع چار سجدوں کے درمیان ادا کئے۔

وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلُ ذَلِكَ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔

وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: صَلَّى سِتَّ رَكَعَاتٍ بِأَرْبَعِ سَجَدَاتٍ.

اور مسلم ہی کی ایک روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یوں بھی ہے کہ آپؐ نے چھ رکوع چار سجدوں کے ساتھ ادا کئے ہیں۔

وَلِأَبِيْ دَاوُدَ عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: صَلَّى، فَرَكَعَ

اور ابوداؤد میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپؐ نے نماز کسوف پڑھی اور پانچ

خَمْسَ رَكَعَاتٍ ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ، رکوع اور دو سجدے پہلی رکعت میں کئے اسی طرح
وَفَعَلَ فِي الثَّانِيَةِ مِثْلَ ذَلِكَ . دوسری رکعت میں کیا۔

لغوی تشریح : ﴿ نحوا من قراءة سورة البقرة ﴾ تقریباً سورۂ بقرہ کی قرأت کے برابر۔ اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ نماز کسوف میں سورۂ فاتحہ آہستہ پڑھی گئی ہے بلند آواز سے نہیں۔ اس لئے کہ اگر نبی ﷺ نے سورۂ فاتحہ بلند آواز سے پڑھی ہوتی تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے سنا ہوتا۔ روایات سے یہ معلوم ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس موقع پر نبی ﷺ کے پہلو میں کھڑے تھے۔ اگر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے خود اپنے کانوں سے سنا ہوتا تو اسے اندازاً اور تخمیناً بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ساری روایات جو ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نبی ﷺ کے پہلو میں کھڑے ہونے کے بارے میں ہیں تمام کی تمام ضعیف اور نہایت کمزور ہیں۔ ایسی روایات سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ بالفرض تسلیم کر لیا جائے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما آپؐ کے قریب ہی کھڑے تھے پھر بھی اس کا احتمال ہے کہ جو تلاوت حضور ﷺ نے فرمائی ہوگی۔ بعینہٖ وہ اسے یاد نہ رکھ سکے ہوں اور اس کی مقدار کو یاد رکھ لیا ہو تو ان کو اندازے اور تخمینے کی ضرورت پیش آئی ہوگی اور انہوں نے سورۂ بقرہ کی قرأت کا اندازہ لگایا ہو۔ اس کے باوجود بلند آواز سے پڑھنے والی روایت صحیح ترین ہے اور باعتبار تعداد بھی زیادہ ہیں۔ ان روایات کے راوی مثبت ہیں اور یہ اصول ہے کہ مثبت منفی پر مقدم ہوتا ہے۔ ﴿ دون القيام الاول ﴾ یعنی پہلے قیام سے کم۔ دون القيام الاولى اور دون الركوع الاول کہنے کا مطلب ہے کہ ہر قیام اور ہر رکوع اپنے سے پہلے والے قیام اور رکوع سے کم ہوتا۔

حاصل کلام : تعداد رکوع میں روایات مختلف ہیں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ تمام روایات کو جمع کرنے کے بعد نتیجہ نکلتا ہے کہ دو دو رکوع تین تین رکوع چار چار رکوع اور پانچ پانچ رکوع ایک رکعت میں ثابت ہوتے ہیں۔ بعض نے ان کو جمع کر کے اس پر محمول کیا ہے کہ کسوف کی نماز آپؐ کی زندگی میں متعدد بار ہوئی ہے اور بعض کا قول ہے کہ کسوف حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں صرف ایک ہی مرتبہ ہوا ہے۔ بعض علمائے کرام نے ان احادیث کو راجح قرار دیا ہے۔ جن میں ہر رکعت میں دو رکوع کا ذکر آیا ہے۔ موقع کی مناسبت سے ہم اس جگہ چند امور کا بالاختصار اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ صحیح صورت حال واضح ہو جائے اور اس مسئلہ کی تنقیح و تحقیق ہو جائے۔

چنانچہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ محقق مؤرخین' پیچیدہ و باریک مسائل کی تحقیق کرنے والے ہیئت دان اور ماہرین فلکیات کا اس پر اتفاق ہے کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ جس روز فوت ہوئے وہ ۱۰ھ ماہ شوال کی ۲۸ یا ۲۹ تاریخ تھی۔ جبکہ انگریزی ۶۳۲ء جنوری کی ۲۷ تاریخ بنتی ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا اور اس پر بھی سب متفق نظر آتے ہیں کہ سورج گرہن نبی ﷺ کی حیات طیبہ میں اس کے بعد پھر نہیں ہوا البتہ اس سے پہلے. وقوع کے متعلق محقق کبیر علامہ قاضی محمد سلمان

منصور پوری نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب سیرت "رحمت للعالمینؐ" میں ذکر کیا ہے کہ سورج گرہن کی تعداد نبی ﷺ کے مکی و مدنی دور اور بالخصوص ہجرت کے بعد دس بنتی ہے۔ اس میں وہ سورج گرہن بھی شامل ہے جو آپؐ کے لخت جگر ابراھیم کی وفات کے موقع پر لگا تھا۔ یہ گرہن ان سب کے آخر میں واقع ہوا ہے۔ لیکن قاضی صاحب نے نہ تو ان کے اوقات کا ذکر فرمایا ہے اور نہ ان جگہوں اور علاقوں کا کہ کہاں واقع ہوئے ہیں' تاکہ مدینہ منورہ میں جو سورج گرہن ملاحظہ کیا گیا اس سورج گرہن سے ممیّز ہو جاتا جو وہاں ملاحظہ نہیں کیا گیا۔ رہا احادیث کا معاملہ تو مسلم نے عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے نبی ﷺ کی زندگی میں مدینہ منورہ میں اپنے تیروں سے تیز اندازی کر رہا تھا کہ سورج کو گرہن لگ گیا۔ میں نے تیروں کو پھینک مارا اور دل میں کہا کہ سورج گرہن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو جو حادثہ پیش آیا ہے بخدا اسے ضرور میں دیکھوں گا۔ یہ سیاق دلالت کرتے ہیں کہ یہ نبی ﷺ کیلئے پہلا موقع تھا کہ سورج کو گرہن لگا۔ کم از کم اس وقت تک گرہن کے بارے میں کوئی حکم ثابت نہیں اور یہ تو معلوم ہے کہ عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے ہیں۔ یہ بات اس کا تعین تو کر دیتی ہے کہ نبی ﷺ کی زندگی میں پہلی مرتبہ جو سورج گرہن مشاہدہ کیا گیا وہ فتح مکہ کے بعد کا ہے' پہلے کا نہیں۔ مسلم اور نسائی میں جابر رضی اللہ عنہ کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ گرہن کا واقعہ شدید گرمی کے دن ہوا اور ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ گرہن جو ابراھیم کی وفات پر لگا تھا وہ جنوری کے مہینے میں لگا تھا اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں سردی شدید ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ دونوں واقعات الگ ہیں اور ایک واقعہ نہیں بلکہ متعدد ہیں۔ اس کے بعد جب ہم فلکیات کے حساب پر نظر ڈالتے ہیں جسے علامہ قاضی محمد سلیمان نے نمایاں کیا ہے تو فتح مکہ کے بعد ہمیں تین مرتبہ گرہن کا ثبوت ملتا ہے پہلا گرہن ۹ھ یا ۲۸ ربیع الاخر بمطابق ۱۳ اگست ۶۳۰ء کو اور اگست کا مہینہ جیسا کہ سب جانتے ہیں سخت گرمی کا مہینہ ہے اور بارش کی کمی کی وجہ سے جزیرۃ العرب میں دوسرے ملکوں اور علاقوں کے مقابلہ میں گرمی کی شدت زیادہ ہوتی ہے اور دوسرا گرہن ۹ھ ۲۹ شوال بمطابق فروری ۶۳۱ء میں واقع ہوا اور تیسرا گرہن ۱۰ھ ۲۸ شوال بمطابق ۲۷ جنوری ۶۳۲ء کو لگا اور جب ہم فلکیات کے حساب اور احادیث میں مذکور کسوف کو باہم ملاتے ہیں۔ تو ثابت ہوتا ہے کہ گرہن دو ہوئے ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ ایک گرہن تو اگست کے مہینہ میں پہلا گرہن یہ شدید گرمی میں واقع ہوا اور ابراھیم کی وفات پر جو جنوری کے مہینہ میں ہوا وہ تیسرا سورج گرہن ہے اور جو ۹ھ شوال کے مہینہ میں (فروری) میں واقع ہوا وہ دوسرا گرہن ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مدینہ میں اس گرہن کا ملاحظہ کرنا ممکن بھی تھا یا نہیں؟ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ متعدد مرتبہ گرہن کے ہونے کا مقتضیٰ ہے۔ لیکن یہ تعدد روایات کے اختلاف اور رکوعات کی تعداد کی تلاش میں سود مند نہیں ہے کیونکہ دونوں واقعات سے متعلقہ روایات ہر رکعت میں دو رکوعوں کی صراحت کرتی ہیں۔ پھر باقی کون سے سورج گرہن رہ جاتے ہیں جن کی نماز میں تین تین' چار چار اور پانچ پانچ رکوع کئے۔ ابراھیم کی وفات کے روز گرہن کے بارے میں بھی روایات میں صریح تعارض ہے۔

عام طور پر روایات میں ہے کہ اس روز نماز کسوف ہر رکعت میں دو رکوع سے پڑھی گئی ہے جبکہ مسلم کی روایت سے نماز میں ہر رکعت تین رکوعوں سے پڑھی گئی ثابت ہے۔ پس احادیث کا باہمی تعارض بجز ترجیح کے دور کرنا ممکن ہی نہیں۔ پس ہمارے نزدیک خواہ ہم متعدد واقعات سے تسلیم کریں یا نہ کریں۔ وہ روایات جن میں ہر رکعت میں دو رکوع کا ذکر ہے وہ قوی ترین ہیں سب سے زیادہ ان کا ثبوت ہے اور قطعی طور پر سب سے صحیح ہونے کی وجہ سے راجح بھی ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ' شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور متاخرین میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے کہ دو رکوع کی احادیث راجح ہیں۔ واللہ اعلم۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کسوف کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ بھی ارشاد فرمایا مگر صاحب ہدایہ نے اس کا انکار کیا ہے کہ نماز کسوف میں خطبہ نہیں کیونکہ کسی حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ اس حدیث میں صاف طور پر اس کا ذکر موجود ہے کہ آپؐ نے سامعین کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا۔

(٤٠٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مَا هَبَّتِ الرِّيحُ قَطُّ، إِلاَّ جَثَا النَّبِيُّ ﷺ عَلَى رُكْبَتَيْهِ، وَقَالَ: «اللَّهُمَّ اجْعَلْهَا رَحْمَةً، وَلاَ تَجْعَلْهَا عَذَاباً». رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَالطَّبَرَانِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب ہوا تیز و تند چلتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر یوں (بارگاہ الٰہی میں) عرض کرتے۔ اے الٰہی! اس ہوا کو رحمت بنا' عذاب نہ بنا۔ (اسے شافعی اور طبرانی دونوں نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ھبت ﴾ ھبوب سے ماخوذ ہے۔ نصر ینصر باب سے ہے' ہوا کا تیز و تند چلنا ﴿ ریح ﴾ مطلق ہوا کو بھی کہتے ہیں یا تیز و تند ہوا کو۔ ﴿ قط ﴾ "طاء" پر تشدید۔ اس پر ہمیشہ ضمہ ہی آتا ہے (مبنی بالضم) ہے اور یہ ماضی میں نفی کے استمرار کی تاکید کیلئے آتا ہے جس طرح ابداً کا لفظ مستقبل کیلئے آتا ہے ﴿ جثا ﴾ نصر ینصر باب سے ہے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھنے کیلئے بولا جاتا ہے۔ خوف کے موقع پر اس طرح بیٹھا جاتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اندھیری کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے کہ اے اللہ! اسے ہمارے لئے باعث رحمت بنا' باعث عذاب نہ بنا۔ ایک دوسری حدیث میں "ریح" کی بجائے "ریاح" کا لفظ بھی آیا ہے کہ یا الٰہی! اس تیز و تند آندھی کو ریاح بنا دے اور ریح نہ بنا کیونکہ قرآن کے بیان کی رو سے ریاح کا لفظ رحمت کیلئے ہے اور ریح کا لفظ عذاب کیلئے۔ معنی کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں دونوں کا معنی ہوا ہے۔

(٤٠٥) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے یہ حدیث بھی مروی

عَنْهُ، أَنَّهُ صَلَّى فِي زَلْزَلَةٍ سِتَّ رَكَعَاتٍ، وَأَرْبَعَ سَجَدَاتٍ، وَقَالَ: هٰكَذَا صَلاَةُ الآيَاتِ. رَوَاهُ البَيْهَقِيُّ، وَذَكَرَ الشَّافِعِيُّ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلَه، دُوْنَ آخِرِهِ.

ہے کہ انہوں نے زلزلے کے موقع پر نماز چار سجدوں اور چھ رکوعوں سے پڑھی اور فرمایا کہ آیات الٰہی کی نماز اسی طرح پڑھی جاتی ہے۔ (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور شافعی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے اسی طرح کی روایت ذکر کی ہے البتہ اس میں روایت کے آخری الفاظ نہیں)

لغوی تشریح: ﴿ فی زلزلۃ ﴾ اس میں فی سبب بیان کرنے کیلئے ہے ("فاء" سببی ہے) معنی ہے زلزلہ کی وجہ سے ﴿ ست رکعات ﴾ ' ﴿ اربع سجدات ﴾ چھ رکوع اور چار سجدے یعنی اس طرح نماز پڑھی کہ ہر رکعت میں تین رکوع اور دو سجدے ہوتے تھے ﴿ صلاۃ الایات ﴾ آیات سے یہاں مراد ناگہانی اور پریشان کن واقعات ہیں ﴿ دون آخرہ ﴾ یعنی حدیث کے آخری الفاظ یعنی "ھکذا صلاۃ لہ الایات" نہیں ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ناگہانی حادثہ' ارضی و سماوی مصیبت کے نزول کی صورت میں فی الفور نماز پڑھنی چاہئے۔ اسے "صلاۃ الایات" کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت اور تکلیف کے دور کرنے کیلئے رجوع صرف اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا چاہئے غیر اللہ کی جانب متوجہ ہونا ان کو مصائب و آلام دور کرنے کا ذریعہ سمجھنا شرک ہے جو ناقابل معافی جرم ہے جس کی بخشش نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو اس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ تمام کئے کرائے اعمال اکارت جائیں۔

١٦ - بَابُ صَلاَةِ الاسْتِسْقَاءِ

نماز استسقاء کا بیان
(بارش مانگنے کیلئے نماز)

(٤٠٦) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنهما قَالَ: خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ مُتَوَاضِعاً، مُتَبَذِّلاً، مُتَخَشِّعاً، مُتَرَسِّلاً، مُتَضَرِّعاً، فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، كَمَا يُصَلِّي فِي العِيْدِ، لَمْ يَخْطُبْ خُطْبَتَكُمْ هٰذِهِ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو عَوَانَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ بڑی تواضع کے ساتھ' سادہ لباس میں نہایت عاجزی و انکساری' بہت خشوع اور بڑی زاری اور تضرع کرتے ہوئے نماز کیلئے باہر نکلے۔ عید کی نماز کی طرح لوگوں کو دو رکعات نماز پڑھائی۔ تمہارے خطبہ کی طرح خطبہ ارشاد نہیں فرمایا۔ (اس روایت کو پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی' ابوعوانہ اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب صلاۃ الاستسقاء﴾ استسقاء کے معنی ہیں باران رحمت کی طلب کرنا۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے قحط کے وقت بارش کی دعا کرنا۔ سقایہ اور سقی۔ پانی اور بارش کو کہتے ہیں اس لئے کہ پینے اور سیراب کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ ﴿خرج﴾ عیدگاہ کی طرف نکلے ﴿متواضعا﴾ تواضع سے ماخوذ ہے تواضع کہتے ہیں بڑائی اور تکبر کی ضد کو۔ بڑائی اور تکبر اظہار شان و آن ہوتی ہے' تواضع میں عاجزی و انکساری۔ ﴿متبذلا﴾ تبذل سے ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب ہے زیب و زیبائش کو چھوڑ دینا اور پھٹا پرانا کپڑا زیب تن کرنا اور ﴿متخشعا﴾ یعنی خشوع کو ظاہر کرنے والا اور اس کے بدن' نظر اور آواز سے دھیما پن نمایاں ہوتا ہے۔ باطنی طور پر خوف زدہ اور جھکا ہوا ہو تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ چیز حاصل کر لے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ ﴿مترسلا﴾ جلد باز نہ ہو آرام و سکون سے چلنے والا۔ ﴿متضرعا﴾ تضرع کو نمایاں اور ظاہر کرنے والا۔ یعنی تذلل اور دست سوال دراز کرنے میں مبالغہ کرنے والا اور اپنی حاجت و ضروریات طلب کرنے والا۔ تمام صیغے اسم فاعل کے ہیں اور منصوب اس بنا پر ہے کہ حال واقع ہو رہا ہے۔ ﴿لم یخطب خطبتکم ھذہ﴾ تمہارے خطبہ کی طرح آپؐ خطبہ نہیں دیتے تھے بلکہ آپؐ خطبہ کی حالت میں دعا تضرع اور اللہ کی بڑائی و کبریائی بیان فرماتے جیسا کہ ابوداؤد میں روایت میں ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ نماز استسقاء رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ استسقاء کے لغوی معنی پانی کیلئے درخواست کرنا' دعا کرنا۔ شرعی اصطلاح کی رو سے ایک مخصوص کیفیت سے نماز پڑھنا۔ استسقاء کی تین قسمیں ممکن ہیں۔ ادنیٰ' اوسط اور اعلیٰ۔ ادنیٰ کی صورت یہ ہے کہ صرف دعا کی جائے اور اوسط کی صورت یہ ہے کہ فرض نماز کے بعد باجماعت ادا کی جائے اور اعلیٰ کی صورت یہ ہے کہ طلب بارش کیلئے باہر نکل کر عاجزی و انکساری' خشوع و خضوع کی حالت میں نماز استسقاء ادا کی جائے اور خوب عاجزی کے ساتھ گڑگڑا کر دعا کی جائے۔

نبی ﷺ سے صرف دعا بھی ثابت ہے جیسا کہ خطبہ جمعہ ارشاد فرمانے کے دوران ایک آدمی نے آپؐ سے بارش کیلئے دعا کی درخواست کی تو آپؐ منبر پر کھڑے ہوئے اور دعا فرمائی جس کے نتیجہ میں بارش شروع ہوگئی اور آئندہ جمعہ تک مسلسل ہوتی رہی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خطیب خطبہ کے دوران دعا کر سکتا ہے اس وقت قبلہ رو ہونا بھی ضروری نہیں۔ خطبہ کے دوران خطیب سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ خطیب دوسرے کی درخواست پر عمل کرنے کا مجاز ہے۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ آپؐ نے نماز استسقاء عید کی نماز کی طرح ادا فرمائی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے جیسا کہ دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز استسقاء کی پہلی رکعت میں سات اور دوسری میں پانچ تکبیریں بھی کہی تھیں۔ اس روایت کی سند میں اگرچہ محمد اور اس کا والد عبدالعزیز دونوں کو ضعیف قرار دیا گیا ہے مگر مذکورہ بالا حدیث اس کی تائید کر رہی ہے۔

خطبہ نماز استسقاء مختصر مگر جامع ہونا چاہئے۔ خطیب مقاصد خطبہ سے تجاوز نہ کر جائے۔ بے موقع و

خلاف موقع گفتگو کر کے لمبا اور طویل بھی نہ کرے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز استسقاء ادا کرنے کے کئی طریقے منقول ہیں۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ سارے لوگ شہر سے یا آبادی سے باہر جمع ہوں۔ لباس پھٹا پرانا ہو' ڈرتے ہوئے اللہ کے حضور گریہ و زاری کرے۔ اس کے بعد امام ان کو دو رکعت نماز باجماعت پڑھائے اور قرأت بلند آواز سے کریں۔ اس کے بعد خطبہ پڑھے اور قبلہ رو ہو کر دعا مانگے اس دوران چادر کو الٹا کرے۔

(٤٠٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: شَكَا النَّاسُ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ قُحُوطَ المَطَرِ، فَأَمَرَ بِمِنْبَرٍ، فَوُضِعَ لَهُ فِي المُصَلَّى، وَوَعَدَ النَّاسَ يَوْماً يَخْرُجُوْنَ فِيْهِ، فَخَرَجَ حِيْنَ بَدَا حَاجِبُ الشَّمْسِ، فَقَعَدَ عَلَى المِنْبَرِ، فَكَبَّرَ وَحَمِدَ اللَّهَ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّكُمْ شَكَوْتُمْ جَدْبَ دِيَارِكُمْ، وَقَدْ أَمَرَكُمُ اللَّهُ أَنْ تَدْعُوْهُ، وَوَعَدَكُمْ أَنْ يَسْتَجِيْبَ لَكُمْ، ثُمَّ قَالَ: اَلْحَمْدُ للهِ رَبِّ العَالَمِيْنَ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ، لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ، اللَّهُمَّ أَنْتَ اللَّهُ، لاَ إِلَهَ إِلاَّ أَنْتَ، أَنْتَ الغَنِيُّ، وَنَحْنُ الفُقَرَاءُ، أَنْزِلْ عَلَيْنَا الغَيْثَ، وَاجْعَلْ مَا أَنْزَلْتَ عَلَيْنَا قُوَّةً وَبَلاَغاً إِلَى حِيْنٍ. ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ، فَلَمْ يَزَلْ حَتَّى رُئِيَ بَيَاضُ إِبِطَيْهِ، ثُمَّ حَوَّلَ إِلَى النَّاسِ ظَهْرَهُ، وَقَلَّبَ رِدَاءَهُ، وَهُوَ رَافِعٌ يَدَيْهِ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ، وَنَزَلَ،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بارش کے نہ ہونے کی وجہ سے قحط سالی کی شکایت کی۔ آپؐ نے عید گاہ میں منبر لے جانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ چنانچہ منبر عید گاہ میں لا کر رکھ دیا گیا۔ لوگوں سے ایک دن کا وعدہ کیا جس میں وہ سارے باہر نکلیں۔ آپؐ خود اس وقت نکلے جب سورج کا کنارہ ظاہر ہوا۔ تشریف لا کر آپؐ منبر پر بیٹھ گئے اور اللہ اکبر کہا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کی پھر (لوگوں سے مخاطب ہو) کر فرمایا "تم لوگوں نے اپنے علاقوں کی خشک سالی کا شکوہ کیا ہے' اللہ تعالیٰ تو تمہیں یہ حکم دے چکا ہے کہ اس سے دعا کرو وہ تمہاری دعا کو قبول فرمائے گا" پھر فرمایا' تعریف اللہ ہی کیلئے سزاوار ہے جو کائنات کا پروردگار ہے۔ لوگوں کے حق میں بڑا مہربان اور ہمیشہ ہر وقت مہربان ہے۔ روز جزاء کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا دوسرا کوئی الٰہ نہیں جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ الٰہی! تو ہی اللہ ہے تیرے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ تو غنی ہے اور ہم فقیر و محتاج ہیں۔ ہم پر باران رحمت کا نزول فرما جو کچھ تو ہم پر نازل فرمائے اسے ہمارے لئے روزی اور مدت دراز تک پہنچنے کا ذریعہ بنا۔ اس کے بعد آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں دست مبارک اوپر

وَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، فَأَنْشَأَ اللّٰهُ تَعَالَى سَحَابَةً، فَرَعَدَتْ، وَبَرَقَتْ، ثُمَّ أَمْطَرَتْ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَقَالَ: غَرِيبٌ، وَإِسْنَادُهُ جَيِّدٌ.

اٹھائے کہ وہ بتدریج آہستہ آہستہ اوپر اٹھتے گئے یہاں تک کہ آپؐ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ پھر لوگوں کی جانب اپنی پشت کر کے کھڑے ہوگئے اور اپنی چادر کو پھیر کر پلٹایا۔ آپؐ اس وقت اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ پھر لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے اور منبر سے نیچے تشریف لے آئے اور دو رکعت نماز پڑھائی۔ اسی لمحہ اللہ تعالیٰ نے آسمان پر بادل پیدا کیا وہ بدلی گرجی اور چمکی اور بارش برسنے لگی۔ (اسے ابوداوٗد نے روایت کیا ہے اور اسے غریب کہا ہے اور اس کی سند نہایت عمدہ و جید ہے)

وَقِصَّةُ التَّحْوِيلِ فِي الصَّحِيحِ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ، وَفِيهِ: فَتَوَجَّهَ إِلَى الْقِبْلَةِ يَدْعُو، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ، جَهَرَ فِيهِمَا بِالْقِرَاءَةِ.

صحیح بخاری میں عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت میں (تبدیلیٔ چادر) کا قصہ اس طرح ہے پھر آپؐ نے قبلہ کی طرف رخ کیا اور دعا فرماتے رہے پھر دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ ان میں قرأت بلند آواز سے کی۔" اور

وَلِلدَّارَقُطْنِيِّ مِنْ مُرْسَلِ أَبِي جَعْفَرٍ الْبَاقِرِ: وَحَوَّلَ رِدَاءَهُ لِيَتَحَوَّلَ الْقَحْطُ.

دار قطنی میں ابو جعفر باقر کی مرسل روایت میں ہے کہ آپؐ نے اپنی چادر اس لئے پھیر کر بدلی کہ قحط سالی بھی اسی طرح پھر جائے۔

لغوی تشریح: ﴿ قحوط المطر ﴾ قحوط میں "قاف" پر ضمہ۔ قحط کی طرح یہ بھی مصدر ہے۔ معنی بندش بارش' باران رحمت کا نازل نہ ہونا ﴿ ووعد الناس یوما ﴾ یعنی ایک دن مقرر فرما دیا ﴿ بدا ﴾ نمایاں ہونا ظاہر ہے ﴿ حاجب الشمس ﴾ سورج کا ابرو' سورج کا پہلا حصہ ایک کنارہ یا آفتاب کی روشنی بھی ہو سکتی ہے۔ ﴿ جدب دیارکم ﴾ اپنے علاقوں کی قحط سالی کی کیفیت ﴿ ان یستجیب لکم ﴾ دعا کو قبول فرماتا ہے اپنے ارشاد کے مطابق جس میں ہے ﴿ ادعونی استجب لکم ۔ ۴۰ / ۶۰ ﴾ مجھ سے مانگو میں قبول کروں گا تمہاری پکار دعا کو اور فرمایا ﴿ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان : ۱۸۶ / ۲ ﴾ میں تو پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ ﴿ الغیث ﴾ بارش۔ ﴿ بلاغا الی حین ﴾ یعنی ایسی روزی عطاء فرما جو ہمیں لمبے عرصہ تک چلے۔ ﴿ البلاغ ﴾ کے معنی ہیں جو کسی کو اس کے مطلوب و مقصود تک پہنچا دے۔ ﴿ حتی رئی...الخ ﴾ صیغۂ مجہول ہے ﴿ الابط ﴾ جو حصہ' جسم' بازو اور کندھے کے نیچے ہے ﴿ حول ﴾ تحویل سے ماخوذ ہے معنی ہے کہ اس نے پلٹایا' پھیرا ﴿ الی الناس ظهره ﴾

لوگوں کی طرف پشت کی اور رخ قبلہ کی طرف ﴿ وقلب ردائه ﴾ یعنی چادر کی بائیں طرف کو دائیں طرف اور نچلے حصہ کو اوپر کیا اور ظاہری حصہ کو باطن بنایا اور اس کی ہر کیفیت کو برعکس بھی کیا۔ کیفیت اس کی یوں ہے کہ اپنے سیدھے ہاتھ (دائیں) سے بائیں طرف سے نچلی طرف کو پکڑا اور بائیں ہاتھ سے دائیں طرف کے نچلے حصہ کو پکڑا پھر دائیں ہاتھ سے دائیں کندھے پر لے آئے اور بائیں ہاتھ سے بائیں کندھے پر لے آئے یوں تو اس عمل سے چادر تبدیل کرنے کی مذکورہ بالا کیفیت پوری ہو جاتی ہے۔ ﴿ وهو رافع يديه ﴾ یعنی جب لوگوں کی طرف پشت کی تو اس وقت اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے ﴿ فانشئا ﴾ پیدا فرمایا ﴿ فرعدت ﴾ اس میں کڑک' گرج پیدا ہوئی۔ یہ بادل کی آواز ہے۔ ﴿ وبرقت ﴾ بادل کا چمکنا ﴿ في الصحيح ﴾ اور صحیح بخاری میں ہے ﴿ من حديث عبدالله بن زيد ﴾ اس سے عبداللہ بن زید بن عاصم انصاری مازنی مراد ہے وہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ مراد نہیں جن سے اذان کا واقعہ منقول ہے۔ ﴿ ليتحول القحط ﴾ تاکہ پلٹ جائے اور تبدیل ہو جائے یعنی قحط سالی اور خشک سالی سرسبزی و شادابی میں تبدیل ہو جائے۔

حاصل کلام : اس سے معلوم ہوا کہ نماز عید کے برعکس نماز استسقاء کے موقع پر منبر باہر لے جانا جائز ہے۔ نیز عید کی طرح خطبہ استسقاء نماز کے بعد پڑھا گیا اور استسقاء کیلئے دعا میں ہاتھ اتنے اوپر اٹھائے کہ بقول حضرت انس رضی اللہ عنہ میں نے رسول اللہ کو کسی موقع پر اتنے بلند ہاتھ اٹھاتے نہیں دیکھا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے بارے میں تیس احادیث جمع کی ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بھی مسنون ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خطبہ کا آغاز بسم اللہ سے نہیں بلکہ الحمد للہ سے کرنا مسنون ہے۔ اس کے علاوہ بھی کسی دوسرے لفظ سے آغاز صحیح نہیں۔

راوی حدیث : ﴿ ابوجعفر باقر ﴾ ابوجعفر محمد الباقر (قاف کے نیچے کسرہ) کی کنیت ہے۔ محمد بن علی زین العابدین بن حسین بن علی بن ابی طالب' امامیہ شیعہ کے عقیدے کے مطابق بارہ ائمہ میں سے ان کا پانچواں نمبر ہے۔ باقر ان کو اس لئے کہتے ہیں کہ ان کا علم بڑا وسیع تھا' بڑے ماہر و متبحر عالم تھے۔ ۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۷ھ میں تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی اور جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

(٤٠٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلاً دَخَلَ المَسْجِدَ يَوْمَ الجُمُعَةِ، وَالنَّبِيُّ ﷺ قَائِمٌ يَخْطُبُ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! هَلَكَتِ الأَمْوَالُ، وَانْقَطَعَتِ السُّبُلُ، فَادْعُ اللَّهَ يُغِيثُنَا، فَرَفَعَ يَدَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «اللَّهُمَّ أَغِثْنَا، اللَّهُمَّ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی جمعہ کے روز مسجد میں داخل ہوا' اس وقت نبی ﷺ کھڑے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے' وہ بولا یا رسول اللہ (ﷺ)! اموال (مویشی) ہلاک ہو گئے اور آمدورفت کے راستے بند ہو گئے ہیں۔ اللہ کے حضور دعا فرمائیں کہ وہ ہم پر بارش نازل فرمائے۔ آپؐ نے اسی وقت اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور دعا فرمائی۔ یا الٰہی! بارش

أَغِثْنَا، اللَّهُمَّ أَغِثْنَا»، فَذَكَرَ الحَدِيْثَ، وَفِيْهِ الدُّعَاءُ بِإِمْسَاكِهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

سے ہماری فریاد رسی فرما۔ یاالٰہی! باران رحمت سے ہماری فریاد رسی فرما۔ ساری حدیث بیان فرمائی۔ اس میں بارش کے بند کروانے کی دعا کا بھی ذکر ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿السبل﴾ سبیل کی جمع ہے جس کا معنی راستہ ہے۔ "سین" اور "باء" پر ضمہ ہے۔ راستوں کے بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے بارش نہ ہونے کی وجہ سے سفر کرنا چھوڑ دیا کیونکہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے سواری کے جانوروں کیلئے چارہ پیدا نہیں ہوا تھا اور یہ جانور اتنے کمزور ہو گئے کہ سفر کے قابل ہی نہ رہے یا یہ مفہوم ہے کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے وہ چیزیں ہی پیدا نہیں ہوئیں جنہیں اٹھا کر منڈی میں لایا جاتا ہے' جب چیزیں ہی نہیں تو باربرداری کے تمام جانور بے کار ہو کر رہ گئے اور راستے بے آباد اور آمدورفت سے خالی ہو کر رہ گئے۔ ﴿یغیثنا﴾ "یاء" پر ضمہ یعنی ہمیں فوری طور پر بارش سے نواز دے تاکہ ہماری تکلیف دور ہو۔ ﴿فرفع یدیه﴾ بخاری نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ آپؐ کے ساتھ لوگوں نے بھی ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا مانگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہاتھ اوپر اٹھانا آداب دعا میں شامل ہے۔ ﴿اغثنا﴾ اغاثہ سے ماخوذ ہے۔ دعائیہ صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ ہمیں باران رحمت سے سیراب فرما۔ ﴿فذکر الحدیث﴾ اس نے ساری حدیث بیان کی جس میں مذکور ہے۔ اس دعا کے بعد بارش مسلسل و لگاتار نازل ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ دوسرے جمعہ کے روز پھر ایک آدمی دوران خطبہ میں کھڑا ہوا اور کثرت بارش کی وجہ سے اموال کے ہلاک ہونے اور راستوں کے منقطع ہونے کا شکوہ کرنے لگا۔ تو نبی ﷺ نے پھر بارش کے رکنے کی دعا فرمائی تو بادل چھٹ گئے اور آفتاب روشن ہو گیا اور مصنف نے ﴿وفیه الدعاء بامساکها﴾ کے فقرے سے اسی طرف اشارہ کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث میں بارش کے رکوانے کی دعا بھی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ انبیاء کرامؑ بلکہ خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ بھی ہر چیز اللہ رب العالمین سے براہ راست طلب فرماتے تھے۔ بیچ میں کسی کو واسطہ یا ذریعہ بنانا صحیح نہیں سمجھتے تھے ورنہ نبی کریم ﷺ بھی ابوالانبیاء یا ابوالبشر یا کسی دوسرے اولوالعزم پیغمبر کا واسطہ دے کر بارش طلب فرماتے۔ نیز صحابہ کرامؓ بھی یہی سمجھتے تھے کہ نبی از خود نہیں بلکہ اللہ کے حضور استدعا کرتے ہیں کہ وہ بارش برسا کر لوگوں کو قحط سالی سے نجات دیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کان وما یکون کا علم بھی نہیں رکھتے تھے ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ قحط سالی کی وجہ سے بیرون شہر لوگوں کا کیا حال ہے۔ اس آدمی کے بتانے پر معلوم ہوا۔

وہ آدمی کون تھا' اس میں اختلاف ہے کسی نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا نام لیا ہے حالانکہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ اس وقت دائرۂ اسلام میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ انداز گفتگو اور طرز کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ سائل

ضرور کوئی مسلمان ہے ورنہ آج کل کے نام نہاد مسلمانوں کی طرح آپؐ کو مشکل کشا سمجھ کر آپؐ ہی سے درخواست کرتا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! ہمیں قحط سالی کی مصیبت سے نجات دلا۔ مسند احمد میں ہے کہ کعب بن مرہ صحابی رضی اللہ عنہ تھے۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے صرف دعا ہی فرمائی ہے بارش کیلئے نماز نہیں پڑھی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے غالبًا اسی سے استدلال کیا ہے استسقاء کیلئے صرف دعا کرنا سنت ہے مگر دوسری احادیث سے نماز استسقاء پڑھنا بھی ثابت ہے۔

اس سلسلہ کی تمام روایات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے بارش کیلئے چھ طرح مختلف اوقات میں دعا کی ہے۔ (۱) ایک دفعہ تو آپؐ لوگوں کو عیدگاہ میں لے گئے' نماز پڑھائی' خطبہ بھی دیا اور دعا بھی فرمائی۔ (۲) ایک دفعہ خطبہ جمعہ کے دوران ہی صرف دعا ہی منبر پر کھڑے ہوئے فرمائی۔ (۳) ایک مرتبہ آپؐ نے باقاعدہ منبر منگوایا اور اس پر بیٹھ کر صرف دعا فرمائی یہ الفاظ مروی ہیں بلکہ حدیث میں اس کے برعکس خطبہ کے لفظ بھی کہے اور نماز نہیں پڑھی۔ (۴) ایک مرتبہ نماز سے فارغ ہو کر سب لوگوں کے ساتھ اجتماعی دعا کی۔ (۵) ایک دفعہ آبادی سے باہر نکل کر احجار الزیت مقام میں جا کر دعا فرمائی۔ (۶) اور ایک دفعہ جنگ کے دوران بارش کیلئے دعا فرمائی۔ ہر دفعہ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔ (زاد المعاد۔ السبل)

(٤٠٩) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ كَانَ إِذَا قَحَطُوا اسْتَسْقَى بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ ، وَقَالَ: اللّٰهُمَّ إِنَّا كُنَّا نَسْتَسْقِيْ إِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا فَتَسْقِيْنَا ، وَإِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فَاسْقِنَا ، فَيُسْقَوْنَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہو جاتے تو حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر بارش طلب فرماتے اور یوں دعا کرتے کہ اے اللہ! ہم تجھ سے تیرے نبی ﷺ کے واسطہ سے بارش طلب کرتے تھے تو ہمیں باران رحمت سے نواز دیتا تھا اور اب ہم تیرے حضور تیرے نبی ﷺ کے چچا کو بطور وسیلہ لائے ہیں لہٰذا تو ہمیں بارش سے سیراب فرما دے (اس دعا کی قبولیت کے نتیجہ میں) ان کو بارش سے سیراب کیا جاتا تھا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ قحطوا ﴾ صیغہ مجہول وہ قحط کا شکار ہوگئے۔ ﴿ یستسقی بالعباس بن عبدالمطلب ﴾ عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر اور ان سے شفاعت و سفارش کرا کر بارش طلب کرتے تھے اس لئے کہ وہ نبی ﷺ کے چچا تھے اور چچا والد کے مثل ہوتا ہے۔ ﴿ اللھم انا کنا نستسقی الیک بنبینا ﴾ یا الٰہی! ہم نبی ﷺ کی زندگی میں ان سے دعا اور سفارش کے ذریعہ سے بارش طلب کرتے تھے۔ ان کی ذات سے نہیں ﴿ وانا نتوسل الیک ﴾ اور اب ان کی وفات کے بعد آپؐ کے چچا

عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر لائے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما دونوں منبر پر تشریف لے گئے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دعا پوری کر چکے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بارگاہ رب العزت سے عرض کیا۔ الٰہی! مصیبت اور بلائیں گناہ کے سبب سے نازل ہوتی ہیں اور توبہ کے بغیر وہ دور نہیں ہوتیں۔ اب لوگوں نے تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ مجھے تیری جناب میں متوجہ کیا ہے' یہ ہمارے ہاتھ تیرے حضور اٹھے ہوئے ہیں' گناہوں سے لبریز ہیں۔ ہم تیری جناب سے توبہ کے ذریعہ فریاد رسی کے طلبگار ہیں تیرے حضور سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ پیشانیاں تیرے آگے جھکی ہوئی ہیں۔ لہٰذا ہمیں بارش سے سیراب فرما دے۔ بس پھر کیا تھا پہاڑوں کی مانند بادل اٹھے اور آسمان پر چھا گئے۔ خوب بارش برسی' زمین سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگی۔ لوگوں میں زندگی آ گئی۔ اس واقعہ کو زبیر بن بکار نے اپنی الانساب میں ذکر کیا ہے۔ (مرعاۃ' ج: ۲' ص: ۳۹۹ اور سبل السلام)

حاصل کلام: قبہ و قبر پرستوں نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ وسیلہ پکڑنا جائز ہے۔ صحابہ کرامؓ نے بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو طلب بارش کیلئے وسیلہ بنایا اور ان کے توسل سے بارش کیلئے دعا مانگی۔ حالانکہ یہ سراسر لغو اور مردود ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرات تو زندہ و مردہ' حاضر و غائب بلکہ ان کے ناموں کا بھی وسیلہ پکڑتے ہیں۔ حالانکہ اس حدیث سے تو صرف زندہ انسانوں کی دعا کا وسیلہ پکڑنا ثابت ہوتا ہے۔ ان کے ناموں کو وسیلہ بنانا ثابت نہیں ہوتا۔ اگر ان حضرات کی طرح وسیلہ اور توسل پکڑنا جائز ہوتا تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے چچا کی عدم موجودگی میں بھی جائز ہوتا حالانکہ ایسا کسی حدیث سے اور قرآن مجید کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔

یہ حدیث ہمارے لئے تین باتوں کا ذکر کرتی ہے ایک تو یہ کہ بارش کی دعا کیلئے خیر اور خاندان نبوت کے کسی فرد کو جو نیکی و تقویٰ میں نمایاں مقام رکھتا ہو' ساتھ لے جانا چاہئے۔ اس حدیث سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی فضیلت و بزرگی نمایاں ہوتی ہے کہ خاندان نبوت میں ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں تواضع و انکساری کس قدر پائی جاتی تھی اور اہل بیت کے کتنے قدر شناس و حق شناس تھے۔ نیز یہ بھی اس حدیث سے مترشح ہو رہا ہے کہ زندہ آدمی خواہ فوت شدہ سے مرتبے و منصب میں کم تر ہو' دعا اسی سے کرانی چاہئے۔ فوت شدہ کا وسیلہ اور توسل شریعت میں نہ ثابت ہے اور نہ ہی معتبر ہے۔

راوی حدیث: ﴿حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ﴾ حضورؐ کے چچا' ان کی کنیت ابوالفضل تھی۔ بیت اللہ کی آباد کاری اور حجاج کو پانی پلانے کا منصب ان کے پاس تھا۔ بیعت عقبہ میں حاضر تھے تاکہ انصار کو عہد وفا کرنے کی تاکید کریں۔ اگرچہ اس وقت وہ مسلمان نہ تھے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر قیدیوں میں شامل تھے۔ فتح مکہ سے تھوڑا سا عرصہ پہلے اسلام قبول کیا اور اس غزوۂ میں شریک بھی ہوئے۔ غزوۂ حنین کے روز ثابت قدم رہے۔ ۳۲ھ میں رجب یا رمضان میں وفات پائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

(٤١٠) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَصَابَنَا - وَنَحْنُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ - مَطَرٌ، قَالَ: فَحَسَرَ ثَوْبَهُ حَتَّى أَصَابَهُ مِنَ المَطَرِ، وَقَالَ: إِنَّهُ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِرَبِّهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ ہم ایک دفعہ بارش کی لپیٹ میں آگئے اور رسول اللہ ﷺ ہمارے ساتھ تھے۔ آنجناب ﷺ نے اپنے بدن اطہر سے کپڑا اوپر اٹھایا کہ بارش آپ کے جسم اطیب پر پڑنے لگی اور ارشاد فرمایا کہ "یہ اپنے آقا و مالک کے ہاں سے نئے نئے تحفہ کی صورت میں آرہی ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فحسر ثوبه﴾ حضور ﷺ نے اپنے بدن مبارک سے کچھ کپڑا اٹھا لیا۔ ﴿حتی اصابه من المطر﴾ کہ بارش کے کچھ قطرے آپ کے جسم پر پڑ گئے۔ ﴿حديث عهد بربه﴾ اپنے مالک کے ارشاد کے مطابق نئی نئی نازل ہوئی ہے یا یہ معنی ہے کہ اپنے مالک کے ایجاد کرنے سے برسی ہے۔ یعنی بارش رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ابھی ابھی نازل فرمایا ہے۔ لہٰذا اس کے ذریعہ سے برکت حاصل کی جائے۔

حاصل کلام: حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بارش عالم قدس سے نازل ہوئی ہے۔ ہنوز یہ ایسی حالت میں ہے کہ کسی گنہگار کا ہاتھ اسے نہیں لگا ہے اور نہ ابھی ایسے مقام تک پہنچی ہے جہاں لوگ گناہ میں ملوث ہوتے ہیں۔ نیز اس میں خیر اور برکت والی اشیاء سے تبرک حاصل کرنے کی جانب رغبت دلائی گئی ہے۔ بارش کے پانی میں نہانا مفید اور جائز ہے۔

(٤١١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَأَى المَطَرَ قَالَ: «اللَّهُمَّ صَيِّباً نَافِعاً». أَخْرَجَاهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب بارش کو دیکھتے تو اس طرح دعا مانگتے۔ "اے اللہ! اس بارش کو منافع بخش و سود مند بنا دے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿صيبا﴾ صاد پر فتحہ "یاء" کے نیچے کسرہ اور تشدید۔ بہت بارش۔ فعل مقدر کی وجہ سے منصوب واقع ہوا ہے یعنی اس بارش کو نفع بخش بنا دے۔ ﴿اخرجاه﴾ ان دونوں سے بخاری و مسلم مراد ہیں۔

(٤١٢) وَعَنْ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَعَا فِي الاسْتِسْقَاءِ: «اللَّهُمَّ جَلِّلْنَا سَحَاباً كَثِيفاً، قَصِيفاً، دَلُوقاً، ضَحُوكاً،

حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے دعاء استسقاء میں یہ دعا مانگی۔ "یا الٰہی! ہمیں ایسے بادل سے جو ساری زمین پر چھایا ہوا ہو، گہرا ہو، کڑکنے والا، زور سے برسنے والا، چمکنے گرجنے والا، تہ

تُمْطِرُنا مِنْهُ رُذَاذاً، قِطْقِطاً، سَحْلاً، يَا ذَا الجَلاَلِ وَالإِكْرَامِ». رَوَاهُ أَبُو عَوَانَةَ فِي صَحِيحِهِ.

بہ تہ ہو' سے بارش کی باریک بوندیں بہت زیادہ برسا دے۔ اے بزرگی اور عزت کے مالک!" (مسند ابی عوانہ)

لغوی تشریح: ﴿ جللنا ﴾ تجلیل سے ماخوذ ہے۔ دعائیہ صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ یہ بادل روئے زمین پر چھا جائے۔ ﴿ کشیفا ﴾ گاڑھا تہ بہ تہ ﴿ قصیفا ﴾ ایسا بادل جس کی کڑک شدید ہو۔ یہ زور دار بارش کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ دونوں لفظ فعیل کے وزن پر ہیں ﴿ دلوقا ﴾ دال پر فتحہ اور لام پر ضمہ زور سے برسنے والا۔ جیسے کہتے ہیں سیلاب لوگوں پر ٹوٹ پڑا۔ ﴿ ضحوکا ﴾ "ضاد" پر فتحہ اور "حاء" پر ضمہ ہے۔ چمکنے والا۔ جس میں بجلی ہو۔ ﴿ رذاذا ﴾ "راء" پر ضمہ۔ چھوٹے چھوٹے قطرے' باریک باریک بوندیں ﴿ قطقطا ﴾ دونوں "قاف" پر کسرہ اور پہلا "طاء" ساکن۔ باریک بوندیں حتیٰ کہ رائی کے دانوں کے برابر۔ ﴿ سجلا ﴾ سین پر فتحہ' جیم ساکن۔ زور دار بارش۔ مصدر ہے۔ بادل کی تعریف کی گئی ہے۔ مبالغہ کے طور پر موسلا دھار برسنے والا۔

حاصل کلام: رسول اللہ ﷺ سے دعائے استسقاء کی کئی دعائیں مختلف الفاظ سے منقول ہیں۔ یہ دعا ان میں سے ایک ہے' جو دعا چاہے پڑھے۔

(٤١٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: خَرَجَ سُلَيْمَانُ عَلَيْهِ السَّلاَمُ يَسْتَسْقِي، فَرَأَى نَمْلَةً مُسْتَلْقِيَةً عَلَى ظَهْرِهَا، رَافِعَةً قَوَائِمَهَا إِلَى السَّمَاءِ، تَقُولُ: اللَّهُمَّ إِنَّا خَلْقٌ مِنْ خَلْقِكَ، لَيْسَ بِنَا غِنًى عَنْ سُقْيَاكَ، فَقَالَ: «ارْجِعُوا فَقَدْ سُقِيتُمْ بِدَعْوَةِ غَيْرِكُمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "حضرت سلیمان علیہ السلام بارش طلب کرنے کیلئے باہر نکلے تو انہوں نے ایک چیونٹی کو پشت کے بل ٹانگیں آسمان کی جانب اٹھائے ہوئے دیکھا جو بارگاہ رب العزت میں عرض کر رہی تھی۔ الٰہی ہم تیری مخلوق ہیں تیری دوسری مخلوق کی طرح۔ ہم بھی تیری بارش سے بے نیاز و مستغنی نہیں ہیں۔ یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا چلو واپس چلیں تمہیں بارش سے سیراب کر دیا گیا' غیروں کی دعا کی بدولت۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ مستلقیہ علی ظهرها ﴾ اپنی گدی پر اوندھی لیٹی ہوئی تھی ﴿ قوائمها ﴾ قائمہ کی جمع ہے۔ پاؤں کے معنی میں۔ ﴿ خلق ﴾ "خاء" پر فتحہ اور لام ساکن۔ اس کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق۔ ﴿ سقیاک ﴾ سین پر ضمہ اور "قاف" ساکن۔ تیری بارش ﴿ سقیتم ﴾ صیغہ

مجہول۔ بارش کے ساتھ سیراب کر دیئے گئے تم لوگ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سابقہ پیغمبر بھی بارش کی بندش کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر بارش طلب کرنے جاتے تھے۔ چھوٹی مخلوق کے ذریعہ انسان کو بارش سے سیراب کیا جاتا ہے۔ للذا دعاء استسقاء یا نماز استسقاء آبادی سے باہر ہی کرنی چاہئے۔ اس طرح آبادی کی گہما گہمی' ہنگامہ خیزی اور شور و شغف سے دور توجہ زیادہ ہو جاتی ہے۔

(٤١٤) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ ٱسْتَسْقَى فَأَشَارَ بِظَهْرِ كَفَّيْهِ إِلَى السَّمَاءِ. أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے بارش کیلئے دعا فرمائی تو اپنے دونوں ہاتھ الٹی حالت میں آسمان کی طرف اٹھا کر ارشاد فرمایا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اشار بظهر كفيه الى السماء ﴾ ہاتھوں کی پشت چہرے کی طرف کی۔ یہ صورت معمول کے مطابق دعا مانگنے کی صورت کے برعکس ہے۔ جب کسی ضرر کو دور کرنا مطلوب و مقصود ہو تو اس طرح دعا کرتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں الٹے ہاتھوں دعا مانگنے کا ذکر ہے حالانکہ عموماً آپؐ سیدھے ہاتھوں سے دعا کرتے تھے۔ ان دونوں میں علماء نے یہ تطبیق دی ہے کہ رحمت کی طلب کرنے کیلئے سیدھے ہاتھوں سے دعا کرنی چاہئے اور ضرر و مصیبت کو دور کرنے کیلئے دعا مانگی جائے تو الٹے ہاتھوں سے کی جائے۔ اس سے تفاءل مراد ہوتا ہے کہ حالت کو اس طرح تبدیل فرما دے۔ دعائے استسقاء کے وقت چادر کو الٹانے اور پھیرنے میں بھی غالباً یہی حکمت کارفرما ہے اور ہتھیلیوں کے نیچے کرنے میں بھی یہی حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بادلوں کے منہ بھی نیچے کر دیئے تاکہ بارش خوب برسے اور خشک سالی کو سرسبزی سے بدل دیا۔

١٧ - بَابُ اللِّبَاسِ

لباس کا بیان

(٤١٥) عَنْ أَبِيْ عَامِرٍ الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيَكُونَنَّ مِنْ أُمَّتِي أَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّونَ ٱلْحِرَ وَٱلْحَرِيرَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَصْلُه فِي الْبُخَارِيِّ.

حضرت ابوعامر اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میری امت میں لازماً کچھ ایسی قومیں ہوں گی جو (زنا) اور ریشم کو حلال سمجھیں گی۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب اللباس ﴾ لباس جو حرام اور حلال ہیں' ان کا بیان ہے۔ اور کتاب الصلوۃ میں اس کا ذکر اس لیے کر دیا ہے کہ نماز کے ساتھ اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ ﴿ الحر ﴾ شیخ احمد محمد شاکر نے "الباعث الحثيث ص ٣٤" پر لکھا ہے کہ "حر" "حا" کے نیچے کسرہ اور "را" ساکن کی صورت میں

زنا کے معنی میں مستعمل ہے۔ یعنی یہ لوگ زنا کو حلال قرار دیں گے۔ یہ صحیح روایت بخاری وغیرہ کے تمام نسخوں میں موجود ہے۔ بعض نے یہ لفظ ﴿خز﴾ "خاء" اور "زاء" کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔ جس سے مراد ریشم ہے۔ مگر یہ دراصل حر سے تخفیف ہے۔ جیسا کہ حافظ ابوبکر بن عربی نے کہا ہے' ملاحظہ ہو: (فتح الباری ج: ۱۰' ص: ۴۵'۴۹)۔ ﴿الحریر﴾ ریشم کی تمام اقسام کیلئے حریر کا لفظ مستعمل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دو چیزیں حرام کی گئی ہیں ایک ریشم کا پہننا دوسرا زنا و بدکاری کرنا۔ ریشم کا لباس زیب تن کرنا انسان کے اندر رعونت اور کبر و نخوت پیدا کرتا ہے۔ اور یہ متکبرین کا لباس ہے۔ اسی لئے اسے امت پر حرام قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ زینت و لطافت کا لباس ہے جو مردوں کے برعکس عورت کا لباس شمار ہوتا ہے اور مردوں کیلئے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے۔ بخاری میں اس کی اصل ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری نے اسے معلق روایت کیا ہے۔ معلق بایں طور کہ عبدالرحمٰن جو اس کے راوی ہیں کو شک و تردد ہے کہ انہوں نے یہ حدیث ابوعامر رضی اللہ عنہ سے سنی ہے یا ابومالک سے۔

راوی حدیث: ﴿ابوعامر اشعری رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام عبداللہ بن ھانی یا عبید بن وھب رضی اللہ عنہ ہے۔ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دور خلافت میں وفات پائی۔

(٤١٦) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ نَشْرَبَ فِي آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالفِضَّةِ، وَأَنْ نَأْكُلَ فِيهَا، وَعَنْ لُبْسِ الحَرِيرِ وَالدِّيْبَاجِ ، وَأَنْ نَجْلِسَ عَلَيْهِ .رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے' باریک اور گاڑھا ریشم پہننے اور ان پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿دیباج﴾ گاڑھے ریشم کا ساختہ کپڑا۔ یہاں خاص کا عام پر عطف ہے۔

(٤١٧) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ لُبْسِ الحَرِيْرِ، إِلاَّ مَوْضِعَ أُصْبُعَيْنِ أَوْ ثَلاَثٍ أَوْ أَرْبَعٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ریشم پہننے سے منع فرمایا۔ سوائے دو یا تین یا چار انگشت۔ (بخاری و مسلم۔ اور متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

حاصل کلام: مردوں کیلئے ریشم پہننا شرعی طور پر حرام ہے البتہ خارش وغیرہ عذر کی صورت میں وقتی اجازت ہے۔ اس کے علاوہ دو' چار انگشت کے برابر اگر کسی کپڑے پر ریشم لگا ہوا ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

(٤١٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَخَّصَ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے دوران سفر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور زبیر بن

لِعَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ وَالزُّبَيْرِ فِي قَمِيْصِ الحَرِيْرِ، فِي سَفَرٍ، مِنْ حِكَّةٍ كَانَتْ بِهِمَا . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

عوام رضی اللہ عنہ کو ریشمی قمیص پہننے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس وجہ سے کہ ان کو خارش تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فی سفر ﴾ غزوہ کیلئے جاتے ہوئے دوران سفر میں من حکہ خارش کی وجہ سے "حا" کے نیچے کسرہ اور کاف پر تشدید۔ خارش کی ایک قسم۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے جوؤں کی شکایت کی تھی تو آپ ؐ نے ریشم زیب تن کرنے کی اجازت عنایت فرما دی اور یہ بھی ممکن ہے کہ خارش جوؤں کی وجہ سے ہی ہوتی ہو۔ ان کو ریشم کی رخصت اس لئے دی کہ ریشم میں نرمی اور گداز پن ہوتا ہے جو خارش کی تکلیف میں کمی کا باعث ہے نیز اس کپڑے میں جوئیں بھی کم ہی پڑتی ہیں۔ گویا دفع ضرر کی حد تک ریشم کی اجازت ہے۔

راوی حدیث: ﴿ زبیر رضی اللہ عنہ ﴾ یہ زبیر بن عوام بن خویلد بن اسد قرشی اسدی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی ساتھی' آپ ؐ کی پھوپھی صفیہ کے لخت جگر اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ غزوات میں اسلام کی جری اور بہادروں میں شمار ہونا۔ جنگ جمل سے واپسی کے بعد ۳۶ھ کو فوت ہوئے۔

(٤١٩) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَسَانِي النَّبِيُّ ﷺ حُلَّةَ سِيَراءَ، فَخَرَجْتُ فِيْهَا، فَرَأَيْتُ الغَضَبَ فِيْ وَجْهِهِ، فَشَقَقْتُهَا بَيْنَ نِسَائِيْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سیراء کا پٹے دار' ریشمی جوڑا عنایت فرمایا۔ میں اسے پہن کر باہر نکلا تو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رخ انور پر غصہ اور ناراضگی کے آثار دیکھے تو میں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنی گھریلو خواتین میں تقسیم کر دیا۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ کسانی ﴾ مجھے پہنایا یعنی عنایت فرمایا ﴿ حلة ﴾ "حاء" پر ضمہ اور لام پر تشدید۔ نیا کپڑا' نیا لباس۔ حلة دراصل ایک رنگ کے دونوں کپڑے ازار (تہبند) اور چادر کو کہتے ہیں۔ جو سارے بدن کو ڈھانپ لے۔ ﴿ سیراء ﴾ نصب کی صورت میں حلة کی صفت ہے اور جر کی صورت میں حلة کی جانب مضاف۔ اور سیراء کی سین کے نیچے کسرہ اور "یاء" پر فتحہ۔ چادر جس میں دھاریاں ہوں یا جس میں ریشم استعمال ہوا ہو۔ فخرجت فیھا" میں اسے پہن کر باہر نکلا۔ ﴿ فرایت الغضب فی وجھه ﴾ میں نے آپ ؐ کے رخ انور پر غصہ و ناراضگی کے آثار دیکھے اس لئے کہ یہ حلة ریشم ساختہ تھا۔ ﴿ فشققتھا ﴾ ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کر دیا یا بانٹ دیا۔ ﴿ بین نسائی ﴾ اپنے گھر کی خواتین میں ایک قول کے مطابق اس سے مراد ان کی اہلیہ' والدہ' چچا زاد بہن اور بھاوج ہیں (عقیل کی بیوی) ان میں سے ہر ایک کا نام فاطمہ تھا۔ یعنی (فاطمہ بنت محمدؐ' فاطمہ بنت اسد' فاطمہ بنت حمزہ اور فاطمہ زوجہ عقیل

رضی اللہ عنھن)

حاصل کلام: نبی ﷺ کو یہ حلہ تحفہ کے طور پر وصول ہوا تھا۔ آپؐ نے یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زیب تن فرمایا مگر آنحضرت ﷺ نے اس پر اظہار ناراضی فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "میں نے تمہیں پہننے کیلئے نہیں دیا تھا بلکہ اس لئے دیا تھا کہ گھر کی عورتیں پہن لیں۔" چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے خواتین میں تقسیم کر دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہدیہ اور تحفہ قبول کرنا مسنون ہے' خواہ اس کا استعمال مرد کیلئے جائز نہ ہو۔

(٤٢٠) وَعَنْ أَبِيْ مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «أُحِلَّ الذَّهَبُ وَالحَرِيرُ لإِنَاثِ أُمَّتِي. وَحُرِّمَ عَلَى ذُكُورِهِمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ.

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کیلئے حلال کر دیا گیا ہے اور ان کے مردوں پر حرام۔" (اسے احمد' نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کیلئے سونا پہننا بصورت زیور و لباس جائز ہے مگر ترغیب نہیں' اسی طرح خواتین کو ریشم کے استعمال کی بھی اجازت ہے۔

(٤٢١) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ إِذَا أَنْعَمَ عَلَى عَبْدِهِ نِعْمَةً، أَنْ يَرَى أَثَرَ نِعْمَتِهِ عَلَيْهِ». رَوَاهُ البَيْهَقِيُّ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کو یہ پسند و محبوب ہے کہ جب وہ اپنے کسی بندے پر انعام فرمائے تو اس نعمت کا اثر اس پر دیکھا جائے۔" (بیہقی)

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا اظہار ہونا چاہئے۔ اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق کھانا پینا اور اچھا لباس پہننا تقویٰ کے خلاف نہیں۔ بہترین سواری بھی تکبر میں شمار نہیں بشرطیکہ آدمی دوسروں کو حقیر نہ سمجھے۔

(٤٢٢) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنْ لُبْسِ القَسِّيِّ وَالمُعَصْفَرِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے قس (شہر کا نام) کے ساختہ کپڑے اور زرد رنگ کے کپڑے پہننے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿القسی﴾ قاف پر فتحہ سین کے نیچے کسرہ اور اوپر تشدید اس کے بعد یائے نسبتی ہے۔ قس کی طرف منسوب ہے۔ بلاد مصر میں سے ایک جگہ کا نام جو ساحل سمندر پر تنیس کے قریب واقع ہے' یہ ایسا کپڑا تھا جس میں ریشم کی دھاریاں ہوتی تھیں اور مقام قس میں تیار کیا جاتا تھا اور ایک قول یہ

بھی ہے کہ یہ "قز" کی طرف منسوب ہے اور یہ ریشم کا بیکار' بچا کھچا مواد ہوتا ہے۔ "زا" اور سین کے قریب المخرج ہونے کی وجہ سے "زا" کو سین میں تبدیل کر دیا اور اس قز سے قس بن گیا۔ ﴿ والمعصفر ﴾ رباعی سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ عصفر سے رنگا ہوا۔ عصفر ہندی زبان میں کسنبہ کو کہتے ہیں۔ اس کا رنگ سرخی اور زردی کے بین بین ہوتا ہے۔ ہندو کاہن' سادھو اور جوگی لوگ پہنتے ہیں۔ ممکن ہے کہ نبی ﷺ کے زمانہ کے کاہنوں کا بھی یہی لباس ہو۔ اسی بنا پر یہ رنگ پہننے کی ممانعت کی گئی ہے۔ (واللہ اعلم)

(٤٢٣) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: رَأَى عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ ثَوْبَيْنِ مُعَصْفَرَيْنِ، فَقَالَ: «أُمُّكَ أَمَرَتْكَ بِهٰذَا؟». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے میرے جسم پر زرد رنگ کے دو کپڑے دیکھے تو فرمایا "کیا تیری والدہ نے یہ پہننے کا حکم دیا ہے؟" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ رای علی ﴾ علی حرف جر ہے "یاء" پر تشدید "یاء" متکلم مجرور۔ ﴿ امک امرتک؟ ﴾ امر سے صیغہ غائب ہے۔ آپ نے ایسا شدید ناپسندیگی کے اظہار کے طور پر فرمایا۔

حاصل کلام: تیری ماں نے تجھے پہنایا ہے کیا؟ یعنی یہ رنگ تو خواتین پہنتی ہیں اس لئے تیری ماں نے تجھے پہنا دیا۔ یہ غالباً حضور ﷺ نے بطور تنبیہہ اور زجر و توبیخ ارشاد فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! میں اسے دھو ڈالوں؟ تو فرمایا "نہیں جلا کر خاکستر کر دو۔"

(٤٢٤) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهَا أَخْرَجَتْ جُبَّةَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، مَكْفُوفَةَ الْجَيْبِ وَالْكُمَّيْنِ وَالْفَرْجَيْنِ بِالدِّيبَاجِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَصْلُه فِي مُسْلِمٍ، وَزَادَ: كَانَتْ عِنْدَ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا حَتَّى قُبِضَتْ، فَقَبَضْتُهَا، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَلْبَسُهَا، فَنَحْنُ نَغْسِلُهَا لِلْمَرْضَى، نَسْتَشْفِي بِهَا. وَزَادَ الْبُخَارِيُّ فِي الأَدَبِ الْمُفْرَدِ: وَكَانَ يَلْبَسُها لِلْوَفْدِ وَالْجُمُعَةِ.

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ کا ایک چوغہ نکالا جس کی آستینوں' گریبان اور چاک پر دبیز ریشم کا حاشیہ تھا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں ہے۔) مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ وہ جبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں تھا کہ وہ وفات پا گئیں تو میں نے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ نبی کریم ﷺ اسے زیب تن فرمایا کرتے تھے اور اسے دھو کر مریضوں کو پلاتے تھے اور شفاء طلب کرتے تھے اور بخاری نے الادب المفرد میں یہ اضافہ کیا ہے کہ حضور ﷺ اسے وفود کی آمد پر اور نماز جمعہ کیلئے پہنتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ مکفوفۃ ﴾ منصوب ہے اور حال واقع ہو رہا ہے۔ ﴿ مکفوف ﴾ کا مطلب ہے ایسا کپڑا جس کے اطراف و جوانب میں دوسرے کپڑے کا نشان ہوتا تھا۔ ﴿ الجیب ﴾ جیم پر فتحہ اور یا ساکن۔ قمیص وغیرہ کا وہ حصہ جو گردن کے گرد ہوتا ہے۔ ﴿ والکمین ﴾ کاف پر ضمہ اور میم پر تشدید کم کا تثنیہ ہے قمیص کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس میں سے ہاتھ داخل اور خارج ہوتا ہے۔ ﴿ والفرجین ﴾ فا پر فتحہ را ساکن فرج کا تثنیہ دراصل یہ کپڑے کا وہ حصہ ہے جو حلق سے شروع ہوتا ہے اور سینے تک جاتا ہے بسا اوقات وہ نیچے تک بھی چلا جاتا ہے۔ مگر پھر اس کا اطلاق سینے پر ملنے والے دونوں اطراف پر ہوتا ہے۔ ﴿ دیباج ﴾ دبیز و گاڑھا ریشم۔ فارسی کلمہ کو معرب بنایا گیا۔ ﴿ حتی قبضت ﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی وفات پا گئیں۔ ﴿ فقبضتھا ﴾ تو میں نے اس جبہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ﴿ نستشفی بھا ﴾ صیغہ معروف متکلم ہے۔ اور ایک نسخہ میں یستشفی صیغۂ مجہول بھی ہے یعنی اس کی برکت سے شفا طلب کی جاتی تھی۔ ﴿ للوفد ﴾ واو پر فتحہ اور فا ساکن۔ معزز لوگوں کی جماعت جو امیر اور معزز آدمی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وفود کی آمد پر ان کے استقبال اور مجمعوں کے مواقع پر زینت و زیبائش کیلئے اچھا اور مخصوص قسم کا لباس پہننا مندوب ہے۔ چار انگشت کے مساوی ریشم کی رخصت کا معنی یہ ہے کہ یہ ریشم کے کپڑے کے عرض میں لگا ہوا (طول میں نہیں) اور آستینوں، گریبانوں اور چاک پر ان کے طول کے حساب سے جائز ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سربراہ مملکت، امیر اور صاحب منصب و مرتبہ خطیب و امام اور دیگر معزز لوگوں اور وفود کی آمد اور جمعہ و جماعت اور دیگر خاص مجمعوں کیلئے عام معمول سے ہٹ کر اچھا لباس رکھنا جائز ہے اور عمدہ اور اچھا صاف ستھرا لباس زیب تن کر کے باہر نکلنا چاہئے۔ بشرطیکہ حدود شرعیہ سے تجاوز نہ کر جائے۔ فخر و ریا اور کبر و نخوت اور شان نمائی نہ ہو۔ ممنوع لباس سے پرہیز و اجتناب کیا گیا ہو۔

۳۔ كِتَابُ الْجَنَائِزِ

جنازے کے مسائل

(٤٢٥) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَادِمِ اللَّذَّاتِ: الْمَوْتِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "لذتوں کو توڑ دینے' کاٹ دینے والی کا ذکر کثرت سے کیا کرو (یعنی موت کا)" (اسے ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ کتاب الجنائز ﴾ جیم پر فتحہ۔ جنازہ کی جمع ہے۔ جنازہ کی جیم پر فتحہ اور کسرہ دونوں اعراب ہیں مگر کسرہ زیادہ فصیح ہے۔ چارپائی پر رکھی ہوئی میت اور ایک قول کے مطابق جیم پر فتحہ ہے اس صورت میں اس کا معنی میت کے ہیں اور کسرہ کی صورت میں اس چارپائی کو کہیں گے جس پر میت پڑی ہو اور ایک قول اس کے برعکس بھی ہے یعنی فتحہ کی صورت میں میت والی چارپائی اور کسرہ کی صورت میں میت "کتاب الصلوٰۃ" کے معاً بعد کتاب الجنائز لانے سے مقصود یہ ہے کہ میت کی تجہیز و تکفین کے جملہ امور و افعال میں نماز جنازہ زیادہ اہم ہے۔ لہٰذا اس طرح دونوں میں قریبی مناسبت اور تعلق کی وجہ سے کتاب الصلوٰۃ کے بعد کتاب الجنائز کو رکھا ہے۔ ایک قول کے مطابق جنازہ کی مشروعیت ۱ ہجری میں ہوئی۔

﴿ اکثروا ﴾ اکثار سے امر کا صیغہ ہے۔ زیادہ کرو ﴿ ھاذم ﴾ مضاف ہونے کی بنا پر مجرور ہے اور "لذات" کی طرف مضاف ہے۔ "ذال" کے ساتھ ہونے کی صورت میں اس کا معنی کاٹ ڈالنے والی' توڑ دینے والی۔ اس سے مراد موت ہے۔ جب موت کسی پر وارد ہوتی ہے تو دنیوی لذتوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑتی' سب ختم ہو جاتی ہیں اور آدمی کو دنیا سے بے رغبت کر دیتی ہے اور ایک روایت میں ھادم بھی منقول ہے جو ﴿ ھدم البناء والجدار ﴾ کے محاورہ سے ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ موت کو اکثر یاد رکھو جو دنیوی لذتوں کی عمارت کو منہدم کر دینے والی ہے۔ موت جب وارد ہوتی ہے تو لذات دنیوی کی تعمیر شدہ عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہتی ہے۔ ﴿ الموت ﴾ جر (کسرہ) کی صورت میں عطف

بیان ہوگا اور رفعی صورت میں مبتداء محذوف کی خبر جو "ھو" ہو سکتا ہے اور نصب کی صورت میں "اعنی" کو مقدر تسلیم کرنا ہوگا اس صورت میں وہ ھاذم کا بیان ہوگا۔

حاصل کلام: موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ابتدائے آفرینش سے روز ابد تک کوئی منکر نہیں۔ یہ انسانوں کی مشاہدہ میں آنے والی چیز ہے کہ روزمرہ آنکھوں کے سامنے ہرایک کے اعزاء و اقرباء' احباب و رفقاء میں سے کوئی نہ کوئی موت کا جام پیتا ہے' سب اس وقت بے بس ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر قدرتی طور پر دلوں میں نرمی' خوف' محاسبۂ اعمال' قیامت کے ہولناک مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں جس سے طبیعت میں قیامت کی تیاری کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور انسان نیک اعمال کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے موت کو ہمیشہ یاد رکھنے کا حکم ہے۔

(٤٢٦) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمُ المَوْتَ لِضُرٍّ نَزَلَ بِهِ، فَإِنْ كَانَ لا بُدَّ مُتَمَنِّياً، فَلْيَقُلِ: اللَّهُمَّ أَحْيِنِي مَا كَانَتِ الحَيَاةُ خَيْراً لِّي، وَتَوَفَّنِي مَا كَانَتِ الوَفَاةُ خَيْراً لِّي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کسی کو اس مصیبت و تکلیف کی وجہ سے جو اس پر نازل ہوئی ہو موت کی تمنا و خواہش ہرگز نہیں کرنی چاہئے اور اگر اس کی تمنا ضروری ہو تو پھر اس طرح کہنا چاہئے اے اللہ! جب تک جینا میرے لئے بہتر ہو اس وقت تک مجھے زندگی عطا فرما اور جب موت میرے لئے بہتر ہو تو مجھے وفات دے دے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لایتمنین ﴾ "تمنی" سے ماخوذ ہے۔ اس میں نون ثقیلہ تاکید کیلئے ہے اور نہی کا صیغہ ہے۔ "لضر" ضاد پر ضمہ اور کبھی فتحہ بھی آجاتا ہے۔ میرے جانی اور مالی نقصان اور ضرر کی وجہ سے ﴿ لابد ﴾ "با" پر ضمہ اور دال پر تشدید۔ ضروری اور لازمی طور پر۔ ﴿ احیني ﴾ ہمزہ اس میں قطعی ہے یعنی باب افعال کا ہے۔ معنی ہے مجھے زندگی عطا فرما ﴿ توفني ﴾ مجھے وفات دے۔ یہ حدیث دنیوی مصائب و آلام اور رشتوں سے تنگ آکر موت کی تمنا و خواہش کرنے کو مکروہ قرار دیتی ہے کیونکہ یہ عدم رضا بالقضا کی خبر دیتی ہے اور شہادت فی سبیل اللہ کی خواہش اور دین کے بارے میں خوف کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا مکروہ و ناپسندیدہ نہیں ہے۔

حاصل کلام: ایک سچے پکے مومن کیلئے زندگی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ صالح آدمی زندگی کی صورت میں اپنے نیک اعمال اور صالح افعال میں اضافہ ہی کرے گا اور سابقہ گناہوں سے اسے تائب ہونے کا موقع نصیب ہوگا۔ اگر آدمی برا ہے' بدکردار' بداعمال ہے تو اسے موقع غنیمت ملے گا کہ توبہ کر لے اور راہ راست پر گامزن ہو کر اپنی اخروی زندگی سدھار لے۔ اس لئے دنیوی مصائب و آلام' مفلسی' غربت' بیماری وغیرہ سے تنگ آکر موت کی آرزو نہ کرے۔ البتہ رب کائنات سے

ملاقات کے شوق میں موت کی آرزو کمال ایمان کی نشانی اور علامت ہے۔ اگر دین کے بارے میں کسی فتنہ اور آزمائش کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں بھی موت و آرزو کی تمنا کی جا سکتی ہے۔ دنیوی مشکلات و تکالیف تو مومن کو اونچا اڑانے کا باعث ہیں ؎

یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے۔

(٤٢٧) وَعَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «الْمُؤْمِنُ يَمُوتُ بِعَرَقِ الْجَبِينِ». رَوَاهُ الثَّلاَثَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے بیان کیا کہ آپؐ نے فرمایا "مومن کی موت کے وقت اس کی پیشانی پر پسینہ رونما ہو جاتا ہے۔" (اس روایت کو تینوں (ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح : ﴿ بعرق الجبین ﴾ "عرق" پسینہ۔ اس پانی کو کہتے ہیں جو محنت و مشقت یا گرمی و حرارت کی وجہ سے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ ایک قول اس کے متعلق یہ ہے کہ یہ وہ پانی ہوتا ہے جو مومن کے گناہوں کی تطہیر کیلئے موت کے وقت اس کی پیشانی پر رونما ہوتا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ طلب حلال' صوم و صلاۃ کی ادائیگی' احکام شرعیہ پر محافظت کے سلسلہ میں جو محنت و مشقت اور کد و کاوش کرنی پڑتی ہے تاآنکہ موت واقع ہو جاتی ہے۔

(٤٢٨) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ وَأَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالاَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَقِّنُوا مَوْتَاكُمْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللَّهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالأَرْبَعَةُ.

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قریب المرگ آدمی کو "لا الٰہ الا اللہ" کی تلقین کرو۔" (اسے مسلم اور چاروں (ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ لقنوا ﴾ تلقین سے ماخوذ امر کا صیغہ ہے معنی ہیں یاددہانی کراؤ۔ ﴿ موتاکم ﴾ میت کی جمع ہے۔ جب مرنے والے کا وقت قریب ہو تو اس کو سناتے ہوئے اس کے پاس پڑھا جائے' تاکہ وہ اسے سنے اور سمجھے اور پھر خود بھی پڑھے۔

حاصل کلام : اس حدیث میں گو صرف لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کا ذکر ہے مگر اس سے مراد پورا کلمہ ہے کہ یوں مرنے والا توحید و رسالت دونوں کا اقرار کر لیتا ہے۔ قریب المرگ آدمی کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ بھی اسے پڑھیں اور جب مرنے والے کے حواس قدرے ٹھیک ہوں تو اسے بھی پڑھنے کی تلقین کرنی چاہئے۔ نہ تو اسے مرنے والے ہی کو تلقین کرنے پر منحصر کیا جانا چاہئے اور نہ اعزاء و اقرباء اور قریب بیٹھے ہوئے لوگوں پر۔ نبی ﷺ نے خود ایک قریب المرگ آدمی کو لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کیلئے فرمایا تھا۔ (مسند احمد) جس سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کو بھی پڑھنے کیلئے کہا جا سکتا ہے۔

(٤٢٩) وَعَنْ مَعْقَلِ بْنِ يَسَارٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «اقْرَءُوْا عَلَى مَوْتَاكُمْ يسٓ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اپنے مرنے والوں کے قریب سورۂ یٰس پڑھا کرو۔" (اسے ابوداؤد' نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اقرووا ﴾ امر کا صیغہ ہے۔ جس کا معنی ہے پڑھو' پڑھا کرو ﴿ علی موتاکم ﴾ جس کی موت کا وقت حاضر ہو رہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جس کی موت کا وقت قریب ہو اس کے پاس سورۂ یاسین پڑھنے سے میت سے جان کنی کی تکلیف میں تخفیف کر دی جاتی ہے مگر یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ تاہم امت کی اکثریت کا اس پر عمل ہے۔

راوی حدیث: ﴿ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ﴾ معقل میں میم پر فتح' "عین" پر سکون اور "قاف" پر کرہ ہے۔ مزینہ قبیلہ کے صحابی تھے۔ حدیبیہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔ بیعت رضوان میں حاضر ہوئے۔ ان کی طرف بصرہ میں ایک نہر منسوب ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے کھودی تھی اس لیے عربوں میں یہ مثل مشہور ہے کہ "اذا جاء نهر الله بطل نهر معقل" جب اللہ نہر (بارش) جاری ہو جاتی ہے تو معقل کی نہر کی کوئی حیثیت نہیں رہتی ہے۔ آپؓ امیر معاویہؓ کی خلافت کے آخر دور میں ۶۰ھ میں فوت ہوئے۔ اور بعض کے نزدیک یزید کے دور میں فوت ہوئے۔

(٤٣٠) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى أَبِي سَلَمَةَ، وَقَد شُقَّ بَصَرُهُ، فَأَغْمَضَهُ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ الرُّوحَ إِذَا قُبِضَ اتَّبَعَهُ الْبَصَرُ»، فَضَجَّ نَاسٌ مِنْ أَهْلِهِ، فَقَالَ: «لاَ تَدْعُوْا عَلَى أَنْفُسِكُمْ إِلاَّ بِخَيْرٍ، فَإِنَّ الْمَلاَئِكَةَ تُؤَمِّنُ عَلَى مَا تَقُوْلُوْنَ»، ثُمَّ قَالَ: «اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِأَبِي سَلَمَةَ، وَارْفَعْ دَرَجَتَهُ فِي الْمَهْدِيِّيْنَ، وَافْسَحْ لَهُ فِي قَبْرِهِ، وَنَوِّرْ لَهُ فِيْهِ، وَاخْلُفْهُ فِي عَقِبِهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی موت کے وقت تشریف لائے تو اس وقت ان کی آنکھ کھلی ہوئی تھی آپؐ نے اسے بند کر دیا اور پھر فرمایا کہ "جب روح بدن سے نکل جاتی ہے تو آنکھ اس کا پیچھا کرتی ہے" اتنے میں گھر کے لوگ آہ و بکا کرنے لگے' چیخنے لگے۔ تو آپؐ نے فرمایا "اپنے لئے اچھی اور بہتر دعا کرنا کیونکہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر فرشتے آمین کہتے ہیں" پھر آپؐ نے دعا فرمائی کہ "الٰہی! ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی مغفرت فرما دے۔ ہدایت یافتہ لوگوں میں اس کا درجہ و مرتبہ بلند فرما اور اس کی قبر کشادہ و وسیع فرما دے اور اسے منور فرما دے اور اس کے پیچھے رہنے والوں میں نائب و قائم مقام ہو جا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ ﴾ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر ﴿ شق ﴾ شین پر فتحہ صیغۂ معلوم۔ ﴿ بصرہ ﴾ اس کی آنکھ۔ رفعی صورت میں یہ شق کا فاعل ہے۔ اس صورت میں کہ وہ لازم ہے اور نصبی حالت میں یہ مفعول ہے۔ اس صورت میں یہ متعدی فعل ہوگا اور اس کا فاعل پوشیدہ ضمیر ہے جو ابوسلمہ کی طرف راجع ہے۔ یعنی ابوسلمہ کی آنکھ کھلی ہوئی تھی اور ﴿ شق بصرہ ﴾ کنایہ ہے موت سے کیونکہ میت کی نظر اس کی طرف لوٹی نہیں۔ کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے ﴿ فاغمضہ ﴾ آپؐ نے اسے بند کر دیا یعنی آنکھ کے پپوٹوں کو آپس میں ملا دیا۔ ﴿ قبض ﴾ صیغۂ مجہول ہے ﴿ فضج ﴾ اس میں فا تعقیب کیلئے ہے' یعنی معاً اہل خانہ نے رونا' چیخنا شروع کر دیا۔ شاید یہ لوگ دور جاہلیت کی طرح واویلاہ اور واثبورہ کہہ رہے تھے اس لئے حضور ﷺ نے ان کو تلقین فرمائی کہ اچھی اور خیر کی دعا کرو کہ فرشتے تمہارے لئے آمین کہتے ہیں۔ ﴿ تومن ﴾ تامین سے ہے یعنی آمین کہتے ہیں۔ ﴿ وافسح ﴾ وسیع و کشادہ فرما دے۔ ﴿ نور ﴾ تنویر سے امر کا صیغہ ہے یعنی اس کیلئے اس کی قبر میں نور پیدا فرما دے۔ ﴿ واخلفہ ﴾ باب نصر ینصر سے۔ یعنی اس کا نائب و قائم مقام ہو جا۔ ایسا قائم مقام جو اس کی تمام ضروریات پوری فرما دے۔ ﴿ فی عقبہ ﴾ عین پر فتحہ اور قاف پر کسرہ۔ اپنے پیچھے' یعنی اے اللہ! مرنے والے نے اپنے پیچھے دنیا میں اہل و عیال' مال و متاع جو کچھ چھوڑا ہے تو اس کا نائب و محافظ بن جا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کی جب روح جسد خاکی سے پرواز کر جائے تو اس کی آنکھیں عموماً کھلی رہ جاتی ہیں انہیں فوراً بند کر دینا چاہئے کیونکہ جسم ٹھنڈا ہونے کے بعد آنکھ کا بند ہونا دشوار ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کھلی رہیں تو مردے سے دہشت و وحشت آنے لگتی ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کے اہل و عیال اور حتیٰ الامکان اعزہ و اقرباء کو اس کے پاس ہونا چاہئے تاکہ مرنے سے پہلے اگر وہ کوئی بات یا نصیحت کرے تو اس کے گواہ بن سکیں۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہوا کہ مرنے والے کیلئے نماز جنازہ سے پہلے مغفرت و بخشش کی دعا کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کیلئے دعا فرمائی۔ مگر اس موقع پر ہاتھ اٹھانا اور اجتماعی دعا کرنا ثابت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا نام عبداللہ بن عبدالاسد مخزومی قرشی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا پھوپھی زاد بھائی۔ آپؐ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ دونوں کا رضاعی بھائی ہے۔ ابولہب کی آزاد کردہ لونڈی نے انہیں اپنا دودھ پلایا۔ ہجرت اپنی اہلیہ کے ساتھ کی۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ غزوۂ احد میں زخمی ہوئے۔ زخم پہلے درست ہوگیا مگر پھر جاری ہوگیا۔ ۴ھ جمادی الاولیٰ میں وفات پائی۔ شوال میں ابوسلمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو حرم نبوی میں داخل فرما لیا۔

(٤٣١) وَعَنْ عائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حِينَ تُوُفِّيَ، سُجِّيَ بِبُرْدٍ حِبَرَةٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب فوت ہوئے تو آپؐ کو ایک دھاری دار چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ سجی ﴾ تسجیۃ یعنی باب تفعیل سے۔ صیغۂ مجہول ہے۔ ڈھانپنے کے معنی میں۔ ڈھانپ دیا گیا۔ ﴿ ببرد حبرۃ ﴾ اس میں مضاف اور مضاف الیہ کی شکل بھی بنتی ہے اور صفت موصوف کی بھی اور ﴿ برد ﴾ کے "با" پر ضمہ ہے اور راء ساکن ہے۔ چادر یا دھاری دار کپڑا اور ﴿ حبرۃ ﴾ میں "حا" کے نیچے کسرہ بھی جائز ہے اور فتحہ بھی۔ بیل بوٹے والی چادر اور یہ ڈھانپنے کا عمل غسل سے پہلے تھا۔

حاصل کلام: میت کو غسل سے پہلے دھاری دار چادر سے ڈھانپ دینا بھی جائز ہے۔ دوسرا آپؐ پر بھی موت وارد ہوئی۔ اس سے حیات النبی کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہوگیا کہ اگر آپؐ نے وفات نہیں پائی تو آپؐ کے ساتھ وہ عمل کیوں کیا ہے جو مرنے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ (غسل اور تدفین و تجہیز وغیرہ)

(٤٣٢) وَعَنْهَا أَنَّ أَبَا بَكْرٍ الصِّدِّيْقَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَبَّلَ النَّبِيَّ ﷺ بَعْدَ مَوْتِهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ (کی پیشانی) کا بوسہ لیا تھا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ قبل ﴾ تقبیل یعنی باب تفعیل سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ میت کا تعظیم و تکریم کے نقطۂ نظر سے بوسہ لینا جائز ہے۔ کیونکہ کسی ایک صحابی کی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر اظہار ناپسندیدگی منقول نہیں گویا اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ (نیل الاوطار للشوکانی)

(٤٣٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِه، حَتَّى يُقْضَىٰ عَنْهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مومن کی روح قرض کے ساتھ اس وقت تک معلق (لٹکی) رہتی ہے جب تک اسے ادا نہیں کر دیا جاتا۔" (احمد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ معلقۃ ﴾ تعلیق تعلیق یعنی باب تفعیل سے۔ جن نعمتوں اور انعامات کا وہ مستحق ہوتا ہے اس کیلئے بند کر دی جاتی ہیں۔ نہ اس کی نجات کا فرمان جاری کیا جاتا ہے اور نہ اس کی ہلاکت کا ﴿ بدینہ ﴾ دال پر فتحہ۔ قرض جس کا ادا کرنا مرنے والے کے ذمہ واجب ہو۔ ﴿ حتی یقضی عنہ ﴾ صیغۂ مجہول یعنی تاوقتیکہ وہ قرض اس کی جانب سے ادا نہ کر دیا جائے۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقوق العباد مرنے والے سے معاف نہیں ہوتے تاوقتیکہ جس کا حق تھا وہ حق دار اسے از خود معاف نہ کر دے یا کوئی دوسرا اس کی طرف سے ادا نہ کر دے۔ اسی طرح قرض کا بار میت کے ذمے ہوتا ہے جب تک اس کی طرف سے وہ قرض ادا نہیں کر دیا جاتا۔ خواہ کوئی رشتہ دار ادا کرے یا احباب و رفقاء میں سے کوئی یا ریاست اپنے شہری کی حیثیت سے اس کا قرض ادا کر دے۔ اس سے ذرا اندازہ لگائیں کہ یہ مال تو مرنے والے نے مالک کی رضامندی سے واپسی کی نیت سے قرض لیا تھا۔ جب تک اس کی ادائیگی نہیں ہوتی میت اسی قرض سے معلق رہتی ہے مگر جن لوگوں نے

دوسروں کی کوئی چیز یا مال فریب' دھوکہ یا ڈاکہ ڈال کر حاصل کی ہو گی' اس کا کیا حشر ہو گا۔

اگر مرنے والے نے اپنا مال اتنا پیچھے چھوڑا ہو کہ اس سے اس کا قرض ادا ہو سکتا ہو تو وارث اس مال میں سے قرض کی ادائیگی کرنے کے پابند ہیں۔ اگر وہ مفلس و غریب تھا اتنا مال ہی ترکہ میں پیچھے نہیں چھوڑا تو پھر اسلامی ریاست اس کے قرض ادا کرنے کی پابند ہو گی۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "مرنے والا جو مال اپنے پیچھے چھوڑ کر مرے تو وہ وارثوں کا حق ہے اور جو قرض اس کے ذمہ تھا وہ میرے اور میرے والیان ریاست کے ذمہ ہے۔ ہم اسے ادا کریں گے۔" اس سے معلوم ہوا کہ قرض کی معافی نہیں کیونکہ یہ حقوق العباد سے متعلق ہے۔

(٤٣٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي الَّذِيْ سَقَطَ عَنْ رَاحِلَتِهِ، فَمَاتَ: اغْسِلُوهُ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ، وَكَفِّنُوهُ فِي ثَوْبَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے اس آدمی کے متعلق جو اپنی سواری سے گر کر جاں بحق ہو جائے فرمایا کہ "اسے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو اور اسی کے دو کپڑوں میں کفن دے دو۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿فی الذی سقط عن راحلته﴾ یہ ایک صحابی رسول تھے۔ حج کا احرام باندھے مقام عرفہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اپنے اونٹ سے گر گئے اور ان کی گردن ٹوٹ گئی اور وفات پا گئے۔ ﴿بماء وسدر﴾ بیری کے پتوں کا طریق استعمال تین طرح پر ہے۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ بیری کے پتوں کو پانی میں ڈال کر اسے اتنا زور سے ہلائیں کہ اس کا جھاگ باہر نکل آئے۔ اس پانی سے میت کے جسم کو مل کر غسل دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پتوں کو پانی میں خوب ابالیں اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ بیری کے پتوں کو جلا کر راکھ بنا لی جائے اور اسے میت کے جسم پر خوب ملا جائے پھر خالص پانی سے بدن میت کو اچھی طرح صاف کیا جائے۔ یہ غسل دینا ایک ہی مرتبہ ہو گا۔ ﴿کفنوه﴾ تکفین سے امر کا صیغہ ہے۔ (باب تفعیل ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) عرفات میں سواری پر جانا جائز ہے۔ (۲) اونٹ کی سواری بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ (۳) حالت احرام میں جو آدمی گر کر فوت ہو جائے اسے بھی پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دیا جائے۔ (۴) انہی احرام کے کپڑوں ہی میں اسے دفن کیا جائے۔ نیا کفن خریدنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا سر ڈھانکا نہ جائے اور نہ خوشبو ہی لگائی جائے۔ سر ننگا رکھنے اور خوشبو نہ لگانے کی حکمت یہ ہے کہ قیامت کے روز یہ اسی حالت میں لبیک اللهم کا تلبیہ پڑھتا ہوا ننگے سر اٹھے گا۔ (بخاری) بیری کے پتوں میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ ایک تو اس سے بدن صاف اور نرم بھی ہو جاتا ہے اور دوسرا اس پر خرچ کچھ بھی نہیں آتا۔ اس دور میں یہ سب سے آسان طریقہ تھا۔ صابن وغیرہ کا استعمال غالبًا نہ ہونے کے برابر تھا۔

(٤٣٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: لَمَّا أَرَادُوا غُسْلَ النَّبِيِّ ﷺ، قَالُوا: وَاللهِ مَا نَدْرِيْ نُجَرِّدُ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَمَا نُجَرِّدُ مَوْتَانَا أَمْ لاَ؟ اَلْحَدِيْثَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ کو غسل دینے کا ارادہ کیا تو انہوں نے کہا اللہ کی قسم! ہمیں علم نہیں کہ ہم نبی ﷺ کے کپڑے اتاریں جس طرح ہم اپنے مرنے والوں کے کپڑے اتارتے ہیں یا نہ اتاریں؟ پھر ساری حدیث بیان کی۔ (احمد اور ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿ ما ندری ﴾ یعنی ہمیں معلوم نہیں۔ ﴿ نجرد ﴾ تجرید سے ماخوذ ہے (باب تفعیل) بدن سے کپڑے اتارنا۔ مصنف مرحوم رحمہ اللہ نے اس حدیث کا ابتدائی حصہ نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ مکمل حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسی تذبذب میں صحابہ کرامؓ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اسی حالت میں انہوں نے کہنے والے سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دو۔ لہٰذا صحابہ کرامؓ نے آپؐ کو بغیر کپڑے اتارے غسل دیا۔ یہ صحابہؓ کا اپنا تردد و تذبذب تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو چونکہ دیگر مخلوق پر شرف و بزرگی حاصل ہے۔ اس لئے آپؐ کے بارے میں انہیں تردد ہوا کہ آپؐ کے کپڑے اتاریں یا نہ اتاریں۔ ورنہ ان کے ہاں میت کے کپڑے اتار کر غسل دینا بغیر کسی شک و ریب کے مشروع تھا۔ البتہ قابل ستر اعضاء کی پردہ پوشی واجب ہے۔

(٤٣٦) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ وَنَحْنُ نُغَسِّلُ ابْنَتَه، فَقَالَ: «اغْسِلْنَهَا ثَلاَثاً أَوْ خَمْساً أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ، إِنْ رَأَيْتُنَّ ذَلِكَ، بِمَاءٍ وَسِدْرٍ، وَاجْعَلْنَ فِي الأَخِيْرَةِ كَافُوراً، أَوْ شَيْئاً مِنْ كَافُورٍ»، فَلَمَّا فَرَغْنَا آذَنَّاهُ، فَأَلْقَى إِلَيْنَا حِقْوَهُ، فَقَالَ: أَشْعِرْنَهَا إِيَّاهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: «ابْدَأْنَ بِمَيَامِنِهَا، وَمَوَاضِعِ الْوُضُوءِ مِنْهَا». وَفِي لَفْظٍ لِلْبُخَارِيِّ: فَضَفَّرْنَا شَعْرَهَا ثَلاَثَةَ قُرُونٍ، فَأَلْقَيْنَاها خَلْفَهَا.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ہمارے پاس اس وقت تشریف لائے جب ہم آپؐ کی صاحبزادی کو غسل دے رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا "اسے تین یا پانچ مرتبہ' یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ غسل دو۔ اگر تم ضرورت محسوس کرو' غسل پانی اور بیری کے پتوں سے دو' آخر میں کافور یا فرمایا کچھ کافور ڈالو" جب ہم فارغ ہوئیں تو ہم نے آپؐ کو اطلاع بھجوا دی آپؐ نے اپنا تہ بند اتار کر ہماری طرف پھینک دیا اور فرمایا "اسے جسم کے ساتھ لگا دو۔" (بخاری و مسلم)

اور ایک روایت میں ہے کہ غسل دائیں طرف سے اور وضو کے اعضاء سے شروع کرنا۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ہم نے اس کے سر کے بالوں کو

تین حصوں میں تقسیم کر دیا اور ان کو پشت پر ڈال دیا۔

لغوی تشریح: ﴿ ونحن نغسل ابنة ﴾ مشہور روایت کے مطابق یہ آپ ﷺ کی صاحبزادی' ابوالعاص کی اہلیہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں۔ ان کی وفات ۸ھ کے آغاز میں ہوئی۔ ایک قول کے مطابق یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا ان دونوں کی وفات کے موقع پر حاضر تھیں۔ یہ صاحبہ خواتین کی میت کو غسل دیا کرتی تھیں۔ ﴿ ان رایتن ذلک ﴾ اگر تم یہ سمجھو کہ تین یا پانچ مرتبہ غسل دینے سے زائد کی ضرورت ہے تو زیادہ مرتبہ غسل دے سکتی ہو۔ ﴿ بماء وسدر ﴾ پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ کا تعلق ﴿ اغسلنها ﴾ کے ساتھ ہے یعنی غسل پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ دو۔ ﴿ فی الاخیرة کافورا ﴾ راوی کو تردد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے "کافور" کہا ہے یا ﴿ شیئا من کافور ﴾ فرمایا۔ جمہور کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ آخری دفعہ پانی میں کافور یا کچھ کافور ملا لینا۔ امام اوزاعی اور بعض علمائے احناف کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ غسل کے بعد جسم پر کافور ڈال دینا۔ نسائی کی حدیث کے الفاظ "واجعلن فی آخر ذلک کافورا" بظاہر اسی کے مؤید ہیں۔ ﴿ آذناہ ﴾ ایذان سے ماخوذ ہے۔ صیغہ جمع متکلم ہے۔ یعنی ہم نے آپ ﷺ کو خبر دی۔ ﴿ حقوہ ﴾ "حا" پر فتحہ اور کسرہ بھی جائز ہے یعنی حاء کے نیچے کسرہ اور قاف ساکن ہے۔ اس سے مراد تہہ بند ہے۔ دراصل تو یہ تہبند باندھنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ مگر مجازی طور پر ازار کیلئے بولا جاتا ہے۔ ﴿ اشعرنها ایاہ ﴾ اشعار سے امر کا صیغہ ہے۔ آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میرے اس تہبند کو بطور شعار استعمال کرو۔ "شعار" اس کپڑے کو کہتے ہیں جو جسم کے ساتھ لگا ہوا ہو۔ آپ ﷺ کے اس ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ کی صاحبزادی کو اس سے برکت حاصل ہو۔ ﴿ ابدان ﴾ آغاز کریں' ابتداء کریں ﴿ بمیا منها ﴾ میمنہ کی جمع ہے یعنی اس کی دائیں جانب سے۔ ﴿ فضفرنا شعرها ﴾ ﴿ الضفر ﴾ مینڈھی' بالوں کو اس طرح بٹ دے کر یا بن کر ایک دوسرے میں داخل کرنا کہ وہ رسی کی مانند ہو جائیں۔ ﴿ ثلاثة قرون ﴾ قرن کی جمع ہے۔ مینڈھیوں کو کہتے ہیں۔ یہ مینڈھیاں بھی نبی ﷺ کے حکم کے تحت بنائی گئیں۔

حاصل کلام: اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ میت کو کم از کم تین مرتبہ غسل ضرور دینا چاہئے۔ البتہ بوقت ضرورت اگر زیادہ مرتبہ غسل دینے کی ضرورت محسوس ہو تو پھر پانچ یا سات مرتبہ یعنی طاق کا لحاظ رکھ کر غسل دینا چاہئے۔ غسل کا آغاز بھی دائیں جانب اور اعضاء وضو سے کرنا چاہئے۔ غسل کے بعد بھی دائیں جانب اور اعضاء وضو سے کرنا چاہئے۔ غسل کے بعد حصول برکت کی غرض سے کسی بزرگ کا خاص کپڑا پہنانا بھی جائز ہے۔ خاتون میت کے سر کے بالوں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے پیچھے ڈال دیئے جائیں۔ انہیں دو حصوں میں تقسیم کر کے سینے پر ڈالنے کا کوئی صحیح ثبوت نہیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میت کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دینا چاہئے۔ اور آخر میں کافور پانی میں ملا کر جسم پر ڈال دینا

چاہئے یا جسم پر کافور مل دینا چاہئے۔ کافور کے علاوہ خوشبو کا استعمال بھی جائز ہے۔

(٤٣٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُفِّنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِيْ ثَلاَثَةِ أَثْوَابٍ بِيْضٍ سَحُوْلِيَّةٍ مِنْ كُرْسُفٍ، لَيْسَ فِيْهَا قَمِيْصٌ وَلاَ عِمَامَةٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سحولیہ کے ساختہ سوتی سفید رنگ کے تین کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا۔ جس میں قمیص اور پگڑی نہیں تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿کفن﴾ تکفین سے ماخوذ ہے ﴿ثلاثۃ اثواب﴾ یعنی تین کپڑوں میں کفن دیا گیا۔ ﴿بیض﴾ "با" کے نیچے کسرہ ہے' بیض کی جمع ہے۔ ﴿سحولیۃ﴾ "سین" اور "حا" دونوں پر ضمہ اور یہ بھی منقول ہے سین پر فتحہ اور "حا" پر ضمہ۔ سحول کی طرف منسوب ہے۔ یمن کا ایک قصبہ یا بستی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ فتحہ کی صورت میں یہ قصار (دھوبی) کی طرف منسوب ہوگا۔ کیونکہ دھوبی کپڑے کو دھو کر صاف کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سحولیہ کا معنی تقیہ (صفائی و طہارت اور پاکیزگی و نظامت) کے ہوں گے۔ ﴿کرسف﴾ کاف پر ضمہ "را" ساکن اور سین پر ضمہ یعنی کپاس۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت مرد ہو تو اسے تین کپڑوں میں کفن دینا چاہئے۔ ان کپڑوں میں نہ تو قمیص ہو اور نہ ہی پگڑی اور کفن میں سوتی کپڑا بہتر ہے۔ تین کپڑوں سے مراد جمہور کے نزدیک تین بڑی چادریں ہیں اور بعض کے ہاں اس سے مراد کفنی' تہہ بند اور بڑی چادر ہے۔

(٤٣٨) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: لَمَّا تُوُفِّيَ عَبْدُ اللهِ بْنُ أُبَيٍّ جَاءَ ابْنُهُ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَالَ: أَعْطِنِيْ قَمِيْصَكَ أُكَفِّنْهُ فِيْهِ، فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ عبداللہ بن ابی جب فوت ہوا تو اس کا بیٹا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا آپؐ اپنی قمیص عنایت فرما دیں کہ میں اس میں اسے کفن دے دوں۔ آپؐ نے اپنی قمیص اتار کر عنایت فرما دی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فاعطاہ﴾ اپنی قمیص عطا فرما دی۔ بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل تدفین سے پہلے ہوا ہے۔ لیکن بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اسے قبر میں داخل کر دیا گیا تھا۔ آپؐ نے اسے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ اسے باہر نکالا گیا۔ پھر اسے اپنی قمیص پہنائی۔ ممکن ہے آپؐ نے پہلے قمیص دینے کا وعدہ فرمایا ہو' دفن کے بعد یہ وعدہ جب یاد دلایا گیا تو آپؐ نے قمیص عنایت فرما دی۔ آپؐ نے اپنی قمیص اس لئے عنایت فرمائی تھی کہ غزوۂ بدر کے اسیران کو آپؐ نے لباس دیئے تھے اور ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی قیدی ہو کر آئے تھے ان کا قد لمبا تھا کسی کی قمیص انہیں پوری نہیں آتی تھی۔ عبداللہ بن ابی نے اپنی قمیص دی تو انہیں پوری آ گئی۔ حضور ﷺ اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتے تھے اس لئے یہ قمیص اس کو پہنائی۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کو ضرورت کے وقت قبر میں داخل کرنے کے بعد باہر نکالنا جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ کو انسانوں سے محبت و شفقت کتنی تھی' اس واقعہ سے اندازہ لگا لیں۔ اپنے احباب و اصحاب کی خواہش کا کتنا پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ (بلکہ منافق کی خواہش کا بھی احترام کیا) راہنمایان و لیڈر حضرات کو بھی اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

راوی حدیث : ﴿ عبداللہ بن ابی ﴾ جاہلیت میں خزرج کا سردار تھا اور بظاہر اسلام میں داخل ہونے کے بعد منافقین کا لیڈر بنا اور رئیس المنافقین کے لقب سے مشہور تھا۔ غزوۂ احد کے موقع پر لشکر اسلام کا تہائی حصہ لے کر واپس ہو گیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ افک میں مرکزی کردار اسی کا تھا۔ سورۂ منافقین میں آیت (لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منھا الاذل) اسی کا قول ہے۔ ۹ھ میں ذی قعدہ میں فوت ہوا۔ "ابی" ہمزہ پر ضمہ اور یا پر تشدید۔ سلول اس کی ماں کا نام تھا۔

﴿ ابنہ ﴾ اس سے عبداللہ بن عبداللہ بن ابی ابن سلول مراد ہیں۔ عظیم صحابہ ؓ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تمام غزوات میں شریک رہے اور جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ ان کا رویہ اپنے باپ کے بارے میں بہت سخت تھا۔ جب عبداللہ بن ابی نے لئن رجعنا .... الخ کہا تھا تو انہوں نے اپنے باپ کی گردن اڑا دینے کی اجازت طلب کی تھی۔ جاہلیت کے دور میں ان کا نام حباب تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کا نام عبداللہ رکھا۔

(٤٣٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «البسُوا مِنْ ثِيَابِكُمُ البيضَ فَإِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ، وَكَفِّنُوا فِيهَا مَوْتَاكُمْ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "سفید لباس زیب تن کیا کرو یہ تمہارے ملبوسات میں بہترین اور عمدہ لباس ہے اور اپنے مرنے والوں کو بھی اس میں کفن دیا کرو۔" (نسائی کے علاوہ اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سفید لباس آنحضور ﷺ کا پسندیدہ و محبوب لباس تھا۔ گو آپؐ نے کبھی کبھی رنگ دار لباس بھی زیب تن فرمایا ہے۔ مرنے والوں کو بھی سفید کفن ہی دینا چاہئے۔ بامر مجبوری دوسرے رنگ کا کپڑا بھی کفن میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(٤٤٠) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا كَفَّنَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيُحْسِنْ كَفَنَهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جب کوئی اپنے بھائی کو کفن دے تو اسے اچھا کفن دینا چاہئے۔" (مسلم)

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اچھا و عمدہ کفن

دینے کا مطلب یہ ہے کہ کفن کا کپڑا صاف ستھرا اور عمدہ ہونا چاہئے اور وہ اس قدر ہو کہ میت کے جسم کو اچھی طرح ڈھانپ لے۔ اچھے کفن سے مراد یہ نہیں کہ وہ قیمتی ہو۔ قیمتی کفن کی ممانعت آئندہ آرہی ہے۔

(٤٤١) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلَى أُحُدٍ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ يَقُولُ: «أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخْذاً لِلْقُرْآنِ»؟ فَيُقَدِّمُهُ فِي اللَّحْدِ، وَلَمْ يُغَسَّلُوا، وَلَمْ يُصَلَّ عَلَيْهِمْ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

اور انہی (حضرت جابر رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے کہ نبی ﷺ شہداء احد کے دو دو آدمیوں کو ایک لباس میں جمع کرتے تھے پھر فرمایا "ان میں سے قرآن کس کو زیادہ یاد تھا۔ جسے زیادہ یاد ہوتا' اسے لحد میں پہلے اتارتے۔ نہ تو ان شہداء کو غسل دیا گیا اور نہ ہی ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ قتلی ﴾ قتیل کی جمع ہے۔ معنی مقتول کے ہی ہیں۔ ﴿ احد ﴾ "ھمزہ" اور "حا" دونوں پر ضمہ ہے۔ اضافت کی وجہ سے مجرور ہے۔ مدینہ کے شمال میں مشہور و معروف پہاڑ کا نام ہے۔ غزوۂ احد اسی پہاڑ کے پاس لڑا گیا۔ جو تاریخ اسلام میں معروف ہے۔ یہ غزوۂ ۳ھ میں شوال کے مہینہ میں ہوا تھا جس میں ستر صحابہ کرام ؓ نے جام شہادت نوش کیا اور نبی کریم ﷺ بھی زخمی ہوئے۔ ﴿ ایھم اکثر اخذا للقران ﴾ جسے قرآن زیادہ ازبر ہو۔ ﴿ فیقدمہ ﴾ تقدیم سے ماخوذ ہے یعنی اسے آگے رکھا جائے۔ ﴿ اللحد ﴾ میت کو قبر میں رکھنے کیلئے قبر کے پہلو میں جو شگاف رکھا جاتا ہے اسے لحد کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) ضرورت کے وقت ایک کفن میں دو آدمیوں کو کفنانا درست ہے۔ (۲) دو یا اس سے زیادہ میتوں کو ایک ہی قبر میں دفن کرنا بھی جائز ہے البتہ ان میں صاحب قرآن کو پہلے داخل کیا جانا چاہئے۔ (۳) شہداء فی سبیل اللہ کو غسل نہیں دیا جاتا۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے شہداء احد کے بارے میں فرمایا کہ "ان کو غسل مت دو۔ ان کا ہر ایک زخم قیامت کے روز مشک کی سی خوشبو دے رہا ہوگا۔" (۴) شہداء کا جنازہ بھی ضروری نہیں۔ جن روایات میں شہداء احد کی نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر ستر تکبیریں کہنے کا ذکر ہے' امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ روایات صحیح نہیں۔ صحیح بخاری میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے آٹھ سال بعد شہدائے احد کا جنازہ پڑھا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ان کیلئے دعائے مغفرت ہے۔ ورنہ شہید کی نمازہ جنازہ کے قائلین مدت دراز کے بعد قبر پر جنازہ پڑھنے کے قائل کیوں نہیں؟

(٤٤٢) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «لاَ تَغَالُوا فِي الكَفَنِ، فَإِنَّهُ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ سے فرماتے سنا کہ (بہت) قیمتی کفن نہ دیا کرو۔ وہ تو بہت جلد بوسیدہ ہو جاتا ہے۔ (ابوداؤد)

يُسْلَبُ سَرِيعاً». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

لغوی تشریح: ﴿ لا تغالوا ﴾ مغالاۃ سے ماخوذ ہے یا تغالی سے۔ اس صورت میں ایک "تا" محذوف ہوگا۔ اس کے معنی ہیں "بہت قیمتی" ﴿ یسلب ﴾ صیغۂ مجہول۔ بوسیدہ ہونے سے کنایہ ہے۔

حاصل کلام: بہت قیمتی کفن کی میت کو ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ دیر یا سویر بوسیدہ ہو جانا ہے۔ یہ روایت سنداً کمزور ہے مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا وفات کے وقت فرمان اس کا مؤید ہے کہ میری چادروں کو دھو کر مجھے انہی میں کفن دینا۔ زندہ آدمی نئے لباس کا میت سے زیادہ حقدار ہوتا ہے۔ (بخاری)

(٤٤٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهَا: «لَوْ مُتِّ قَبْلِي لَغَسَّلْتُكِ»، اَلْحَدِيْثُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے انہیں فرمایا کہ "اگر تو مجھ سے پہلے فوت ہو جائے تو میں تمہیں غسل دوں گا۔" (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شوہر اپنی اہلیہ کو غسل دے سکتا ہے۔ جمہور علماء اس کے قائل ہیں کہ خاوند اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے کی تردید کرتا ہے۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی اہلیہ (رسول اللہ ﷺ کی لخت جگر) کو خود اپنے ہاتھوں سے غسل دیا اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خود غسل دیا۔ جس سے ثابت ہوا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو غسل دے سکتے ہیں اور یہی بات راجح ہے۔

(٤٤٤) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَوْصَتْ أَنْ يُغَسِّلَهَا عَلِيٌّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خود یہ وصیت کی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود ان کو غسل دیں۔ (سنن دارقطنی)

حاصل کلام: وصیت کا پورا کرنا اسلام میں نہایت ضروری ہے۔ اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا۔ وصیت بھی پوری ہوگئی اور خاوند کا اپنی بیوی کو غسل دینا بھی ثابت ہوگیا۔

راوی حدیث: ﴿ فاطمہ بنت النبی رضی اللہ عنہا ﴾ نبی ﷺ کی سب سے چھوٹی لخت جگر تھیں۔ اس امت کی خواتین کی سردار۔ ۲ھ رمضان المبارک میں حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لیا۔ رخصتی کے وقت ان کی عمر پندرہ سال پانچ ماہ تھی۔ ۱۱ھ رمضان المبارک میں نبی ﷺ

کے چھ ماہ بعد مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

(٤٤٥) وَعَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِيْ قِصَّةِ الغَامِدِيَّةِ، الَّتِيْ أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِرَجْمِهَا فِي الزِّنَا - قَالَ: ثُمَّ أَمَرَ بِهَا، فَصُلِّي عَلَيْهَا وَدُفِنَتْ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے غامدیہ کے قصہ میں مروی ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے ارتکاب زنا کی پاداش میں رجم و سنگساری کا حکم دیا تھا کہ آپؐ نے اس کی نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم دیا پھر خود اس کی جنازہ پڑھی اور اسے دفن کیا گیا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ في قصة الغامدية ﴾ غامدیہ غامد کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے غامدیہ کہلائی۔ جہینہ کی ایک شاخ تھی۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ اس خاتون نے نبی ﷺ کے روبرو خود اس کا اعتراف کیا کہ وہ زنا سے حاملہ ہے۔ لہٰذا نبی ﷺ نے بچہ کا دودھ پلائی کا زمانہ گزار کر دودھ چھڑانے کے بعد رجم کا فیصلہ فرمایا اور حکم دیا کہ اسے سنگسار کر دیا جائے۔ رجم کہتے ہیں مجرم کو پتھروں سے مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جسے شرعی حد لگی ہو اور وہ جاں بحق ہو جائے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

حاصل کلام: صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ آنجناب ﷺ نے بذات خود غامدیہ کی نماز جنازہ ادا فرمائی تھی۔ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والے مثلاً خود کشی کرنے والا زنا کرنے والد وغیرہ کے بارے میں قاضی عیاض نے کہا ہے کہ علماء کے نزدیک ان کا جنازہ پڑھا جائے گا۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام اور مفتی کو فاسق کا جنازہ پڑھانے سے گریز کرنا چاہئے' تاکہ فساق کو اس سے عبرت حاصل ہو۔

(٤٤٦) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِرَجُلٍ قَتَلَ نَفْسَهُ بِمَشَاقِصَ، فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی لایا گیا جس نے تیر سے خودکشی کی تھی۔ آپؐ نے اس کی نماز نہ پڑھی۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اتى ﴾ صیغۂ مجہول لایا گیا ﴿ بمشا قص ﴾ مشقص کی جمع۔ مشقص کے میم کے نیچے کسرہ ہے۔ چوڑا نیزہ' ﴿ فلم يصل عليه ﴾ اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی۔ یعنی بطور عبرت اور اس جیسا فعل کرنے والوں کو خوف زدہ کرنے اور ڈرانے' دھمکانے کیلئے آپؐ نے نماز جنازہ نہ پڑھی۔

حاصل کلام: خود کشی کرنے والے کی نمازہ جنازہ میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور ایک قول یہ ہے کہ قوم کے معزز و فضلاء تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھیں گے۔ البتہ عام لوگ پڑھیں گے کیونکہ نسائی میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "میں اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔" یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے نماز جنازہ پڑھی تھی۔ جیسے ابتداء میں آپؐ مقروض کا جنازہ

نہیں پڑھتے تھے البتہ صحابہؓ کو فرما دیتے تھے کہ تم جنازہ پڑھو۔

(٤٤٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تُعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ المَرْأَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَقُمُّ المَسْجِدَ - قَالَ: فَسَأَلَ عَنْهَا النَّبِيُّ ﷺ، فَقَالُوا: مَاتَتْ، فَقَالَ: «أَفَلاَ كُنْتُمْ آذَنْتُمُونِيْ»؟ - فَكَأَنَّهُمْ صَغَّرُوا أَمْرَهَا - فَقَالَ: «دُلُّوْنِيْ عَلَى قَبْرِهَا»، فَدَلُّوْهُ، فَصَلَّى عَلَيْهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس عورت کے بارے میں جو مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی' روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اس کے متعلق صحابہ کرامؓ سے دریافت فرمایا تو صحابہ کرامؓ نے جواب دیا کہ وہ فوت ہو چکی ہے۔ آپؐ نے فرمایا "تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟ گویا انہوں نے اس کے معاملۂ وفات کو معمولی خیال کیا۔ آپؐ نے فرمایا مجھے اس کی قبر کا راستہ بتاؤ۔" انہوں نے آپ کو اس کی قبر کر راستہ بتا دیا۔ آپؐ نے وہاں جا کر قبر پر نماز جنازہ پڑھی۔ (بخاری و مسلم)

وَزَادَ مُسْلِمٌ: ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ هَذِهِ القُبُوْرَ مَمْلُوْءَةٌ ظُلْمَةً عَلَى أَهْلِهَا، وَإِنَّ اللَّهَ يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلاَتِيْ عَلَيْهِمْ».

اور مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے پھر آپؐ نے فرمایا "یہ قبریں اہل قبور کیلئے اندھیروں سے بھری ہوئی ہیں اور میری نماز سے ان کی قبروں میں روشنی ہو جاتی ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿ تقم ﴾ قاف پر ضمہ اور میم پر تشدید یعنی جھاڑو دیا کرتی تھی۔ لکڑیوں' کپڑے کے چیتھڑوں کے ذریعہ کوڑا کرکٹ اور غبار اور بھوسا وغیرہ نکال باہر کرتی تھی۔ یہ خاتون سیاہ فام تھی اور اس کا نام ام محجن تھا۔ ﴿ آذنتمونی ﴾ اس کی وفات کی مجھے اطلاع دیتے کہ میں بھی اس کی نماز جنازہ پڑھتا۔ ﴿ صغروا ﴾ نبی ﷺ کی عظمت کے پہلو کے اعتبار سے انہوں نے اس کی وفات کو معمولی اور حقیر سمجھا۔ ﴿ دلونی ﴾ دال پر ضمہ۔ دلالت سے امر کا صیغہ ہے۔ ﴿ فدلوہ ﴾ دال پر فتحہ اور لام پر ضمہ دلالت سے ماضی کا صیغہ ہے۔ ﴿ ظلمۃ ﴾ منصوب ہے تمییز واقع ہونے کی بنا پر۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) دفن کرنے کے بعد اس کی قبر پر بھی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ گو تدفین سے پہلے بھی اس پر نماز جنازہ پڑھی جا چکی ہو۔ حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ بھی آپؐ نے ایک ماہ بعد ان کی قبر پر پڑھی تھی کیونکہ ان کی وفات کے وقت آپؐ مکہ مکرمہ میں تھے۔ (۲) مرنے والے کی قبر وہی ہے جہاں اسے دفن کیا ہو۔ انہی قبروں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان میں تاریکی ہی تاریکی ہے روشنی نام کی کوئی چیز نہیں۔۔ (۳) مسجد کی صفائی کرنے والے کا مرتبہ اور مقام بہت بلند ہے۔ (۴) مسجد کی صفائی مسلمان خاتون بھی کر سکتی ہے۔ (۵) مسجد کو صاف ستھرا اور پاک رکھنا

ضروری ہے۔ صفائی، جھاڑو سے بھی کی جا سکتی ہے اور کپڑے سے بھی۔ (٦) نبی ﷺ کی غریبوں سے محبت کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ آپؐ کو اپنے کارکن مرد و عورت دونوں سے کس قدر تعلق اور لگاؤ تھا۔

(٤٤٨) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَنْهَى عَنِ النَّعْيِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ موت کے لئے کھلے عام منادی سے منع فرمایا کرتے تھے۔ (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿النعی﴾ موت کی اطلاع دینا۔ مجرد اطلاع دینا۔ مجرد اطلاع تو ممنوع نہیں ہے بلکہ جاہلیت کے دور کے طریقے سے منادی کرنا ممنوع ہے۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ اس منادی میں نوحہ ہوتا اور مرنے والے کے افعال حمیدہ بیان کئے جاتے تھے۔

(٤٤٩) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَعَى النَّجَاشِيَّ فِي الْيَوْمِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ، وَخَرَجَ بِهِمْ إِلَى الْمُصَلَّى، فَصَفَّ بِهِمْ، وَكَبَّرَ عَلَيْهِ أَرْبَعاً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے نجاشی کی خبر وفات اسی روز دی جس روز وہ فوت ہوا تھا۔ آپؐ صحابہ کرامؓ کو لے کر جنازگاہ کی طرف تشریف لے گئے۔ صف بندی کروائی اور اس پر چار تکبیریں کہیں۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے کسی کی موت کی اطلاع دینا ثابت ہو رہا ہے اور نماز غائبانہ بھی ثابت ہو رہی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں۔ مگر احناف اور مالکی علماء اسے آپؐ کی خصوصیت پر محمول کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ خطابی رحمہ اللہ وغیرہ کا خیال ہے کہ اگر کسی نے جنازہ نہ پڑھی ہو تو غائبانہ اس کی نماز جنازہ پڑھنی چاہئے۔ یہ بات گو وزنی ہے مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ نجاشی پر حبشہ میں نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی تھی۔

راوی حدیث: ﴿نجاشی رضی اللہ عنہ﴾ نون پر فتحہ۔ حبشہ کے بادشاہ کا لقب۔ جیسا کہ روم کے بادشاہ کو قیصر اور ایران کے بادشاہ کو کسریٰ کہتے تھے۔ نجاشی کا اصل نام اصحمہ بن ابجر رضی اللہ عنہ تھا۔ کفار مکہ کے فتنہ سے اپنے دین کو بچانے کیلئے مسلمانوں نے اسی بادشاہ کے دور میں حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی۔ نبی ﷺ نے ٦ھ کے آخر میں یا محرم ٧ھ میں عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کے ذریعہ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس نے آپؐ کے مکتوب گرامی کو بوسہ دیا اور اپنی آنکھوں سے بھی لگایا اور اپنے تخت شاہی سے نیچے اتر آیا اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور نبی ﷺ کو یہ ساری صورتحال تحریر کر کے بھجوا دی۔ غزوۂ تبوک ٩ھ کے بعد ماہ رجب میں وفات پائی۔ پھر نبی ﷺ نے اس کے نائب کو بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔

(٤٥٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «مَا مِنْ رَجُلٍ مُسْلِمٍ يَمُوتُ، فَيَقُومُ عَلَى جَنَازَتِهِ أَرْبَعُونَ رَجُلاً، لاَ يُشْرِكُونَ بِاللهِ شَيْئاً، إِلاَّ شَفَّعَهُمُ اللَّهُ فِيهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ ”کوئی مسلمان نہیں مرتا کہ اس کے جنازے میں ایسے چالیس آدمی شریک ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ مگر اللہ تعالیٰ اس مرنے والے کے حق میں ان کی شفاعت قبول فرما لیتا ہے۔“ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے کثرت جنازہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اس حدیث میں چالیس موحد لوگوں کی شفاعت کا ذکر ہے کہ بعض دوسری احادیث میں سو کی تعداد بھی ہے اور بعض میں تین صفوں کا ذکر بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائلین کے جواب میں موقع محل کے اعتبار سے آپؐ نے تعداد کا ذکر فرمایا دیا۔

(٤٥١) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: صَلَّيْتُ وَرَاءَ النَّبِيِّ ﷺ عَلَى امْرَأَةٍ مَاتَتْ فِي نِفَاسِهَا، فَقَامَ وَسْطَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی ﷺ کے پیچھے ایک ایسی عورت کی نماز جنازہ پڑھی جو حالت نفاس میں فوت ہوئی تھی۔ آپؐ اس کے درمیان میں کھڑے ہوئے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿في نفاسها﴾ بچے کی پیدائش کے ایام میں۔ یہ خاتون ام کعب انصاریہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت اگر عورت ہو تو امام میت کے درمیان میں کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھائے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مسند امام احمدؒ ابوداوٗد' ترمذی وغیرہ میں ہے کہ میت اگر مرد ہو تو امام کو اس کے سر کے برابر کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھانی چاہئے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی ایک قول یہی منقول ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔ اس کے برعکس علمائے احناف عموماً مرد و عورت کے دل کے برابر کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھاتے ہیں۔ مگر اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں بلکہ نص صریح کے مقابلہ میں محض قیاس پر عمل کرتے ہیں کہ دل منبہ ایمان ہے اس لئے دل کے برابر کھڑا ہونا چاہئے۔ مگر یہ حقیقتاً حدیث کے خلاف ہے۔

(٤٥٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: وَاللهِ لَقَدْ صَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى ابْنَيْ بَيْضَاءَ فِي المَسْجِدِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے بیضاء کے دونوں بیٹوں کی نماز جنازہ مسجد میں ادا فرمائی۔ (مسلم)

حاصل کلام: مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا نبی ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ دونوں مسجد میں نماز جنازہ کو مکروہ سمجھتے ہیں حالانکہ کوئی شرعی و نقلی دلیل ان کے پاس نہیں۔ بلکہ ابن ابی شیبہ میں ہے کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جنازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد ہی میں پڑھایا تھا۔ نیز مسند سعید منصور میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفۂ راشد دوم کا جنازہ بھی حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے مسجد ہی میں پڑھایا تھا اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا جنازہ مسجد ہی میں پڑھا تھا۔ اگر ایسا کرنا ناجائز و مکروہ ہوتا تو خلفاء راشدین اس پر عمل نہ کرتے۔ نبی ﷺ کے اپنے عمل سے اور صحابہؓ کے اس پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے بغیر کسی قسم کی کراہت کے مسجد میں جنازہ پڑھا جا سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿بیضاء﴾ سھل اور سھیل کی والدہ کا لقب ہے۔ ان کا نام دعد بنت جحدم فھریہ ہے اور ان کے خاوند کا نام وھب بن ربیعہ قرشی ہے۔ سھل تو ان لوگوں میں سے تھا جس نے قریش کے اس صحیفہ کو پاش پاش کیا تھا جس میں قریش نے بنو ہاشم اور مسلمانوں سے مقاطعہ کی قرارداد کی تھی۔ ایک قول کے مطابق انہوں نے اپنے اسلام کے قبول کا اظہار مکہ ہی میں کر دیا تھا اور ایک قول کے مطابق انہوں نے اپنے اسلام لانے کو چھپائے رکھا۔ اسی حالت میں بدر میں حاضر ہوئے۔ مسلمانوں نے اسے بھی قیدی بنا لیا مگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے شہادت دی کہ میں نے ان کو مکہ میں نماز پڑھتے دیکھا ہے تو ان کی شہادت پر آزادی دے دی گئی۔ انہوں نے مدینہ میں وفات پائی۔ رہے سھیل تو وہ قدیم الاسلام تھے۔ حبشہ کی ہجرت اور ہجرت مدینہ دونوں میں شریک رہے ہیں۔ بدر اور باقی تمام غزوات میں شامل رہے ہیں۔ غزوۂ تبوک ۹ھ کے بعد مدینہ میں وفات پائی۔ بیضاء کے تین بیٹے مشہور تھے۔ دو تو یہ تھے اور تیسرا صفوان تھا۔ غزوۂ بدر میں قتل ہو کر جام شہادت نوش کیا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کے کافی عرصہ بعد وفات پائی ہے۔

(٤٥٣) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِي لَيْلَى قَالَ: كَانَ زَيْدُ بْنُ أَرْقَمَ يُكَبِّرُ عَلَى جَنَائِزِنَا أَرْبَعاً، وَأَنَّهُ كَبَّرَ عَلَى جَنَازَةٍ خَمْساً، فَسَأَلْتُهُ، فَقَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُكَبِّرُهَا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَالأَرْبَعَةُ.

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے کہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں کہتے تھے مگر (خلاف معمول) ایک مرتبہ انہوں نے پانچ تکبیریں کہیں تو میں نے ان سے دریافت کیا انہوں نے جواب دیا کہ نبی ﷺ بھی پانچ تکبیریں کہتے تھے۔ (اسے مسلم اور چاروں (ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں چار سے زیادہ تکبیریں بھی جائز ہیں۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے پانچ' چھ' سات اور آٹھ تکبیریں بھی منقول ہیں۔ مگر اکثر روایات میں چار

تکبیروں کا ذکر ہے۔ بیہقی وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے چار تکبیریں کہنے کا حکم فرمایا۔ بعض نے اسے اجماع قرار دیا ہے مگر یہ درست نہیں جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ سے چار سے زائد تکبیریں بھی ثابت ہیں۔ چوتھی تکبیر کے بعد کی تکبیرات میں میت کیلئے دعا ہوتی ہے۔ تکبیرات جنازہ میں رفع الیدین صحابہ سے ثابت ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کے قائل ہیں بلکہ بعض علمائے احناف کا بھی اس پر عمل ہے۔

راوی حدیث : ﴿ ابن ابی لیلی ﴾ انصاری مدنی ہیں۔ پھر کوفہ میں منتقل ہونے کی وجہ سے کوفی کہلائے۔ کبار تابعین میں سے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے سماع ثابت ہے۔ ان کی کنیت ابوعیسیٰ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اختتام میں ابھی چھ سال باقی تھے۔ جب ان کی پیدائش ہوئی۔ ۸۶ھ میں معرکۂ جماجم میں فوت ہوئے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ نہر بصرہ میں ڈوب کر جاں بحق ہوئے۔

(٤٥٤) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ كَبَّرَ عَلَى سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ سِتّاً، وَقَالَ: إِنَّهُ بَدْرِيٌّ. رَوَاهُ سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ. وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ میں چھ تکبیریں کہیں اور فرمایا کہ وہ بدری تھے۔ (اسے سعید بن منصور نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے۔)

لغوی تشریح : ﴿ بدری ﴾ بدری ہیں سے مراد ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ بدری ہونے کا شرف و بزرگی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے چھ تکبیریں کہیں کہ اس طرح اس کیلئے زیادہ دعا مانگی جا سکے۔

حاصل کلام : اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ چار سے زائد تکبیریں کسی کی بزرگی اور شرف کا لحاظ رکھتے ہوئے کہی جا سکتی ہیں۔

راوی حدیث : ﴿ سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ ﴾ حنیف تصغیر ہے حنیف کی۔ انصاری اوسی مدنی۔ بدر اور باقی غزوات و مشاہد میں حاضر تھے۔ غزوۂ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بصرہ پر عامل مقرر کیا اور صفین میں بھی ان کے ساتھ تھے۔ ہجرت مدینہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے مابین مؤاخاۃ ہوئی۔ ۳۸ھ میں وفات پائی۔

(٤٥٥) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُكَبِّرُ عَلَى جَنَائِزِنَا أَرْبَعاً، وَيَقْرَأُ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فِي التَّكْبِيرَةِ الْأُولَى. رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں کہا کرتے تھے اور پہلی تکبیر میں سورۂ فاتحہ (بھی) پڑھتے تھے۔ (اسے شافعی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام : اس سے اور آئندہ آنے والی روایت دونوں سے ثابت ہوا کہ نماز جنازہ کی پہلی تکبیر میں سورۂ فاتحہ پڑھنا مسنون ہے۔ اب یہ کہنا کہ قراءت کی نیت سے نہ پڑھے بلکہ صرف دعا کی نیت سے

پڑھے۔ محض ایسی تاویل ہے جس کی پشت پر کوئی شرعی دلیل نہیں۔ نسائی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ عصر کا پڑھنا بھی منقول ہے۔ اس سورۂ میں تو دعا کا کوئی اشارہ اور لفظ تک نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو سورۂ فاتحہ کا نماز جنازہ میں پڑھنا واجب ہے۔ اور بعض حضرات اس کی مشروعیت کے قائل نہیں۔ مگر اس کی عدم مشروعیت پر کوئی صحیح دلیل نہیں۔

(٤٥٦) وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عَبْدِاللهِ بْنِ عَوْفٍ، قَالَ: صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ عَلَى جَنَازَةٍ، فَقَرَأَ فَاتِحَةَ الكِتَابِ ، فَقَالَ لِتَعْلَمُوا أَنَّهَا سُنَّةٌ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی۔ انہوں نے اس میں سورۂ فاتحہ پڑھی اور فرمایا (میں نے اس لئے سورۂ فاتحہ پڑھی ہے) تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لتعلموا انها سنة﴾ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ یہ طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ ہے۔ یہاں سنت سے وہ سنت مراد نہیں جو فرض کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ یہ فقہاء کرام کی جدید اصطلاح ہے۔ لہٰذا یہ اس کے وجوب کے منافی نہیں۔

حاصل کلام: ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۂ فاتحہ بلند آواز سے پڑھی اور وجہ بھی بیان کر دی کہ تمہیں بتانے کیلئے کہ یہ مسنون ہے۔ گویا نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ اونچی آواز سے پڑھنا بھی جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿طلحه بن عبدالله بن عوف﴾ عبدالرحمٰن بن عوف مشہور و معروف صحابی کے بھائی کے بیٹے تھے۔ طلحہ ندی کے لقب سے مشہور تھے۔ ثقہ اور بڑے پایہ کے فقیہہ تھے۔ اوساط تابعین میں شمار کئے گئے ہیں۔ ۹۷ھ میں ۷۲ برس کی عمر پا کر فوت ہوئے۔

(٤٥٧) وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى جَنَازَةٍ، فَحَفِظْتُ مِنْ دُعَائِهِ «اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُ، وَارْحَمْهُ، وَعَافِهِ، وَاعْفُ عَنْهُ، وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ، وَوَسِّعْ مَدْخَلَهُ، وَاغْسِلْهُ بِالمَاءِ، وَالثَّلْجِ ، وَالبَرَدِ. وَنَقِّهِ مِنَ الخَطَايَا، كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ، وَأَبْدِلْهُ دَاراً خَيْراً مِّنْ دَارِهِ، وَأَهْلاً خَيْراً مِنْ أَهْلِهِ، وَأَدْخِلْهُ

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پر نماز پڑھائی۔ میں نے آپؐ کی دعا میں سے اتنا حصہ یاد کر لیا۔ "اے اللہ! اس کی مغفرت فرما دے، اس پر رحم فرما، اسے عافیت و آرام سے رکھ۔ اس سے درگزر فرما۔ اس کی مہمان نوازی اچھی فرما۔ اس کی قبر کشادہ و فراخ کر دے، اسے پانی، برف اور ژالوں سے دھو دے (بالکل صاف کر دے) اسے گناہوں سے ایسا صاف کر دے جیسا کہ سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے اور اسے اس دنیاوی گھر سے بہتر اور عمدہ گھر اور

الجنّة، وقِهِ فِتْنَةَ القَبْرِ، وَعَذَابَ النَّارِ» . رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اہل و عیال سے بہتر اہل و عیال عطا فرما' اسے جنت میں داخل فرما' اسے قبر کے فتنہ و آزمائش اور عذاب دوزخ سے محفوظ رکھ۔" (مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ نزلہ ﴾ "نون" اور "زا" دونوں پر ضمہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ "زاء" ساکن ہو۔ خورد و نوش کی مہمان کے سامنے پیش کی جانے والی کوئی چیز اور یہاں اجر و ثواب مراد ہے۔ ﴿ وسع ﴾ توسیع باب تفعیل سے۔ کشادہ و وسیع کر۔ ﴿ مدخلہ ﴾ میم پر ضمہ' جائے داخلہ۔ مراد یہاں قبر ہے۔ ﴿ البرد ﴾ "با" اور "را" دونوں پر فتحہ اولے مراد ہیں۔ ﴿ نقہ ﴾ "قاف" پر تشدید۔ تنقیۃ سے ماخوذ ہے' دعا ہے کہ پاک کر دے صاف ستھرا کر دے۔ ﴿ الدنس ﴾ دال اور نون دونوں پر فتحہ میل کچیل۔ ﴿ ابدلہ ﴾ ابدال سے ماخوذ ہے (باب افعال) بدل دے۔ اس کے عوض دے ﴿ وقہ ﴾ اس میں واؤ عطف کی ہے۔ "قاف" کے نیچے کسرہ ہے۔ وقایۃ سے ماخوذ ہے۔ دعا ہے اور "ھاء" ضمیر میت کی طرف راجع ہے۔ بچا اسے' حفاظت فرما اس کی' محفوظ رکھ اسے۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے یہ دعا بھی بلند آواز سے پڑھی تھی۔ تبھی تو حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے اسے یاد کر لیا تھا۔ ابوداؤد وغیرہ میں تو "سمعت" کا لفظ صراحتاً منقول ہے کہ میں نے یہ دعا آپؐ سے سنی اور یہ بھی امکان ہے کہ راوی نے آپؐ سے بعد میں پوچھ کر یاد کر لیا ہو۔ اکثر فقہاء کی رائے یہی ہے کہ دعا آہستہ مانگی جائے اور بعض بآواز بلند کے بھی قائل ہیں۔ بعض نے یہ بھی رائے دی ہے کہ رات کے اوقات میں بآواز بلند اور دن میں آہستہ آواز سے مانگنی چاہئے۔ دعا میں چونکہ افضل یہ ہے کہ آہستہ مانگی جائے اس لئے اکثر فقہاء نے آہستہ پڑھنے کو راجح قرار دیا ہے اور اکثر احادیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرح بطور تعلیم اونچی آواز سے پڑھا جائے تو اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں۔

راوی حدیث : ﴿ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ ﴾ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ قبیلہ اشجع سے تعلق کی وجہ سے اشجعی کہلائے۔ غزوۂ خیبر میں پہلی مرتبہ شریک جہاد ہوئے۔ فتح مکہ کے روز قبیلہ اشجع کا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ ۷۳ھ میں فوت ہوئے۔

(٤٥٨) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا صَلَّى عَلَى جَنَازَةٍ، يَقُولُ: «اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا، وَمَيِّتِنَا، وَشَاهِدِنَا، وَغَائِبِنَا، وَصَغِيرِنَا، وَكَبِيرِنَا، وَذَكَرِنَا، وَأُنْثَانَا، اللَّهُمَّ مَنْ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی کی نماز جنازہ پڑھتے تو یہ دعا مانگتے۔ "الٰہی! ہمارے زندوں اور مردوں' ہمارے حاضر و غائب' ہمارے چھوٹوں اور بڑوں' ہمارے مردوں اور عورتوں کی مغفرت و بخشش فرما دے۔ الٰہی! ہم میں سے جسے تو زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھ اور

أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الإِسْلاَمِ، وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الإِيمَانِ، اللَّهُمَّ لاَ تَحْرِمْنَا أَجْرَهُ، وَلاَ تَفْتِنَّا بَعْدَهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالأَرْبَعَةُ.

جسے تو موت دے اسے ایمان کی موت سے سرفراز فرما۔ الٰہی! ہمیں اس کے اجر و ثواب سے محروم نہ رکھیو اور نہ ہمیں اس کے بعد گمراہ کرنا۔ (اسے مسلم اور چاروں (ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ شاھدنا ﴾ جو حاضر ہیں۔ ﴿ صغیرنا ﴾ کم عمر اور چھوٹے عمر والوں کے حق میں بلندی درجات کی دعا یا اس کی دعا کہ اللہ تعالیٰ تکلیف و مصیبت کے وقت افعال صالحہ پر ثابت قدم رکھے۔ ﴿ فاحیه ﴾ احیاء سے ماخوذ ہے۔ زندگی کی دعا۔ ﴿ لا تحرمنا ﴾ "تا" پر فتحہ اور "را" کے نیچے کسرہ۔ حرمان سے ماخوذ و مشتق ہے۔ نہ محروم رکھ ہمیں۔ ﴿ اجره ﴾ اس کی موت کی وجہ سے ہمیں جو صدمہ پہنچا ہے اس پر صبر کے اجر سے۔ ﴿ لاتفتنا ﴾ دوسرے "تا" کے نیچے کسرہ اور نون جمع پر تشدید۔ باب ضرب یضرب سے اور فعل کے نون کو نون متکلم میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ یعنی ہمیں اس کی موت کے بعد فتنہ و آزمائش میں مبتلا نہ کرنا بلکہ اس کی موت کو ہمارے لئے مقام عبرت بنا دے۔ یہ حدیث مسلم میں نہیں ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ کسی کاتب کی کرم فرمائی ہے' مصنف کی نہیں۔

(٤٥٩) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى المَيِّتِ فَأَخْلِصُوا لَهُ الدُّعَاءَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم کسی میت کی نماز جنازہ پڑھو تو خوب خلوص دل سے اس کیلئے دعا کرو۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: نماز جنازہ پڑھنے والے کیلئے دراصل مرنے والے کیلئے رب کائنات کے حضور اس کی بخشش کی سفارش کرتے ہیں۔ ہر سفارشی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی سفارش قبول ہو اس لئے سفارش کرنے والا بڑی آہ و زاری اور درد دل سے سفارش کرتا ہے۔ یہ میت کا آخری وقت ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کیلئے جتنے خلوص قلب سے دعا کی جا سکتی ہو کرنی چاہئے۔ لیکن بعض لوگ تو صرف رسم ہی پوری کرتے ہیں۔ خلوص نام کی چیز بہت ہی کم نظر آتی ہے اور دو تین منٹ میں جنازے کا جھٹکا کر کے رکھ دیتے ہیں۔

(٤٦٠) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «أَسْرِعُوا بِالجَنَازَةِ، فَإِنْ تَكُ صَالِحَةً، فَخَيْرٌ تُقَدِّمُونَهَا إِلَيْهِ، وَإِنْ تَكُ سِوَى ذَلِكَ، فَشَرٌّ تَضَعُونَهُ عَنْ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جنازہ لے جانے میں جلدی کیا کرو۔ اس لئے کہ اگر مرنے والا صالح اور نیک آدمی تھا تو اس کیلئے بہتر ہوگا کہ اسے بہتر جگہ کی طرف جلدی لے جاؤ اور اگر دوسرا ہے (برا آدمی ہے) تو اپنی گردن

رِقَابِكُمْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

سے اتار کر رکھ دو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اسرعوا﴾ موت کے وقوع کے یقینی ہونے کے بعد میت کو جلدی لے جاؤ اور تجہیز و تکفین میں جلدی کرو ﴿تضعونه﴾ وضع سے ماخوذ ہے جس کے معنی اتار کر رکھ دینے کے ہیں۔ یہ حمل کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے جس کے معنی اٹھانا ہوتا ہے اور یہ کنایۃً "اپنے سے دور کر دینے کے معنی میں مستعمل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کے دفن کرنے میں بلا ضرورت تاخیر کرنا خلاف سنت ہے۔ میت کو جلدی دفن کرنے کی تاکید حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمائی تھی۔ نیز طبرانی میں سند حسن سے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کو موت آجائے تو اسے روک نہ رکھو بلکہ اسے قبر کی طرف جلدی سے لے جاؤ۔"

(٤٦١) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ شَهِدَ الجَنَازَةَ حَتَّى يُصَلِّيَ عَلَيْهَا فَلَهُ قِيرَاطٌ، وَمَنْ شَهِدَهَا حَتَّى تُدْفَنَ فَلَهُ قِيرَاطَانِ»، قِيلَ: وَمَا القِيرَاطَانِ؟ قَالَ: «مِثْلُ الجَبَلَيْنِ العَظِيمَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: «حَتَّى تُوضَعَ فِي اللَّحْدِ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص جنازہ کے ساتھ جائے یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھی جائے اسے ایک قیراط کے برابر ثواب ملے گا اور جو شخص دفن ہونے تک حاضر رہے اسے دو قیراط اجر ملے گا۔" دریافت کیا گیا کہ دو قیراط سے کیا مراد ہے؟ فرمایا "دو قیراط دو بڑے پہاڑوں کے برابر۔" (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی روایت میں ہے "میت کو قبر میں اتارے جانے تک حاضر رہے۔"

وَلِلْبُخَارِيِّ: «مَنْ تَبِعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ إِيمَاناً وَاحْتِسَاباً، وَكَانَ مَعَها حَتَّى يُصَلَّى عَلَيْهَا وَيُفْرَغَ مِنْ دَفْنِهَا، فَإِنَّهُ يَرْجِعُ بِقِيرَاطَيْنِ، كُلُّ قِيرَاطٍ مِثْلُ جَبَلِ أُحُدٍ».

اور بخاری کی روایت میں ہے "جس نے کسی مسلمان کے جنازہ میں ایمان اور حصول ثواب کی نیت سے شرکت کی اور نماز جنازہ کے اختتام تک اس کے ساتھ بھی رہا اور تدفین سے فراغت کے بعد واپس لوٹا تو وہ دو قیراط لے کر واپس لوٹا۔ ہر قیراط احد پہاڑ کی مقدار کے برابر ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿قیراط﴾ "قاف" کے نیچے کسرہ۔ نصف دانق اور دانق درہم کا چھٹا حصہ۔ قیراط سمجھ میں جلدی آجانے والا پیمانہ وزن تھا اس لئے قیراط بولا گیا ہے۔ اس زمانہ میں کام کی اجرت قیراط کی صورت میں دی جاتی تھی۔ مذکور قیراط وزن کے اعتبار سے تو بالکل معمولی اور حقیر ہے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیراط بڑا عظیم ہے اور یہی بتانا مطلوب و مقصود تھا کہ اس کو دنیاوی قیراط نہ سمجھنا بلکہ وہ پہاڑوں جتنا عظیم ہے۔ ﴿ایمانا و

احتسابا ﴾ دونوں منصوب ہیں علت کی بنا پر یا پھر حال واقع ہو رہے ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ جنازہ میں شرکت کے ساتھ طلب اجر و ثواب کی غرض ہو۔ دکھلاوا اور اہل میت کے ہاں حاضری لگوانے کی نیت نہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جنازہ کے ساتھ چلنے اور نماز جنازہ ادا کرنے کے ثواب کو تمثیل کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ مومن کی نماز جنازہ پڑھنے کا بہت بڑا ثواب ہے۔ اہل ایمان کو ترغیب دلائی گئی ہے کہ جنازہ میں شرکت کا اہتمام کریں۔ اس روایت میں لفظ "قیل" سے مراد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں جیسا کہ ابو عوانہ میں ہے کہ انہوں نے یہ سوال آپ ؐ سے کیا تھا کہ قیراط کیا ہے؟

(٤٦٢) وَعَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ، أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ وَأَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ، يَمْشُونَ أَمَامَ الجَنَازَةِ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَأَعَلَّهُ النَّسَائِيُّ وَطَائِفَةٌ بِالإِرْسَالِ.

حضرت سالم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی ﷺ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کو جنازے کے آگے چلتے دیکھا ہے۔ (اس کو پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور نسائی اور ایک گروہ نے اسے مرسل ہونے کی وجہ سے معلول کہا ہے)

حاصل کلام: جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جانے کی صورت میں آگے چلنا چاہئے یا پیچھے۔ مختلف روایات سے آپ ؐ کا عمل دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے ہر طرح ثابت ہے مگر بہتر کونسا ہے؟ اس میں ائمہ کرام کی آراء مختلف ہیں۔ جمہور علماء امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ تینوں ائمہ آگے آگے چلنے کو بہتر خیال کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور اوزاعی رحمہ اللہ پیچھے چلنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آگے پیچھے ہر سمت چلنا جائز ہے۔ کسی پر فوقیت و برتری اور ترجیح نہیں۔ چلنے والے جس طرح سہولت پائیں، اس پر عمل کریں۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ پیدل چلنے والے آگے چلیں اور سوار جنازے کے پیچھے پیچھے۔ یہ رائے سفیان ثوری اور کچھ دیگر علماء کی ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر جنازے کے ساتھ خواتین بھی ہوں تو اس صورت میں مردوں کو جنازے کے آگے چلنا بہتر ہے ورنہ پیچھے چلیں گے۔ بہرحال جس طرح کی صورت درپیش ہو چلنے والے اپنے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اسی کو اختیار کر سکتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ سالم ﴾ ان کی کنیت ابو عبداللہ یا ابو عمر ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے۔ سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب۔ سادات تابعین میں سے تھے اور مدینہ طیبہ کے فقہاءِ سبعہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ علم و فضل میں اپنے والد سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ ١٠٦ھ میں ذی القعدہ یا ذی الحجہ کے مہینے میں فوت ہوئے۔

(٤٦٣) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: نُهِينَا عَنِ اتِّبَاعِ الجَنَائِزِ، وَلَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہمیں جنازوں میں شرکت سے منع کر دیا گیا مگر یہ ممانعت ہم پر لازمی قرار نہیں دی گئی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ نهينا ﴾ صیغہ مجہول ہے مگر یہ مرفوع کے حکم میں ہے بلکہ بخاری میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا۔ ﴿ لم يعزم ﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی یہ ممانعت ہمارے لئے لازمی قرار نہیں دی گئی بلکہ یہ نفی کراہت و ناپسندیدگی کیلئے تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے خواتین کی جنازوں میں شرکت ممنوع معلوم ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ پہلے خواتین کو جنازوں میں شریک ہونے اور قبرستان میں جانے سے منع فرما دیا گیا ہو مگر جب ان میں اسلامی شعور کافی حد تک بیدار ہوگیا تو جس طرح آپؐ نے قبرستان جانے کی اجازت دے دی اسی طرح جنازہ میں شرکت کی بھی اجازت دے دی ہو۔ چنانچہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے نسائی' ابن ماجہ اور ابن ابی شیبہ میں مروی ہے کہ ایک جنازہ میں عورتیں شریک ہوئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں روکنا چاہا مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "انہیں جانے دو۔"

(٤٦٤) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا رَأَيْتُمُ الجَنَازَةَ فَقُومُوا، فَمَنْ تَبِعَهَا فَلاَ يَجْلِسْ حَتَّى تُوضَعَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم کسی جنازے کو آتے دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ۔ نیز جو شخص جنازے کے ساتھ ہو وہ جنازے کے زمین پر رکھے جانے سے پہلے نہ بیٹھے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فقوموا ﴾ امر کا صیغہ ہے مگر یہاں امر استحباب کے معنی میں ہے یا یہ حکم اب منسوخ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے آخری دو ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے قیام چھوڑ دیا تھا (حتى توضع) آدمیوں کے کندھوں سے اتار کر زمین پر رکھنے تک اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قبر میں اتارنے تک۔ دونوں کا احتمال ہے مگر پہلا قول راجح ہے۔ جنازہ کو زمین پر رکھنے سے پہلے بیٹھنے کی ممانعت بھی استحباب پر محمول ہے وجوب پر نہیں۔

حاصل کلام: موت کا عمل انسان کیلئے اضطراب اور بے چینی و بے قراری کا باعث ہوتا ہے۔ نیز میت کے ہمراہ فرشتے بھی ہوتے ہیں اس لئے ان کے احترام میں کھڑے ہونا لائق اعتبار ہے۔ مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپؐ کو علم ہوا کہ جنازہ کیلئے کھڑا ہونا یہودیوں کا طریقہ ہے تو آپؐ نے بیٹھنے اور یہودیوں کی مخالفت کا حکم فرمایا۔ اس بنا پر بعض نے کھڑے ہونے کے حکم کو منسوخ قرار دیا ہے اور بعض نے اس حکم کو محض استحباب پر محمول کیا ہے۔ اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جنازہ کو زمین پر رکھنے سے پہلے بیٹھنا نہیں چاہئے۔ نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نے ایسا کبھی نہیں دیکھا کہ نبی ﷺ کسی جنازے پر حاضر ہوئے ہوں اور جنازے کے زمین پر رکھے جانے سے پہلے ہی زمین پر بیٹھ گئے ہوں۔

(٤٦٥) وَعَنْ أَبِيْ إِسْحَاقَ، أَنَّ

حضرت ابو اسحٰق رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ عبداللہ بن

عَبْدَ اللهِ بْنَ يَزِيْدَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَدْخَلَ الْمَيِّتَ مِنْ قِبَلِ رِجْلَيِ الْقَبْرِ، وَقَالَ: هٰذَا مِنَ السُّنَّةِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ.

یزید رضی اللہ عنہ نے میت کو اس کے پاؤں کی طرف سے قبر میں اتارا اور کہا کہ سنت طریقہ یہی ہے۔ (ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿ من رجل القبر ﴾ یعنی اس جانب سے جس جانب سے میت کے پاؤں ہوتے ہیں یہ حال کا اطلاق محل پر ہے۔ یعنی حال بول کر محل مراد لیا ہے۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ میت کو قبر میں پاؤں کی جانب سے اتارنا چاہئے۔ اہل حجاز میں اسی پر عمل تھا اور اسی کو امام شافعیؒ و احمدؒ نے اختیار کیا ہے اور یہی افضل ہے کیونکہ کوئی صحیح روایت اس کے برعکس ثابت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابواسحاق ﴾ عمرو بن عبداللہ سبیعی ہمدانی کوفی۔ مشہور تابعی کثیرالروایہ۔ مگر تدلیس کرتے تھے۔ آخر عمر میں ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابھی دو سال باقی تھے کہ ان کی پیدائش ہوئی۔ ۱۲۹ھ میں فوت ہوئے۔

﴿ عبداللہ ابن یزید رضی اللہ عنہ ﴾ خطمی انصاری۔ قبیلہ اوس سے تھے۔ جس وقت صلح حدیبیہ میں حاضر ہوئے اس وقت ان کی عمر سترہ برس تھی۔ جنگ جمل و صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ کوفہ میں آئے۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے عہد میں کوفہ کے والی تھے۔ اسی دور میں کوفہ میں فوت ہوئے۔

(٤٦٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «إِذَا وَضَعْتُمْ مَوْتَاكُمْ فِي الْقُبُوْرِ، فَقُوْلُوْا: بِسْمِ اللهِ، وَعَلَى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللهِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَأَعَلَّهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِالْوَقْفِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جب اپنے مرنے والوں کو قبروں میں اتارو تو "بسم اللہ' وعلی ملہ رسول اللہ" کہو۔" (اسے احمد' ابوداؤد اور نسائی نے نکالا ہے۔ ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور دارقطنی نے اسے معلول قرار دیتے ہوئے اسے وقوف کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت کو قبر میں داخل کرتے ہوئے یہ دعا پڑھنی مسنون ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کی طرح نسائی نے اس روایت کو گو موقوف ہی قرار دیا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ اس کی تائید مستدرک کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس کی سند حسن ہے۔

(٤٦٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «كَسْرُ عَظْمِ الْمَيِّتِ كَكَسْرِهِ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کسی مردے کی ہڈی توڑنے (کا گناہ) زندہ انسان کی ہڈی توڑنے کے گناہ کی طرح ہے۔"

حَيًّا». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ عَلَى شَرْطِ مُسْلِمٍ، وَزَادَ ابْنُ مَاجَهْ مِنْ حَدِيثِ أُمِّ سَلَمَةَ: «فِي الإِثْمِ».

(اسے ابوداؤد نے مسلم کی شرط کی سند سے روایت کیا ہے) اور ابن ماجہ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی روایت میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ (گناہ میں)۔"

لغوی تشریح: ﴿ فی الاثم ﴾ گناہ میں۔ یعنی کہ مردہ کی ہڈی توڑنا گناہ کے اعتبار سے ایسا ہے جیسے کسی زندہ کی ہڈی توڑنے کا ہے۔ یہ درد اور الم و تکلیف کے پہلو سے نہیں کیونکہ زندہ کو اس سے تکلیف ہوگی جبکہ مردے کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے مسلمان خواہ وہ مردہ ہی ہو اس کی عزت و احترام کا سبق ملتا ہے۔ احترام میں زندہ اور مردہ میں کوئی خاص امتیاز نہیں رکھا۔ مگر اس دور میں سرجری نے اتنی ترقی کرلی ہے جس کا صدیوں پہلے خواب و خیال بھی نہ تھا۔ علماء کرام نے جرم کی تحقیق و تفتیش کیلئے پوسٹ مارٹم اور علاج معالجہ کیلئے چیر پھاڑ کی اجازت دی ہے۔

(٤٦٨) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: أَلْحِدُوا لِيْ لَحْداً وَانْصِبُوا عَلَيَّ اللَّبِنَ نَصْباً، كَمَا صُنِعَ بِرَسُولِ اللهِ ﷺ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میرے لئے بغلی لحد والی قبر بنانا اور مجھ پر کچی اینٹیں چننا جس طرح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا گیا۔ (مسلم)

وَلِلْبَيْهَقِيِّ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ نَحْوُهُ، وَزَادَ: وَرُفِعَ قَبْرُهُ عَنِ الأَرْضِ قَدْرَ شِبْرٍ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اور بیہقی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ آپ کی قبر زمین سے صرف ایک بالشت برابر اونچی بنائی گئی۔ (ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

وَلِمُسْلِمٍ عَنْهُ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ، أَنْ يُجَصَّصَ القَبْرُ، وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ، وَأَنْ يُبْنَى عَلَيْهِ.

اور مسلم میں جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ "قبر کو پختہ کیا جائے اور اس پر بیٹھا جائے اور اس پر عمارت تعمیر کی جائے۔"

لغوی تشریح: ﴿ الحدوا ﴾ فتح یفتح سے امر کا صیغہ۔ لحد۔ قبر کے قبلہ رخ گڑھے کو کہتے ہیں جہاں سے میت کو قبر میں اتارا جاتا ہے ﴿ وانصبوا ﴾ ضرب یضرب سے صیغہ امر ہے۔ اقیموا کے معنی میں یعنی نصب کرو' قائم کرو ﴿ اللبن ﴾ لام پر فتحہ اور "با" کے نیچے کسرہ' اینٹ جو گارے سے بنائی جاتی ہے جب اسے آگ میں پکایا جائے تو "آجر" کہتے ہیں یہ جیم پر ضمہ اور "را" پر تشدید ﴿ قدر شبر ﴾ شین پر کسرہ اور "با" ساکن۔ یہ فاصلہ ہے جو انگوٹھے کے سرسے لے کر چھنگلی کے سر تک۔ یعنی بالشت۔ ﴿ ان

یجصص القبر ﴾ تجصیص سے ماخوذ ہے اور صیغہ مجہول ہے یعنی چونا گچ اور پختہ عمارت۔ ﴿ وان یبنی علیہ ﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی قبر کو بلند اور نمایاں کرنے کی غرض سے اس پر عمارت تعمیر نہ کی جائے یا قبر پر گنبد وغیرہ جیسی عمارت نہ بنائی جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ (۱) قبر ایک بالشت سے زیادہ اونچی نہیں ہونی چاہئے۔ (۲) قبر کو بغلی بنانا آپؐ کے نزدیک پسندیدہ تھا۔ (۳) کچی اینٹیں اندر لگانی چاہئیں۔ (۴) قبر پر کسی قسم کی عمارت تعمیر کرنا اور قبر کو پختہ بنانا شرعاً منع ہے اور یہ ممانعت تحریمی ہے۔ (۵) نیز قبر کو کوئی مخصوص شکل دینا بھی درست نہیں۔ نبی ﷺ کی ابدی آرام گاہ کوہان نما تھی اور ایک بالشت سے بلند نہیں تھی اور یہی کیفیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی قبروں کی تھی۔

(٤٦٩) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى عَلَى عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُونٍ، وَأَتَى الْقَبْرَ، فَحَثَى عَلَيْهِ ثَلَاثَ حَثَيَاتٍ، وَهُوَ قَائِمٌ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھی اور ان کی قبر پر تشریف لائے اور کھڑے کھڑے تین لپ مٹی ڈالی۔ (سنن دار قطنی)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت کو قبر میں داخل کرنے کے بعد وہاں موجود آدمیوں کو تین تین مٹھیاں بھر کر مٹی کھڑے کھڑے ڈالنی چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ عثمان بن مظعون جمحی قرشی رضی اللہ عنہ ﴾ آپ اکابر صحابہؓ میں سے تھے۔ بڑے عابد و زاہد صحابیؓ تھے۔ جاہلیت ہی کے زمانہ میں انہوں نے اپنے اوپر شراب کو حرام قرار دے لیا تھا۔ ۱۳ آدمیوں کے بعد اسلام قبول کیا۔ دونوں ہجرتیں کیں۔ غزوہ بدر میں حاضر ہوئے۔ مدینہ طیبہ میں ہجرت کے تیسویں ماہ' شعبان میں وفات پائی۔ مہاجرین میں سب سے پہلے یہی فوت ہوئے اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد نبی ﷺ نے ان کو بوسہ دیا۔ جب تدفین سے فارغ ہوئے تو فرمایا وہ ہمارے بہترین پیشرو ہیں۔"

(٤٧٠) وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ، وَقَالَ: **اسْتَغْفِرُوا لِأَخِيكُمْ، وَسَلُوا لَهُ التَّثْبِيتَ، فَإِنَّهُ الْآنَ يُسْأَلُ.** رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب میت کی تدفین سے فارغ ہو جاتے تو قبر پر کھڑے ہو جاتے اور فرماتے کہ "اپنے بھائی کیلئے بخشش مانگو اور ثابت قدم رہنے کی دعا کرو کیونکہ اب اس سے باز پرس کی جائے گی۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت سے قبر میں باز پرس ہوتی ہے۔ تدفین کے بعد دعا کرنا

میت کیلئے ثابت ہے۔ مگر اس دور میں لوگوں نے سنت کو پس پشت ڈال کر نئی نئی رسمیں ایجاد کر لی ہیں اور اذانیں شروع کر دی ہیں جس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔

(٤٧١) وَعَنْ ضَمْرَةَ بْنِ حَبِيْبٍ - أَحَدِ التَّابِعِيْنَ - قَالَ: كَانُوا يَسْتَحِبُّونَ إِذَا سُوِّيَ عَلَى الْمَيِّتِ قَبْرُهُ وَانْصَرَفَ النَّاسُ عَنْهُ، أَنْ يُقَالَ عِنْدَ قَبْرِهِ: يَا فُلاَنُ! قُلْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، يَا فُلاَنُ! قُلْ: رَبِّيَ اللَّهُ، وَدِيْنِي الإِسْلاَمُ، وَنَبِيِّ مُحَمَّدٌ ﷺ. رَوَاهُ سَعِيْدُ بْنُ مَنْصُورٍ مَوْقُوفاً، وَلِلطَّبَرَانِيِّ نَحْوُهُ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي أُمَامَةَ مَرْفُوعاً مُطَوَّلاً.

حضرت ضمرہ بن حبیب رحمہ اللہ جو ایک تابعی ہیں سے مروی ہے کہ لوگ مستحب سمجھتے تھے کہ جب میت کی قبر برابر و ہموار کر دی جاتی اور لوگ جانے لگتے تو قبر کے پاس کھڑے ہو کر میت کو مخاطب ہو کر یوں کہا جائے اے فلاں (لا الہ الا اللہ) کہو۔ (اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں)۔ اس کو تین مرتبہ کہتے۔ اے فلاں! "ربی اللہ و دینی الاسلام و نبی محمد" کہو۔ (میرا رب اللہ ہے' میرا دین اسلام ہے اور محمدؐ میرے نبی ہیں)

(سعید بن منصور نے اسے موقوف بیان کیا ہے اور طبرانی نے اسی طرح کی ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی لمبی مرفوع حدیث بیان کی ہے)

لغوی تشریح : ﴿ کانوا یستحبون ﴾ پسند کرنے والوں سے یہاں صحابہ کرامؓ مراد ہیں۔ ﴿ سوی ﴾ تسویہ سے ماخوذ ہے' علامہ ابن قیم نے المنار میں کہا ہے کہ تلقین کی یہ مرفوع حدیث فن حدیث کی معرفت رکھنے والوں کے نزدیک موضوع ہونے میں ذرا بھر شک نہیں۔ اسی طرح انہوں نے "الھدیٰ" میں بھی پورے جزم اور اعتماد سے کہا ہے کہ یہ موضوع اور من گھڑت روایت ہے اور کتاب الروح میں اسے ضعیف کہا ہے۔ علامہ یمانی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس پر عمل کرنا بدعت ہے اور اس پر اکثر لوگوں کے عمل سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔

حاصل کلام : میت کو دفن کرنے کے بعد میت کو مخاطب کر کے تلقین کرنا کسی بھی صحیح یا حسن روایت سے ثابت نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ سے جب اس بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا اہل شام کے علاوہ میں نے یہ عمل کسی اور کو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

راوی حدیث : ﴿ ضمرہ بن حبیب ﴾ ان کی کنیت ابوعتبہ ہے۔ ضمرہ میں ضاد پر فتحہ اور میم ساکن۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ ضمرہ بن حبیب بن صہیب زبیدی۔ زبیدی کی "زا" پر ضمہ ہے۔ حمص کے رہنے والے تھے اس لئے حمصی کہلائے۔ ثقہ تابعی ہیں اور چوتھے طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔

(٤٧٢) وَعَنْ بُرَيْدَةَ بْنِ الْحُصَيْبِ

حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

الأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ، فَزُورُوهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. زَادَ التِّرْمِذِيُّ: «فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الآخِرَةَ». زَادَ ابْنُ مَاجَهْ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ مَسْعُودٍ: «وَتُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا».

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔ اب ان کی زیارت کرو۔" (مسلم) ترمذی نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ "قبروں کی زیارت آخرت کی یاد دلاتی ہے۔" اور ابن ماجہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ "یہ زیارت دنیا سے بے رغبت بنا دیتی ہے۔"

لغوی تشریح: فزوروھا زیارت سے امر کا صیغہ ہے۔ ممانعت کے بعد اجازت کے معنی میں ہے۔ ﴿ تذکر ﴾ تذکیر سے ماخوذ ہے یعنی یاددہانی کراتی ہے۔ ﴿ تزھد ﴾ تزھید سے ماخوذ ہے۔ یعنی دنیا سے بے رغبت و زاہد بنا دیتی ہے۔ زیارت قبور سے بس یہی مقصود و مطلوب ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قبروں کی زیارت جائز ہے۔ ابتداء میں آپؐ نے اس سے منع فرمایا تھا مگر پھر اس کی اجازت دے دی اور اس سے مقصد آخرت کی یاد اور میت کیلئے بخشش و مغفرت کی دعا کرنا ہے۔ قبروں پر نذر و نیاز اور عرس کا شریعت مطہرہ میں کوئی جواز نہیں۔

(٤٧٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ لَعَنَ زَائِرَاتِ الْقُبُورِ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کیلئے جانے والی خواتین پر لعنت فرمائی ہے۔ (اسے ترمذی نے نکالا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث خواتین کا قبور کی زیارت کیلئے جانے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ لعنت کسی حرام کام پر کی جاتی ہے حالانکہ بہت سی احادیث سے خواتین کا قبروں کی زیارت کیلئے جانا ثابت ہوتا ہے۔ ان میں تطبیق کی ایک صورت یہ ہے کہ یہ ممانعت زیارت قبور کی اجازت و رخصت سے پہلے کی ہے مگر جب اجازت و رخصت دی گئی تو اس میں مرد و عورت شامل ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ تاحال زیارت قبور کی حرمت خواتین کیلئے برقرار ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں میں صبر کی کمی ہوتی ہے اور جزع و فزع' آہ و بکا کثرت سے کرتی ہیں اور بعض علماء کا قول ہے کہ خواتین کو زیارت قبور سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ وہ عموماً حرام کام کا ارتکاب کرتی ہیں۔ مثلاً جاہلیت کے طور طریقے اختیار کرتی ہیں' روتی پیٹتی اور بین کرتی ہیں' جزع و فزع کرتی ہیں اور چیختی چلاتی ہیں' یہ امور اسلام کی تعلیم کے منافی ہیں اس لئے ان سے منع کیا گیا ہے۔ اگر زیارت قبور عبرت حاصل کرنے' اخروی یاددہانی و تذکیر کیلئے ہو تو اس میں کوئی مضائقہ و حرج نہیں۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح حدیث میں "زوارات" کا لفظ ہے کہ عورتوں کے باکثرت قبرستان جانے پر آپؐ نے لعنت فرمائی۔ عبرت کیلئے گاہے بگاہے جانا جائز ہے۔

علامہ البانی نے بھی اسی بات کو صحیح کہا ہے اور فرمایا ہے "زائرات القبور" کے الفاظ ضعیف ہیں اور صحیح "زوارات القبور" کے الفاظ ہیں جن میں عورتوں کیلئے کثرت سے قبرستان جانے کی ممانعت ہے۔ (احکام الجنائز)

(٤٧٤) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ النَّائِحَةَ وَالْمُسْتَمِعَةَ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نوحہ کرنے اور سننے والی پر لعنت فرمائی ہے۔ (ابوداؤد)

أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ.

لغوی تشریح: نائحة نیاحة سے ماخوذ ہے۔ مرنے والے کے اوصاف و شمائل کو گن گن کر بلند آواز سے بیان کرنا اور رونا اور اچھے اور عمدہ کارناموں کو بیان کر کے چیخ و پکار کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے نوحہ کرنے اور سننے کی حرمت ثابت ہوتی ہے بلکہ نبی کریم ﷺ عورتوں سے نوحہ نہ کرنے کا باقاعدہ عہد لیتے تھے۔ جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے۔

(٤٧٥) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَخَذَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ لاَ نَنُوحَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیعت کے موقع پر یہ عہد لیا تھا کہ ہم میت پر نوحہ نہ کریں گی۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ مرنے والوں پر نوحہ اور بین کرنا، چیخنا چلانا، واویلا کرنا، گریباں چاک کرنا، منہ نوچنا حرام افعال ہیں۔ غمی سے آنکھوں کا اشک بار ہونا، آنسوؤں کا بے اختیار بہہ نکلنا حرام نہیں۔ گویا آنکھوں کا فعل حرام نہیں بلکہ زبان کا فعل حرام ہے۔

(٤٧٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «الْمَيِّتُ يُعَذَّبُ فِي قَبْرِهِ بِمَا نِيحَ عَلَيْهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَهُمَا نَحْوُهُ عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مرنے والے کو اس پر نوحہ کرنے والوں کے سبب سے قبر میں عذاب دیا جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم نیز ان دونوں نے مغیرہ بن شعبہ کے واسطہ سے اسی طرح روایت بیان کی ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿الميت يعذب﴾ اس حدیث میں ایک اشکال ہے کیونکہ اس کی رو سے دوسرے کسی کے رونے کی وجہ سے مرنے والے کو عذاب ثابت ہو رہا ہے حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ولا تزر وازرة وزر اخرى (١٥/١٧) کہ "کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔" اس لئے علماء کرام نے اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے ہیں ان میں سے ایک قول ہے کہ اگر نوحہ مرنے والے کا اپنا طریقہ ہو اور زندگی میں اس نے اسے برقرار رکھا ہو پھر تو اسے عذاب ہوگا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مرنے والے کو عذاب اس صورت میں ہوگا کہ وہ خود اس کی وصیت کر گیا ہو۔ بصورت دیگر اسے عذاب نہیں دیا جائے گا۔

(٤٧٧) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ بِنْتاً للنَّبِيِّ ﷺ تُدْفَنُ، وَرَسُولُ اللهِ ﷺ جَالِسٌ عِنْدَ القَبْرِ، فَرَأَيْتُ عَيْنَيْهِ تَدْمَعَانِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی کی تدفین کے موقع پر حاضر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ میں نے دیکھا آپؐ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿شهدت بنتا﴾ یہ آپؐ کی صاحبزادی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔ جنہوں نے ۹ھ میں وفات پائی۔ ﴿تدفن﴾ صیغہ مجہول ہے یعنی اس کی تدفین کے موقع پر۔ ﴿تدمعان﴾ "تا" اور میم دونوں پر فتحہ یعنی اشک رواں تھے۔ آنسو بہہ رہے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت پر رونا جائز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے لخت جگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے موقع پر آنسو بہہ نکلے تھے تو حضرت عبدالرحمن ابن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! کیا آپؐ بھی گریہ و زاری کرتے ہیں؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا "یہ بے صبری کی وجہ سے نہیں بلکہ شفقت پدری کی بنا پر ہے۔" گویا غم کی وجہ سے شفقت پدری جوش مارے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں تو قابل مذمت و ملامت نہیں البتہ زبان سے چیخ و پکار اور نوحہ کرنا منع ہے۔

(٤٧٨) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لاَ تَدْفِنُوا مَوْتَاكُمْ بِاللَّيْلِ إِلاَّ أَنْ تُضْطَرُّوا إِلَيْهِ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَأَصْلُهُ فِي مُسْلِمٍ، لَكِنْ قَالَ: زَجَرَ أَنْ يُقْبَرَ الرَّجُلُ فِي اللَّيْلِ حَتَّى يُصَلَّى عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اپنے مرنے والوں کو رات کے اوقات میں دفن نہ کرو الاّ یہ کہ تم اس کیلئے مجبور ہو جاؤ۔" (ابن ماجہ) اس کی اصل مسلم میں ہے لیکن اسی میں ہے کہ آپؐ نے رات کو دفن کرنے پر ڈانٹا الاّ یہ کہ نماز جنازہ پڑھ لی جائے۔

لغوی تشریح: ﴿لا تدفنوا﴾ باب ضرب یضرب سے ہے۔ دفن نہ کرو۔ ﴿زجر﴾ زجر سے ماخوذ ہے۔ سختی سے ڈانٹ پلانا اور روک دینا۔ مسلم کی حدیث میں رات کے اوقات میں میت کو دفن کرنے کی ممانعت صرف اس گمان کے تحت ہے کہ رات کے وقت نماز جنازہ میں لوگ کم تعداد میں شریک ہوں گے۔

حاصل کلام: یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ رات کے وقت کفن اچھی طرح نہ دیا جا سکے گا۔ اگر نماز جنازہ دن کے وقت پڑھ لی جائے اور کسی عذر سے دفن کی نوبت رات کو آئے تو یہ منع نہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رات ہی میں دفن کیا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تدفین بھی رات ہی کو ہوئی تھی بلکہ خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو رات کو دفن کیا تھا۔ (ترمذی' ابن ماجہ) یہ اور اسی موضوع کی دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رات کو کسی خاص وجہ کے بغیر بھی دفن کرنا جائز ہے۔ جمہور اسی

کے قائل ہیں۔ مگر امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ' سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ اور متاخرین میں ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ رات کو بلاضرورت دفن کرنا مکروہ ہے۔

(٤٧٩) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ جَعْفَرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا جَاءَ نَعْيُ جَعْفَرٍ، حِيْنَ قُتِلَ، قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، «اصْنَعُوا لِآلِ جَعْفَرٍ طَعَاماً، فَقَدْ أَتَاهُمْ مَا يَشْغَلُهُمْ». أَخرَجَهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيُّ.

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر موصول ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کیلئے کھانا تیار کرو۔ ان کو ایسی تکلیف دہ اطلاع ملی ہے جو ان کو کھانا پکانے سے مشغول رکھے گی۔" (نسائی کے علاوہ اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن کا کوئی عزیز وفات پا جائے تو ان کو کھانا کھلانا مسنون ہے۔ ہمسایہ کا حق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ہے۔ کھانا صرف میت کے گھر والوں اور ان کے دور سے آئے ہوئے اعزاء و اقرباء کیلئے سنت ہے باقی محلے دار اور تدفین میں شریک لوگ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ اہل خانہ کا کھانا پکانا اور ان کے ہاں جمع ہونا درست نہیں۔ حدیث میں اس کی ممانعت ثابت ہے۔

راوی حدیث: ﴿ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ﴾ حضرت جعفرؓ ابو طالب کے بیٹے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے اور ان سے دس برس بڑے تھے۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہیں قیام پذیر ہوئے۔ نجاشی نے انہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ پھر انہوں نے مدینہ کی طرف بھی ہجرت فرمائی اور خیبر میں اس وقت پہنچے جب یہ فتح ہو چکا۔ نبی ﷺ نے ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور فرمایا "مجھے معلوم نہیں کہ جعفر کی آمد پر مجھے اتنی مسرت ہے یا خیبر کے فتح ہونے پر۔" انتہائی سخی انسان تھے۔ ۸ھ میں موتہ کے معرکہ میں جامِ شہادت نوش کیا اور جنت بریں کو سدھار گئے۔ اس معرکہ میں لشکر اسلام کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ دونوں بازو جنگ میں بدن سے کٹ کر جدا ہو گئے تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ان کے دونوں ہاتھ کے بدلہ ان کے دو پر لگا دیئے ہیں۔ جن سے وہ جنت میں جہاں چاہیں پرواز کرتے پھرتے ہیں۔" اسی وجہ سے ان کو جعفر طیار کہا جاتا ہے اور جعفر ذوالجناحین بھی انہی کا لقب ہے۔

(٤٨٠) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُعَلِّمُهُمْ إِذَا خَرَجُوا إِلَى المَقَابِرِ، أَنْ يَقُولُوا: السَّلَامُ عَلَى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ، وَإِنَّا إِنْ

حضرت سلیمان بن بریدہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ جب قبرستان جاتے تو رسول اللہ ﷺ ان کو سکھلاتے کہ یوں کہو۔ سلام ہو تم پر اے گھر والو! مومنوں اور مسلمانوں میں سے اور ہم بھی انشاء اللہ تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں

شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لاَحِقُونَ، نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.
اور ہم اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اهل الديار ﴾ ان سے مراد قبروں میں پڑے ہوئے لوگ ہیں۔ دیار' دار کی جمع ہے۔ گھر کو قبر سے تشبیہہ دی گئی ہے اس لئے کہ قبر میت کیلئے گھر کی مانند ہے کہ وہ اس میں رہائش پذیر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے قبرستان میں جانا اور پھر ان کیلئے اور اپنے لئے مغفرت و بخشش کی دعا کرنا ثابت ہوتا ہے۔ "من المومنين والمسلمين" سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرک' کافر اور ملحد کے لئے دعا و بخشش جائز نہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اہل قبور کو فریاد رس' مشکل کشا سمجھ کر ان سے فریادیں کرتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں یہ سب کام خلاف شرع ہیں اور شرکیہ افعال ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے ہر ممکن طریقہ سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ سليمان بن بريده بن حصيب اسلمی مروزی رحمۃ اللہ علیہ ﴾ مشہور تابعی ہیں۔ ابن معین اور ابوحاتم نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ ان کا اپنے والد سے سماع کہیں مذکور نہیں مگر خزرجی نے کہا کہ ان کی اپنے والد سے متعدد احادیث مسلم میں منقول ہیں۔

(٤٨١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: مَرَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِقُبُورِ الْمَدِيْنَةِ فَأَقْبَلَ عَلَيْهِمْ بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: «السَّلاَمُ عَلَيْكُمْ، يَا أَهْلَ الْقُبُورِ! يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ، أَنْتُمْ سَلَفُنَا، وَنَحْنُ بِالأَثَرِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر مدینہ کے قبرستان پر ہوا۔ آپؐ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "اے اہل قبور! تم پر سلام ہو۔ اللہ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے۔ تم ہمارے پیشرو ہو اور ہم تمہارے پیچھے چلے آرہے ہیں۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا اور حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ انتم سلفنا ﴾ سلفنا میں سین اور لام دونوں پر فتحہ ہے۔ یعنی پہلے فوت ہونے والے۔ ﴿ ونحن بالاثر ﴾ اثر میں همزه اور "ثا" پر فتحہ' ہم تمہارے پیچھے پیچھے آرہے ہیں اور تمہیں ملنے والے ہیں۔

(٤٨٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَسُبُّوا الأَمْوَاتَ، فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلَى مَا قَدَّمُوا». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مردوں کو گالی مت دو اس لئے کہ انہوں نے جو بھیجا ہے اسے حاصل کر لیا ہے۔" (بخاری) ترمذی نے مغیرہ کے حوالہ سے اسی طرح

وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ عَنِ الْمُغِيرَةِ نَحْوَهُ، لَكِنْ قَالَ: «فَتُؤْذُوا الْأَحْيَاءَ». روایت کیا ہے لیکن اس میں فتوذوا الاحیاء ہے یعنی گالی سے تم زندہ لوگوں کو تکلیف دیتے ہو۔

لغوی تشریح: ﴿ لاتسبوا ﴾ سب سے ماخوذ ہے۔ باب نصر ینصر گالی گلوچ' سب و شتم' برے اور قبیح وصف سے پکارنا۔ ﴿ افضو ﴾ افضاء سے ماخوذ ہے۔ پہنچ گئے ہیں۔ پا چکے ہیں ﴿ الی ماقدموا ﴾ جو اعمال و افعال وہ آگے بھیج چکے ہیں یہ تقدیم سے ماخوذ ہے۔ ﴿ فتوذوا الاحیاء ﴾ ایذاء سے ماخوذ ہے۔ یعنی تمہارا مردوں کو برا بھلا کہنا' سب و شتم کرنا' زندوں کیلئے باعث اذیت ہے کیونکہ مرنے والوں کا ان سے قرابت داری کا تعلق ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مرنے والوں کو سب و شتم نہیں کرنا چاہئے۔ ابولھب کی بیٹی درۃ مسلمان ہوئی تو بعض نے کہا اللہ کے دشمن کی بیٹی مسلمان ہوئی ہے۔ اس نے اس کی شکایت رسول اللہ ﷺ سے کی تو آپؐ نے فرمایا "مرنے والوں کو برا مت کہو۔ اس سے ان کی مسلمان ہونے والی اولاد کو تکلیف پہنچتی ہے۔" (مسند احمد) غور فرمائیں جب کفار کو ان کی مسلمان اولاد کے سامنے گالی دینا جائز نہیں تو مسلمانوں کے اکابرین کو گالی دینا اسلام کی کونسی خدمت ہے؟

٤ ـ كِتَابُ الزَّكٰاةِ

زکوٰۃ کے مسائل

(٤٨٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ مُعَاذاً رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ إِلَى الْيَمَنِ، فَذَكَرَ الْحَدِيْثَ، وَفِيْهِ: «إِنَّ اللّٰهَ قَدِ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ، تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ، فَتُرَدَّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف روانہ فرمایا' پھر ساری حدیث بیان کی جس میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے اموال پر زکوٰۃ فرض کی گئی ہے۔ جو ان کے اغنیاء سے وصول کی جائے اور انہی کے محتاجوں اور غریبوں میں تقسیم کر دی جائے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ کتاب الزکاۃ ﴾ لغت میں زکوٰۃ نمو یعنی زیادہ ہونے کو کہتے ہیں۔ اور پاکیزہ ہونا۔ زکوٰۃ کو بھی زکوٰۃ اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ مال کو پاک کر دیتی ہے اور صاحب مال کو گناہوں سے پاک کر دیتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے کے مال کو اور بڑھا دیتی ہے اور اس کے وقت فرضیت میں علماء کا اختلاف ہے۔ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ یہ ۲ھ میں فرض ہوئی' رمضان کی فرضیت سے پہلے اور تحقیق کرنے والوں کا خیال ہے کہ یہ فرض تو مکہ میں ہی ہو گئی مگر اس کے تفصیلی احکام مدینہ میں ۲ھ کو نازل ہوئے ہیں۔ ﴿ بعث معاذا الی الیمن ﴾ آپؐ نے ۱۰ھ میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو قاضی یا عامل بنا کر اہل یمن کی طرف روانہ فرمایا اور ایک قول کے مطابق ۹ھ میں اور ایک تیسرے قول کے مطابق ۸ھ میں بھیجا۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک یمن ہی میں رہے۔ پھر شام کا رخ کیا اور طاعون عمواس کے زمانہ میں وفات پائی۔ ﴿ فذکر الحدیث ﴾ اس میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کیلئے وصیت تھی کہ انہیں اہل یمن کے ساتھ کیا سلوک انجام دینا ہے ﴿ افترض ﴾ فرض قرار دی گئی۔ ﴿ فترد ﴾ اس میں "فا" تعقیب کیلئے ہے یعنی وصول کرنے کے بعد غرباء میں تقسیم کر دی جائے گی۔ ﴿ ترد ﴾ رد سے ماخوذ ہے

اور صیغۂ مجہول ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالت مآب ﷺ کے عہد باسعادت سے زکوٰۃ کی وصولی اور اس کے مصارف کا سرکاری سطح پر انتظام ہوگیا تھا۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں سے زکوٰۃ حاصل کی جائے گی وہیں کے محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ مقامی فقراء سے اگر زکوٰۃ بچ جائے تو پھر دوسرے علاقوں میں زکوٰۃ منتقل کی جا سکتی ہے۔ یہ غرباء کا حق ہے ان پر کوئی احسان نہیں۔

(٤٨٤) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أن أبا بكر رضي الله عنه كَتَبَ لَهُ: هٰذِهِ فَرِيْضَةُ الصَّدَقَةِ، الَّتِيْ فَرَضَهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ، وَالَّتِيْ أَمَرَ اللَّهُ بِهَا رَسُولَهُ: «فِيْ كُلِّ أَرْبَعٍ وَعِشْرِيْنَ مِنَ الإِبِلِ فَمَا دُوْنَهَا الغَنَمُ: فِي كُلِّ خَمْسٍ شَاةٌ، فَإِذَا بَلَغَتْ خَمْساً وَعِشْرِيْنَ إِلَى خَمْسٍ وَثَلاثِيْنَ، فَفِيْهَا بِنْتُ مَخَاضٍ أُنْثَى، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ فَابْنُ لَبُونٍ ذَكَرٌ. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتّاً وَثَلاثِيْنَ، إِلَى خَمْسٍ وَأَرْبَعِيْنَ فَفِيْهَا بِنْتُ لَبُونٍ أُنْثَى. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتّاً وَأَرْبَعِيْنَ، إِلَى سِتِّيْنَ، فَفِيْهَا حِقَّةٌ طَرُوقَةُ الجَمَلِ. فَإِذَا بَلَغَتْ وَاحِدَةً وَسِتِّيْنَ، إِلَى خَمْسٍ وَسَبْعِيْنَ، فَفِيْهَا جَذَعَةٌ. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتّاً وَسَبْعِيْنَ، إِلَى تِسْعِيْنَ، فَفِيْهَا بِنْتَا لَبُونٍ. فَإِذَا بَلَغَتْ إِحْدَى وَتِسْعِيْنَ، إِلَى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ، فَفِيْهَا حِقَّتَانِ طَرُوْقَتَا الجَمَلِ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى عِشْرِيْنَ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فریضۂ زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہ تحریر لکھ کر دی تھی۔ جسے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر مقرر فرمایا تھا اور جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو دیا تھا کہ اونٹوں کی چوبیس یا اس سے کم تعداد پر بکریاں ہیں ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری جب تعداد پچّیس سے بڑھ کر پینتیس ہو جائے تو اس تعداد پر ایک سالہ اونٹنی اگر میسر نہ ہو تو پھر دو سالہ نر بچہ اور جب چھتیس سے تعداد بڑھ کر پینتالیس تک پہنچ جائے تو ان میں دو سالہ اونٹنی اور جب چھیالیس سے بڑھ کر ساٹھ تک تعداد پہنچ جائے تو ان میں تین سالہ جوان اونٹ کی جفتی کے قابل اونٹنی اور جب اکسٹھ سے بڑھ کر پچھتّر تک پہنچ جائے تو ان میں چار سالہ اونٹ اور جب چھہتر سے تعداد بڑھ کر نوے ہو جائے تو ان میں دو' دو سالہ دو اونٹنیاں اور پھر اکانوے سے بڑھ کر تعداد ایک سو بیس تک پہنچ جائے تو ان میں تین' تین سالہ دو جوان اونٹنیاں۔ جو اونٹ کی جفتی کے قابل ہوں۔ اور جب تعداد ایک سو بیس سے زائد ہو جائے تو پھر ہر چالیس اونٹوں پر ایک دو سالہ اونٹنی اور ہر پچاس پر تین سالہ اور جس کے پاس صرف چار ہی اونٹ ہوں تو اس تعداد

وَمِائَةٍ، فَفِيْ كُلِّ أَرْبَعِيْنَ بِنْتُ لَبُونٍ، وَفِيْ كُلِّ خَمْسِيْنَ حِقَّةٌ. وَمَنْ لَّمْ يَكُنْ مَّعَهُ إِلاَّ أَرْبَعٌ مِنَ الإِبِلِ، فَلَيْسَ فِيْهَا صَدَقَةٌ، إِلاَّ أَنْ يَشَاءَ رَبُّهَا. وَفِيْ صَدَقَةِ الغَنَمِ، فِيْ سَائِمَتِهَا: إِذَا كَانَتْ أَرْبَعِيْنَ، إِلَى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ شَاةٍ، شَاةٌ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ إِلَى مِائَتَيْنِ، فَفِيْهَا شَاتَانِ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى مِائَتَيْنِ، إِلَى ثَلاَثِمَائَةٍ، فَفِيْهَا ثَلاَثُ شِيَاهٍ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى ثَلاَثِمَائَةٍ، فَفِيْ كُلِّ مِائَةٍ، شَاةٌ. فَإِذَا كَانَتْ سَائِمَةُ الرَّجُلِ نَاقِصَةً عن أَرْبَعِيْنَ شَاةً، شَاةً، وَاحِدَةً، فَلَيْسَ فِيْهَا صَدَقَةٌ، إِلاَّ أَنْ يَّشَاءَ رَبُّهَا، وَلاَ يُجْمَعُ بَيْنَ مُتَفَرِّقٍ، وَلاَ يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ، خَشْيَةَ الصَّدَقَةِ. وَمَا كَانَ مِنَ خَلِيْطَيْنِ، فَإِنَّهُمَا يَتَرَاجَعَانِ بَيْنَهُمَا بِالسَّوِيَّةِ. وَلاَ يُخْرَجُ فِي الصَّدَقَةِ هَرِمَةٌ، وَلاَ ذَاتُ عَوَارٍ، وَلا تَيْسٌ، إِلاَّ أَنْ يَشَاءَ المُصدِّقُ. وَفِي الرِّقَةِ: فِي مِائَتَي دِرْهِمٍ، رُبْعُ العُشْرِ، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ إِلاَّ تِسْعِيْنَ وَمِائَةً، فَلَيْسَ فِيْهَا صَدَقَةٌ، إِلاَّ أَن يَشَاءَ رَبُّهَا. وَمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهُ مِنَ الإِبِلِ صَدَقَةُ الجَذَعَةِ، وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ جَذَعَةٌ، وَعِنْدَهُ حِقَّةٌ، فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الحِقَّةُ،

پر کوئی زکوٰۃ نہیں الاّ یہ کہ ان کا مالک چاہے اور بکریوں کی زکوٰۃ کہ جو باہر چرنے جاتی ہوں' چالیس سے لے کر ایک سو بیس کی تعداد پر صرف ایک بکری زکوٰۃ میں وصول کی جائے گی۔ جب یہ تعداد ایک سو بیس سے بڑھ کر دو سو تک پہنچ جائے گی تو دو بکریاں زکوٰۃ میں وصول کی جائیں گی۔ پھر جب دو سو سے بڑھ کر تین سو تک پہنچ جائے گی تو تین بکریاں وصول کی جائیں گی۔ جب تعداد تین سو سے بڑھ جائے گی تو ہر سو پر ایک بکری زکوٰۃ وصول ہوگی' اگر کسی کی باہر جنگل میں چرنے والی بکریاں چالیس سے ایک بھی کم تعداد میں ہوں تو مالک پر کوئی زکوٰۃ نہیں الاّ یہ کہ مالک چاہے۔ زکوٰۃ کے ڈر سے نہ تو الگ الگ چرنے والیوں کو اکٹھا کیا جائے اور نہ ہی اکٹھی چرنے والیوں کو الگ الگ۔ اور جو جانور دو آدمیوں کے درمیان مشترکہ ہوں وہ مساوی طور پر زکوٰۃ کا حصہ نکالیں۔ زکوٰۃ کی مد میں بوڑھا اور نہ یک چشم جانور اور نہ سانڈ لیا جائے الاّ یہ کہ زکوٰۃ دینے والا آپ چاہے اور چاندی کے سکوں کا نصاب دو سو درہم ہے اس میں سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ ہے۔ اگر کسی کے پاس دو سو درہم سے ایک درہم بھی کم ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں الاّ یہ کہ اس کا مالک خود دینا چاہے۔ اور جس کے اونٹوں کی زکوٰۃ میں چار سالہ اونٹ واجب الوصول ہو اور اس کے پاس اس عمر کا اونٹ نہ ہو اور یہ اس کے پاس تین سالہ ہو جوان اونٹنی تو اس سے دو بکریاں اور تین سالہ جفتی کے لائق جوان اونٹنی وصول کیا جائے بشرطیکہ بکریاں بآسانی دستیاب

وَيَجْعَلُ مَعَهَا شَاتَيْنِ إِنِ اسْتَيْسَرَتَا لَهُ، أَوْ عِشْرِيْنَ دِرْهَماً. وَمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهُ صَدَقَةُ الحِقَّةِ، وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ الحِقَّةُ، وَعِنْدَهُ الجَذَعَةُ. فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الجَذَعَةُ، وَيُعْطِيْهِ المُصَدِّقُ عِشْرِيْنَ دِرْهَماً أَوْ شَاتَيْنِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

ہو سکیں یا بیس درہم دینا ہوں گے اور جس کی زکوٰۃ میں تین سالہ جوان اونٹنی آتی ہو ہو اور اس کے پاس چار سالہ اونٹ ہو تو اس سے وہی چار سالہ اونٹ ہی وصول کر لیا جائے گا مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا اسے بیس درہم یا دو بکریاں واپس دے گا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ کتب لہ ﴾ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو تحریر کر کے دیا جب ان کو بحرین کی طرف زکوٰۃ کی وصولی پر عامل بنا کر بھیجا۔ ﴿ ھذہ فریضۃ الصدقۃ ﴾ یہ فرضیت زکوٰۃ کا نوشتہ ہے۔ اس تحریری مکتوب کا آغاز اس سے ہوتا ہے۔ بخاری میں مکتوب سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے ﴿ فما دونھا ﴾ اس تعداد سے کم کا مطلب ہے جو بیس سے کم۔ الغنم بکری اور بھیڑ دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں الغنم مبتداء مؤخر ہے اور اس کی خبر ﴿ فی کل اربع وعشرین فما دونھا ﴾ ہے جس کا مطلب ہے کہ اس تعداد و مقدار میں بکری یا بھیڑ زکوٰۃ میں نکالنا ہے۔ ﴿ فی کل خمس ﴾ ہر پانچ کی تعداد میں سے مراد اونٹ ہیں۔ جب پانچ اونٹ ہوں گے تو زکوٰۃ کا نصاب شروع ہوگا اور اس تعداد پر ﴿ شاۃ ﴾ ایک بکری یا بھیڑ دینا ہوگی ﴿ بنت مخاض ﴾ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو ایک سال پورا کر کے دوسرے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ "مخاض" اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اس عمر کو پہنچ چکی ہو کہ وہ حاملہ ہونے کی صلاحیت تو رکھتی ہو مگر ہنوز حاملہ نہ ہوئی ہو۔ اسے مخاض اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی ماں کا شمار ان میں ہے جو حاملہ ہوتی ہیں اور مؤنث کی قید تاکید کیلئے ہے اور اس پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ نر اونٹ وہ کام نہیں دے سکتا جو مادہ دے سکتی ہے۔ ﴿ ابن لبون ﴾ لبون کے لام پر فتحہ ہے۔ وہ اونٹ جو دو سال مکمل کر کے تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ ﴿ بنت لبون ﴾ وہ اونٹ جو دو سال مکمل کر کے تیسرے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ ﴿ حقہ ﴾ "حا" کے نیچے کسرہ اور قاف پر تشدید۔ مادہ (اونٹنی) جو تین سال کی عمر پوری کر کے چوتھے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ اس کی جمع حقاق آتی ہے اور مذکر اس کا ﴿ حق ﴾ "حاء" کا کسرہ ہے۔ "حقہ" اسے اس لئے کہتے ہیں کہ اس پر سواری کی جا سکتی ہے اور بار برداری کے قابل ہو جاتی ہے اور نر کی جفتی کے بھی قابل ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے ﴿ طروقۃ الجمل ﴾ کہا گیا ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ یہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ نر اگر اس پر جفتی کے ذریعہ وطی کرے تو کر سکتا ہے خواہ اس سے وطی نہ کی ہو۔ ﴿ جذعۃ ﴾ جیم اور ذال دونوں پر فتحہ جو پورے چار کو پہنچ چکی ہو اور پانچویں میں قدم رکھ چکی ہو۔ ﴿ فاذا زادت ﴾ جب تعداد اس سے زیادہ ہو جائے ﴿ علی عشرین

ومائة ﴾ ایک سو بیس سے خواہ ایک ہی کا اضافہ ہو۔ ﴿ ففی کل اربعین ﴾ تو ان کو چالیس اور پچاس کے دو زمروں میں تقسیم کرلیں گے۔ مثلاً جب مذکورہ تعداد میں ایک کا اضافہ ہو جانے کی صورت میں اس تعداد کو تین مرتبہ چالیس شمار کیا جائے گا اور ایک کے زائد عدد کا کوئی وزن نہیں۔ تین دفعہ چالیس کی صورت میں تین بنت لبون وصول کی جائیں گی۔ یہ ایک سو تیس تک کی زکوٰۃ ہوگی اور ایک سو تیس کی صورت میں پچاس پر حقہ اور چالیس پر دو بنت لبون' بس اسی طرح دس کے اضافہ کی صورت میں تبدیلی اور تغیر واقع ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مکتوب گرامی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ جب اونٹوں کی تعداد ایک سو اکیس ہو جائے تو ان میں تین بنت لبون زکوٰۃ ہوگی تاوقتیکہ یہ تعداد ایک سو انتیس تک پہنچ جائے۔ مدعا و مقتضاء کلام یہ ہے کسروں کو شمار میں نہیں رکھا جاتا اور تمام دہائیوں میں زکوٰۃ ہے (مثلاً دس' بیس' تیس علی ھذا القیاس)۔ (عون المعبود اور سبل الاسلام) الا ان یشاء ربھا الآیہ کہ اونٹوں کا مالک رضاکارانہ طور پر اپنی طرف سے نفلی طور پر زکوٰۃ کو نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے۔ اس پر واجب نہیں ہے۔ ﴿ فی سائمتھا ﴾ سے مراد زکوٰۃ میں وصول کی جانے والی بکریاں "سائمہ" وہ بکری جس کی زندگی کا انحصار جنگلوں میں چرنا ہو اور گھر پر چارہ بہت کم کھاتی ہو۔ جمہور کے نزدیک جنگل میں چرنے کی قید لازمی ہے۔

﴿ الی عشرین ومائة شاة شاة ﴾ ایک سو بیس تک کی تعداد میں صرف ایک بکری ہے پہلا "شاة" کا لفظ مائة کی تمیز ہے اور دوسرا شاۃ مرفوع ہے اور یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر پہلا جملہ ﴿ فی صدقة الغنم ﴾ ہے اور شاۃ کے لفظ میں نر و مادہ' بھیڑ اور بکری دونوں شامل ہیں اور غنم کا لفظ شاہ کا مترادف ہے یعنی شاۃ اور غنم دونوں ہم معنی ہیں اور ﴿ فاذا زادت علی عشرین ومائة ﴾ جب ایک سو بیس پر اضافہ ہو جائے خواہ ایک ہی عدد کا کیوں نہ ہو اس میں دو بکریاں ہیں اور جب دو سو سے زیادہ ہو کر تین سو ہو جائیں تو تین بکریاں ﴿ فاذازادت علی ثلث مائة ففی کل مائة شاة ﴾ اور جب تین سو سے تعداد میں اضافہ ہو جائے تو ہر سو میں ایک بکری کی زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ بظاہر تو اس سے یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ چوتھی بکری اس وقت دینا ضروری ہوتا ہے جبکہ تعداد چار سو تک پہنچ جائے۔ جمہور کا یہی قول ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ جب تین سو پر ایک کا بھی اضافہ ہو جائے گا تو اس تعداد میں چار بکریاں دینا ہوں گی۔ پہلی بات قابل ترجیح ہے اور اس کی تائید وہ روایت بھی کر رہی ہے جسے ترمذی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے "کہ جب تین سو بکریوں میں ایک کا مزید اضافہ ہو جائے تو پھر ہر ایک سو بکریوں پر ایک بکری ہے' جب تک تعداد میں پورے سو کا اضافہ نہیں ہو جاتا اس میں کوئی زکوٰۃ نہیں۔" ﴿ فاذا کانت سائمة الرجل ﴾ جب آدمی کے جانور جنگل میں چرنے چگنے والے چالیس سے تعداد میں کم ہوں تو ان پر ایک بکری بھی زکوٰۃ دینا نہیں بنتی۔ ﴿ ناقصة ﴾ منصوب ہے۔ کانت کی خبر واقع ہو رہی ہے۔ ﴿ من اربعین شاة شاة واحدة ﴾ دونوں شاۃ پر فتحہ ہے اس لئے منصوب ہے پہلی صورت میں عدد سے تمیز واقع ہو رہی ہے اور دوسری صورت میں حرف جر محذوف ہے جسے نزع الخافض کہتے ہیں یعنی بشاۃ واحدۃ یا پھر یہ ناقصہ مفعول ہے۔ مطلب ساری گفتگو کا یہ ہوا کہ جب کسی آدمی کے

پاس باہر چرنے چگنے والے جانوروں کی تعداد چالیس سے ایک بھی کم ہو تو ان میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور جب تعداد ایک سے بھی زیادہ کم ہو پھر تو کسی صورت بھی زکوٰۃ نہیں۔ ﴿ ولا یجمع ﴾ صیغہ مجہول (نہ جمع کیا جائے گا نہ اکٹھا کیا جائے گا) "ولا یفرق" "را" پر تشدید (صیغہ مجہول) ﴿ خشیۃ الصدقۃ ﴾ منصوب' مفعول لہ واقع ہو رہا ہے یعنی زکوٰۃ زیادہ یا کم دینے کے خوف و اندیشہ کے پیش نظر' زیادہ کا اندیشہ ہو تو مالک کو ہوگا اور کم کا خوف زکوٰۃ وصول کرنے والے کیلئے۔ دونوں فریقین کیلئے یکساں طور پر عائد ہوتی ہے۔ الگ الگ کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تین آدمی ہیں ہر ایک کی چالیس چالیس بکریاں ہیں۔ الگ الگ کی صورت میں ہر ایک کو ایک بکری زکوٰۃ میں دینا واجب آتی ہے اس طرح مجموعی طور پر تین بکریاں دینا پڑتی ہیں مگر جب زکوٰۃ وصول کرنے والا ان کے پاس پہنچتا ہے تو انہوں نے بکریاں جمع کرلیں اور تعداد ایک سو بیس بن گئی۔ اس طرح ان کو صرف ایک بکری دینا پڑتی ہے اور جمع شدہ بکریوں کو الگ الگ کرنے کی صورت یہ ہے کہ دو آدمی اکٹھے ہیں دو سو اور ایک بکریاں ان کی ملکیت میں ہیں۔ اس طرح دونوں پر تین بکریاں زکوٰۃ دینا لازمی ہے مگر جب زکوٰۃ وصول کرنے والا ان کے پاس پہنچا تو دونوں نے اپنی اپنی بکریاں الگ کرلیں کہ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے ذمہ ایک ایک بکری ہی آئے گی۔ ایسے مال کے مالکوں کو اس طرح حیلہ سازی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ زکوٰۃ وصول کرنے والے کو منع کرنے کی یہ صورت ہے کہ دو آدمی ہیں جو باہم نہ شریک ہیں اور نہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنا مال ملایا ہوا ہے' ان دونوں میں سے ہر ایک کے پاس ایک سو بیس یا کم و بیش بکریاں ہیں تو اس صورت میں ہر ایک کو ایک بکری زکوٰۃ میں دینا آتی ہے۔ مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا ان دونوں کی بکریاں ازخود جمع کرتا ہے اور ان کی مجموعی تعداد دو سو سے زائد ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ تین بکریاں وصول کرلیتا ہے اور جدا اور الگ الگ کرنے کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک سو بیس بکریاں تین آدمیوں کی ملک میں ہیں۔ اس صورت میں صرف ایک ہی بکری زکوٰۃ میں دینا آتی ہے مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا اسے تین حصوں میں تقسیم کردیتا ہے اور اس طرح تین بکریاں وصول کرلیتا ہے۔ بایں طور کہ ہر چالیس پر ایک بکری کے حساب سے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ ﴿ خشیۃ الصدقۃ ﴾ کا معنی یہ ہوا کہ کثرت کے خوف و اندیشہ کے پیش نظر یا تعداد کی قلت کے نقطۂ نظر سے دونوں معنوں کا احتمال ہے۔ کسی کو کسی پر ترجیح نہیں۔ دونوں معنی اکٹھے بھی ہو سکتے ہیں۔ ﴿ وما کان من خلیطین ﴾ خلیطین کا معنی شریک ہیں اور اس میں "من" موصول کے بیان کیلئے ہے "والخلطۃ " اور شرکت یہ ہے کہ چرواہا' چراگاہ' نر اور پانی پلانا ایک طرح کا ہے۔ فانھما یترا جعان بینھما بالسویۃ سویۃ میں "یا" پر تشدید ہے معنی مساوات برابری کی سطح پر اور "تراجع" کا معنی یہ ہے کہ جب زکوٰۃ وصول کرنے والا دونوں کے مجموعہ پر واجب زکوٰۃ ایک بکری کی صورت میں وصول کرلیتا ہے حالانکہ اس کے ذمہ تو آدھی بکری آتی ہے اور باقی نصف اس کے دوسرے ساتھی پر۔ تو اب زکوٰۃ وصول کرنے والا دوسرے ساتھی سے نصف بکری کی قیمت اس سے لے کر دوسرے کے حوالہ کردے گا۔ اس طرح دونوں کی طرف سے ان پر واجب الادا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

کمی و بیشی کا شکوہ کسی کو نہیں رہے گا۔ بالسویۃ یہی سے۔ ہی برابری مراد ہے۔ ﴿ لایخرج ﴾ صیغہ مجہول نہیں نکالا جائے گا۔ ﴿ ھرمۃ ﴾ فتحہ اور کسرہ۔ "ھا" پر فتحہ "را" کے نیچے کسرہ۔ بوڑھی اور اتنی عمر رسیدہ جس کے دانت گر چکے ہوں۔ ﴿ ولا ذات عوار ﴾ عوار کے عین پر فتحہ اور ضمہ دونوں جائز ہیں۔ عیب کے معنی میں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ عوار کے عین پر فتحہ کی صورت میں اس کا معنی عیب ہوگا اور ضمہ کی صورت میں کانا ہوگا اور بہتر یہی ہے کہ اسے فتحہ سے ہی پڑھا جائے تاکہ تمام عیوب و نقائص اس میں شامل ہو جائیں۔ ﴿ ولا تیس ﴾ "تا" پر فتحہ "یا" ساکن۔ سانڈ بکرا جو بکریوں پر جفتی کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔ ﴿ الا ان یشاء المصد ﴾ مصدق کے صاد پر تشدید اور تخفیف دونوں طرح ہے۔ پہلے کا اصل متصدق یعنی زکوٰۃ و صدقہ دینے والا۔ یعنی مال کا مالک۔ اس میں استثناء فقط لفظ تیس کی طرف راجع ہے۔ یعنی سانڈ بکرا کا لینا مالک کی مرضی پر منحصر ہے۔ کیونکہ اس کی ضرورت اسے ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی رضامندی اور خوشی کے بغیر بکرے کا وصول کرنا مالک کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہوگا۔ دوسری صورت میں مصدق کا صاد مخفف ہے۔ جس کا معنی صدقہ لینے والا' اس پر دوڑ دھوپ اور سعی کرنے والا اور استثناء تینوں کی طرف راجع ہے یعنی بوڑھی گھونسٹ۔ عیب والی اور سانڈ بکرے (بوک) کی طرف الآ یہ کہ زکوٰۃ لینے والا اس کے لینے میں مصلحت سے زیادہ موافقت محسوس کرے اور مساکین کیلئے زیادہ اچھا سمجھے۔ ﴿ وفی الرقۃ ﴾ اور چاندی میں زکوٰۃ کی نوعیت یہ ہے۔ رقۃ کے "را" کے نیچے کسرہ۔ دراصل یہ ورق سے ہے۔ ورق "واؤ" پر فتحہ اور "را" کے نیچے کسرہ۔ چاندی کو کہتے ہیں ﴿ ربع العشر ﴾ ربع کے راء اور عشر کے عین پر ضمہ ہے اور "با" اور شین ساکن ہیں یا دونوں پر ضمہ "ربع" کسی چیز کا چوتھا حصہ اور "عشر" دسواں حصہ اور ربع العشر چالیسواں حصہ ہوا اور دو سو درہم باون تولہ اور چھ ماشہ چاندی کے برابر ہوتے ہیں یعنی سات سو پینتیس گرام اور درہم تین ماشے ایک رتی کا اور پانچ رتی بڑے رائی کے دانوں کے برابر۔ ﴿ فان لم تکن ﴾ اور اگر چاندی ﴿ الا تسعین ومائۃ ﴾ ایک سو نوے درہم ہو یعنی جب دو سو درہم پورے نہ ہوں اس پر زکوٰۃ نہیں۔ نوے کا ذکر محض اس لئے کیا ہے کہ سو پورا ہونے سے پہلے آخری گنتی نوے ہی ہے اور حساب کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب احاد سے اکائی تجاوز کر جائیں تو دہائیوں سے گنتی کی جاتی ہے۔ جیسے دہائیوں سینکڑوں اور ہزاروں ہیں۔ (فانھا تقبل منہ الحقۃ) جذعہ کی جگہ حقہ قبول کر لیا جائے گا۔ ﴿ ویجعل ﴾ مالک ساتھ شامل کرے گا۔ ﴿ معھا شاتین ﴾ دو بکریاں نقصان و کمی کی تلافی کرنے کیلئے کیونکہ حقہ جذعہ سے چھوٹا ہوتا ہے ﴿ ان استیسرتالہ ﴾ بایں صورت کہ دو بکریاں اس کے مویشیوں میں موجود ہوں ﴿ او عشرین درھما ﴾ او یہاں تخیر کیلئے ہے یعنی اختیار حاصل ہے کہ اگر چاہے تو یہ دے دے' چاہے وہ دے دے۔ ﴿ ویعطیہ المصدق ﴾ دال پر تشدید۔ زکوٰۃ و صدقہ وصول کرنے والا سرکاری کارندہ اور نمائندہ۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مال و مویشی کی زکوٰۃ کا نصاب مذکور ہے نیز اس میں زکوٰۃ وصول کرنے کا طریق کار۔ زکوٰۃ میں وصول کئے جانے والے جانوروں کی عمروں کا بیان ہے اور زکوٰۃ کی وصولی کا اہتمام

مذکور ہے۔ نہ تو مالک کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے اور نہ ہی سرکاری اہل کار کو دھوکہ میں رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ہر قسم کے مویشیوں پر زکوٰۃ نہیں بلکہ جنگل میں چرنے چگنے والوں پر ہے۔

(٤٨٥) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَهُ إِلَى الْيَمَنِ، فَأَمَرَهُ أَنْ يَأْخُذَ مِنْ كُلِّ ثَلَاثِيْنَ بَقَرَةً تَبِيْعاً أَوْ تَبِيْعَةً، وَمِنْ كُلِّ أَرْبَعِيْنَ مُسِنَّةً، وَمِنْ كُلِّ حَالِمٍ دِيْنَاراً، أَوْ عَدْلَه مَعَافِرِيّاً. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَاللَّفْظُ لِأَحْمَدَ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَأَشَارَ إِلَى الاخْتِلَافِ فِيْ وَصْلِهِ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کی طرف (عامل مقرر کرکے) بھیجا۔ ان کو حکم دیا کہ وہ تیس گائیوں پر ایک سالہ مادہ گائے یا نر بچھڑا وصول کرے اور ہر چالیس کی تعداد پر ایک دو سالہ بچھڑا لیا جائے اور ہر نوجوان سے ایک دینار یا معافری کپڑا لیا جائے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ احمد کے ہیں اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور اس کے موصول ہونے کے بارے میں اختلاف کا اشارہ کیا ہے ابن حبان اور حاکم دونوں نے اسے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿من كل ثلاثين بقرة﴾ یہ نصاب متفق علیہ ہے کسی کا اس میں اختلاف نہیں۔ تیس سے کم پر کوئی چیز واجب نہیں مگر امام زھری کی رائے ہے کہ ہر پانچ گائے کی تعداد پر ایک بکری ہے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو اونٹوں کے نصاب پر قیاس کرکے کہا ہے۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ نصاب کا تعین قیاس سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور "بقرۃ" اسم جنس ہے اور "تا" اس میں "وحدۃ" کی علامت ہے، تانیث کی نہیں۔ یہ مذکر و مونث دونوں پر یکساں بولا جاتا ہے۔ تبيعا او تبيعة تبيعا اس کو کہتے ہیں جو ایک سال کی عمر مکمل کرکے دوسرے سال میں قدم رکھ چکا ہو اور "او" اس میں تخییر کیلئے ہے یعنی سرکاری وصول کنندہ کو اختیار ہے چاہے مادہ حاصل کرے اور چاہے نر وصول کرے۔ مسنة اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دو دانت نکل آئے ہوں یعنی جو دو سال مکمل کر چکا ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ تحفة الاحوذی (ج ۲، ص ۴) میں ہے کہ طبرانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہر چالیس کی تعداد پر مسنہ یا مسن ہے ﴿ومن كل حالم﴾ ہر بالغ سے۔ خواہ احتلام سے دوچار ہوا ہو یا ہنوز نہ ہوا ہو پر "دينارا" ایک دینار بطور جزیہ وصول کیا جائے گا۔ ﴿راوعدله﴾ عین پر فتحہ۔ دال ساکن ہے مراد ہے اتنی قیمت۔ اس کے برابر مساوی قیمت اور ایک قول یہ بھی ہے کہ فتحہ اور کسرہ دونوں برابر ہیں۔ ﴿معافريا﴾ وہ چادریں جو یمن کی بنی ہوئی ہیں۔ "معافر" بروزن مساجد ہے یہ ھمدان کا ایک قبیلہ ہے۔ انہی کی طرف معافری کپڑے منسوب ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں گائے کے نصاب کی تفصیل کے ساتھ ساتھ غیر مسلم سے جزیہ وصول کرنے کا بھی حکم ہے۔ بالاتفاق علماء نے بھینس کو گائے پر قیاس کیا اس کی حلت اور زکوٰۃ کا وہی حکم ہے جو گائے کا

ہے۔

(٤٨٦) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «تُؤْخَذُ صَدَقَاتُ الْمُسْلِمِينَ عَلَى مِيَاهِهِمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ. وَلِأَبِي دَاوُدَ: «وَلاَ تُؤْخَذُ صَدَقَاتُهُمْ إِلاَّ فِي دُورِهِمْ».

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "مسلمانوں سے زکوٰۃ ان کے پانی پلانے کی جگہوں پر وصول کی جائے گی۔" (احمد) اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ مسلمانوں کے صدقات ان کے گھروں ہی پر حاصل کئے جائیں گے۔

لغوی تشریح: ﴿علی میاھھم﴾ میاہ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چشمے ہیں جہاں لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلانے کیلئے لے جاتے ہیں۔ ﴿الا فی دورھم﴾ دور' دار کی جمع ہے۔ ان کی اپنی رہائش گاہیں' جائے رہائش' مکانات' پانی کے گھاٹ' ان کے قبائل اور مویشیوں کی قیام گاہیں مراد ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ سرکاری زکوٰۃ وصول کنندہ خود لوگوں کے پاس پہنچ کر زکوٰۃ کی وصولی کرے۔ ایسا نہیں کہ خود دور دراز جگہ میں ڈیرہ جما کر بیٹھ جائے اور لوگوں کو اپنے ہاں آکر زکوٰۃ جمع کرانے کا حکم دے۔ اس طرح لوگوں کا مشقت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں عامل زکوٰۃ کو زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے لوگوں کے پاس ان کے گھروں' مویشیوں کی قیام گاہوں میں جانے کا حکم ہے۔ تاکہ کسی قسم کے دھوکہ میں مبتلا نہ کیا جا سکے اور وہ اپنی حاکمیت کی دھونس بھی نہ جما سکے۔ بلکہ ایک خادم دین کی حیثیت سے گھر گھر جا کر زکوٰۃ وصول کرے۔ جابر بن عتیک کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "تمہارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے والے سرکاری نمائندے آئیں گے جب وہ تمہارے پاس پہنچیں تو ان کو خوش آمدید کہو اور جس چیز کا وہ مطالبہ کریں' وہ ان کے سپرد کر دو۔ اگر انہوں نے انصاف سے کام لیا تو انہیں ثواب ملے گا اور اگر ظلم کریں گے تو اس کا وبال انہی پر پڑے گا۔" اگر یہ زکوٰۃ مقدار وجوب سے زیادہ طلب کریں تو صحیح بخاری میں ہے کہ انہیں زیادہ ہرگز نہ دی جائے۔

(٤٨٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِ فِي عَبْدِهِ وَلاَ فِي فَرَسِهِ صَدَقَةٌ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَلِمُسْلِمٍ: لَيْسَ فِي الْعَبْدِ صَدَقَةٌ، إِلاَّ صَدَقَةَ الْفِطْرِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "مسلمانوں پر نہ اس کے غلام میں زکوٰۃ ہے اور نہ اس کے گھوڑے میں۔" (بخاری) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ "غلام میں زکوٰۃ نہیں مگر صدقہ فطر سے۔"

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غلام اور گھوڑے میں زکوٰۃ نہیں۔ یعنی جو غلام اپنی خدمت کیلئے اور جو گھوڑا اپنی سواری کے لئے مخصوص ہو ان پر کسی قسم کی زکوٰۃ نہیں۔ البتہ اگر برائے تجارت

ہوں تو ان پر زکوٰۃ ہوگی۔ جمہور علماء کا یہی مسلک ہے مگر علامہ ابن حزم اور دیگر ظاہریہ کے نزدیک گھوڑے تجارت کیلئے ہوں تو ان کی بھی زکوٰۃ نہیں۔

(٤٨٨) وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيمٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «فِي كُلِّ سَائِمَةِ إِبِلٍ: فِي أَرْبَعِينَ بِنْتُ لَبُونٍ، لاَ تُفَرَّقُ إِبِلٌ عَنْ حِسَابِهَا، مَنْ أَعْطَاهَا، مُؤْتَجِراً بِهَا، فَلَهُ أَجْرُهَا، وَمَنْ مَنَعَهَا، فَإِنَّا آخِذُوهَا وَشَطْرَ مَالِهِ، عَزْمَةً مِنْ عَزَمَاتِ رَبِّنَا، لاَ يَحِلُّ لِآلِ مُحَمَّدٍ مِنْهَا شَيْءٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَعَلَّقَ الشَّافِعِيُّ القَوْلَ بِهِ عَلَى ثُبُوتِهِ.

حضرت بہز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "چرنے والے تمام اونٹوں میں چالیس پر ایک دو سالہ اونٹنی ہے اور اونٹوں کو ان کے حساب سے جدا نہ کیا جائے گا اور جو شخص حصول ثواب کی نیت سے زکوٰۃ ادا کرے گا اس کو اس کا ثواب بھی ملے گا اور جس نے زکوٰۃ روک لی تو ہم زکوٰۃ زبردستی وصول کریں گے اور اس کا کچھ مال بھی' ہمارے پروردگار کے فرائض میں سے ایک لازمی حصہ ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی آل محمد کیلئے حلال نہیں ہے۔" (اسے احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور شافعی نے اس کے ثابت ہونے پر اپنے قول کو معلق رکھا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ سائمة ابل ﴾ سائمة ' ابل کی طرف مضاف ہے۔ ﴿ فی اربعین بنت لبون ﴾ یعنی فی الجملہ چالیس میں "بنت لبون" دو سالہ اونٹنی ہے۔ حضرت انس کی روایت میں جو پہلے گزر چکی ہے ۳۶ سے زیادہ ۴۵ تک میں ایک بنت لبون کا ذکر ہے اور اس حدیث میں چالیس کی تعداد' اس وقت مراد ہے جب ایک سو بیس سے اونٹ زیادہ ہوں تو پھر چالیس پر بنت لبون ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تفصیل موجود ہے یا یہ کہ ۴۰ کی تعداد بھی ۳۶ سے ۴۵ کے مابین ہے۔ ان دونوں کے مابین جتنے اونٹ ہوں ۴۰ ہوں یا اس سے کم و بیش ان پر زکوٰۃ ہے' یہ مفہوم ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں منطوق راوی ہے اس لئے اعتبار اسی روایت کا ہے۔ ﴿ لا یفرق ﴾ تفریق سے ماخوذ ہے۔ مبنی للمفعول ہے یعنی الگ الگ اور جدا جدا نہیں کیا جائے گا۔ "ابل عن حسابها" اس کا معنی ہے کہ مالک اپنی ملکیت کی چیزوں کو دوسرے کی ملکیت سے الگ نہ کرے جبکہ دونوں کے مویشی اکٹھے ہوں۔ جیسا کہ اس سے پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ یا یہ معنی ہوں گے کہ تمام اونٹوں کو فی چالیس کے حساب سے شمار کیا جائے' اس صورت میں نہ مریل و کمزور کو چھوڑا جائے گا نہ کسی فربہ کو' نہ چھوٹے کو اور نہ بڑے کو ﴿ موتجرابها ﴾ اجر و ثواب کے حصول کے ارادے سے ان کو زکوٰۃ میں دینا ﴿ ومن منعها ﴾ جس نے

نہ دیا ﴿ فانا اخذوھا ﴾ تو ہم اسے بزور و زبردستی وصول کریں گے۔ ﴿ وشطر مالہ ﴾ کچھ مال یا آدھا مال۔ نہ زکوٰۃ نہ دینے کی سزا کے طور پر ﴿ اخذوھا ﴾ میں جو ضمیر مجرور ہے' اس پر اس کا عطف ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ تشطیر سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ اس صورت میں یہ معنی ہوگا کہ اس کے مال کو عامل دو نصف حصوں میں تقسیم کر دے اور بہترین و افضل حصہ خود وصول کر لے۔ ﴿ عزمۃ ﴾ رفعی حالت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر ہوگی اور نصب کی صورت میں مصدر۔ مطلب ہے کہ یہ فریضہ ہے اور واجب حق ہے ﴿ من عزمات ربنا ﴾ اللہ تعالیٰ کے حقوق و واجبات میں سے ﴿ لایحل لال محمد ﴾ الخ آل محمد کیلئے یہ حلال نہیں۔ آل محمد سے کیا مراد ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ اس سے بنو ہاشم' بنو عبدالمطلب بن عبد مناف مراد ہیں اور ایک قول یہ ہے اس سے مراد بالخصوص آل علی' آل عباس اور آل عقیل اور آل حارث بن عبدالمطلب ہیں۔ ﴿ اوعلق الشافعی ﴾ علق تعلیق سے ماخوذ ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے ثبوت پر اپنا قول معلق رکھا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو میرا قول اس کے مطابق ہے۔ کیونکہ اس کا دارومدار بھز بن حکیم پر ہے اور اس پر کلام ہے اور کسی دوسری صحیح حدیث میں زکوٰۃ نہ دینے والے سے مقدار زکوٰۃ سے زائد مال بطور جرمانہ وصول کرنے کا ذکر نہیں۔

حاصل کلام : زکوٰۃ کے ایک مسئلے کے علاوہ یہ بھی ثابت ہوا کہ بنو ہاشم' بنو عبدالمطلب زکوٰۃ نہیں لے سکتے۔ بنو ھاشم میں اولاد علی' اولاد عباس' اولاد عقیل اور اولاد حارث بن عبدالمطلب شامل ہیں۔ یہ بھی زکوٰۃ کا استحقاق نہیں رکھتے۔ امام یوسف کے بقول سید' سید کو زکوٰۃ دے سکتا ہے۔

راوی حدیث : ﴿ بھز بن حکیم ﴾ ابو عبدالملک ان کی کنیت ہے۔ بھز کی "با" پر فتحہ اور ھا ساکن۔ بھز بن حکیم بن معاویہ بن حیدہ۔ حیدہ کی "حا" پر فتحہ "یا" ساکن اور "دال" پر فتحہ' تصغیر ہے۔ بصری ہے۔ طبقہء سادسہ کے تابعی ہیں۔ اس حدیث سے حجت پکڑنے میں اختلاف ہے۔ ابوداؤد کا خیال ہے کہ اس کی احادیث صحیح ہیں۔ ابن معین' ابن مدینی اور نسائی نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے لیکن ابوحاتم نے کہا ہے' اس سے احتجاج نہیں کیا جاتا اور ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ غلطیاں بہت کرتے ہیں۔ ۱۴۰ھ کے بعد وفات پائی اور ایک روایت کے مطابق ۱۶۰ھ کے بعد۔

﴿ عن ابیہ ﴾ یعنی حکیم بن معاویہ' یہ بھی تابعی ہیں۔ ابن حبان نے ان کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔

﴿ عن جدہ ﴾ معاویہ بن حیدہ بن معاویہ بن قشیر بن کعب قشیری صحابیت کے شرف سے مشرف تھے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کی۔ ان سے بھی بہت سی احادیث منقول ہیں۔

(٤٨٩) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا كَانَتْ لَكَ مائَتَا دِرْهَمٍ، وَحَالَ عَلَيْهَا الحَوْلُ، فَفِيهَا خَمْسَةُ	حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تیرے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر پورا سال گزر جائے تو ان میں پانچ درہم زکوٰۃ ہے۔ جب تک تیرے پاس بیس دینار نہ ہوں اور ان

دَرَاهِمَ، وَلَيْسَ عَلَيْكَ شَيْءٌ، حَتَّى يَكُونَ لَكَ عِشْرُونَ دِينَاراً، وَحَالَ عَلَيْهَا الحَوْلُ، فَفِيْهَا نِصْفُ دِينَارٍ، فَمَا زَادَ، فَبِحِسَابِ ذَلِكَ، وَلَيْسَ فِي مَالٍ زَكَاةٌ، حَتَّى يَحُولَ عَلَيْهِ الحَوْلُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَهُوَ حَسَنٌ، وَقَدِ اخْتَلَفُوا فِي رَفْعِهِ.

پر پورا سال نہ گزر جائے۔ اس وقت تک تجھ پر کوئی چیز نہیں جب بیس دینار ہوں تو ان میں نصف دینار زکوٰۃ ہے۔ جو اس سے زیادہ ہو گا تو اسی حساب سے زکوٰۃ ہو گی۔ کسی بھی مال پر اس وقت تک زکوٰۃ نہیں جب تک کہ اس پر پورا سال نہ گزر جائے۔" (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور یہ حسن ہے۔ اس کے مرفوع ہونے میں اختلاف ہے) اور ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جو مالی سال کے

وَلِلتِّرْمِذِيِّ عَنِ ابْنِ عُمَرَ: مَنِ اسْتَفَادَ مَالاً، فَلاَ زَكَاةَ عَلَيْهِ، حَتَّى يَحُولَ عَلَيْهِ الحَوْلُ. وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ.

دوران حاصل ہو اس پر بھی سال گزرنے سے پہلے کوئی زکوٰۃ نہیں اور راجح یہی ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔

لغوی تشریح: ﴿حال عليها الحول﴾ یعنی اس مال پر پورا سال گزر جائے۔ ﴿عشرون دينارا﴾ بیس دینار موجود وزن کے مطابق ساڑھے سات تولہ یعنی ۱۰۵ گرام بنتا ہے۔ ﴿فما زاد فبحساب ذلك﴾ اس سے زائد ہو تو اسی حساب سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو کچھ نصاب سے زائد ہو گا خواہ وہ قلیل ہے یا کثیر' اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ﴿من استفاد مالا﴾ جو حاصل ہوا ہو۔ ﴿والراجح وقفه﴾ راجح بات کے مطابق یہ حدیث موقوف ہے مگر مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ اس میں اجتہاد کیلئے کوئی راستہ اور گنجائش نہیں ہے۔ (سبل)

حاصل کلام: اس حدیث میں سونے اور چاندی کی مقدار زکوٰۃ کا بیان ہے۔ چاندی اگر دو سو درہم سے کم ہو تو اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ یاد رہے کہ درہم کا وزن سوا تین ماشہ ہوتا ہے۔ احتیاطاً ساڑھے باون تولہ نصاب زکوٰۃ مقرر کیا گیا ہے اور سونے کے بیس دینار پر زکوٰۃ ہے۔ ایک دینار برابر ہے بیس مثقال کے یا نوے ماشہ کے جو ساڑھے سات تولہ بنتا ہے اور ایک حساب اس طرح بھی لگایا گیا ہے کہ درہم سوا تین ماشہ کا ہوتا ہے' اس لحاظ سے محتاط اندازے کے مطابق پچاس تولے مقرر کیا گیا ہے اور زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہے اور سونے کا نصاب بیس مثقال ہے اور ایک مثقال بیس قیراط کا وزن تین ماشہ ایک رتی بتایا گیا ہے۔ اس حساب سے تو بیس مثقال سونے کے ساڑھے باسٹھ ماشہ بنتے ہیں (یعنی پانچ تولہ اڑھائی ماشہ) اور اس کی زکوٰۃ بھی چالیسواں حصہ ہے۔ کاغذی نوٹ جو روپیہ کا بدل ہے اس میں بھی زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث دو طریق سے منقول ہے۔ ایک عاصم بن ضمرہ عن علی اور دوسرا حارث الاعور عن علی۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک یہ دونوں طریق صحیح ہیں۔

(٤٩٠) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَيْسَ فِي الْبَقَرِ الْعَوَامِلِ صَدَقَةٌ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ أَيْضاً.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کام کرنے والے بیلوں پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ (اسے ابوداؤد اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ راجح یہی ہے کہ یہ بھی موقوف ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ البقرا لعوامل ﴾ عوامل عاملہ کی جمع ہے۔ عاملہ وہ جانور جو کھیتی باڑی کیلئے جوتتے ہیں، گاہنے کا کام لیتے ہیں، کنوئیں سے پانی نکالنے کا کام لیتے ہیں اور وزنی چیزوں کو کھینچ کر لے جانے کا کام لیتے ہیں اور ایسی دوسری ضروریات کے کام آتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن جانوروں سے پیداوار حاصل کرنے کیلئے کام لیا جائے یعنی آلات و ذرائع کے طور پر استعمال ہوں ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اسی طرح وہ کارخانے جن سے پیداوار حاصل ہوتی ہے اس کی مشینری پر بھی زکوٰۃ نہیں کیونکہ وہ بھی آلات پیداوار اور ذرائع پیداوار ہیں۔

(٤٩١) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ وَلِيَ يَتِيماً لَهُ مَالٌ، فَلْيَتَّجِرْ لَهُ، وَلاَ يَتْرُكْهُ حَتَّى تَأْكُلَهُ الصَّدَقَةُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ، وَلَهُ شَاهِدٌ مُرْسَلٌ عِنْدَ الشَّافِعِيِّ.

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی یتیم کا متولی بنے اسے چاہئے کہ مال یتیم کو تجارت میں لگائے۔ اسے یوں ہی بے کار پڑا نہ رہنے دے کہ زکوٰۃ ہی اسے کھا جائے۔" (اسے ترمذی اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے، البتہ امام شافعی کے پاس ایک مرسل روایت اس کی شاہد ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ من ولی ﴾ علم، یعلم کے باب سے معروف کا صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ جو شخص متولی ہے اور لام پر تشدید کی صورت میں بھی پڑھا گیا ہے۔ ﴿ فلیتجر ﴾ باب افتعال ہے۔ تجارت سے ماخوذ ہے۔ "ولا یترکہ" نہی کا صیغہ ہے یعنی مال یتیم کو یوں بے کار پڑا نہ رہنے دے۔ ﴿ حتی تاکلہ الصدقہ ﴾ کہ زکوٰۃ اسے کھا جائے۔ یعنی سال بہ سال اس پر زکوٰۃ فرض ہوتی رہے اور آہستہ آہستہ ساری جائیداد اسی کی مد میں ادا ہو جائے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یتیم کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر واجب نہ ہوتی تو مال یتیم کے ختم ہونے کا اندیشہ کیسے پیدا ہوتا۔ جمہور کی یہی رائے ہے اور یہی مسلک حق ہے۔

(٤٩٢) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي أَوْفَى رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ:

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جب لوگ زکوٰۃ لے

كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا أَتَاهُ قَوْمٌ بِصَدَقَتِهِمْ قَالَ: اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِمْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

کر حاضر ہوتے تو آپ ان کیلئے یوں دعا فرماتے۔ ''یااللہ! ان پر رحم و کرم فرما۔'' (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: نسائی میں ہے کہ ایک شخص اپنی زکوٰۃ لے کر خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس کیلئے ان الفاظ میں دعا دی۔ اللهم بارك فيه وفي اهله۔ الٰہی! اس شخص اور اس کے اھل میں برکت نازل فرما۔'' اس حدیث سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرامؓ خود حاضر ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں زکوٰۃ پیش کرتے اور رسول اللہ ﷺ ان کیلئے خیر و برکت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دعا کرتے۔

(٤٩٣) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ العَبَّاسَ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ فِيْ تَعْجِيْلِ صَدَقَتِهِ قَبْلَ أَنْ تَحِلَّ، فَرَخَّصَ لَهُ فِيْ ذٰلِكَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالحَاكِمُ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ آیا زکوٰۃ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ادا ہو سکتی ہے؟ تو آپ نے ان کو اس کی اجازت دے دی۔ (ترمذی اور مستدرک حاکم)

لغوی تشریح: ﴿ قبل ان تحل ﴾ مقررہ وقت آنے سے پہلے۔ یحل' حلول سے ماخوذ ہے۔ باب ضرب یضرب ہے۔ یعنی سائل نے پوچھا کہ کیا زکوٰۃ سال گزرنے اور وقت مقررہ سے پہلے ادا ہو سکتی ہے یا نہیں؟

حاصل کلام: زکوٰۃ فرض تو سال گزرنے کے بعد ہوتی ہے مگر نبی ﷺ نے پیشگی ادائیگی کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جس طرح نماز' روزہ اور حج ایسی عبادات اپنے وقت سے پہلے ادا نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی عبادت ہے یہ بھی اپنے وقت سے پہلے ادا نہیں ہو سکتی۔ سفیان ثوری کی یہی رائے ہے حالانکہ یہ استدلال و قیاس کچھ زیادہ وزنی نہیں اس لئے کہ زکوٰۃ کا دیگر عبادات کی طرح ٹائم ٹیبل متعین نہیں۔ اسے اگر قدرے تاخیر سے دیا جا سکتا ہے تو پیشگی بھی ادا ہو سکتی جس کی دلیل یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ جمہور اہل عالم کی بھی یہی رائے ہے۔

(٤٩٤) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُما، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، قَالَ: «لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ أَوَاقٍ مِنَ الوَرِقِ صَدَقَةٌ، وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ ذَوْدٍ مِنَ الإِبِلِ صَدَقَةٌ، وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ''پانچ اوقیہ سے کم چاندی پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اسی طرح اونٹوں کی تعداد پانچ سے کم ہو تو ان پر بھی زکوٰۃ نہیں اور پانچ وسق سے کم کھجوروں پر بھی زکوٰۃ نہیں۔'' (مسلم)

اور مسلم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

خَمْسَةِ أَوْسُقٍ مِنَ التَّمْرِ صَدَقَةٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ أَبِيْ سَعِيْدٍ؛ لَيْسَ فِيمَا دُوْنَ خَمْسَةِ أَوْسَاقٍ مِنْ تَمْرٍ وَلاَ حَبٍّ صَدَقَةٌ. وَأَصْلُ حَدِيْثِ أَبِيْ سَعِيْدٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

پانچ وسق سے کم کھجوروں یا غلہ میں زکوٰۃ نہیں۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کی اصل بخاری و مسلم میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اواق ﴾ اس پر تنوین ہے اور قاف کے بعد "یاء" مشددہ اور مخففہ کی صورت بھی جائز ہے۔ اوقیہ کی جمع ہے۔ اوقیہ کے ہمزہ پر ضمہ اور "یا" پر تشدید۔ ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور یوں پانچ اوقیہ کے دو سو درہم ہیں۔ جدید وزنی پیمانہ کی اصطلاح کے مطابق یہ سات سو پینتیس گرام بنتا ہے۔ ﴿ الورق ﴾ "واؤ" پر فتحہ اور "را" پر کسرہ اور "را" ساکن بھی پڑھی گئی ہے۔ معنی اس کے چاندی "ذود" ذال پر فتحہ اور "واؤ" ساکن۔ اونٹ کے معنی میں۔ یہ اسم جمع ہے اس میں مذکر و مؤنث سبھی شامل ہیں۔ اسی لئے خمس کی اضافت اس کی طرف جائز ہے۔ ﴿ اوسق ﴾ ھمزہ پر فتحہ "واؤ" ساکن اور سین پر ضمہ، وسق کی جمع۔ وسق کی "واؤ" پر فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور پانچ وسق تین سو صاع ہوئے اور ایک صاع میں چار مد آتے ہیں اور ایک مد ایک رطل اور تہائی رطل کے برابر ہوتا ہے۔ پس صاع جدید پیمانہ کی زبان میں اڑھائی کلوگرام کے قریب ہوتا ہے ﴿ اوساق ﴾ وسق کی جمع ہے' اوسق کی طرح ہے۔ ﴿ حب ﴾ "حا" پر فتحہ اور "با" پر تشدید۔ بیج' تخم مثلاً گندم کا بیج' جو' مسور وغیرہ اور لفظ ﴿ دون ﴾ چاروں جگہ ﴿ اقل ﴾ کے معنی میں ہے یعنی کم از کم مراد یہ ہے کہ مذکورہ اشیاء کی اس مقدار سے کم پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں چاندی کا نصاب پانچ اوقیہ بیان ہوا ہے جبکہ اس سے پہلی حدیث میں دو سو درہم ہے۔ ان دونوں احادیث میں کوئی تفاوت و اختلاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور پانچ اوقیہ کے دو سو درہم ہوگئے کوئی تفاوت نہ رہا۔ تین سو صاع حجازی ہمارے ملک میں مروج انگریزی وزن کے اعتبار سے بیس من ہوتے ہیں۔ ایک وسق میں ساٹھ صاع ہوتے ہیں جو چار من کے برابر ہے۔ گویا ہمارے ملکی حساب سے بیس من غلہ سے کم پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ مگر احناف نے کتاب اللہ اور حدیث کے عموم کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فتویٰ دیا ہے کہ غلہ اور کھجور خواہ ایک من یا اس سے بھی کم ہی کیوں نہ ہو اس پر بھی زکوٰۃ ہے مگر پہلی رائے ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خود وزن مقرر فرمایا ہے تو پھر ہمیں اسی پر عمل کرنا چاہئے۔ اپنی جانب سے کم و بیش کرنے کا مجاز نہیں۔ ہر اس جنس میں جو سال بھر ذخیرہ ہو سکتی ہے۔ اس پر زکوٰۃ ہے۔ مثلاً گندم' چاول' جو' باجرہ' مکئی' ماش' مونگ' چنے وغیرہ۔

(٤٩٥) وَعَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، حضرت سالم بن عبداللہ رحمہ اللہ اپنے والد سے روایت

عَنْ أَبِيهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالعُيُونُ، أَوْ كَانَ عَثَرِيّاً، اَلْعُشْرُ، وَفِيمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ العُشْرِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ. وَلِأَبِيْ دَاوُدَ: أَوْ كَانَ بَعْلاً اَلْعُشْرُ، وَفِيْمَا سُقِيَ بِالسَّوَانِي أَوِ النَّضْحِ نِصْفُ العُشْرِ.

کرتے ہیں' انہوں نے نبی ﷺ سے بیان کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جو زمین آسمانی بارش اور چشموں سے سیراب ہوتی ہو یا رطوبت والی ہو اس میں دسواں حصہ زکوٰۃ ہے (عشر ہے) اور جو زمین پانی کھینچ کر سیراب کی جاتی ہو۔ اس میں بیسواں حصہ (نصف عشر) ہے۔" (بخاری) ابوداؤد کی روایت میں "بعلا العشر" کا لفظ ہے "العشر" کی جگہ اور اگر جانوروں کے ذریعہ یا ڈول سے پانی نکال کر سیراب کی جاتی ہو اس میں بیسواں حصہ (نصف عشر) ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ فیما سقت السماء ﴾ اس سے مراد بارش' اولے' برف' شبنم وغیرہ ہے اور یہ خبر مقدم ہے۔ ﴿ والعیون ﴾ عین کی جمع ہے۔ چشمے کو کہتے ہیں جو زمین کا پیٹ چاک کر کے نکل آتا ہے اور بلا کسی مشقت و محنت کے اس کا پانی حاصل ہو جاتا ہے۔ ﴿ او کان عثریا ﴾ "عین" اور "ثا" دونوں پر فتحہ ہے اور "را" کے نیچے کسرہ اور "یا" پر تشدید۔ زمین میں جو رطوبت ہوتی ہے' اس میں سے خوراک حاصل کر کے پروان چڑھتی ہے کیونکہ پانی سطح زمین کے قریب ہوتا ہے اس لئے وہ زمین بغیر سیراب کئے اور پانی چھوڑے پانی حاصل کر لیتی ہے "العشر" مبتداء مؤخر ہے۔ عین پر ضمہ ہے اور شین ساکن ہے۔ ایک چیز کے دس حصے کر لئے جائیں تو اس کا ایک جزء عشر کہلائے گا۔ ﴿ وفیما سقی ﴾ صیغہ مجہول۔ اس زمین میں جسے سیراب کیا جائے ﴿ بالنضح ﴾ نضح کے نون پر فتحہ اور "ضاد" ساکن ہے۔ اصل میں پانی کا چھڑکاؤ کرنا بلکہ خوب پانی بہا دینا۔ یہاں وہ اونٹ مراد ہیں جن کے ذریعہ پانی لا کر زمین سیراب کی جاتی ہے۔ اونٹ کی طرح بیل اور گدھے جن سے پانی حاصل کرنے کی خدمت لی جاتی ہے۔ ﴿ بعلا ﴾ یعنی ﴿ عثریا ﴾ کے بدلے بعلا کا لفظ روایت کیا ہے۔ بعل کی "با" پر فتحہ اور عین ساکن۔ وہ زمین جو سیراب کئے بغیر زمین کی نمی و رطوبت یا آسمانی بارش کے ذریعہ سیراب ہوتی ہو۔ اس کا معنی بھی قریب قریب وہی ہے جو عثری (نمی والی زمین) کا ہے یا پھر دونوں مترادف المعنی ہیں۔ ﴿ بالسوانی او النضح ﴾ سوانی سانیۃ کی جمع ہے۔ عطف اس کا تقاضہ کرتا ہے کہ سانیہ اور نضح کے معنی الگ الگ ہوں مگر عموماً علماء نے انہیں مترادف قرار دیا ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ قابل اعتماد بات یہ ہے کہ سانیہ جانوروں کے ذریعہ پانی لا کر زمین کو سیراب کرنے کا نام ہے اور "نضح" عام ہے اس میں سیراب کرنے کے تمام ذرائع و آلات شامل ہیں۔ اس طرح عام کا عطف خاص پر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زمین کو مختلف ذرائع و وسائل سے سیراب کرنے کی صورت میں زکوٰۃ (عشر) کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ مثلاً جو زمین مشقت طلب ذریعہ سے سیراب ہو جیسے اونٹ' بیل

یا آدمی پانی نکال کر یا لا کر سیراب کرتے ہوں تو اس زمین کی پیداوار پر نصف عشر (بیسواں) حصہ ہے۔ اسی طرح اگر زمین کنوئیں کے پانی' ٹیوب ویل کے پانی سے یا پانی خرید کر سیراب کیا جاتا ہو جیسے نہر کا پانی' ٹیوب ویل کا پانی خرید کر سیراب کیا جاتا ہے تو ایسی صورت میں بھی نصف عشر (بیسواں) حصہ ہے آج کل آبیانہ دے کر زمین سیراب کی جاتی ہے۔ یہ آبیانہ مشقت و محنت کے قائم مقام ہے لہٰذا موجودہ نظام کے تحت نہری پانی سے سیراب کی جانے والی زمینوں کی پیداوار میں بھی بیسواں حصہ ہے۔

(٤٩٦) وَعَنْ أَبِيْ مُوسَى الأَشْعَرِيِّ وَمُعَاذٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُمَا: **لاَ تَأْخُذَا فِي الصَّدَقَةِ إِلاَّ مِنْ هٰذِهِ الأَصْنَافِ الأَرْبَعَةِ: الشَّعِيْرِ، وَالحِنْطَةِ، وَالزَّبِيْبِ، وَالتَّمْرِ.** رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ وَالحَاكِمُ.

وَلِلدَّارَقُطْنِيِّ عَنْ مُعَاذٍ قَالَ: فَأَمَّا القِثَّاءُ وَالبِطِّيْخُ وَالرُّمَّانُ وَالقَصَبُ، فَقَدْ عَفَا عَنْهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ. وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ دونوں سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "جو' گندم' منقیٰ (کشمش) اور کھجور ان چار اصناف کے علاوہ کسی غلہ پر زکوٰۃ وصول نہ کی جائے۔ (اسے طبرانی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دارقطنی نے معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کھیرا ککھڑی' تربوز' انار اور گنے میں البتہ رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ معاف فرمائی ہے۔ مگر اس روایت کی سند میں ضعف ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿الزبيب﴾ خشک انگور (کشمش) ﴿القثاء﴾ "قاف" کے نیچے کسرہ اور "ثا" پر تشدید۔ کھیرا ﴿البطيخ﴾ "با" کے نیچے کسرہ "طاء" پر تشدید۔ تربوز ﴿الرمان﴾ "را" پر ضمہ اور میم پر تشدید۔ انار۔ ﴿القصب﴾ قاف اور صاد دونوں پر فتحہ۔ گنا۔ یہ حدیث زکوٰۃ کی فرضیت کو غلہ اور پھلوں میں انہی چار اصناف پر انحصار کرتی ہے۔ یہ رائے ایک گروہ کی ہے اور دوسرے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو ان چار اصناف کے قائم مقام ہو اور جو ذخیرہ ہو سکتی ہو اور محفوظ رہ سکتی ہو اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اس حدیث میں جو حصر ہے وہ حصر حقیقی نہیں ہے بلکہ وہ حصر اضافی ہے اس مناسبت سے کہ جو اجناس اس دور میں یمن میں دستیاب تھیں اور ان سبزیوں کی مناسبت سے جن پر زکوٰۃ فرض ہی نہیں۔ پس چاول اور مکئی وغیرہ غلہ قسم کی اجناس جنہیں شہروں میں بالعموم لوگ ذخیرہ کر لیتے ہیں' میں زکوٰۃ واجب ہے۔ محققین کے نزدیک یہ رائے زیادہ قابل لحاظ ہے۔

حاصل کلام: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت جو دارقطنی کے حوالہ سے ہے اس میں ضعف اس لئے ہے کہ اس میں ایک راوی ضعیف ہے اور سند بھی منقطع ہے جیسا کہ مصنف نے التلخیص میں وضاحت بیان کی ہے۔

(٤٩٧) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ أَبِيْ حَثْمَةَ حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا خَرَصْتُمْ فَخُذُوا، وَدَعُوا الثُّلُثَ فَإِنْ لَمْ تَدَعُوا الثُّلُثَ، فَدَعُوا الرُّبُعَ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلاَّ ابْنَ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ''جب تم غلہ کا تخمینہ اور اندازہ لگاؤ تو ایک تہائی چھوڑ دیا کرو اگر تہائی نہیں چھوڑ سکتے تو چوتھائی چھوڑ دیا کرو۔'' (ابن ماجہ کے علاوہ اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اذا خرصتم ﴾ یہ خطاب زکوٰۃ وصول کرنے والے عمال کو ہے اور ان کیلئے جو وصولی زکوٰۃ کیلئے دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرتے ہیں اور ''خرص'' اندازہ لگانے' تخمینہ کرنے کو کہتے ہیں۔ یہاں خرص سے مراد انگور اور تر کھجور کا درختوں پر اندازہ ہے۔ ان دونوں کا اندازہ کس طرح لگایا جائے۔ اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اندازہ لگانے والا مرد درخت کے گرد چکر لگائے۔ جب انگور اور کھجور میں مٹھاس پیدا ہو جائے تو سارے پھل پر سرسری طور پر نظر دوڑائے پھر اندازہ لگائے کہ جب یہ انگور خشک ہو کر کشمش کی صورت اختیار کر لیں گے تو اس وقت ان کی مقدار اور وزن اتنا رہ جائے گا اور یہ کھجور جب خشک ہوگی تو اتنی مقدار میں باقی رہ جائے گی۔ اس تخمینہ اور اندازہ لگانے کیلئے ایک ہی آدمی کافی ہے بشرطیکہ وہ منصف مزاج اور عادل ہو ﴿ فخذوا ﴾ پس تخمینہ کے مطابق تم زکوٰۃ وصول کر لو۔ ''خذوا'' امر کا صیغہ ہے اور اخذ سے ماخوذ ہے۔ ﴿ ودعوا الثلث الخ ﴾ مال کے مالکوں کیلئے تخمینہ لگائی گئی مقدار میں سے ۳/۱ حصہ چھوڑ دو ایک قول یہ ہے کہ یہ ۳/۱ یا ۴/۱ حصہ جو مال کے مالکوں کیلئے چھوڑا جاتا ہے وہ اس لئے چھوڑا جاتا ہے کہ مالک خود اپنے اعزاء و اقرباء اور اپنے ہمسایوں کو اور اندازہ لگانے کے وقت پاس سے گزرنے والوں پر صدقہ و خیرات کر سکے اور مالک سے اس کا تقاضا و مطالبہ اسے کسی تنگی اور حرج میں مبتلا کئے بغیر کچھ محتاجوں اور مساکین کیلئے کیا جائے گا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۳/۱ یا ۴/۱ عشر نکالنے سے پہلے ہی اصل مال سے الگ رکھا جائے گا فراخ دلی کے خیال سے کہ پھلوں کا مالک خود اور اپنے اہل و عیال کو کھلا سکے اور ان کی فروخت اس وقت ہوگی جبکہ کھجور رنگ پکڑ کر سرخی مائل ہو جائے۔ اہل و عیال' ہمسائے اور مہمانوں کو فوقیت اور ترجیح دینے کیلئے۔ یہ مقدار جس کے چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے' ان سبزیوں کے قائم مقام ہے جن پر زکوٰۃ نہیں۔ یہ حدیث شریعت اسلامیہ کی خوبیوں اور محاسن میں سے ہے۔ صاحب سبل السلام نے بتایا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ تو معمول کی بات ہے کہ جب پھل پک جائے تو مال کے مالک کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ خود اور اس کے اہل و عیال وہ پھل کھائیں اور لوگوں کو اس قدر کھلائیں کہ وہ ذخیرہ کر کے نہ رکھے جا سکیں۔ عرف عام میں خود کھانے اور دوسروں کو کھلانے کو ان سبزیوں کی جگہ تصور کیا جاتا ہے جو ذخیرہ کر کے رکھی نہیں جا سکتیں۔

راوی حدیث: ﴿ سھل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ ﴾ سھل کے سین پر فتحہ اور ''ھاء'' ساکن ہے۔ ان کا نام عبداللہ یا عامر بن ساعدہ بن عامر انصاری خزرجی مدنی ہے۔ صغار صحابہؓ میں شمار ہوتا ہے۔ ۳ھ میں پیدا

ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے اور مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مدینہ ہی میں وفات پائی۔

(٤٩٨) وَعَنْ عَتَّابِ بْنِ أَسِيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُخْرَصَ العِنَبُ، كَمَا يُخْرَصُ النَّخْلُ، وَتُؤْخَذُ زَكَاتُه زَبِيْباً. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَفِيْهِ انْقِطَاعٌ.

حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ "ہم انگوروں کا اندازہ بھی اس طرح لگائیں جس طرح کھجوروں کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور اس کی زکوٰۃ میں کشمش وصول کی جائے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے مگر اس میں انقطاع ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں انقطاع ہے اس لئے کہ اسے سعید بن مسیب' عتاب بن اسید سے روایت کرتے ہیں اور ابوداؤد کہتے ہیں کہ سعید بن مسیب کا عتاب سے سماع ہی ثابت نہیں۔ مگر امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گو یہ حدیث مرسل ہے لیکن ائمہ کا فتویٰ اس کا مؤید ہے۔

راوی حدیث: ﴿عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ﴾ عتاب میں عین پر فتحہ اور "تا" پر تشدید۔ بن اسید۔ اسید کے ھمزہ پر فتحہ اور سین کے نیچے کسرہ۔ بن ابی العیص بن امیہ بن عبد شمس اموی مکی۔ مشہور صحابی ہیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد حنین کی طرف جانے لگے تو ان کو مکہ پر اپنا عامل مقرر فرمایا۔ اس منصب پر عہد رسالت اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مامور رہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی وفات اسی روز ہوئی جس روز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری ایام تک زندہ رہے۔

(٤٩٩) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ، أَنَّ امرَأَةً أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ وَمَعَها ابْنَةٌ لَّها، وَفِي يَدِ ابْنَتِهَا مَسْكَتَانِ مِنْ ذَهَبٍ، فَقَالَ لَهَا: **«أَتُعْطِيْنَ زَكَاةَ هٰذَا»**؟ قَالَتْ: لاَ، قَالَ: **«أَيَسُرُّكِ أَنْ يُسَوِّرَكَ اللَّهُ بِهِمَا يَوْمَ القِيَامَةِ سِوَارَيْنِ مِنْ نَارٍ»**؟ فَأَلْقَتْهُمَا. رَوَاهُ الثَّلاَثَةُ، وَإِسْنَادُهُ قَوِيٌّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ مِنْ حَدِيْثِ عَائِشَةَ.

حضرت عمرو بن شعیب رحمہ اللہ اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک خاتون نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس کے ہمراہ اس کی بیٹی بھی تھی۔ جس کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن تھے۔ آپؐ نے اس سے فرمایا "کیا تو اس کی زکوٰۃ دیتی ہے؟" اس نے عرض کیا نہیں! آپؐ نے فرمایا "کیا تجھے یہ پسند ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کے بدلے تجھے آگ کے دو کنگن پہنائے؟" یہ سن کر اس خاتون نے دونوں کنگن پھینک دیئے۔ (اسے تینوں نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند قوی ہے۔ حاکم نے اسے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا اور اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ان امراہ﴾ اس خاتون کا نام اسماء بنت یزید بن سکن ہے۔ ﴿مسکتان﴾ کے میم' سین اور کاف تینوں پر فتحہ ہے اور یہ مسکۃ کا تثنیہ ہے یعنی کنگن جو ہاتھوں میں پہنا جاتا ہے۔ فارسی میں کہا جاتا ہے دست برنجن اور کنگن بھی کہا جاتا ہے۔ مسکۃ پازیب کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پازیب وہ زیور ہے جو پاؤں میں اس طرح پہنا جاتا ہے جس طرح کنگن ہاتھوں میں پہنے جاتے ہیں۔ "ایسرکٔ" اس میں ہمزہ استفہامیہ ہے اور فعل مضارع ہے' سرور سے ماخوذ ہے اور کاف مؤنث کے خطاب کیلئے ہے۔ معنی ہے کیا تجھے یہ پسند ہے' خوش لگتا ہے' باعث سرور و مسرت ہے۔ ﴿ان یسورکٔ﴾ تسویر سے ماخوذ ہے' کنگن پہننے کو کہتے ہیں۔ ﴿بھما﴾ ان دونوں کی جگہ ان دونوں کے بدلہ میں یا یہ معنی ہے کہ ان دونوں کے سبب تجھے آگ کے دو کنگن پہنائے جائیں۔ زکوٰۃ کی عدم ادائیگی کی صورت میں۔ ﴿فالقتھما﴾ اس نے وہ دونوں کنگن پھینک مارے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ زیورات پر زکوٰۃ ہے۔ لیکن اس کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ زیور میں زکوٰۃ واجب ہے۔ دوسرا یہ کہ زیور میں زکوٰۃ فرض نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ' احمد رحمہ اللہ اور ایک قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ زیور کی زکوٰۃ اسے عاریتاً دینا ہے' الگ زکوٰۃ نہیں۔ چوتھا قول یہ ہے کہ زیورات میں صرف ایک ہی بار زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ راجح قول یہی ہے کہ زیورات پر زکوٰۃ فرض ہے اور یہ صحیح حدیث اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ اس کے مقابلے میں بعض آثار کی بنا پر جو کہا گیا ہے کہ زیورات میں زکوٰۃ نہیں وہ قابل التفات نہیں۔ (سبل)

(٥٠٠) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّهَا كَانَتْ تَلْبَسُ أَوْضَاحاً مِنْ ذَهَبٍ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَكَنْزٌ هُوَ؟ فَقَالَ: «إِذَا أَدَّيْتِ زَكَاتَهُ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے سونے کا زیور پہن رکھا تھا۔ انہوں نے دریافت کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! کیا وہ کنز ہے؟ فرمایا "جب تو نے اس کی زکوٰۃ ادا کر دی تو پھر یہ کنز نہیں۔" (اسے ابوداؤد اور دارقطنی دونوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اوضاحا﴾ "ضاد" اور "حا" کے ساتھ "وضح" کی جمع ہے "وضح" کے معنی ہیں پازیب یعنی پاؤں کا زیور ﴿اکنزھو﴾ اس میں ہمزہ استفہامیہ ہے۔ یعنی دریافت کیا کہ آیا یہ کنز کی تعریف میں آتا ہے جس کے بارے میں قرآن حمید میں سخت وعید وارد ہے۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھم وجنوبھم وظھورھم' ھذا ماکنزتم لانفکم' فذوقواما کنتم تکنزون (٩

: ۳۴-۳۵) ”یعنی جو لوگ سونے چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اس میں سے خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے......“ ﴿ اذا ادیت زکاتہ ﴾ اس سے زیور میں زکوٰۃ کا وجوب معلوم ہوتا ہے اور سنن ابی داوٗد میں ہے کہ جب مال نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جائے اور اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو پھر وہ کنز نہیں رہتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیور میں نصاب معتبر ہے۔ جب نصاب زکوٰۃ سے کم مالیت کا زیور ہوگا تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

حاصل کلام : اوضاح جیسا کہ اوپر بیان ہوا وضح کی جمع ہے' وضح کہتے ہیں روشن اور چمک دمک کو۔ دراصل تو یہ زیور چاندی سے تیار ہوتا تھا۔ اس ظاہری چمک دمک اور سفیدی کی وجہ سے اسے اوضاح کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں یہ زیور سونے کا بھی تیار کیا جانے لگا۔ اس حدیث سے بھی سونے چاندی سے ساختہ زیورات پر زکوٰۃ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ چاندی کے زیور پر بھی زکوٰۃ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاتھ میں چاندی کے چھلے دیکھے تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ ”اے عائشہ! تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو؟“ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا ”اچھا تو پھر جہنم کی آگ میں سے تمہارے لئے یہی کافی ہیں۔“ حاکم نے اس کی سند کو شیخین کی شرط کے مطابق کہا ہے۔

(۵۰۱) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نَعُدُّهُ لِلْبَيْعِ. رَوَاهُ أبو دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ لَيِّنٌ.

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سامان تجارت سے زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ (اسے ابوداوٗد نے کمزور سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ نعدہ ﴾ ہم اسے تیار کرتے تھے اور فروخت کیلئے حاضر کرتے تھے۔ ﴿ نعدہ ﴾ میں نون پر ضمہ اور عین کے نیچے کسرہ۔ اعداد سے ماخوذ ہے۔ باب افعال ہے۔ یہ حدیث اموال تجارت پر زکوٰۃ کے وجوب کی دلیل ہے۔ ﴿ واسنادہ لین ﴾ ابوداوٗد نے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ پھر منذری رحمہ اللہ نے بھی سکوت کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔ (عون المعبود' ج ۲ ص : ۳)

حاصل کلام : اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اموال تجارت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ مجاہد نے اس کی فرضیت پر قرآن مجید کی آیت ﴿ انفقوا من طیبات ماکسبتم ﴾ سے استدلال کیا ہے اور ابن منذر نے اس کی فرضیت پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ فقہاء سبعہ بھی اسی کے قائل ہیں اور ائمہ اربعہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ مال تجارت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ البتہ ظاہریہ اس کی فرضیت کے قائل نہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں ہے اور اس روایت کا ایک راوی سلیمان بن سمرہ مجہول ہے۔ لیکن متقدمین کا اتفاق اور صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ اس کے مؤید ہیں۔

(۵۰۲) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "معدنیات میں خمس یعنی پانچواں حصہ ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وفی الرکاز ﴾ اس میں "واوٗ" پہلے جملہ پر عطف کیلئے ہے اور وہ جملہ ہے ﴿ العجماء جبار' والبئر جبار' والمعدن جبار ﴾ مصنف نے اختصار کے پیش نظر اتنا حصہ چھوڑ دیا ہے۔ ﴿ والرکاز ﴾ "را" کے نیچے کسرہ۔ جاہلیت کے زمانہ کا زمین میں مدفون خزانہ جو بغیر کسی کثیر عمل و مشقت کے حاصل ہوا ہو۔ ﴿ الخمس ﴾ خا اور میم دونوں پر ضمہ۔ کسی چیز کے پانچ برابر حصے کئے جائیں تو ان میں سے ایک حصہ پانچواں حصہ کہلاتا ہے اور یہ مبتداء مؤخر ہے اور خبر اس کی پہلا جملہ ﴿ فی الرکاز ﴾ ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ رکاز کے مال میں زکوٰۃ نہیں بلکہ خمس ہے۔ اس کی حیثیت اموال غنیمت کی سی ہے۔ اس میں خمس واجب ہے جو بیت المال میں جمع کیا جائے گا اور باقی تمام کا مالک وہ شخص ہوگا جسے یہ خزانہ ملا۔

(۵۰۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ فِي كَنْزٍ وَجَدَهُ رَجُلٌ فِيْ خَرِبَةٍ: «إِنْ وَجَدْتَهُ فِي قَرْيَةٍ مَسْكُونَةٍ فَعَرِّفْهُ، وَإِنْ وَجَدْتَهُ فِي قَرْيَةٍ غَيْرِ مَسْكُونَةٍ فَفِيهِ وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَه بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس خزانے کے بارے میں جو کسی آدمی کو ویرانے سے حاصل ہوا ہو (ملا ہو) فرمایا "اگر تو نے یہ خزانہ کسی آباد جگہ سے پایا ہے تو اس کی تحقیق کیلئے اعلان کرو اور اگر تو نے کسی غیر آباد جگہ سے پایا ہے تو اس میں اور معدنیات میں (پانچواں حصہ) ہے۔"

(اسے ابن ماجہ نے حسن سند سے نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فی خربة ﴾ "خا" پر فتحہ اور "را" کے نیچے کسرہ۔ شکستہ' بے آباد مقام جہاں کوئی رہتا نہ ہو۔ ﴿ فی قریہ مسکونہ ﴾ جہاں لوگ آباد ہوں۔ یعنی یہ ویران اور بے آباد جگہ آبادی میں ہو ﴿ فعرفه ﴾ تعریف سے امر کا صیغہ ہے تو لوگوں میں اس کا اس وقت تک اعلان کرو اور اس کی کیفیت بیان کرو کہ یا تو اس کا مالک آجائے اور یا پھر سال بھر اس پر گزر جائے تو ایسی صورت میں تمہارے لئے اس کا کھانا صحیح اور درست ہے تو گویا اس خزانے کی نوعیت گری پڑی چیز کی سی ہوگی۔ ﴿ وان وجدته ﴾ اور اگر تو اسے غیر آباد جگہ میں پائے تو اس کا حکم' رکاز کا حکم ہوگا اور دونوں کے حکم کی نوعیت اموال غنیمت کے حکم کی ہوگی۔ ﴿ وفی الرکاز ﴾ واوٗ عطف اس بات کا متقاضی ہے کہ جب خزانہ زمین کے پیٹ سے نہ نکالا جائے تو اسے رکاز نہیں کہتے ہیں۔

(۵۰٤) وَعَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَخَذَ مِنَ المَعَادِنِ القَبَلِيَّةِ الصَّدَقَةَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

رسول اللہ ﷺ نے قبل جگہ میں واقع کانوں سے زکوٰۃ وصول کی۔ (ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿ معادن ﴾ "معدن" کی جمع ہے۔ "معدن" میں دال کے نیچے کسرہ ہے۔ کان' زیر زمین اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں سونا' چاندی اور جواہرات وغیرہ اللہ تعالیٰ نے بکثرت پیدا فرمائے ہوں۔ ﴿ القبلیۃ ﴾ "قاف" پر فتحہ اور "با" پر بھی "قبل" کی طرف نسبت ہے۔ "فرع" کے نواح میں ایک جگہ کا نام ہے اور "فرع" میں "فا" پر ضمہ ہے اور "را" ساکن ہے اور ایک قراءت کے مطابق دونوں پر ضمہ بھی ہے۔ مدینہ کے بالائی حصہ میں ساحل سمندر پر واقع زمین جو مکہ و مدینہ کے درمیان مدینہ سے آٹھ برد (تقریباً ۹۶ میل) کے فاصلہ پر ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ جگہ چار دن کی مسافت پر واقع ہے۔ اس میں بہت سی مساجد اور بستیاں ہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کانوں پر زکوٰۃ واجب ہے ان میں خمس نہیں۔ معدن اور رکاز (کان اور دفینہ) دونوں ایک نہیں ہیں۔ لغوی اعتبار سے' حکماً نہ شرعاً۔

راوی حدیث: ﴿ بلال بن حارث رضی اللہ عنہ ﴾ بلال بن حارث مزنیہ قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے مزنی کہلائے۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ۵ھ میں نمائندہ کی حیثیت سے آئے تھے۔ مدینہ میں سکونت اختیار کی۔ پھر بصرہ منتقل ہوگئے تھے۔ فتح مکہ کے روز انہوں نے مزنیہ قبیلہ کا جھنڈا اٹھایا ہوا تھا۔ ۸۰ برس کی عمر میں ۶۰ھ میں وفات پائی۔

١ - بَابُ صَدَقَةِ الفِطْرِ

صدقۂ فطر کا بیان

(٥٠٥) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: فَرَضَ رَسُولُ اللهِ ﷺ زَكَاةَ الفِطْرِ صَاعاً مِنْ تَمْرٍ، أَوْ صَاعاً مِنْ شَعِيرٍ، عَلَى العَبْدِ وَالحُرِّ وَالذَّكَرِ وَالأُنْثَى وَالصَّغِيرِ وَالكَبِيرِ، مِنَ المُسْلِمِينَ، وَأَمَرَ بِهَا أَنْ تُؤَدَّى قَبْلَ خُرُوجِ النَّاسِ إِلَى الصَّلاَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے غلام' آزاد' مرد' عورت' بچے' بوڑھے سب پر صدقہ فطر واجب کیا ہے۔ ایک صاع (ٹوپا) کھجوروں سے یا ایک صاع جو سے اور اس کے متعلق حکم دیا ہے کہ یہ فطرانہ نماز کیلئے نکلنے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔ (بخاری و مسلم)

وَلاِبْنِ عَدِيٍّ وَالدَّارَقُطْنِيِّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ: أَغْنُوهُمْ عَنِ الطَّوَافِ فِي هٰذَا اليَوْمِ.

ابن عدی اور دار قطنی میں ضعیف سند سے ہے کہ اس روز غرباء کو دربدر پھرنے سے بے نیاز کر دو۔

لغوی تشریح: ﴿باب صدقة الفطر﴾ رمضان کے اختتام پر فطرانہ دینا۔ قسطلانی کے بقول فطرانہ کی فرضیت رمضان المبارک کے آغاز سے صرف دو روز پہلے ۲ھ میں ہوئی۔ ﴿فرض﴾ بمعنی واجب اور لازم۔ یعنی اسے واجب اور لازم قرار دیا گیا۔ یہ صدقۂ فطر (فطرانہ) کے وجوب کی واضح دلیل ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ فرض قدر کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن یہ ظاہر کے سراسر خلاف ہے۔ ﴿من المسلمين﴾ کافروں میں سے نہ ہو۔ اس لئے کافر غلام کا صدقۂ فطر نہیں نکالا جاتا۔ ﴿اغنوهم﴾ اغناء سے امر کا صیغہ ہے۔ ضمیر منصوب فقراء کی طرف راجع ہے یعنی "ھم" ضمیر سے مراد محتاج و ضرورت مند لوگ ہیں۔ ﴿عن الطواف﴾ دست سوال دراز کرنے کیلئے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومنے پھرنے سے بے نیاز کر دیں اور لوگوں سے اپنی معاشی ضروریات طلب کرنے سے روک دیں۔ یہ بے نیازی اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ فطرانہ دن کے پہلے حصہ میں ادا کر دیا جائے تاکہ ضرورت مند لوگ اپنی ضروریات کا سامان خرید سکیں اور بے فکر ہو جائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فطرانہ مسلمانوں کے سب افراد پر واجب ہے اور اس کی ادائیگی کا حکم بھی نماز عید سے پہلے پہلے ہے تاکہ معاشرہ کے ضرورت مند حضرات اس روز مانگنے سے بے نیاز ہو کر عام مسلمانوں کے ساتھ خوشیوں اور مسرتوں میں شریک ہو سکیں۔ اس فطرانہ کی مقدار ایک صاع مقرر فرمائی ہے۔ غیر مسلم غلام کا فطرانہ نہیں۔ البتہ جن افراد کی کفالت کسی کے ذمہ ہو ان سب کا فطرانہ وہ خود ادا کرے گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صدقۂ فطر کیلئے نصاب کا مالک ہونا بھی ضروری نہیں۔ فرض کا لفظ بتا رہا ہے کہ فطرانہ ادا کرنا نہایت ضروری اور لازمی ہے۔ امام اسحٰق بن راھویہ رحمہ اللہ نے تو فطرانہ کے وجوب پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

(٥٠٦) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُعْطِيْهَا فِي زَمَنِ النَّبِيِّ ﷺ صَاعاً مِنْ طَعَامٍ، أَوْ صَاعاً مِنْ تَمْرٍ، أَوْ صَاعاً مِنْ شَعِيْرٍ، أَوْ صَاعاً مِنْ زَبِيْبٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِيْ رِوَايَةٍ: «أَوْ صَاعاً مِنْ أَقِطٍ». قَالَ أَبُو سَعِيْدٍ: أَمَّا أَنَا فَلاَ أَزَالُ أُخْرِجُهُ، كَمَا كُنْتُ أُخْرِجُهُ فِي زَمَنِ رَسُولِ اللهِ ﷺ. وَلِأَبِيْ دَاوُدَ: «لاَ أُخْرِجُ أَبَداً إِلاَّ صَاعاً».

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نبی ﷺ کے زمانہ میں گندم سے ایک صاع اور کھجور سے ایک صاع اور جو سے ایک صاع اور کشمش (منقی) سے ایک صاع (فطرانہ) دیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ پنیر میں سے ایک صاع نکالا کرتے تھے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تو ہمیشہ وہی مقدار نکالتا رہوں گا جو میں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نکالا کرتا تھا اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ میں تو ہمیشہ ایک صاع ہی نکالوں گا۔

لغوی تشریح: ﴿ کنا نعطیھا ﴾ ہم دیا کرتے تھے سے مراد ہم صدقہ فطر (فطرانہ) دیا کرتے تھے۔ ﴿ صاعا من طعام ﴾ طعام کا لفظ مابعد مذکور چیزوں کے مابین میں بولا گیا تا کہ طعام اور دوسری اجناس کے مابین فرق و تغائر واضح ہو جائے اور اس سے مراد گندم ہے۔ طعام بول کر اہل عرب عموماً اس سے مراد گندم لیتے ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ "طعام" میں اجمال ہے اور مابعد اس کی تفصیل ہے اور بعض روایات میں اس کی صراحت بھی ہے اس لئے یہی قول راجح ہے۔ ﴿ اقط ﴾ ھمزہ پر فتحہ اور قاف کے نیچے کسرہ۔ پنیر کو کہتے ہیں۔ یہ دراصل دودھ ہوتا ہے جو خشک کر کے جمایا ہوتا ہے اور پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ ﴿ فلا ازال اخرجه ﴾ اور میں ہمیشہ ایک صاع کی مقدار ہی فطرانہ نکالتا رہوں گا خواہ کوئی جنس ہو' گندم ہو یا دوسری اجناس اور ایک صاع میں پانچ رطل پورے اور ۳/ا مزید ہوتے ہیں اور یہ وزن چار مد کے مساوی ہوتا ہے۔ جدید حساب کے مطابق ایک صاع کا وزن اڑھائی کلوگرام کے قریب ہوتا ہے اور اس کا مکمل ضبط تو ممکن نہیں۔ جب کوئی چیز ہلکے وزن کی ہوتی ہے جیسے جو تو صاع اس کی قلیل مقدار سے پورا ہو جاتا ہے اور جب بھاری و ثقیل وزن کی ہوتی ہے تو اس سے بھی زیادہ وزن سے پورا ہوتا ہے۔ یہ حدیث ہر چیز سے فطرانہ ایک صاع کا تقاضا کرتی ہے اور نصف صاع فطرانہ کے فرض کی ادائیگی کیلئے کافی نہیں ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس امر میں بالکل واضح ہے کہ فطرانہ ایک صاع ہی مسنون ہے۔ خواہ کوئی جنس ہو۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کا یہی موقف تھا۔ انہوں نے ایک صاع ہی دینے کا اظہار اسی لئے فرمایا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں آدھا صاع گندم کو پورے صاع جو کے برابر کر دیا اس لئے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کو کہنا پڑا کہ ہم تو اتنا ہی فطرانہ ہر جنس سے ادا کرتے رہیں گے جتنا آپؐ کے دور میں کرتے رہے ہیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اجتہاد سے کام لیا اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور اس پر عمل صحابہؓ کو دلیل بنایا۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی رائے وزنی ہے' اسی پر عمل ہونا چاہئے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے صاع کا اعتبار کیا ہے جنس کی گرانی اور ارزانی کا نہیں جبکہ دوسرے حضرات نے صاع کا نہیں بلکہ قیمت اشیاء کا اعتبار کیا ہے۔

(۵۰۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: فَرَضَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ زَكَاةَ الفِطْرِ طُهْرَةً لِلصَّائِمِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ، وَطُعْمَةً لِلْمَسَاكِينْ، فَمَنْ أَدَّاهَا قَبْلَ الصَّلَاةِ فَهِيَ زَكَاةٌ مَقْبُولَةٌ، وَمَنْ أَدَّاهَا بَعْدَ الصَّلَاةِ فَهِيَ صَدَقَةٌ مِنَ الصَّدَقَاتِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر (فطرانہ) روزہ دار کی لغویات اور فحش گوئی سے روزہ کو پاک کرنے کیلئے اور مساکین کو کھانا کھلانے کیلئے مقرر کیا ہے۔ جو اسے نماز ادا کرنے سے پہلے ادا کر دے وہ تو مقبول ہے اور جو ادائیگی نماز کے بعد دیا جائے تو یہ صدقوں میں ایک صدقہ ہے۔ (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ. کیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ طهرة ﴾ "طا" پر ضمہ۔ منصوب ہے مفعول لہ ہونے کی وجہ سے۔ معنی روزہ دار کے نفس کی طہارت کیلئے۔ ﴿ من اللغو ﴾ لغو کا تعلق زبان و قول سے ہے' دل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ﴿ والرفث ﴾ فحش کلامی۔ ﴿ طعمة ﴾ "طا" پر ضمہ۔ مراد کھانا اور اس کا عطف طهرة کے لفظ پر ہے۔ کہا گیا ہے کہ مساکین کا بالخصوص ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ صدقۂ فطر بھی انہی کا مخصوص استحقاق ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ صدقہ فطر کا مصرف وہی جگہیں ہیں جو زکوٰۃ کے مصارف ہیں۔ بعض اصناف کا نص میں ذکر اس کی تخصیص کو مستلزم نہیں ہے۔ من اداها قبل الصلاة قبل صلاۃ سے مراد ہے نماز عید سے پہلے ﴿ صدقة من الصدقات ﴾ یعنی پھر یہ عام صدقہ ہو گا۔ صدقۂ فطر نہیں ہو گا' اور آدمی فریضہ کا تارک ہی رہے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ فطرانہ مساکین کا حق ہے۔ یہ حق نماز عید سے پہلے ادا کر دینا چاہئے۔ نماز عید کے بعد ادا شدہ فطرانہ ایک عام صدقہ ہو گا' فطرانہ عید نہیں ہو گا۔

٢ - بَابُ صَدَقَةِ التَّطَوُّعِ — نفلی صدقے کا بیان

(٥٠٨) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لاَ ظِلَّ إِلاَّ ظِلُّهُ» - فَذَكَرَ ٱلْحَدِيْثَ - وَفِيهِ: «وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا، حَتَّى لاَ تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "سات قسم کے آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ایسے روز میں سایہ عطا کرے گا جس روز اس کے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہو گا۔" پھر ساری حدیث بیان کی۔ اس میں ہے کہ "ان سات آدمیوں میں وہ آدمی بھی شامل ہے جو ایسے طریقہ سے مخفی طور پر صدقہ دے کہ بائیں ہاتھ تک کو خبر نہ ہونے پائے کہ دائیں ہاتھ سے کیا دیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ سبعة ﴾ سات اقسام و انواع کے لوگ۔ ﴿ يظلهم ﴾ باب افعال سے ماخوذ ہے۔ یعنی ان کو سایہ میں جگہ دے گا۔ ﴿ فی ظله ﴾ اپنے سائے میں۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے عرش عظیم کا سایہ ہے۔ جیسا کہ دوسری احادیث میں ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنی حمایت و حفاظت میں لے لے گا۔ ﴿ يوم لاظل ﴾ جس روز کوئی سایہ نہ ہو گا اس سے مراد قیامت کا دن ہے ﴿ فذكر الحديث ﴾ پھر حدیث بیان فرمائی اور اس میں ان ساتوں کا ذکر کیا جو یہ ہیں۔ (١) امام عادل۔ (٢) وہ نوجوان جس کی نشو و نما اللہ کی عبادت میں ہوئی ہو۔ (٣) وہ آدمی جس کا قلب مسجد سے معلق ہو۔ (٤) ایسے دو آدمی جن کی باہمی

محبت اللہ کیلئے ہو۔ اگر جمع ہوں تب بھی اللہ کی خاطراور اگر جدا جدا ہوں تب بھی ان کی جدائی اللہ کیلئے ہو۔ (۵) وہ آدمی جسے حسب و نسب والی حسین و جمیل نوجوان عورت دعوت برائی دے اور وہ یہ کہہ کر کہ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں' اس کی دعوت کو ٹھکرا دے۔ (۶) وہ آدمی جو تنہائی اور کنج عزلت میں ذکر الٰہی میں ایسا مشغول ہو کہ اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو جائیں۔ (۷) اور ساتواں وہ آدمی ہے جو ایسے مخفی طریقہ سے صدقہ و خیرات کرتا ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔ ﴿ حتی لا تعلم شماله ﴾ بائیں کو خبر نہ ہو کہ دائیں نے کیا دیا۔ دراصل اس میں مبالغہ آرائی ہے کہ صدقہ دیتے وقت ریا کا شائبہ و گمان تک نہ ہو۔ یہ حدیث صدقہ واجبہ اور نافلہ دونوں پر محیط ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے۔ اس روز عرش الٰہی کے علاوہ اور کہیں سایہ میسر نہیں آئے گا۔ عرش کیا ہے۔ اس کی صحیح کیفیت و نوعیت تو اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے۔

اس حدیث میں مرد کی قید اتفاقی ہے ورنہ انہی اوصاف سے متصف اگر کوئی خاتون ہوگی تو اسے بھی یہی ثواب ملے گا۔ نیز اس حدیث سے صدقہ و خیرات مخفی طریقہ سے دینے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ فرض اور واجب صدقہ دکھا کر کھلے عام دینا چاہئے تاکہ لوگوں میں رغبت و شوق پیدا ہو اور نفلی چھپا کر بہتر ہے۔ ضروری اور لازمی نہیں کیونکہ اگر نفلی خیرات عمومی حیثیت کی حامل ہو اور ریا بھی مطلوب نہ ہو تو اس کا بھی کھلے عام دینا زیادہ بہتر ہے۔

(۵۰۹) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: «كُلُّ امْرِئٍ فِي ظِلِّ صَدَقَتِهِ حَتَّى يُفْصَلَ بَيْنَ النَّاسِ». رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ "ہر آدمی اپنے صدقہ کے سایہ میں کھڑا ہوگا یہاں تک کہ لوگوں کا فیصلہ ہو جائے۔" (ابن حبان اور مستدرک حاکم)

حاصل کلام : اس حدیث میں صدقہ کی فضیلت بیان ہوئی ہے کہ صدقہ کرنے والا قیامت کے روز اپنے صدقہ کے سایہ میں کھڑا ہوگا۔ اس روز گرمی و تمازت انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی ہوگی۔ سایہ کا نصیب ہونا اس روز بڑی غیر معمولی نعمت ہوگی۔ سایہ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ واقعتاً صدقہ سائبان کی طرح سایہ دے رہا ہوگا اور صدقہ کرنے والا اس سایہ میں کھڑا سکون و طمانیت محسوس کر رہا ہوگا یا دوسرا معنی یہ کہ صدقہ آدمی کی حمایت کر رہا ہوگا اور اسے بخشوا کر رہے گا۔ صدقات نفلیہ کا ایک مفید پہلو یہ بھی ہے کہ فرض زکوٰۃ میں اگر کسی قسم کی کمی یا نقص رہ گیا ہوگا تو اس سے وہ پورا کر دیا جائے گا۔

(۵۱۰) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی نبی ﷺ سے روایت

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: أَيُّمَا مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِماً ثَوْباً عَلَى عُرْيٍ كَسَاهُ اللّٰهُ مِنْ خُضْرِ الجَنَّةِ، وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ أَطْعَمَ مُسْلِماً عَلَى جُوعٍ أَطْعَمَهُ اللّٰهُ مِنْ ثِمَارِ الجَنَّةِ، وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقَى مُسْلِماً عَلَى ظَمَإٍ سَقَاهُ اللّٰهُ مِنَ الرَّحِيقِ المَخْتُومِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَفِيْ إِسْنَادِهِ لِيْنٌ.

ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جو مسلمان اپنے برہنہ بھائی کو کپڑا پہنائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے سبز ریشمی کپڑے پہنائے گا اور جو مسلمان اپنے کسی بھوکے مسلمان بھائی کو کھانا کھلائے گا اللہ تعالیٰ اسے جنت کے پھل کھلائے گا اور جو مسلمان اپنے پیاسے مسلمان بھائی کو پانی (یا مشروب) پلائے گا اللہ تعالیٰ اسے جنت کی مہر بند پاکیزہ شراب پلائے گا۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ اس کی سند میں کمزوری ہے)

لغوی تشریح: ﴿کسا﴾ کے معنی ہیں کسی کو لباس پہنانا۔ ﴿علی عری﴾ "عری" کے عین پر ضمہ اور "را" ساکن یہ مصدر واقع ہو رہا ہے۔ یعنی ایسی حالت کہ اس کے جسم پر لباس نہیں۔ من خضر الجنه - خضر کے "خا" پر ضمہ اور ضاد ساکن یہ اخضر کی جمع ہے۔ یعنی جنت کا سبز لباس۔ ﴿علی جوع﴾ بھوکے کو۔ ﴿جائعا﴾ بھوکا' خالی پیٹ۔ ﴿علی ظما﴾ شدید پیاس کی حالت میں۔ "ظا" اور "میم" دونوں پر فتحہ یعنی پیاسا۔ ﴿الرحیق﴾ خالص شراب جس میں نشہ نہ ہو۔ ﴿المختوم﴾ مہربند جسے مہر لگا کر منہ بند کر دیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کو جنت کی ایسی شراب پلائے گا جس کو کستوری کی مہر لگا کر بند کر دیا گیا ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے عمل کا آخرت میں جو بدلہ عنایت فرمائے گا وہ اس کی جنس سے ہوگا۔ البتہ جنت کا لباس دنیا کے لباس سے عمدہ' بہترین' خوبصورت اور قیمتی ہوگا۔ بدلہ اسے ملے گا جس کا عمل شرف قبولیت سے مشرف ہوگا۔ قبولیت عمل کیلئے دو شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مشروع و مسنون ہو غیر مشروع نہ ہو اور دوسرا اس سے مقصود و مطلوب اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا کا حصول ہو۔ شہرت و ریا کاری اور دکھاوا مطمع نظر نہ ہو۔

حدیث میں پیاسے' ننگے اور بھوکے کا ذکر کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہٹے کٹے نوجوان توانا کو اور مالدار اور پیشہ ور گداگر کو نہ دیا جائے۔ حقیقی ضرورت مند و حاجت مند کو دیا جائے۔ اس سے غرباء کی امداد پر جنت کی ابدی اور لازوال نعمتوں کی بشارت ملتی ہے۔ سربند شراب پیش کرنے سے عز و شرف بھی حاصل ہوگا اور شراب میں کسی قسم کی آمیزش بھی نہ ہوگی۔ اس حدیث میں کمزوری جس کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ اس کی سند میں ابوخالد یزید بن عبدالرحمٰن مختلف فیہ راوی ہے۔

(۵۱۱) وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی نبی ﷺ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا "اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ آغاز و ابتداء ان سے کر

السُّفْلَى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ، وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى، وَمَنْ يَسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللَّهُ، وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللَّهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

جن کی تو کفالت اور عیالداری کرتا ہے اور بہتر صدقہ وہ ہے جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد دیا جائے۔ جو شخص دست سوال دراز کرنے سے بچے گا اللہ تعالیٰ اسے بچا لے گا اور جو استغناء کا مظاہرہ کرے گا اللہ تعالیٰ اسے مستغنی (بے پروا) کر دے گا۔" (بخاری و مسلم، متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ الید العلیا ﴾ اوپر والے ہاتھ سے مراد دینے والا ہاتھ ہے۔ ﴿ الید السفلی ﴾ نیچے والے ہاتھ سے مراد ہے لینے والا، سوال کرنے والا۔ ﴿ ابدا ﴾ شروع کر، ابتداء و آغاز کر یعنی دو اور خرچ کرو۔ ﴿ بمن تعول ﴾ جن کا نان و نفقہ تیرے ذمہ ہو۔ ﴿ ماکان عن ظھرغنی ﴾ اپنی ضروریات کی تکمیل کے بعد جو زائد بچ رہے اور صاحب مال کو اس کی چنداں ضرورت و حاجت بھی نہ رہے اور لفظ ظھر محض کلام میں وسعت کیلئے استعمال کیا ہے۔ ﴿ ومن یستعفف ﴾ جو سوال کرنے، مانگنے سے بچنا چاہئے۔ ﴿ یعفه الله ﴾ باب افعال سے اعف یعف سے ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ بچنے کی توفیق سے نواز دیتا ہے۔ ﴿ ومن یستغن ﴾ یعنی جو کچھ اس کے پاس ہے۔ خواہ کم مقدار میں ہو یا کثیر، اسی پر قناعت کرتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر گھر کے افراد ضرورت مند و محتاج ہوں تو ان پر اپنا مال خرچ کرنا بھی نیکی اور صدقہ ہے۔ ان کی موجودگی میں دوسرے کو صدقہ دینا کوئی مستحسن عمل نہیں۔ مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بہتر مال وہ ہے جسے آدمی اپنے اہل و عیال اور گھر والوں پر صرف کرے یا جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرے یا پھر اپنے احباب و رفقاء اور دوستوں پر (شرعی حدود میں رہتے ہوئے) خرچ کرے۔ اس حدیث میں صدقہ دینے کی فضیلت کے ساتھ ساتھ سوال کرنے اور بلا ضرورت مانگنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور جو از خود مانگنے سے بچنا چاہے اسے اللہ تعالیٰ اپنے ہاں سے اسباب پیدا فرما کر بچا لیتا ہے۔

(٥١٢) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قِيْلَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَيُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: جُهْدُ الْمُقِلِّ، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا "کم مال والے کا صدقہ اور صدقہ کی ابتداء ان سے کر جن کی تو کفالت کرتا ہے۔" (اسے احمد، ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ، ابن حبان اور

وَالحَاكِمُ. حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿جهد المقل﴾ الجهد کے "جیم" پر ضمہ اور "ھا" ساکن۔ ہمت' طاقت اور اگر فتحہ پڑھا جائے تو پھر اس کے معنی مشقت و محنت کے ہیں۔ المقل کے میم پر ضمہ اور قاف کے نیچے کسرہ۔ قلیل مال والا آدمی ہے معنی یہ ہوئے کہ جب آدمی کے پاس مال کی کمی ہو پھر اتنا صدقہ و خیرات کرے جتنی اس کی حالت اجازت دیتی ہے تو ایسی حالت میں کیا ہوا صدقہ دوسرے صدقات سے افضل ہے۔ بظاہر یہ حدیث پہلی حدیث کے معارض ہے جس کے الفاظ ہیں۔ افضل الصدقة ما كان عن ظهر غنى ان کے مابین تطبیق یہ ہے کہ اس دوسری حدیث سے وہ شخص مراد ہے جو صدقہ کرنے کے بعد فقر کی مشقت کو برداشت نہیں کر سکتا اور پہلی حدیث اس آدمی کے بارے میں ہے جو ایسے حالات میں صبر و برداشت کر سکتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے غنی سے نفس و ضمیر کا استغناء مراد ہے اس اعتبار سے ان میں کوئی تفاوت نہیں رہتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے دو باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ امیر و مالدار اور غریب و مفلس کے صدقہ و خیرات میں نمایاں فرق ہے۔ اور دوسری یہ کہ اپنے اہل و عیال کے حقوق ادا کرنے کے بعد صدقہ و خیرات کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ خود تو صدقہ دیتا پھرے اور اس کے اہل و عیال محتاج ہوں اور دوسروں کے روبرو دست سوال دراز کرتے پھریں۔ اس لئے اپنے گھر والوں کی جائز شرعی ضروریات کی تکمیل کے بعد دوسروں کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ اول خویش بعد درویش کا محاورہ اس پر خوب چسپاں ہے۔

(٥١٣) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «تَصَدَّقُوا»، فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللهِ! عِنْدِيْ دِيْنَارٌ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى نَفْسِكَ»، قَالَ: عِنْدِيْ آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى وَلَدِكَ»، قَالَ: عِنْدِيْ آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى زَوْجَتِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى خَادِمِكَ»، قَالَ: عِنْدِيْ آخرُ، قَالَ: «أَنْتَ أَبْصَرُ بِهِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "صدقہ و خیرات کرو۔" ایک آدمی نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس ایک دینار ہے۔ "آپؐ نے فرمایا "اسے تو اپنی ذات پر خرچ کر۔" وہ بولا میرے پاس ایک اور بھی ہے' آپؐ نے فرمایا "اسے اپنی اولاد پر صدقہ (خرچ) کر۔" اس نے پھر عرض کیا میرے پاس ایک اور بھی ہے' آپؐ نے فرمایا "اسے اپنی اہلیہ پر صدقہ (خرچ) کر۔" اس نے پھر عرض کیا میرے پاس ایک اور بھی ہے' آپؐ نے فرمایا "اسے اپنے خادم پر صدقہ (خرچ) کر" وہ بولا حضور ﷺ میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ آپؐ نے

فرمایا ”اس کے خرچ کرنے کی تجھے زیادہ سمجھ بوجھ ہے۔“ (اسے ابوداوَد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿تصدق به علی نفسك﴾ "تصدق" انفق کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی خرچ کر۔ صدقہ کا لفظ بول کر مراد انفاق لینے سے اس جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حقدار کیلئے خرچ کرنا اجر و ثواب میں صدقہ کرنے کے برابر ہے۔ ﴿انت ابصر﴾ یعنی تجھے زیادہ علم ہے کہ تیرے خرچ کرنے کا کونسا زیادہ مستحق ہے؟ اب تیری مرضی پر منحصر ہے کہ چاہے تو اسے بھی خرچ کر دے اور چاہے اسے اپنے پاس روک رکھ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا اپنی ذات پر حدود شرعی کے اندر رہتے ہوئے خرچ کرنا بھی صدقہ و خیرات کرنے کی طرح اجر و ثواب رکھتا ہے۔ ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے کہ پہلے اپنی ذات پر پھر اولاد پر پھر بیوی پر پھر خادم پر جو کچھ بچ جائے اسے اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ چاہے تو کسی جگہ خرچ کر دے اور چاہے اسے اپنے پاس محفوظ رکھے' آئندہ کسی کام آئے گا۔ للذا ثابت ہوا کہ اہل حقوق کی ترتیب کے اعتبار سے خرچ کرنا واجب ہے تا کہ کسی مستحق کا استحقاق مجروح نہ ہو۔

(٥١٤) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «إِذَا أَنْفَقَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ طَعَامِ بَيْتِهَا، غَيْرَ مُفْسِدَةٍ، كَانَ لَهَا أَجْرُهَا بِمَا أَنْفَقَتْ، وَلِزَوْجِهَا أَجْرُهُ بِمَا اكْتَسَبَ، وَلِلْخَازِنِ مِثْلُ ذَلِكَ، لَا يَنْقُصُ بَعْضُهُمْ مِنْ أَجْرِ بَعْضٍ شَيْئاً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جب عورت اپنے گھر کے مال سے فضول خرچی کئے بغیر خرچ کرے تو اسے خرچ کرنے کے بدلے میں اجر و ثواب ملے گا اور اس کے شوہر کیلئے کمانے کا ثواب اور اسی طرح خزانچی کیلئے بھی اجر ہے ہر ایک کا ثواب دوسرے کے ثواب میں سے کچھ بھی کم نہیں کرے گا۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿غير مفسدة﴾ یعنی فضول خرچی' اسراف و تبذیر بیوی کو خاوند کے مال سے خرچ کرنے کی اجازت۔ شوہر کی جانب سے بیوی کو صریح طور پر اجازت ملنے پر محمول کیا جائے گا یا کسی اشارہ وغیرہ پر۔ جیسا کہ معاشرہ میں یہ چیز معروف و معلوم ہے کہ خاوند کی اجازت کے بغیر معمولی چیزوں کو خیرات میں دے دینا قابل مؤاخذہ تصور نہیں کیا جاتا۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ گویا اس کی بیوی کو اجازت دے دی گئی ہے۔

حاصل کلام: عورت کو خاوند کی اجازت کے بغیر اتنا صدقہ و خیرات نہیں کرنا چاہئے کہ خاوند کے گھر کا معاشی نظام متاثر ہو کر برباد ہو جائے اور شوہر کیلئے معاشی مشکلات اور دشواریاں کھڑی ہو جائیں۔ معمولی

صدقہ مثلاً سائل کو روٹی دے دی یا تھوڑا بہت آٹا دے دیا یا پڑوسی کو تھوڑی بہت نمک مرچ دے دی وغیرہ۔ اس صدقہ میں بیوی کے ساتھ اس کا شوہر کما کر لانے کی وجہ سے' خزانچی اس کی حفاظت کرنے کی وجہ سے اور خادم خدمت گاری کی بنا پر اجر و ثواب کے مستحق ہیں کسی کے اجر میں سے کمی نہیں کی جائے گی' ہر ایک کو اس کا پورا پورا اجر ملے گا۔

(٥١٥) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَتْ زَيْنَبُ امْرَأَةُ ابْنِ مَسْعُودٍ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّكَ أَمَرْتَ الْيَوْمَ بِالصَّدَقَةِ، وَكَانَ عِنْدِي حُلِيٌّ لِيْ، فَأَرَدْتُ أَنْ أَتَصَدَّقَ بِهِ، فَزَعَمَ ابْنُ مَسْعُودٍ أَنَّهُ وَوَلَدَهُ أَحَقُّ مَنْ تَصَدَّقْتُ بِهِ عَلَيْهِمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «صَدَقَ ابْنُ مَسْعُودٍ، زَوْجُكِ وَوَلَدُكِ أَحَقُّ مَنْ تَصَدَّقْتِ بِهِ عَلَيْهِمْ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ زینب رضی اللہ عنہا آئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! آپؐ نے آج صدقہ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ میرے پاس میرا ذاتی زیور ہے میں اسے صدقہ کرنا چاہتی ہوں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا خیال ہے کہ وہ اور ان کی اولاد میرے صدقے کے زیادہ حقدار ہیں آپؐ نے فرمایا "ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ٹھیک کہا ہے' تیرا شوہر اور اس کی اولاد تیرے صدقے کے زیادہ مستحق ہیں۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ حلى ﴾ "حا" پر ضمہ اور کسرہ دونوں ہیں اور "لام" پر کسرہ اور تشدید اور "یا" پر بھی تشدید۔ حلی کی جمع ہے حلی کی "حا" پر فتحہ اور لام ساکن۔ سونے چاندی کے وہ زیور جو عورت تزئین و آرائش کیلئے پہنتی ہے یا پھر اس سے ڈورے میں پروئے ہوئے گھونگے' سلیمانی منکے یا کوڑیاں مراد ہیں۔ نیز شیشے وغیرہ کے سوراخ دار دانے اور عمدہ پتھر کے نگینے وغیرہ۔ یہ اس امر کے جواز کی دلیل ہے کہ بیوی شوہر کے معاملات و مصالح میں اپنی زکوٰۃ دے سکتی ہے بشرطیکہ شوہر محتاج اور عیال دار ہو۔

حاصل کلام: لفظ صدقہ نفلی صدقہ اور فرض زکوٰۃ اور صدقہ فطر (فطرانہ) سب پر مشترک طور پر بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی زکوٰۃ کی تقسیم کے مصارف کے موقع پر لفظ صدقہ ہی استعمال ہوا ہے اگر اس بات کا کوئی قرینہ واضح موجود نہ ہو کہ یہاں عام صدقہ مراد ہے تو ایسی صورت میں اصول یہ ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ (فرضی صدقہ) ہوتا ہے۔ اس مقام پر بھی بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرضی صدقہ ہے اس لئے کہ نفلی صدقہ کے متعلق پوچھنے کی تو ضرورت ہی نہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک بیوی اپنے شوہر کو اپنی زکوٰۃ دے سکتی ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بیوی اپنے شوہر کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی مگر ان کا یہ قول اس صریح حدیث کے مخالف ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ شوہر اپنی اہلیہ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا۔ اس حدیث کی روشنی میں جب بیوی فرضی زکوٰۃ دے سکتی ہے تو نفلی بدرجہ اولیٰ دے سکتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ زینب رضی اللہ عنہا ﴾ یہ عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ محترمہ ہیں۔ بنو ثقیف سے

ہونے کی وجہ سے ثقفیہ کہلائیں۔ ان کے باپ کا نام معاویہ یا عبداللہ بن معاویہ یا ابو معاویہ ہے۔ یہ نبیؐ اور اپنے شوہر سے روایت کرتی ہیں اور حضرت عمرؓ سے بھی۔ ان سے ان کے بیٹے' بھتیجے اور بعض دوسرے احباب نے روایت کیا ہے۔

(٥١٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَزَالُ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ، حَتَّى يَأْتِيَ يَوْمَ القِيَامَةِ، وَلَيْسَ فِي وَجْهِهِ مُزْعَةُ لَحْمٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو لوگ گداگری اور بھیک مانگنے کو پیشہ ہی بنا لیتے ہیں قیامت کے روز ایسی حالت میں آئیں گے کہ ان کے چہرے پر گوشت نہیں ہو گا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ مضغة ﴾ اور ایک نسخہ میں ﴿ مزعة ﴾ بھی ہے۔ دونوں میں پہلے حرف پر ضمہ ہے اور دوسرا حرف ساکن ہے' اس کے معنی ٹکڑے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے ایسے آدمی کی قیامت کے روز قدر و منزلت اور عزت و وجاہت نہیں ہوگی اور ذلیل و خوار اور گری ہوئی توقیر کے ساتھ آئے گا اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ اسے اتنا عذاب دیا جائے گا کہ چہرے کا گوشت تک اڑ جائے اور جب اٹھایا جائے تو چہرہ صرف ہڈیوں کا خالی خولہ ڈھانچہ رہ جائے اور اسے اس کی پہچان کی علامت بنا دیا جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے گداگری کے پیشہ کی مذمت معلوم ہو رہی ہے۔ سوال صرف تین قسم کے آدمیوں کیلئے جائز ہے۔ ایک وہ شخص جو آفات ناگہانی کی زد میں آجائے اور سارا مال برباد ہو جائے۔ خورد و نوش کیلئے بھی باقی کچھ نہ بچے۔ اسے اپنے گزارہ کی حد تک مانگنے کی اجازت ہے اور ایسے آدمی کی مدد کرنا ضروری ہے۔ دوسرا وہ شخص جو کسی ناحق تاوان یا قرض کے گرداب میں پھنس جائے تو وہ مانگ کر اتنی رقم پوری کر سکتا ہے اور تیسرا وہ شخص جو دیانت داری سے کام کرتا ہے اور کرنا بھی چاہتا ہے مگر پوری کوشش کے باوجود کام نہ مل سکے یا جائز مصارف و اخراجات سے آمدنی کم ہو اور گھریلو معاشی ضروریات پوری نہ ہو رہی ہوں اور فاقہ کشی کی نوبت کا اندیشہ لاحق ہو جائے تو ایسا آدمی بھی معاشرے کے دوسرے لوگوں سے مانگ کر اپنی ضروریات پوری کرنے کا استحقاق رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ غیر مستحق لوگ محض پیسہ جمع کرنے کی خاطر مانگتے ہیں ان کا انجام قیامت کے روز وہی ہو گا جس کا ذکر مذکورہ بالا حدیث میں ہوا ہے۔

(٥١٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ سَأَلَ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ تَكَثُّراً، فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْراً، فَلْيَسْتَقِلَّ أَوْ لِيَسْتَكْثِرْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو آدمی اپنا مال بڑھانے اور زیادہ کرنے کی غرض سے لوگوں سے مانگتا ہے تو ایسا آدمی اپنے لئے انگاروں کے سوا اور کوئی چیز نہیں مانگتا۔ اب اس کی مرضی ہے چاہے انہیں کم کرلے چاہے

زیادہ۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ تکثرا ﴾ مال کو زیادہ کرنے کی غرض سے۔ اپنی حاجت و ضرورت کو پورا کرنے کیلئے نہیں۔ ﴿ جمرا ﴾ آگ کا دھکتا ہوا انگارا۔ ﴿ فلیستقل الخ ﴾ یعنی چاہے کم لے یا زیادہ حاصل کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے گداگری کا پیشہ ناجائز ثابت ہوتا ہے۔ توانا و قوی الجثہ آدمی کا سوال کرنا معاشرہ میں بے عزت کرنے کا موجب ہوتا ہے جن لوگوں نے بلاوجہ مانگنے کو اپنا معمول بنا لیا ہو ان کو خیرات دینا محل نظر ہے۔

(۵۱۸) وَعَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: **لأَنْ يَأْخُذَ أَحَدُكُمْ حَبْلَهُ، فَيَأْتِيَ بِحُزْمَةِ الحَطَبِ عَلَى ظَهْرِهِ، فَيَبِيْعَهَا، فَيَكُفَّ بِهَا وَجْهَهُ، خَيْرٌ لَّهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ النَّاسَ، أَعْطَوهُ أَوْ مَنَعُوهُ.** رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر تم میں سے کوئی رسی لے کر لکڑیوں کا گٹھا جنگل سے اپنی پشت پر اٹھا کر لائے پھر اسے فروخت کر دے پس اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے چہرے کو مانگنے سے روک دے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے مانگتا پھرے اور وہ اس کو دیں یا نہ دیں۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ بحزمة الحطب ﴾ حزمہ "حا" پر ضمہ اور "زا" ساکن۔ لکڑیوں کا گٹھا۔ ﴿ فیکف اللہ بھا وجھہ ﴾ یعنی اللہ اس کے ذریعہ سے اس کے چہرے کو محفوظ رکھتا ہے اور دست سوال دراز کرنے کی رسوائی سے باز رکھتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے گداگری اور بھیک مانگنا قابل مذمت فعل ہے۔ کما کر کھانا، محنت و مشقت کر کے حاصل کرنا بہتر ہے۔ سوالی و گداگر کو اگر کچھ مل بھی جائے تو سوال کرنے کی ذلت کیا کچھ کم ہے۔ بھیک مانگنے سے عزت و آبرو نہیں رہتی۔ معاشرہ میں وقار کم ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی نگاہوں میں ایسے آدمی کا کوئی مقام و مرتبہ نہیں رہتا۔ مفت خوری کی بد عادت ایسے آدمی کو کاہل و سست بنا کر رکھ دیتی ہے۔ معاشرے کی ترقی متاثر ہو جاتی ہے۔ نوبت بسا اوقات بایں جا رسید کہ خودکشی کی نوبت اور چوری اور ہیرا پھیری ایسی بری عادات کا خوگر بن کر رہ جاتا ہے۔

(۵۱۹) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**المَسْأَلَةُ كَدٌّ يَكُدُّ بِهَا الرَّجُلُ وَجْهَهُ، إِلاَّ أَنْ يَسْأَلَ الرَّجُلُ سُلْطَاناً أَوْ فِي أَمْرٍ لاَ بُدَّ**

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سوال کرنا ایک زخم ہے جس سے انسان اپنے چہرے کو زخمی کرتا ہے البتہ ایسا شخص جو مجبوری کی وجہ سے سوال کرے یا سربراہ مملکت سے۔" اس کے لیے کوئی حرج نہیں۔ (اسے

مِنْهُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿کدوح﴾ "کاف" اور "دال" دونوں پر ضمہ۔ کدح کی جمع ہے اور کدح کے کاف پر فتحہ اور دال ساکن ہے۔ خراش' زخم کو کہتے ہیں یعنی اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات اور خراشوں کی ایسی علامات ہوں گی جو فی الحقیقت ناپسندیدہ ہوں گی یا یہ کہ اس کے چہرے پر ذلت و رسوائی اور اہانت کے نشانات ہویدا ہو رہے ہوں گے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بغیر ضرورت کسی سے مانگنا جائز نہیں اور ضرورت مند کو بھی بادشاہ اور سربراہ مملکت سے مانگنا چاہئے کیونکہ حاجت مندوں کا بیت المال پر حق ہے اور بادشاہ سے سوال اپنے حق کے حصول کیلئے ہے۔ اس میں کسی کے امتنان و احسان کا کوئی تعلق نہیں۔

٣ - بَابُ قِسْمِ الصَّدَقَاتِ

اشیاء خیرات کو بانٹنے کا بیان

(٥٢٠) عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ إِلاَّ لِخَمْسَةٍ: لِعَامِلٍ عَلَيْهَا، أَوْ رَجُلٍ اشْتَرَاهَا بِمَالِهِ، أَوْ غَارِمٍ، أَوْ غَازٍ فِي سَبِيلِ اللهِ، أَوْ مِسْكِينٍ تُصُدِّقَ عَلَيْهِ مِنْهَا فَأَهْدَى مِنْهَا لِغَنِيٍّ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَأُعِلَّ بِالإِرْسَالِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مالدار کیلئے پانچ صورتوں کے علاوہ صدقہ حلال نہیں ہے (١) زکوٰۃ کا مال اکٹھا کرنے کی صورت میں (٢) وہ شخص جو اپنے مال سے صدقہ کی کوئی چیز خریدے (٣) مقروض (٤) فی سبیل اللہ جہاد کرنے والا (٥) مسکین پر جو صدقہ کیا گیا ہو اس میں سے وہ کچھ مالدار کو تحفہ کے طور پر دے۔" (اسے احمد' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اسے مرسل ہونے سے معلول قرار دیا گیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لغنی﴾ غنی اسے کہتے ہیں جس کی ملکیت میں اوقیہ کے مساوی چیز ہو یا اتنی کہ صبح و شام اس کیلئے کافی ہو جائے۔ ﴿لعامل علیھا﴾ عامل سے مراد وہ کارندہ اور تحصیل دار ہے جو صدقہ کی وصولی کیلئے کام کرتا ہے۔ مثلاً اسے اکٹھا کرنے والا' حساب رکھنے والا' تحریر کرنے والا۔ اس کیلئے کارکردگی کا معاوضہ لینا جائز ہے خواہ وہ خود مالدار ہی کیوں نہ ہو۔ ﴿غارم﴾ مقروض' قرضدار۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ باہمی رقابت و دشمنی کی اصلاح کیلئے قرض لینا یا کسی پر کوئی بوجھ آن پڑا ہے اسے اتارنے کیلئے قرض لینا۔ رہا اپنی ذات کیلئے قرض کا حصول تو اگر وہ اس کے ادا کرنے کی قدرت و استطاعت ہی نہ رکھتا ہو تو پھر وہ فقراء کے زمرہ میں شامل ہوگا ورنہ اسے غنی شمار کیا جائے گا اس لئے صدقہ لینا حلال نہیں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غنی کیلئے زکوٰۃ لینا حلال نہیں۔ غنی کون ہے؟ اس کی تعریف

میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ ابوداؤد میں ہے کہ آپؐ سے پوچھا گیا کہ غنی کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا "جس کے پاس اتنی چیز ہو کہ اس کی صبح و شام کی گزر بسر ہو سکے۔" اور نسائی میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "جس کی ملکیت میں ایک اوقیہ (دس روپیہ) ہو پھر وہ سوال کرے تو اس نے لپٹ چمٹ کر سوال کیا۔"

(٥٢١) وَعَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَدِيِّ بْنِ الخِيَارِ، أَنَّ رَجُلَيْنَ حَدَّثَاهُ: أَنَّهُمَا أَتَيَا رَسُولَ اللهِ ﷺ يَسْأَلاَنِهِ مِنَ الصَّدَقَةِ، فَقَلَّبَ فِيْهِمَا البَصَرَ، فَرَآهُمَا جَلْدَيْنِ، فَقَالَ: **إِنْ شِئْتُمَا أَعْطَيْتُكُمَا، وَلاَ حَظَّ فِيْهَا لِغَنِيٍّ، وَلاَ لِقَوِيٍّ مُكْتَسِبٍ**. رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَقَوَّاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

حضرت عبیداللہ بن عدی بن خیار رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ دو آدمیوں نے انہیں اپنا واقعہ سنایا کہ وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دونوں نے آپؐ سے صدقہ کا سوال کیا۔ آپؐ نے ان دونوں کو ایک نظر اٹھا کر اوپر سے نیچے تک دیکھا تو دونوں کو طاقتور پایا۔ آپؐ نے فرمایا "**اگر تم چاہتے ہو تو تمہیں صدقہ دے دیتا ہوں مگر مالدار اور صحت مند کماؤ آدمی کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں۔**" (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد اور نسائی نے اسے قوی کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فقلب فیهما البصر﴾ آپؐ نے اپنی نگاہیں ان کی طرف اٹھا کر اوپر نیچے سے ان کو دیکھا۔ ﴿جلدین﴾ جیم پر فتحہ اور لام ساکن اور اس پر کسرہ بھی جائز ہے۔ مضبوط و قوی آدمی ﴿لا حظ﴾ کوئی حصہ نہیں اور نہ کوئی حق ہے۔ ﴿لقوی مکتسب﴾ صیغۂ اسم فاعل۔ اپنی ضرورت کے بقدر کمانے کی طاقت رکھنے والا ﴿ان شئتما اعطیکما﴾ یعنی صدقہ صحت مند اور غنی کیلئے لینا ذلت کا باعث اور حرام ہے۔ اس کے باوجود اگر تم حرام چاہتے ہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ یہ بات آپؐ نے ان سے زجر و توبیخ کے طور پر فرمائی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غنی اور صحت مند کیلئے صدقہ و زکوٰۃ لینا جائز نہیں۔ صدقہ دینے والے کو بھی چاہئے کہ سائل کو اچھی طرح دیکھ لے کہ وہ اس کا مستحق ہے یا نہیں۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ وہ غیر مستحق کو سوال نہ کرنے کی تلقین کرے اور اس کو برے انجام سے خبردار کر دے۔

راوی حدیث: ﴿عبیداللہ بن عدی بن خیار قرشی نوفلی﴾ خاندان قریش سے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی پیدائش عہد رسالت مآب ﷺ میں ہوئی۔ اس لئے ان کا شمار تابعین میں کیا گیا ہے۔ انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایت کی ہے اور ایک قول کے مطابق ان کا والد حالت کفر میں بدر میں قتل ہوا اور یہ فتح مکہ کے موقع پر عاقل بالغ تھے۔ اس اعتبار سے وہ صحابی ہیں۔ ان کا شمار قریش کے فقہاء و علماء میں ہوتا ہے۔ ٩٠ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور میں وفات پائی۔

(۵۲۲) وَعَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ مُخَارِقٍ الهِلاَلِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ المَسْأَلَةَ لاَ تَحِلُّ إِلاَّ لِأَحَدِ ثَلاَثَةٍ: رَجُلٍ تَحَمَّلَ حَمَالَةً، فَحَلَّتْ لَهُ المَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَهَا، ثُمَّ يُمْسِكُ، وَرَجُلٍ أَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اجْتَاحَتْ مَالَهُ، فَحَلَّتْ لَهُ المَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَ قِوَاماً مِنْ عَيْشٍ، وَرَجُلٍ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ، حَتَّى يَقُومَ ثَلاَثَةٌ مِنْ ذَوِي الحِجَى مِنْ قَوْمِهِ: لَقَدْ أَصَابَتْ فُلاَناً فَاقَةٌ، فَحَلَّتْ لَهُ المَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَ قِوَاماً مِنْ عَيْشٍ، فَمَا سِوَاهُنَّ مِنَ المَسْأَلَةِ يَا قَبِيصَةُ سُحْتٌ، يَأْكُلُهُ صَاحِبُهُ سُحْتاً». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَأَبُو دَاوُدَ وابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت قبیصہ بن مخارق ہلالی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”سوال کرنا صرف تین آدمیوں کیلئے حلال ہے“ ایک وہ شخص جو کسی کا بوجھ اٹھالیتا ہے یہاں تک کہ اس کا قرض وغیرہ ادا ہو جائے پھر وہ سوال کرنے سے باز آجائے اور دوسرا وہ جو کسی ناگہانی مصیبت میں پھنس گیا ہو اور اس کا مال تباہ و برباد ہوگیا ہو اسے گزر اوقات کی حد تک سوال کرنا جائز ہے اور تیسرا وہ شخص جسے فاقے آرہے ہوں اور اس کی قوم کے تین صاحب عقل آدمی اس کی شہادت دیں کہ واقعی اسے فاقہ کشی کا سامنا ہے اسے بھی گزر اوقات کی حد تک سوال کرنا جائز ہے اور ان کے علاوہ اے قبیصہ! سوال حرام ہے اور سوال کرنے والا حرام کھاتا ہے۔“ (مسلم، ابوداؤد، ابن خزیمہ، اور صحیح ابن حبان)

لغوی تشریح: ﴿ ثلاثة ﴾ اس پر تنوین ہے ﴿ رجل ﴾ ثلاثۃ سے بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہے یا پھر رفع ہے۔ اس صورت میں ﴿ احدهم ﴾ محذوف ہوگا۔ ﴿ تحمل ﴾ برداشت کیا، کفالت کی ”حمالة“ حا پر فتحہ ہے۔ وہ مال جو انسان دوسرے کی طرف سے ادا کرنے کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ مثلاً دوسرے کا قرض ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے یا کسی کی دیت ادا کرنے کی حامی بھرتا ہے یا فریقین کے مابین تنازع کو دور کرنے کیلئے رقم کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کرلی ہو اور وہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ رہا ہو تو وہ دوسروں سے تعاون کی اپیل کر سکتا ہے اور زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ ﴿ ثم يمسك ﴾ اپنی ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً دست سوال دراز کرنے سے رک جائے۔ ﴿ جائحة ﴾ آسمانی یا زمینی آفت مثلاً ژالہ باری سے اس کی فصل تباہ ہوگئی، آگ لگنے سے اور ڈوب کر مرنے کی صورت میں تلافی مافات کیلئے ﴿ اجتاحت ﴾ ہلاک ہوگئی۔ ﴿ قواما ﴾ قاف کے نیچے کسرہ۔ قوام جس سے کوئی اپنی حاجت و ضرورت کا انتظام کرتا ہے اور اپنی خستہ حالی کا سدباب کرتا ہے۔ ﴿ الحجى ﴾ ”حا“ کے نیچے کسرہ یعنی عقل مند ﴿ سحت ﴾ سین پر ضمہ اور ”حا“ ساکن معنی حرام۔ يسحت البركة کے معنی ہیں جو برکت کو لے اڑے۔

حاصل کلام : اس حدیث میں سوال کرنے والے کی پوزیشن معلوم کرنے کیلئے ایک ضابطہ بیان ہوا ہے وہ یہ کہ اس کی برادری یا قوم کے تین سرکردہ صاحب عقل و دانش آدمی اس کی حالت' کسمپرسی اور فاقہ کشی کی شہادت دیں تو اسے سوال کرنے کی اجازت ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تین قسم کے آدمیوں کو سوال جائز ہے اور سائلین کی پوزیشن کو جانچنے اور تحقیق کرنے کا بھی حکم ہے کہ اگر کوئی ضرورت مند ہو اور اس کے قبیلے کے تین عقلمند افراد گواہی دے دیں تو اس کیلئے سوال کرنا جائز ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام نے گداگری کی کس طرح حوصلہ شکنی کی ہے اور محنت و مزدوری کی ترغیب دی ہے۔

راوی حدیث : ﴿ قبیصہ بن مخارق الھلالی رضی اللہ عنہ ﴾ ابو بشر کنیت ہے۔ قبیصہ میں "قاف" پر فتحہ اور "باء" پر کسرہ ہے۔ اور مخارق میں میم پر ضمہ ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے۔ قبیصہ بن مخارق بن عبداللہ بن شراد العامری الھلالی۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ بصرہ میں رہائش پذیر ہوئے' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد کے ساتھ آئے اور آپؐ سے احادیث سنیں چھ حدیثوں کے راوی ہیں۔

(٥٢٣) وَعَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِيعَةَ بْنِ الحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ الصَّدَقَةَ لاَ تَنْبَغِي لِآلِ مُحَمَّدٍ، إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ النَّاسِ». وَفِي رِوَايَةٍ: «وَإِنَّهَا لاَ تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَلاَ لِآلِ مُحَمَّدٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "صدقہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مناسب ہی نہیں۔ یہ تو لوگوں کے اموال کی میل کچیل ہے" اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ "صدقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے حلال نہیں۔" (مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ اوساخ الناس ﴾ وسخ کی جمع ہے۔ میل کچیل۔ آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کا ذکر کتاب الزکوٰۃ کی ایک ابتدائی حدیث میں گزر چکا ہے۔

راوی حدیث : ﴿ عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث رضی اللہ عنہ ﴾ عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب بن ھاشم قرشی۔ مدینہ میں رہائش پذیر ہوئے۔ پھر دمشق تشریف لے گئے اور ۶۲ھ میں وہیں پر وفات پائی۔

(٥٢٤) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَشَيْتُ أَنَا وَعُثْمَانَ بْنُ عَفَّانَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ! أَعْطَيْتَ بَنِي الْمُطَّلِبِ مِنْ خُمُسِ خَيْبَرَ وَتَرَكْتَنَا، وَنَحْنُ وَهُمْ بِمَنْزِلَةٍ وَاحِدَةٍ، فَقَالَ

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپؐ نے بنو عبدالمطلب کو خیبر کے خمس میں سے حصہ عنایت فرمایا ہے اور ہمیں نظرانداز فرمایا حالانکہ آپؐ کے ساتھ تعلق کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ یہ سن کر

رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّمَا بَنُو الْمُطَّلِبِ وَبَنُو هَاشِمٍ شَيْءٌ وَّاحِدٌ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بنو عبدالمطلب اور بنو ہاشم دونوں ایک ہی چیز ہیں۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ من خمس خیبر ﴾ خمس میں خا اور میم دونوں پر ضمہ۔ مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے کل اموال کا پانچواں حصہ اللہ' اس کے رسول اور رسول اللہ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافر کیلئے لیا جانے والا مال خمس کہلاتا ہے۔ ﴿ ونحن وھم ﴾ "ھم" سے یہاں بنو عبدالمطلب مراد ہیں ﴿ بمنزلۃ واحدۃ ﴾ آپؐ سے قرابت داری کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہیں۔ یہ اس لئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو عبد شمس بن عبد مناف سے تھا اور حضرت جبیر کا بنو نوفل بن عبدمناف سے تھا اس طرح دونوں ہاشم بن عبدمناف کے بھائی بنتے ہیں جس طرح مطلب بن عبد مناف۔ اس طرح یہ تینوں عبد شمس' نوفل اور مطلب' ہاشم کے ساتھ قرابت داری میں برابر ہیں۔ تو پھر جب قرابت داری کی بنا پر اگر مطلب کی اولاد استحقاق رکھتی ہے تو عبد شمس اور نوفل کی اولاد بھی استحقاق رکھتی ہے۔ ﴿ انما بنو عبدالمطلب و بنو ہاشم شئی واحد ﴾ اس لئے کہ جاہلیت اور عہد اسلام میں ان کے مابین باہمی موالاۃ ہمیشہ سے چلی آرہی ہے جبکہ غیروں کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ اپنوں کے علاوہ یہ لوگ قرابت داروں کو حصہ دینے میں شریک ہیں۔ اگرچہ نسب میں یہ سب برابر ہیں۔ مصنف نے اس حدیث کو اس باب میں یہ تنبیہہ کرنے کیلئے بیان کیا ہے کہ بنو عبدالمطلب بھی بنو ہاشم کی طرح زکوٰۃ لینے کی حرمت میں برابر کے شریک ہیں۔ یعنی دونوں کیلئے زکوٰۃ لینا حرام ہے۔

حاصل کلام: حضرت جبیر بن مطعم اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا "ہم اور بنی مطلب برابر ہیں" کہنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وفاداری اور اطاعت کیشی جیسی بنو مطلب کر رہے ہیں ویسی ہم بھی کر رہے ہیں۔ فرمانبرداری میں یکساں ہیں۔ دوسرا یہ کہ قرابت داری کے اعتبار سے بھی ہم اور ان میں زیادہ تفاوت نہیں۔ جتنا کچھ استحقاق قرابت انہیں آپؐ سے حاصل ہے اتنا ہی ہمیں بھی حاصل ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنو امیہ میں سے تھے ان کو شرف دامادی بھی حاصل تھا۔ بنو امیہ اور بنو ہاشم قریش میں بالکل برابر کے قبائل شمار ہوتے تھے۔ بالفاظ دیگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنی عبد شمس میں سے اور حضرت جبیر رضی اللہ عنہ نوفل کی اولاد میں سے اور رسول اللہ ﷺ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہاشم کی اولاد سے ہیں۔ اس طرح گویا یہ سب مطلب کی اولاد ہیں۔ ہاشم' مطلب' نوفل اور عبد شمس یہ چاروں عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ اس طرح حضرت جبیر رضی اللہ عنہ' عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کا تعلق نبی ﷺ سے ایک ہی درجہ کا ہے۔ حضرت جبیر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ کے سوال کا بھی یہی مطلب تھا۔

نبی ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ زمانۂ قدیم سے بنو ہاشم اور بنو امیہ برابر چلے آرہے ہیں۔ آپؐ نے اس حیثیت سے تفریق نہیں فرمائی بلکہ اس حیثیت سے فرمائی کہ بنو ہاشم بنو امیہ کی بہ نسبت آپؐ کے زیادہ قریب تھے اس لئے ان کیلئے زکوٰۃ لینا حرام قرار دے دیا اور بنو امیہ کیلئے

حرام نہیں کیا۔ اس لئے بنو ہاشم کو خمس میں سے دیا گیا اور بنو امیہ کو خمس میں سے نہیں دیا۔ اسی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خمس میں سے نہیں دیا گیا۔

(٥٢٥) وَعَنْ أَبِيْ رَافِعٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ رَجُلاً عَلَى الصَّدَقَةِ مِنْ بَنِيْ مَخْزُومٍ، فَقَالَ لِأَبِيْ رَافِعٍ: اصْحَبْنِيْ، فَإِنَّكَ تُصِيْبُ مِنْهَا: فَقَالَ: لاَ، حَتّٰى آتِيَ النَّبِيَّ ﷺ، فَأَسْأَلَهُ، فَأَتَاهُ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: «**مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْ أَنْفُسِهِمْ، وَإِنَّها لاَ تَحِلُّ لَنَا الصَّدَقَةُ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلاَثَةُ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے بنو مخزوم کے ایک آدمی کو زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر فرمایا۔ اس نے ابو رافع رضی اللہ عنہ کو کہا کہ تم میرے ساتھ چلو تجھے اس میں سے کچھ حصہ مل جائے گا۔ اس نے کہا میں نہیں جاؤں گا تاوقتیکہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بارے میں دریافت نہ کر لوں۔ چنانچہ وہ آپؐ کی خدمت میں آیا اور آپؐ سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا "قوم کا غلام بھی انہیں میں شمار ہوتا ہے اور ہمارے لئے صدقہ (زکوٰۃ) حلال نہیں ہے۔" (اسے احمد اور تینوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے بھی)

لغوی تشریح: ﴿بعث رجلا﴾ آپؐ نے ایک آدمی کو بھیجا اس آدمی سے مراد حضرت ارقم رضی اللہ عنہ ہیں ﴿تصیب منھا﴾ اس حاصل شدہ صدقہ میں سے تو اس کا معاوضہ اور اجرت لے لینا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بنو ہاشم کے آزاد کردہ غلاموں پر بھی زکوٰۃ لینا حرام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس آدمی کیلئے خود زکوٰۃ کا لینا حرام ہے اس کے غلام پر بھی حرام ہوتی ہے۔ ابو رافع رضی اللہ عنہ چونکہ نبی ﷺ کے غلام تھے اس لئے ان کیلئے بھی زکوٰۃ لینا حرام تھا۔

راوی حدیث: ﴿ابو رافع رضی اللہ عنہ﴾ ان کے نام میں مختلف اقوال ہیں۔ چنانچہ ان کا نام اسلم تھا یا ھرمز یا ثابت یا ابراھیم' قبطی تھے۔ یہ دراصل حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے غلام تھے۔ انہوں نے انہیں نبی ﷺ کو ہبہ کر دیا تھا۔ غزوۂ بدر سے پہلے ایمان قبول کر لیا تھا مگر اس میں شریک نہیں ہوئے اور بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو ان کے اسلام قبول کرنے کی بشارت ابو رافع رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو دی۔ آپؐ نے اس مقام مسرت پر اسے آزاد فرما دیا۔ ٣٦ھ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع میں مدینہ میں وفات پائی۔

(٥٢٦) وَعَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يُعْطِي عُمَرَ الْعَطَاءَ،

حضرت سالم بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کوئی چیز عطا فرماتے تو حضرت عمر

فَيَقُوْلُ: أَعْطِهِ أَفْقَرَ مِنِّيْ، فَيَقُولُ: خُذْهُ، فَتَمَوَّلْهُ، أَوْ تَصَدَّقْ بِهِ، وَمَا جَاءَكَ مِنْ هٰذَا المَالِ، وَأَنْتَ غَيْرُ مُشْرِفٍ وَلاَ سَائِلٍ، فَخُذْهُ، وَمالاَ فَلاَ تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

رضی اللہ عنہ عرض کرتے کہ جو لوگ مجھ سے زیادہ غریب ہیں انہیں عطا فرما دیجئے۔ اس کے جواب میں آپ ؐ فرماتے "اسے لے لو اور مالدار ہو جاؤ یا اسے صدقہ و خیرات کر دو جو مال بغیر عوض و لالچ اور مانگنے کے تمہارے پاس آئے اسے لے لیا کرو اور جو اس طرح نہ ملے اس کے پیچھے اپنے آپ کو نہ لگاؤ۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿العطاء﴾ کام کرنے کا معاوضہ اور اجرت یا عطیہ ہو ﴿افقر﴾ افعل التفضیل کا صیغہ یعنی جو زیادہ فقیر ہے۔ ﴿فتموله﴾ امر کا صیغہ ہے یعنی اسے اپنا مال بنا لو۔ ﴿مشرف﴾ اس کی خواہش کرتے ہوئے اس کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھنا اور اس کا تعرض کرنا اور اس پر حریص و لالچی ہونا۔ ﴿فلا تتبعه﴾ اتباع سے امر کا صیغہ ہے مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس کی طلب میں معلق نہ کرو۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ عامل کو اپنی مزدوری و اجرت حاصل کر لینی چاہئے واپس نہیں کرنی چاہئے۔ اکثریت کی رائے کے مطابق یہاں امر ندب کیلئے ہے یعنی ایسا کرنا مندوب ہے فرض و واجب نہیں اور ایک رائے یہ ہے کہ اسے قبول کرنا واجب ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو دی جائے اسے لے لینا چاہئے۔ لہٰذا اس کا قبول کرنا دو شرطوں سے مشروط ہے جو اس حدیث میں مذکور ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عامل کو اپنے کام اور کارکردگی کی اجرت و معاوضہ لے لینا چاہئے کیونکہ اس حدیث میں "عطاء" سے مراد یہی ہے کیونکہ مسلم کی ایک حدیث میں ہے یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وصولی زکوٰۃ کی اجرت کے بارے میں آپ ؐ نے فرمایا تھا۔ یہ امر مستحب ہے' ایجابی نہیں اور اس سے مراد ہر عطیہ بھی ہے' جب دل میں حرص نہ ہو اور خود زبان سے یا حال سے اس کے حصول کا تقاضا بھی نہ ہو تو پھر جو کچھ وصول ہو اسے اخذ کر لے بشرطیکہ حلال ہو حرام نہ ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مالی حرص و طمع کے ساتھ سوال کرنا بھی حرام ہے۔

٥۔ كِتَابُ الصِّيَامِ

روزے کے مسائل

(٥٢٧) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَقَدَّمُوا رَمَضَانَ بِصَوْمِ يَوْمٍ وَلاَ يَوْمَيْنِ، إِلاَّ رَجُلٌ كَانَ يَصُومُ صَوْماً فَلْيَصُمْهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی بھی رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے نہ رکھے مگر جو شخص پہلے سے روزہ رکھتا آ رہا ہو اسے چاہئے کہ اس دن کا روزہ رکھ لے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لا تقدموا﴾ یہ اصل میں "لا تتقدموا" تھا یعنی رمضان کے استقبال کیلئے رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے مت رکھو ﴿کان یصوم صوما﴾ یعنی معمول کے گنے چنے دنوں میں جو وہ روزے رکھتا تھا اور وہ دن شعبان کے آخری دنوں میں واقع ہو جائیں۔ مثلاً ایک آدمی معمول کے مطابق ہر ہفتہ میں سوموار کا روزہ رکھتا ہے اور یہ سوموار کا دن شعبان کے آخر میں آگیا تو اس طرح روزہ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں وہ حسب معمول روزہ رکھ سکتا ہے۔ ﴿فلیصمه﴾ اس میں لام امر جواز کے بیان کیلئے ہے یعنی معمول و عادت کے مطابق رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے رکھ سکتا ہے۔

(٥٢٨) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَنْ صَامَ الْيَوْمَ الَّذِيْ يُشَكُّ فِيْهِ، فَقَدْ عَصَى أَبَا الْقَاسِمِ ﷺ. ذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ تَعْلِيْقاً، وَوَصَلَهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس شخص نے مشکوک دن میں روزہ رکھا اس نے ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی۔ (بخاری نے اسے تعلیقاً اور پانچوں نے اسے موصولاً ذکر کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الیوم الذی یشک فیه﴾ یشک صیغہ مجہول ہے۔ وہ شعبان کا تیسواں روز ہے جبکہ اس رات چاند ابر آلودگی وغیرہ کی وجہ سے نظر نہ آئے اور یہ شک واقع ہو جائے کہ آیا رمضان ہے یا شعبان۔

حاصل کلام : شریعت اسلامیہ نے یہ واضح اصول مقرر فرما دیا ہے کہ روزہ رکھو تو چاند دیکھ کر رکھو اور اسی طرح روزوں کا اختتام بھی عید کا چاند دیکھ کر کرو۔ اب اگر شعبان کی انتیسویں شب چاند نظر نہ آیا تو اس روز روزہ رکھنا مشکوک ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے۔ علم فلکیات کے ماہرین کی آراء بھی لازماً قابل اعتماد و یقین نہیں۔

(۵۲۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: «إِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَصُومُوا، وَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَأَفْطِرُوا، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: فَإِنْ أُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ ثَلَاثِيْنَ. وَلِلْبُخَارِيِّ: فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِيْنَ. وَلَهُ فِي حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ: فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِيْنَ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ”جب تم چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور جب (عید کے لیے) چاند دیکھ لو تو افطار کر دو اگر مطلع ابر آلود ہو تو اس کیلئے اندازہ لگا لو۔“ (متفق علیہ) مسلم کے الفاظ ہیں کہ ”اگر مطلع ابر آلود ہو تو پھر اس کے لئے تیس دن کی گنتی کا اندازہ رکھو اور بخاری کے الفاظ ہیں ”پھر تیس روز کی گنتی و تعداد پوری کرو۔“ اور بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ”پھر تم شعبان کے تیس دن پورے کرو۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ اذا رایتموہ ﴾ جب تم اسے دیکھ لو' اسے سے مراد چاند ہے یعنی جب چاند تمہیں نظر آجائے۔ ﴿ فان غم ﴾ غم کے غین پر ضمہ اور میم پر تشدید۔ صیغۂ مجہول۔ مطلب یہ ہے کہ جب چاند نظر نہ آئے مخفی اور پوشیدہ رہ جائے۔ ابر آلودگی کی وجہ سے یا کسی ایسی ہی دوسری وجہ سے۔ ﴿ فاقدروا لہ ﴾ قدر سے امر کا صیغہ ہے۔ فاقدوا لہ کے دال پر ضمہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ مکمل مہینہ کی گنتی اور تعداد پوری کرو اور تیسویں روز افطار کرو۔

(۵۳۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: تَرَاءَى النَّاسُ الْهِلَالَ، فَأَخْبَرْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَنِّي رَأَيْتُهُ، فَصَامَ، وَأَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ لوگوں نے چاند دیکھنا شروع کیا تو میں نے نبی ﷺ کو اطلاع دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے۔ آپ ؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح : ترا ای الناس الھلال لوگ عید کا چاند دیکھنے کیلئے اکٹھے ہوئے اور چاند دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ماہ رمضان کا چاند دیکھنے کیلئے خبر واحد یعنی صرف ایک آدمی

کی شہادت مقبول ہے اور یہ جمہور کا مذہب ہے۔

حاصل کلام: ان احادیث سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ روزہ کا آغاز اور اختتام دونوں چاند کے نظر آنے پر منحصر ہے۔ چاند نظر آجائے تو روزہ رکھا جائے اور چاند دیکھ کر ہی روزے رکھنا بند کرے۔ اگر انتیس شعبان کو چاند نظر نہ آئے تو اس ماہ کے تیس دن پورے کئے جائیں اور اسی طرح اگر انتیس رمضان کو چاند نظر نہ آئے تو روزے تیس پورے کئے جائیں۔ اگر گرد و غبار اور ابر آلودگی کی وجہ سے ایک مقام پر چاند نظر نہ آئے مگر دوسری جگہ مطلع صاف ہونے کی بنا پر نظر آجائے تو روزہ سارے شہروں' قصبوں اور دیہاتوں میں رکھا جائے گا۔ اسی طرح عید بھی منائی جائے گی بشرطیکہ ان جگہوں کا مطلع ایک ہو۔ اگر فاصلہ اس قدر ہو کہ مطلع ہی تبدیل ہو جائے تو پھر وہاں کی رؤیت قابل قبول نہ ہوگی۔ جیسا کہ جمہور علمائے کرام نے کہا ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روزہ رکھنے کیلئے ایک معتبر و مقبول آدمی کی شہادت کافی ہے۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے مگر ہلال عید کیلئے دو شہادتوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں' سب متفق ہیں۔

(٥٣١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ أَعْرَابِياً جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنِّي رَأَيْتُ الهِلاَلَ، فَقَالَ: **أَتَشْهَدُ أَن لاَّ إِلٰهَ إِلاَّ اللَّهُ؟** قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: **أَتَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً رَسُولُ اللهِ؟** قَالَ نَعَمْ، قَالَ: **فَأَذِّنْ فِي النَّاسِ يَا بِلاَلُ أَنْ يَصُوْمُوا غَداً**. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ، وَرَجَّحَ النَّسَائِيُّ إِرْسَالَهُ.

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک صحرا نورد نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا "کیا تو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی الٰہ نہیں؟" اس نے کہا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا "کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؟" اس نے کہا ہاں! آپؐ نے فرمایا بلال اٹھو اور لوگوں میں منادی کر دو کہ کل روزہ رکھا جائے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور نسائی نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فاذن ﴾ تاذین سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے۔ مراد اس سے عام اعلان اور منادی ہے۔ یہ حدیث مذہب جمہور کی تائید کرتی ہے کہ رمضان کے چاند کیلئے ایک عادل مسلمان کی گواہی کافی ہے اور یہی بات صحیح ہے۔

(٥٣٢) وَعَنْ حَفْصَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ام المومنین سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے صبح صادق سے

ﷺ قَالَ: «مَنْ لَمْ يُبَيِّتِ الصِّيَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلاَ صِيَامَ لَهُ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَمَالَ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ إِلَى تَرْجِيحِ وَقْفِهِ، وَصَحَّحَهُ مَرْفُوعاً ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

وَلِلدَّارَقُطْنِيِّ: «لاَ صِيَامَ لِمَنْ لَمْ يَفْرِضْهُ مِنَ اللَّيْلِ».

پہلے روزے کی نیت نہ کی اس کا کوئی روزہ نہیں۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور نسائی کا رجحان اس کے موقوف ہونے کی طرف ہے اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اس کا مرفوع ہونا صحیح قرار دیا ہے) اور دارقطنی کی روایت میں ہے "جس نے رات کو اپنے آپ پر واجب نہ کرلیا اس کا کوئی روزہ نہیں۔"

لغوی تشریح: ﴿من لم یبیت﴾ الخ تبییت سے ماخوذ ہے۔ یعنی رات میں روزے کی نیت کرنا ﴿لم یفرضه﴾ باب ضرب یضرب سے ہے۔ یعنی اس کو اپنے اوپر فرض نہیں کیا اور یہ اس طرح کہ اس نے اس کی نیت نہ کی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرضی روزے کی نیت صبح صادق سے پہلے ہونی ضروری ہے گویا غروب آفتاب کے بعد سے لے کر صبح صادق کے طلوع ہونے سے پہلے تک نیت کی جا سکتی ہے۔ نیت اس لئے ضروری اور لازمی ہے کہ روزہ ایک عمل ہے اور عمل کیلئے نیت ضروری ہے اور ہر دن کے روزے کیلئے الگ الگ نیت شرط ہے۔ البتہ روزہ کی نیت کے جو الفاظ زبان سے کہے جاتے ہیں وہ بدعت ہے کیونکہ نیت دل کا عمل ہے' زبان کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی یہ نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہیں۔

راوی حدیث: ﴿حفصه بنت عمر بن خطاب رضی الله عنهما﴾ پہلے یہ خنیس بن حذافہ سہمی کے نکاح میں تھیں۔ ان کے ساتھ ہجرت کی۔ غزوۂ بدر کے موقع پر یہ وفات پاگئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنی زوجیت میں لے کر اپنے حرم میں داخل فرما لیا۔ یہ ۳ھ کی بات ہے۔ ساٹھ سال کی عمر میں شعبان ۴۵ھ میں فوت ہوئیں۔

(۵۳۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ: هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ؟ قُلْنَا: لاَ، قَالَ: فَإِنِّي إِذاً صَائِمٌ، ثُمَّ أَتَانَا يَوْماً آخَرَ، فَقُلْنَا: أُهْدِيَ لَنَا حَيْسٌ، فَقَالَ: أَرِينِيهِ فَلَقَدْ أَصْبَحْتُ صَائِماً، فَأَكَلَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک روز نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ "کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟" ہم نے عرض کیا' نہیں۔ تو آپ نے فرمایا "اچھا تو میں روزہ سے ہوں۔" اس کے بعد پھر ایک روز تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا کہ حلوہ کا تحفہ ہمیں (کہیں سے) دیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا "ذرا مجھے تو دکھاؤ صبح سے میں روزے سے تھا۔" (یہ فرما کر) آپ نے حلوہ

تناول فرمالیا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فانی اذا صائم ﴾ اذاً پر تنوین ہے۔ اس حدیث سے یہ امر واضح ہو رہا ہے کہ نفلی روزے کی نیت طلوع آفتاب کے بعد بھی ہو سکتی ہے اور یہ حدیث اس کا تقاضا کرتی ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی سابقہ روایت میں نیت کا لزوم فرض روزے کیلئے ہے' نفل روزے کیلئے نہیں ہے ﴿ حیس ﴾ "حا" پر فتحہ اور "یا" ساکن۔ جسے کھجور' مکھن' گھی اور پنیر شامل کر کے تیار کیا گیا ہو۔ ﴿ ارینیہ ﴾ اراءۃ سے امر مخاطب کا صیغہ ہے اور اس میں نون وقایہ کا ہے اور بعد کی "یا" یائے متکلم ہے اور یہ فعل کا پہلا مفعول واقع ہو رہا ہے اور دوسرا مفعول ضمیر غائب ہے ﴿ فاکل ﴾ پھر آپؐ نے اسے تناول فرمالیا۔ یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ نفلی روزہ دار بغیر کسی عذر کے روزہ افطار کر سکتا ہے۔ (توڑ سکتا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ نفلی روزہ کی نیت طلوع فجر سے پہلے لازمی نہیں بلکہ طلوع آفتاب کے بعد بھی کی جا سکتی ہے۔ ائمہ اربعہ میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نفلی روزے کی نیت بھی صبح صادق سے پہلے کرنے کو لازمی قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ صریح حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ نفلی روزہ بغیر کسی عذر کے توڑا جا سکتا ہے۔ ائمہ ثلاثہ (امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ) اور اکثر علماء کا یہی مذہب ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بلا عذر روزہ افطار کرنا جائز نہیں۔ اس کو پورا کرنا ان کے نزدیک واجب ہے۔ ان کے نزدیک عذر ضیافت کو قرار دیا گیا ہے۔ اگر افطار کر لیا تو اس کی قضاء توڑنے والے پر واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ کسی کے نزدیک قضاء واجب نہیں اور نفلی روزے کو قصداً توڑنے کا کفارہ کسی کے نزدیک بھی نہیں ہے۔

(٥٣٤) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**لاَ يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الفِطْرَ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "لوگ اس وقت تک بھلائی پر قائم رہیں گے جب تک روزہ افطار کرنے میں جلدی کریں گے" (بخاری و مسلم)

وَلِلتِّرْمِذِيِّ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: «أَحَبُّ عِبَادِي إِلَيَّ، أَعْجَلُهُمْ فِطْراً».

اور ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی نبی ﷺ سے روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "میرے بندوں میں میرے محبوب و پسندیدہ بندے وہ ہیں جو افطار کرنے میں عجلت سے کام لیتے ہیں۔""

لغوی تشریح: ﴿ ما عجلوا الفطر ﴾ جب تک افطار کرنے میں جلدی کریں گے۔ یہ تعجیل سے ماخوذ ہے یعنی تحقیق سے جب یہ ثابت ہو جائے کہ سورج غروب ہو چکا ہے تو فوراً روزہ افطار کر دینا چاہئے۔ اس عجلت کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب و پسندیدہ اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ افطار میں جلدی کرنا اہل

اسلام کا شعار ہے جبکہ اہل کتاب تاخیر سے روزہ افطار کرتے ہیں۔ اس میں آسانی کا بھی پہلو ہے۔ اطاعت و فرمانبرداری کا بھی یہی تقاضا ہے اس لئے شعار اسلام کا اہتمام کرنا اور شریعت کی دی ہوئی سہولت کو لینا اور معاملات میں تکلیف و مشقت سے بچنا خیر و برکت کا باعث ہے۔

حاصل کلام: مطلع صاف ہو' گرد و غبار اور ابر آلودگی نہ ہو اور غروب آفتاب کا یقین ہو جائے تو پھر روزہ افطار کرنے میں بلاوجہ تاخیر کرنا جائز نہیں۔ تاخیر سے روزہ افطار کرنا اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا طریقہ ہے اور مصابیح میں یہ بھی ہے کہ افطاری میں تاخیر و دیر کرنا اہل بدعت کی علامت ہے۔ لہٰذا غروب آفتاب کے فوراً بعد روزہ افطار کر لینا چاہئے۔

(٥٣٥) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «تَسَحَّرُوا، فَإِنَّ فِي السَّحُورِ بَرَكَةً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سحری کھایا کرو اس لئے کہ اس میں بڑی برکت ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿السحور﴾ سین پر فتحہ کی صورت میں طلوع فجر سے پہلے سحر کیلئے جو کچھ کھایا پیا جائے اسے سحور کہتے ہیں اور اس پر اگر ضمہ ہو تو پھر یہ مصدر ہو گا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سحری کھانے کی ترغیب ہے یہود و نصاریٰ چونکہ سحری کا اہتمام نہیں کرتے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزے میں فرق سحری کھانے کا ہے۔ اس سے روزے کی تکمیل میں آسانی اور سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

(٥٣٦) وَعَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ الضَّبِّيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا أَفْطَرَ أَحَدُكُمْ فَلْيُفْطِرْ عَلَى تَمْرٍ، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيُفْطِرْ عَلَى مَاءٍ، فَإِنَّهُ طَهُورٌ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی روزہ افطار کرے تو اسے کھجور سے افطار کرنا چاہئے۔ پھر اگر کھجور دستیاب نہ ہو سکے تو پانی سے افطار کر لے اس لئے کہ وہ پاک ہے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ' ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ممکن ہو تو کھجور سے افطار کرنا چاہئے کیونکہ کھجور مقوی معدہ' مقوی اعصاب اور جسم میں واقع ہونے والی کمزوری کا بدل ہے۔ اگر کھجور مہیا نہ ہو سکے تو پھر پانی سے افطار بہتر ہے۔ نبی ﷺ تازہ کھجوروں سے افطار فرمایا کرتے تھے۔ اگر تازہ نہ ملتی تو خشک کھجور سے افطار کرتے۔ اگر یہ بھی نہ ملتی تو پھر چند گھونٹ پانی سے روزہ افطار فرما لیتے تھے۔

راوی حدیث: ﴿سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ﴾ سلمان بن عامر بن اوس بن حجر بن عمرو بن حارث الضبی۔

مشہور صحابی ہیں۔ بصرہ میں رہائش رکھی تھی۔ نبی ﷺ کی زندگی ہی میں یہ صاحب عمر رسیدہ تھے۔ خلافت معاویہ تک زندہ رہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ جنگ جمل میں شہید ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر سو برس کی تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کے ماسوا کوئی بھی ضبی صحابی نہیں۔

(٥٣٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ الوِصَالِ، فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ المُسْلِمِيْنَ: فَإِنَّكَ تَوَاصِلُ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: «**وَأَيُّكُمْ مِثْلِيْ؟ إِنِّي أَبِيْتُ يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ**»، فَلَمَّا أَبَوْا أَنْ يَنْتَهُوا عَنِ الوِصَالِ وَاصَلَ بِهِمْ يَوْماً، ثُمَّ يَوْماً، ثُمَّ رَأَوُا الهِلاَلَ، فَقَالَ: «**لَوْ تَأَخَّرَ الهِلاَلَ لَزِدْتُكُمْ**»، كَالمُنْكِّلِ لَهُمْ حِيْنَ أَبَوا أَن يَنْتَهُوا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وصال سے منع فرمایا' مسلمانوں میں سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ اللہ کے رسول (ﷺ)! آپؐ خود تو وصال فرماتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا "تم میں سے میرے جیسا کون ہے؟ میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا پروردگار مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔" جب لوگوں نے وصال سے باز آنے سے انکار کر دیا تو آپؐ نے ان کے ساتھ ایک دن پھر دوسرے دن کا وصال کیا۔ پھر انہوں نے چاند کو دیکھ لیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "اگر چاند آج نظر نہ آتا تو میں تمہارے لئے زیادہ دن وصال کرتا۔" گویا آپؐ لوگوں کو اس سے باز نہ رہنے کی وجہ سے سزا دے رہے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ الوصال ﴾ اس کو کہتے ہیں کہ آدمی قصداً دو دن یا زیادہ دن تک افطار نہ کرے اور مسلسل روزہ رکھے نہ رات کو کچھ کھائے پئے اور نہ سحری کے وقت۔ جمہور علماء اسلام کا قول یہ ہے کہ وصال کرنا نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہے۔ آپؐ کیلئے جائز اور امت کیلئے ناجائز ہے۔ ائمہ ثلاثہ' امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وصال کے روزے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صبح تک وصال جائز ہے۔ سحری بہرنوع کھانی چاہئے۔ ﴿ یطعمنی ربی ویسقینی ﴾ میرا رب مجھے کھلاتا ہے' پلاتا ہے۔ جمہور نے اسے مجازاً قوت پر محمول کیا ہے کہ کھانے پینے سے جو قوت حاصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ وہ قوت مجھے عطا فرما دیتے ہیں۔ بعض نے اسے حقیقت پر معمول کرتے ہوئے کھانے پینے سے جنت کا کھانا پینا مراد لیا ہے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں' اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو اپنے معارف کی ایسی غذا کھلاتے ہیں جس سے آپؐ کے دل پر لذت سرگوشی و مناجات کا فیضان ہوتا ہے۔ اللہ کے قرب سے آپؐ کو آنکھوں کی ٹھنڈک ملتی ہے اور اللہ کی محبت کی نعمت سے آپؐ کو سرشاری نصیب ہوتی ہے اور اس کی جناب کی طرف شوق میں افزونی ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ غذا جو آپؐ کو اللہ کی

جناب سے عطا ہوتی ہے۔ یہ روحانی غذا ایسی ہے جو آپؐ کو دنیوی غذا سے ایک لمبی مدت تک بے نیاز کر دیتی ہے۔ (تلخیص از زاد المعاد' ج ا' ص: ۱۵۴' ۱۵۵) ﴿کالمنکل لھم﴾ تنکیل سے ماخوذ اسم فاعل ہے۔ معنی زجر و توبیخ' ڈانٹ ڈپٹ۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ بھی ان کے ساتھ مسلسل روزہ رکھتے ہیں۔ یہ بیان صرف جواز کیلئے نہیں ہے بلکہ زجر و توبیخ کیلئے ہے اور اس سے ممانعت کے عمل کو تاکید کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے۔ پس جب انہوں نے براہ راست صوم وصال رکھا تو ان کے سامنے اس کی حکمت ظاہر ہوئی۔ یہ چیز اسے قبول کرنے کی زیادہ داعی تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزے میں وصال مکروہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو مشقت میں مبتلا نہیں کرتا۔ مسلسل کچھ کھائے پیئے بغیر روزہ رکھنا انسانی قویٰ کو کمزور کر دینے کا بھی موجب ہے۔ آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی یا غذا کی قوت مل جاتی تھی اس لئے آپؐ وصال فرما لیتے۔ بعض صحابہ کرامؓ نے نیکی کے جذبہ اور آپؐ کے عمل کو دیکھ کر وصال کرنا شروع کیا تو آپؐ نے انہیں اس سے منع فرمایا مگر جب وہ باز نہ آئے تو آپؐ نے سبق سکھانے کیلئے مسلسل روزے رکھنا شروع کئے تو اتنے میں چاند نظر آگیا تو آپؐ نے زجر و توبیخ کے طور پر فرمایا کہ "کرو وصال کہاں تک کرو گے۔ اگر چاند نظر نہ آتا تو میں وصال صوم کو مزید طول دے دیتا تاکہ تمہیں سبق ملے۔" البتہ بخاری میں ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "وصال نہ کرو ہاں! اگر تم میں سے کوئی وصال کرنا ہی چاہے تو سحر تک وصال کرے۔" جس سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے موقف کی تائید ہوتی ہے کہ صبح تک وصال جائز ہے۔ سحری کا کھانا شعائر اسلام سے ہے۔ اس لئے سحری کھانا چاہئے اور رات دن کا وصال آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ہے۔

(٥٣٨) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ، وَالعَمَلَ بِهِ، والجَهْلَ، فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ». رَوَاهُ البخاريُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس نے جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا اور حماقت و بیوقوفی کو ترک نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانے پینے کو چھڑانے کی ضرورت نہیں۔" (بخاری اور ابوداؤد- اور الفاظ ابوداؤد کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿لم یدع﴾ نہ چھوڑا' ترک نہ کیا۔ ودع سے ماخوذ ہے۔ ﴿الزور﴾ زا پر ضمہ اور "واو" ساکن معنی جھوٹ ﴿الجھل﴾ حماقت و بیوقوفی اور سختی ﴿فلیس للہ حاجۃ﴾ تو اللہ کو اس کی طرف التفات و توجہ کی حاجت و ضرورت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں اس کا یہ عمل قابل قبول نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے کی حالت میں جھوٹ' غلط بیانی' جہالت و نادانی

کے کام بھی ترک کر دینے چاہئیں۔ جھوٹ بولنے اور غلط بیانی سے روزے کی روح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس لئے روزے کی حالت میں ایک روزے دار کا بچنا نہایت ضروری ہے۔ روزے دار کی جسمانی تربیت کے ساتھ روحانی تربیت بھی ہوتی ہے۔ گویا روزے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت پر کنٹرول کرنا سیکھ جائے۔ جھوٹ' دغا' فریب اور نادانی کے کاموں سے اجتناب کرے۔ اگر یہی مقصود حاصل نہ ہوا تو پھر روزہ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

(٥٣٩) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُقَبِّلُ وَهُوَ صَائِمٌ، وَيُبَاشِرُ وَهُوَ صَائِمٌ، وَلٰكِنَّهُ كَانَ أَمْلَكَكُمْ لِإِرْبِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ، وَزَادَ فِي رِوَايَةٍ: «فِي رَمَضَانَ».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لے لیتے تھے اور معانقہ بھی فرما لیتے تھے لیکن آپؐ تمہاری نسبت اپنی طبیعت پر زیادہ کنٹرول اور ضبط کرنے والے تھے۔ (بخاری و مسلم' یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور ایک روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ آپؐ یہ دونوں فعل رمضان میں کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ یقبل ﴾ تقبیل سے ماخوذ ہے۔ ﴿ یباشر ﴾ میاں بیوی کا ایک دوسرے کے جسم سے جسم ملانا' بغل گیر ہونا۔ ﴿ لاربہ ﴾ دونوں پر فتحہ ہے۔ یعنی حاجت' خواہش نفس (میاں بیوی کا صنفی تعلق) اور ایک قراءت کے مطابق ھمزہ کے نیچے کسرہ اور راء ساکن۔ اس صورت میں حاجت اور عضو مخصوص کا احتمال ہے۔ اس حدیث سے بوسہ اور مباشرت جسمانی ایسے آدمی کیلئے مباح ہے جو اپنے آپ پر قابو اور کنٹرول رکھنے کا حوصلہ اور طاقت رکھتا ہو اور یہ رعایت ایسے آدمی کیلئے نہیں جسے اپنے نفس پر پورا کنٹرول نہ ہو۔ یہ قول اس مسئلہ میں تمام اقوال و آراء میں زیادہ مناسب اور مبنی برعدل ہے۔

(٥٤٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ احْتَجَمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ، وَاحْتَجَمَ وَهُوَ صَائِمٌ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے احرام اور روزے کی حالت میں پچھنے لگوائے۔ (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ پچھنے یا سینگی لگوانے سے نہ احرام میں کوئی نقص واقع ہوتا ہے اور نہ روزے میں کوئی کمی آتی ہے۔ دونوں حالتوں میں پچھنے لگوانے جائز ہیں۔ البتہ اگر کمزوری واقع ہو جائے اور اس کی وجہ سے روزہ ٹوٹنے کا اندیشہ و خطرہ پیدا ہو تو پھر پچھنے لگوانے سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔ اکثر ائمہ کرام کی رائے یہی ہے کہ پچھنے لگوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

(٥٤١) وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى عَلَى رَجُلٍ بِالبَقِيْعِ، وَهُوَ يَحْتَجِمُ فِيْ رَمَضَانَ، فَقَالَ: «أَفْطَرَ الحَاجِمُ وَالمَحْجُومُ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

ﷺ بقیع میں ایک ایسے شخص کے پاس تشریف لائے جو رمضان میں پچھنے لگوا رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر آپؐ نے فرمایا کہ ''سینگی (پچھنے) لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔'' (بجز ترمذی اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ احمد' ابن خزیمہ اور ابن حبان تینوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿افطر الحاجم والمحجوم﴾ یہ حدیث اس بارے میں نص ہے کہ سینگی لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ بظاہر یہ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سابقہ حدیث کے معارض ہے۔ جمہور علماء روزے دار کیلئے سینگی لگوانے کے جواز کے قائل ہیں اور اس حدیث کی تاویل میں ان کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ان دونوں نے اپنے آپ افطار کیلئے خود کو پیش کر دیا ہے بلکہ قریب بھی پہنچ گئے جسے سینگی لگائی گئی وہ تو ضعف و کمزوری کی وجہ سے اور سینگی لگانے والا اس لئے کہ اس سے بچنا مشکل ہے کہ جب وہ خون چوس رہا ہو تو کوئی قطرۂ خون حلق میں چلا جائے اور روزہ ٹوٹ جائے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ اس کی ناسخ آئندہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ لیکن جہاں تک تاویل مذکور کا تعلق ہے تو حدیث کے الفاظ اس کے اطلاق کا انکار کر رہے ہیں۔ یہی بات راجح ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث بتا رہی ہے کہ سینگی لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے مگر جمہور اس کے قائل نہیں۔ انہوں نے اس کی جو تاویل کی ہے وہ گو اتنی اہمیت نہیں رکھتی مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور آئندہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کے نسخ کا احتمال قوی تر ہے۔

راوی حدیث: ﴿شداد بن اوس رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابویعلیٰ ہے۔ انصار میں سے ہونے کی وجہ سے انصاری مدنی کہلائے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے برادر زادہ (بھتیجے) تھے۔ علم و حلم کے مالک تھے۔ ۵۸ھ میں ۷۵ برس کی عمر پا کر شام میں وفات پائی۔

(٥٤٢) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَوَّلُ مَا كُرِهَتِ الحِجَامَةُ لِلصَّائِمِ، أَنَّ جَعْفَرَ بْنَ أَبِيْ طَالِبٍ احْتَجَمَ وَهُوَ صَائِمٌ، فَمَرَّ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ: أَفْطَرَ هٰذَانِ. ثُمَّ رَخَّصَ النَّبِيُّ ﷺ بَعْدُ فِي

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے روزہ دار کیلئے سینگی لگوانا اس لئے مکروہ ہوئی کہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے روزہ کی حالت میں سینگی لگوائی' نبی ﷺ اس کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے فرمایا ''ان دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔'' اس کے بعد نبی ﷺ نے روزہ دار کیلئے سینگی لگوانے کی رخصت دے دی

الحِجَامَةِ لِلصَّائِمِ ، وَكَانَ أَنَسٌ يَحْتَجِمُ وَهُوَ صَائِمٌ . رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَقَوَّاهُ .

اور انس رضی اللہ عنہ روزہ کی حالت میں سینگی لگواتے تھے۔ (اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اور اس کو قوی کہا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ بعد ﴾ کے دال پر عموماً ضمہ ہے۔ اسے مبنی علی الضم کہتے ہیں۔ نیت میں مضاف الیہ ہونے کے باوجود اسے حذف کر دیا جاتا ہے جیسے ﴿ بعد ذلک ﴾ اس میں "ذلک" ذہن میں ہوتا ہے مگر اسے حذف کر دیا جاتا ہے اس لئے بعد پر ضمہ پڑھا جاتا ہے۔

حاصل کلام : یہ حدیث واضح دلیل ہے کہ سینگی لگوانے سے روزہ ٹوٹ جانے کا حکم منسوخ ہو گیا ہے اور اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی گزشتہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

(٥٤٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُا ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اكْتَحَلَ فِيْ رَمَضَانَ وَهُوَ صَائِمٌ . رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ ،وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ :لاَ يَصِحُّ فِيْهِ شَيْءٌ .

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں روزہ کی حالت میں سرمہ لگایا۔ (اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس بارے میں کوئی حدیث بھی صحیح نہیں)

حاصل کلام : سرمہ لگانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ' اسحٰق رحمہ اللہ' ابن مبارک رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ روزہ دار کیلئے سرمہ لگانا مکروہ سمجھتے ہیں۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے اور یہی جمہور علماء کی رائے ہے۔ اس بارے میں گو مرفوعاً احادیث سب ضعیف ہیں جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے مگر حضرت انس رضی اللہ عنہ کا اثر ان کا موید ہے جس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے ﴿ لاباس باسناده ﴾ ابن شبرمہ اور اور ابن ابی لیلیٰ نے تو کہہ دیا ہے کہ سرمہ ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے کہ ایک حدیث میں ہے کہ "روزہ اندر جانے والی چیز سے ٹوٹ جاتا ہے) اور سرمہ وغیرہ کا اثر حلق میں اتر جاتا ہے۔ مگر یہ قول درست نہیں کیونکہ سرمہ وغیرہ کا اثر مساموں کے ذریعہ حلق میں ظاہر ہوتا ہے۔ آنکھ براہ راست کھانے کی جگہ نہیں جیسے کوئی تمہ پاؤں کے تلوں پر ملے تو اس کی کڑواہٹ منہ میں محسوس ہوتی ہے حالانکہ اس سے کوئی بھی روزہ ٹوٹ جانے کا قائل نہیں۔ مزید برآں یہ روایت بھی ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں فضل بن المختار اور شعبہ مولیٰ ابن عباس دونوں ضعیف ہیں۔ رہی ابوداؤد کی ایک حدیث کہ روزہ دار سرمہ لگانے سے پرہیز کرے تو اس کے بارے میں خود امام ابوداؤد نے وضاحت کر دی ہے کہ امام یحیٰی بن معین نے مجھ سے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ (نیل' سبل)

(٥٤٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «مَنْ نَسِيَ وَهُوَ صَائِمٌ، فَأَكَلَ أَوْ شَرِبَ، فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ، فَإِنَّمَا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو روزہ دار بھول کر کچھ کھا لے یا پی لے تو اسے چاہئے کہ اپنا روزہ پورا کر لے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا پلایا ہے۔" (بخاری و مسلم)

أَطْعَمَهُ اللَّهُ، وَسَقَاهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَلِلْحَاكِمِ : مَنْ أَفْطَرَ فِيْ رَمَضَانَ نَاسِياً فَلاَ قَضَاءَ عَلَيْهِ وَلاَ كَفَّارَةَ. وَهُوَ صَحِيْحٌ.

اور امام حاکم سے یوں روایت ہے کہ "اگر کوئی بھول کر رمضان میں روزہ کھول لے تو اس پر قضاء اور کفارہ نہیں۔" (اور یہ حدیث صحیح ہے۔)

(٥٤٥) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ ذَرَعَهُ الْقَيْءُ فَلاَ قَضَاءَ عَلَيْهِ، وَمَنِ اسْتَقَاءَ فَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَأَعَلَّهُ أَحْمَدُ، وَقَوَّاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جسے قے آجائے تو اس پر (روزہ کی) قضا نہیں اور جو جان بوجھ کر قے کرے اس پر قضا ہے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور امام احمد نے اس کو معلول کہا ہے اور امام دارقطنی نے اسے قوی کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ذرعہ القئی ﴾ یعنی جو زور سے بغیر ارادہ اور قصد کے قے آئے اور "استقاء" کے معنی یہ ہیں کہ جو قصداً اور اراداتا خود قے کرے۔

حاصل کلام: امام احمد رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے مگر امام دارقطنی رحمہ اللہ' امام ابن حبان رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ' ابن عمر رضی اللہ عنہما' زید بن ارقم رضی اللہ عنہ اور جمہور علماء کا اس روایت کے مطابق یہی قول ہے کہ قصداً قے کرنے سے ہی روزہ ٹوٹتا ہے بلکہ امام ابن منذر نے تو اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر حضرات قے سے روزہ ٹوٹ جانے اور اس کی قضاء کے قائل نہیں مگر یہ قول دلیل کے اعتبار سے انتہائی کمزور ہے۔

(٥٤٦) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ خَرَجَ عَامَ الْفَتْحِ إِلَى مَكَّةَ، فِيْ رَمَضَانَ، فَصَامَ، حَتَّى بَلَغَ كُرَاعَ الْغَمِيْمِ، فَصَامَ النَّاسُ، ثُمَّ دَعَا بِقَدَحٍ مِّنْ مَّاءٍ فَرَفَعَهُ، حَتَّى نَظَرَ النَّاسُ إِلَيْهِ، ثُمَّ شَرِبَ، فَقِيْلَ لَهُ بَعْدَ ذَلِكَ: إِنَّ بَعْضَ النَّاسِ قَدْ صَامَ، فَقَالَ: «أُولٰئِكَ الْعُصَاةُ، أُولٰئِكَ الْعُصَاةُ».

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ کی طرف رمضان میں نکلے تو آپؐ نے روزہ رکھا یہاں تک کہ آپؐ کراع الغمیم (ایک جگہ کا نام) پہنچے۔ اس دن لوگوں نے بھی روزہ رکھا۔ آپؐ نے پانی کا پیالہ منگوایا اور اس کو اتنا اونچا کیا کہ لوگوں نے دیکھ لیا۔ پھر آپؐ نے اسے پی لیا۔ پھر اس کے بعد آپؐ سے کہا گیا کہ بعض لوگوں نے روزہ رکھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "یہی لوگ نافرمان ہیں' یہی لوگ نافرمان ہیں۔" اور ایک حدیث کے الفاظ یوں ہیں کہ آپؐ سے کہا

وَفِي لَفْظٍ: «فَقِيلَ لَهُ: إِنَّ النَّاسَ قَدْ شَقَّ عَلَيْهِمُ الصِّيَامُ، وَإِنَّمَا يَنْتَظِرُوْنَ فِيْمَا فَعَلْتَ، فَدَعَا بِقَدَحٍ مِّن مَّاءٍ بَعْدَ العَصْرِ فَشَرِبَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ

گیا کہ بے شک لوگوں کو روزہ نے مشقت میں ڈال دیا ہے اور اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہ وہ آپؐ کے عمل کا انتظار کرتے ہیں تو آپؐ نے عصر کے بعد پانی کا پیالہ منگوایا اور پی لیا۔

لغوی تشریح: ﴿خرج عام الفتح﴾ نبی کریم ﷺ ۸ ہجری ۱۰ رمضان کو مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے ﴿کراع الغمیم﴾ "کاف" پر ضمہ اور "راء" پر تخفیف اور "انعمیم" میں "غین" پر فتحہ اور "میم" پر کسرہ ہے۔ عسفان سے آگے ایک وادی کا نام ہے۔ ﴿دعا بقدح﴾ یعنی پیالہ طلب کیا۔ ﴿فرفعه﴾ اسے اس کو ہاتھ پر رکھ کر بلند کیا تاکہ لوگ دیکھ لیں اور روزہ افطار کر لینے کا انہیں علم ہو جائے۔ ﴿اولئک العصاة﴾ "عصاۃ" عاص کی جمع ہے یعنی نافرمان۔ کیونکہ انہوں نے اپنے آپ پر سختی کی اور روزہ افطار کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ علامہ الیمانی نے سبل السلام میں کہا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مسافر کو اختیار ہے کہ چاہے تو روزہ رکھے اور اگر چاہے تو روزہ نہ رکھے اور ضرورت پر مسافر روزہ افطار بھی کر سکتا ہے اگرچہ دن کا اکثر حصہ روزہ سے گزر چکا ہو۔ مولانا صفی الرحمٰن فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ سفر کے دوران مشقت کی صورت میں روزہ افطار کرنا افضل ہے۔

(٥٤٧) وَعَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَمْرٍو الأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي أَجِدُ بِيْ قُوَّةً عَلَى الصِّيَامِ فِي السَّفَرِ، فَهَلْ عَلَيَّ جُنَاحٌ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: **«هِيَ رُخْصَةٌ مِّنَ اللهِ، فَمَنْ أَخَذَ بِهَا فَحَسَنٌ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يَصُومَ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِ»**. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَأَصْلُهُ فِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ مِن حَدِيثِ عَائِشَةَ، أَنَّ حَمْزَةَ بْنَ عَمْرٍو سَأَلَ.

حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول (ﷺ) سے کہا: میں سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہوں (اگر میں روزہ رکھ لوں) تو کیا مجھ پر کوئی حرج ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے جو اس کو لے لے تو بہتر ہے اور جو کوئی روزہ رکھنا پسند کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں۔" (مسلم' اور اس حدیث کا اصل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی متفق علیہ حدیث میں یوں ہے کہ حمزۃ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے سوال کیا)

راوی حدیث: ﴿حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ﴾ حجاز کے رہنے والے صحابی ہیں جن کی کنیت ابوصالح یا ابومحمد ہے۔ ان سے ان کے فرزند اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں۔ وہ ٦١ھ میں فوت ہوئے اور ان کی عمر ۸۰ برس کی تھی۔

(٥٤٨) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

اللّٰهُ تَعالَى عَنهُمَا قَالَ: رُخِّصَ لِلشَّيْخِ الكَبِيْرِ أَنْ يُفْطِرَ وَيُطْعِمَ عَنْ كُلِّ يَوْمٍ مِّسْكِيناً، وَلاَ قَضَاءَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالحَاكِمُ، وَصَحَّحَاهُ.

بڑی عمر والے بوڑھے کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ افطار کرے اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے اور اس پر قضاء نہیں ہے۔ (اسے دار قطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دونوں نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ رخص ﴾ یہ "رخصت" سے ہے اور احتمال ہے کہ یہ رخصت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآن پاک کی آیت سے سمجھی ہو اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس رخصت کی صراحت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہو۔ ﴿ ویطعم عن کل یوم مسکینا ﴾ کہ ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اس کی مقدار گندم اور کھجور وغیرہ کا ایک مد مراد ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بہت بوڑھا شخص جس کی طاقت بحال ہونے کی امید نہ ہو۔ اسی طرح علاج سے مایوس مریض کا بھی یہی حکم ہے کہ یومیہ ایک مسکین کے کھانے کے برابر صدقہ کرے۔ ایک روایت میں کھانے کا اندازہ آدھا صاع گندم آیا ہے۔ یعنی سوا کلو گندم۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ جب بہت بوڑھے ہوگئے تو انہوں نے کھانا تیار کرایا اور تیس مسکینوں کو بلا کر کھلایا۔ امام دار قطنی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حاملہ اور بچے کو دودھ پلانے والی عورت کا بھی یہی حکم ہے۔ مسکین کو کھانا کھلانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ جمہور کے نزدیک ضروری ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اسے مستحب قرار دیتے ہیں اور بعض نے کھانا کھلانے کو منسوخ قرار دیا ہے۔ یعنی اتنی مقدار صدقہ کر دیا جائے تب بھی جائز ہے۔ (سبل، فتح)

(٥٤٩) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: هَلَكْتُ يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ: «وَمَا أَهْلَكَكَ»؟ قَالَ: وَقَعْتُ عَلَى امْرَأَتِي فِي رَمَضَانَ، فَقَالَ: «هَلْ تَجِدُ مَا تُعْتِقُ رَقَبَةً»؟ قَالَ: لاَ، قَالَ: «فَهَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تَصُومَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ»؟ قَالَ: لاَ، قَالَ: «فَهَلْ تَجِدُ مَا تُطْعِمُ سِتِّيْنَ مِسْكِيناً»؟ قَالَ: لاَ، ثُمَّ جَلَسَ، فَأُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِعَرَقٍ فِيْهِ تَمْرٌ،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ہلاک ہوگیا۔ آپؐ نے فرمایا "کس چیز نے تجھے ہلاک کیا؟" اس نے کہا میں رمضان میں اپنی عورت سے مباشرت کر بیٹھا۔ تو آپؐ نے فرمایا "کیا تجھ میں اتنی طاقت ہے کہ ایک گردن کو آزاد کر دے؟" اس نے کہا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا "کیا تو طاقت رکھتا ہے کہ دو ماہ کے متواتر روزے رکھے؟" اس نے کہا، نہیں۔ آپؐ نے فرمایا "کیا تیرے پاس اتنا مال ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکے؟" اس نے کہا نہیں۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔ تو نبی

فَقَالَ: «تَصَدَّقْ بِهٰذَا»، فَقَالَ: أَعَلَى أَفْقَرَ مِنَّا؟ فَمَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا أَهْلُ بَيْتٍ أَحْوَجُ إِلَيْهِ مِنَّا، فَضَحِكَ النَّبِيُّ ﷺ حَتَّى بَدَتْ أَنْيَابُهُ، ثُمَّ قَالَ: «اذْهَبْ فَأَطْعِمْهُ أَهْلَكَ». رَوَاهُ السَّبْعَةُ وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

ﷺ کے پاس ایک ٹوکرا لایا گیا جس میں کھجوریں تھیں۔ آپؐ نے فرمایا ”ان کو خیرات کر دو۔“ اس نے کہا کیا اپنے سے زیادہ محتاج پر (خیرات کروں)؟ کیونکہ دو سنگلاخ پہاڑوں (مدینہ) کے مابین کوئی گھر والا مجھ سے زیادہ محتاج نہیں۔ تو نبی ﷺ مسکرائے یہاں تک کہ آپؐ کی داڑھیں ظاہر ہوگئیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا ”جاؤ اسے اپنے گھر والوں کو کھلا دو۔“
(اسے ساتوں نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ جاء رجل ﴾ آدمی آیا۔ اس شخص کا نام سلمان یا سلمہ صخر بیاضی تھا۔ ﴿ وقعت علی امراتی ﴾ میں اپنی بیوی پر پڑ گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے میں نے اس سے وطی کی ہے اور اس کا یہ کہنا کہ ﴿ هلکت ﴾ میں ہلاک ہوگیا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ روزہ کی حالت میں بیوی سے جماع کرنے کی حرمت سے باخبر تھا اور اس نے عمداً یہ حرکت کر لی۔ جس سے وہ شخص اس حکم سے خارج ہے جس نے بھول کر جماع کیا ہو۔ ﴿ رقبة ﴾ سے مراد غلام یا لونڈی ہے اور یہ ﴿ ماتعتق ﴾ میں ”ما“ کا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿ فاتی ﴾ صیغۂ مجہول ہے یعنی نبی ﷺ کے پاس لایا گیا۔ ﴿ بعرق ﴾ سے مراد بڑا ٹوکرا ہے۔ ﴿ فیہ تمر ﴾ جس میں پندرہ صاع یعنی ساٹھ مد کھجوریں تھیں۔ یہ اس لئے کہ ہر مسکین کیلئے ایک مد ہے اور دار قطنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا ہر مسکین کیلئے ایک مد ہو ﴿ اعلی افقر ﴾ میں ہمزہ استفہام ہے اور ”علی“ حرف جر ہے۔ یعنی کیا میں ایسے شخص پر صدقہ کروں جو مجھ سے اور میرے اہل بیت سے بھی زیادہ محتاج ہو؟ ﴿ فما بین لابتیھا ﴾ میں ﴿ لابتیھا ﴾ لابۃ کا ﴿ تثنیۃ ﴾ ہے اور باء پر فتح ہے۔ یعنی وہ سیاہ پتھریلی زمین جسے آگ نے جلایا ہو اور ”ھا“ کی ضمیر مدینہ طیبہ کی طرف ہے اور ”لابتان“ سے معروف دو حرے مراد ہیں جو مدینہ طیبہ کے شرقی اور غربی جانب ہیں۔ ایک کا نام ”حرۃ الواقم“ اور دوسرے کا ”حرۃ الوبرۃ“ ہے اور مدینہ طیبہ ان دونوں کے مابین واقعہ ہے۔ لہٰذا ”لابتین“ سے مراد مدینہ منورہ ہے۔ یعنی مدینہ میں کوئی اہل خانہ مجھ سے زیادہ ان کھجوروں کا محتاج نہیں۔ ﴿ انیابہ ﴾ یہ ”ناب“ کی جمع ہے اور یہ وہ دانت ہوتے ہیں جو ”رباعی“ کے ساتھ ملے ہوتے ہیں اور ”رباعی“ ثنایا کے ساتھ والے دانت کو کہتے ہیں اور ”ثنایا“ سے سامنے کے دو دانت مراد ہوتے ہیں اور اس کا اطلاق اوپر اور نیچے کے سامنے کے دو دانتوں پر ہوتا ہے۔ (اطعمہ اھلک) یہ اپنے گھر والوں کو کھلاؤ۔ یہ حدیث اس بات کی قطعاً دلیل نہیں کہ فقیر پر کفارہ نہیں یا فقیر کا اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا ہی کافی ہے بلکہ یہ تنگ دستی کی بنا پر کفارہ مؤخر ہونے کی دلیل ہے کہ جب میسر آئے تب کفارہ ادا کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک قول میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے کہ تنگ دست پر کفارہ نہیں۔ مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ' امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوثور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ استدلال درست نہیں' کفارہ جب میسر ہو بہرنوع ادا کیا جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کفارہ کا ذکر کیا۔ تنگ دستی کی بنا پر کھجوریں اسے بطور صدقہ کے دیں کفارہ کے طور پر نہیں۔ اس حدیث میں قطعاً ذکر نہیں کہ آپؐ نے اس سے کفارہ کو ساقط قرار دیا ہو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو کفارہ کے سقوط کا ذکر ہے وہ سخت ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔ نیز اس حدیث میں گو روزہ قضا رکھنے کا حکم نہیں مگر دوسری احادیث میں قضا کا حکم موجود ہے۔ اس بنا پر ائمہ اربعہ اور جمہور علماء ایسی صورت میں مرد و زن دونوں کیلئے روزہ رکھنے کے قائل ہیں۔ الاّ یہ کہ عورت روزہ دار نہ ہو۔ تو عورت پر قضا نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے اس حدیث پر دو جلدوں میں بحث کی ہے اور اس سے ایک ہزار فوائد و مسائل کا استنباط کیا ہے۔

(۵۵۰) وَعَنْ عَائِشَةَ وَأُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصْبِحُ جُنُباً مِنْ جِمَاعٍ، ثُمَّ يَغْتَسِلُ وَيَصُومُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ فِي حَدِيثِ أُمِّ سَلَمَةَ «وَلاَ يَقْضِي».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جماع سے جنبی ہوتے تو صبح ہونے پر آپؐ غسل کرتے اور روزہ رکھتے۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم نے ام سلمہ رضی اللہ عنہما کی حدیث میں یہ زائد کیا کہ قضا نہیں دیتے تھے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جنبی آدمی پر غسل سے پہلے صبح ہو جائے تو روزہ درست ہے۔ جمہور اسی کے قائل ہیں بلکہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور اس کے معارض مسند امام احمد وغیرہ میں جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اگر کسی پر حالت جنابت میں صبح ہو جائے تو روزہ نہ رکھے' اس کے بارے میں جمہور نے کہا ہے کہ وہ منسوخ ہے اور خود حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ جو ایسی صورت میں روزہ نہ رکھنے کے قائل تھے' نے جب یہ حدیث سنی تو انہوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ (سبل وغیرہ)

(۵۵۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامٌ، صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص فوت ہو جائے اور اس پر روزہ لازم ہو تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وعليه صيام ﴾ یعنی اس کے ذمہ روزہ لازم و واجب ہو کیونکہ "علی" کا لفظ وجوب کیلئے ہے۔ ﴿ صام عنه وليه ﴾ اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ولی یعنی وارث کو میت کی طرف سے روزہ رکھنا چاہئے اور روزہ میں نیابت جائز ہے اور جن حضرات نے

کہا ہے کہ روزہ میں نیابت نہیں ان کے پاس کوئی قابل اعتماد دلیل نہیں۔ راجح یہی ہے کہ روزہ میں نیابت ہے۔

حاصل کلام: عموماً محدثین نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حج کی طرح روزہ میں بھی نیابت درست ہے مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میت کی طرف سے روزہ نہیں بلکہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا چاہئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ مگر اس صریح اور صحیح حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ میں نیابت بھی جائز ہے اور یہی بات راجح ہے۔ نیز حج کی طرح لازم نہیں کہ ولی ہی میت کی طرف سے روزہ رکھے کوئی اور دوسرا آدمی بھی روزہ رکھ سکتا ہے۔ حدیث میں ولی کا ذکر اغلبیت کی بنا پر ہے۔ (سبل)

١ - بَابُ صَوْمِ التَّطَوُّعِ، وَمَا نُهِيَ عَنْ صَوْمِهِ

نفلی روزے اور جن دنوں میں روزہ رکھنا منع کیا گیا ہے' کا بیان

(٥٥٢) عَنْ أَبِي قَتَادَةَ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ سُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ، قَالَ: «يُكَفِّرُ السَّنَةَ الْمَاضِيَةَ وَالبَاقِيَةَ»، وَسُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَاشُورَاءَ فَقَالَ: «يُكَفِّرُ السَّنَةَ المَاضِيَةَ»، وَسُئِلَ عَنْ صَومِ يَوْمِ الاثْنَيْنِ، فَقَالَ: «ذٰلِكَ يَوْمٌ وُلِدْتُ فِيهِ، وَبُعِثْتُ فِيهِ، وَأُنْزِلَ عَلَيَّ فِيهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرفہ (9 ذوالحج) کے دن روزے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "(یہ روزہ) گزشتہ سال اور آئندہ سال کے گناہ دور کر دیتا ہے۔" اور آپؐ سے عاشورہ کے دن کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا "یہ گزشتہ سال کے گناہ دور کر دیتا ہے۔" اور آپؐ سے سوموار کے دن کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ "اس دن میں پیدا ہوا اور اسی دن مجھے نبوت دی گئی اور اسی دن مجھ پر قرآن اتارا گیا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یوم عرفۃ ﴾ عرفہ کا دن' ذی الحجہ کا نواں دن ہوتا ہے اور جو میدان عرفات میں نہ ہو اس کیلئے اس دن کا روزہ مستحب ہے اور جو میدان عرفات میں ہو اس کے بارے میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔ اس بارے میں سب سے معتدل قول یہ ہے کہ میدان عرفات میں حاجی کیلئے روزہ مستحب نہیں بلکہ مکروہ ہے۔ ﴿ یکفر ﴾ یہ تکفیر سے ہے یعنی اس کی برکت سے پہلے اور آنے والے سال کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور عرفہ کا روزہ دو سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور ان گناہوں سے صغیرہ

گناہ مراد ہیں کبیرہ نہیں کیونکہ وہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے' یا یہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف فرما دیں۔ "یوم عاشوراء" عاشورہ کا دن محرم الحرام کی دس تاریخ کو ہوتا ہے۔ یہود اس دن روزہ رکھتے تھے۔ آپؐ نے بھی اس دن روزہ رکھنے کی ترغیب دی' البتہ فرمایا کہ "یہود کی مخالفت میں ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھو" اور سوموار کے روز' روزہ رکھنے کے بارے میں آپؐ نے جو فرمایا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو اپنی کسی خاص نعمت سے نوازا ہو۔ بطور تشکر و تقرب اس دن روزہ مستحب ہے اور سوموار کے دن روزہ رکھنے کے بارے میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "اس دن اللہ کے حضور اعمال پیش کئے جاتے ہیں اس لئے میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ کے حضور میرے اعمال روزہ کی حالت میں پیش کئے جائیں۔"

(٥٥٣) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّال، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو کوئی رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے بعد چھ روزے شوال کے رکھے یہ عمل سارے سال (روزے رکھنے) کی مانند ہوگا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ثم اتبعه﴾ یعنی رمضان کے بعد روزہ رکھے۔ ﴿ستامن شوال﴾ چھ شوال کے۔ خواہ یہ شوال کے آغاز میں رکھے یا درمیان میں یا آخر میں اور خواہ متواتر رکھے یا متفرق ﴿کان کصیام الدھر﴾ گویا اس نے سال بھر کے روزے رکھے۔ یہ اس لئے کہ ہر نیکی کا بدلہ دس گنا ہوتا ہے۔ رمضان کے روزے دس ماہ کے برابر اور چھ شوال کے دو ماہ کے برابر۔

(٥٥٤) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا مِنْ عَبْدٍ يَصُومُ يَوْماً فِي سَبِيلِ اللهِ إِلاَّ بَاعَدَ اللَّهُ بِذَلِكَ الْيَوْمِ عَنْ وَجْهِهِ النَّارَ سَبْعِينَ خَرِيفاً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کوئی شخص ایسا نہیں جو اللہ کی راہ میں ایک دن روزہ رکھے مگر اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو ستر سال کیلئے جہنم کی آگ سے دور کر دیتے ہیں۔" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿فی سبیل اللہ﴾ اللہ کی راہ میں' جب مطلقاً یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد جہاد ہوتا ہے۔ یعنی جہاد کے دوران جو ایک دن روزہ رکھتا ہے اسے یہ فضیلت حاصل ہوگی لیکن اگر روزہ رکھنے سے کمزوری آجائے اور جہاد و قتال میں کمزوری کا باعث بنے تو پھر روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ "خریفا" سے مراد ایک سال ہے۔

(٥٥٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَصُومُ حَتَّى نَقُولَ لاَ يُفْطِرُ، وَيُفْطِرُ حَتَّى نَقُولَ لاَ يَصُومُ، وَمَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ اسْتَكْمَلَ صِيَامَ شَهْرٍ قَطُّ إِلاَّ رَمَضَانَ، وَمَا رَأَيْتُهُ فِي شَهْرٍ أَكْثَرَ مِنْهُ صِيَاماً فِيْ شَعْبَانَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

روزے رکھتے تھے یہاں تک کہ ہم کہتے: آپؐ کبھی افطار نہیں کریں گے اور آپؐ روزے چھوڑ دیتے یہاں تک کہ ہم کہتے تھے (اسی طرح) آپؐ کبھی روزے نہیں رکھیں گے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپؐ نے کبھی سوائے رمضان کے کسی مہینے کے مکمل روزے رکھے ہوں اور میں نے آپؐ کو نہیں دیکھا کہ کسی مہینے میں آپؐ نے شعبان سے زیادہ روزے رکھے ہوں۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کم و بیش ہر مہینے میں روزے رکھتے تھے۔ کبھی متواتر روزے رکھتے اور کبھی ضروری مشاغل کی بنا پر کئی کئی دن روزہ نہ رکھتے۔ البتہ رمضان کے علاوہ سب سے زیادہ روزے آپؐ شعبان میں رکھتے تھے۔

(٥٥٦) وَعَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَن نَصُومَ مِنَ الشَّهْرِ ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ، ثَلاَثَ عَشْرَةَ، وَأَرْبَعَ عَشْرَةَ، وَخَمْسَ عَشْرَةَ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ہم ہرماہ تین دن کے روزے رکھیں یعنی تیرہ' چودہ اور پندرہ (تاریخ کو)۔ (اسے نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

(٥٥٧) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: **«لاَ يَحِلُّ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَصُومَ، وَزَوْجُهَا شَاهِدٌ، إِلاَّ بِإِذْنِهِ»**. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ، زَادَ أَبُو دَاوُدَ: «غَيْرَ رَمَضَانَ».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "کسی عورت کیلئے حلال نہیں کہ وہ روزہ رکھے جبکہ اس کا خاوند گھر میں ہو۔ الآ یہ کہ شوہر اس کی اجازت دے۔" (بخاری و مسلم' یہ الفاظ بخاری کے ہیں) اور ابوداؤد نے "سوائے رمضان" کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ شوہر کے حقوق کی ادائیگی نفلی روزہ سے مقدم ہے۔ نفلی روزہ خاوند کی اجازت کے بغیر رکھنا عورت پر حرام ہے۔ البتہ فرضی روزہ کا حکم اس سے مستثنیٰ ہے کہ فرض کی ادائیگی بہرنوع مقدم ہے۔

(٥٥٨) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنْ صِيَامِ يَوْمَيْنِ: يَوْمِ الفِطْرِ، وَيَوْمِ النَّحْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ عیدالفطر کا دن اور قربانی کا دن۔ (بخاری و مسلم)

(٥٥٩) وَعَنْ نُبَيْشَةَ الهُذَلِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «أَيَّامُ التَّشْرِيقِ أَيَّامُ أَكْلٍ وَشُرْبٍ وَذِكْرِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت نبیشہ الھذلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تشریق کے دن کھانے' پینے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے دن ہیں۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ایام التشریق﴾ تشریق کے دن یوم النحر یعنی دس ذی الحجہ کو قربانی کے دن کے بعد۔ مزید تین دن ہیں۔ ﴿ایام اکل وشرب﴾ کھانے پینے کے دن ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ ان دنوں روزہ رکھنا حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿نبیشۃ رضی اللہ عنہ﴾ تصغیر کے ساتھ' ان کے والد کا نام و نسب یوں ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن عتاب الھذلی۔ مشہور صحابی ہیں اور ان سے گیارہ احادیث مروی ہیں۔ بصرہ میں سکونت اختیار کرلی تھی اور انہیں "نبیشۃ الخیر" کہا جاتا تھا۔

(٥٦٠) وَعَنْ عَائِشَةَ وَابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمْ قَالاَ: لَمْ يُرَخَّصْ فِي أَيَّامِ التَّشْرِيْقِ أَنْ يُصَمْنَ إِلاَّ لِمَنْ لَمْ يَجِدِ الهَدْيَ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی سوائے اس شخص کے جسے قربانی کا جانور نہ ملا ہو۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لم یرخص﴾ یہ صیغہ مجہول ہے کہ رخصت نہیں دی گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حکماً مرفوع ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ ان دونوں (عائشہؓ اور ابن عمرؓ) نے سورۂ بقرہ کی اس آیت ۱۹۶ سے یہ مسئلہ سمجھا ہو۔ فمن لم یجد.... کہ جو ھدی نہ پائے وہ حج میں تین روزے رکھے۔ ﴿ان یصمن﴾ یہ بھی صیغہ مجہول ہے۔ ﴿الا لمن یجد الھدی﴾ سوائے اس شخص کے جو ھدی نہ پائے۔ "ھدی" اس اونٹ کو کہتے ہیں جو کعبہ کی طرف حرم میں ذبح کرنے کیلئے بھیجا جاتا ہے۔ یعنی جو شخص حج تمتع یا قران کرنے والا ہو یا محصر ہو اور اس کے پاس قربانی نہ ہو تو اس کیلئے ایام تشریق میں روزے رکھنے جائز ہیں کیونکہ یہ حدیث حقیقی طور پر مرفوع نہیں اور جو اس بارے میں مرفوع روایات میں ہے وہ سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں۔

حاصل کلام: ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی متعدد احادیث میں ممانعت آئی ہے اور اس بارے میں علماء کا

اختلاف ہے۔ بعض اہل علم مطلقاً ان دنوں روزہ رکھنا مکروہ قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ وغیرہ کا یہی موقف ہے اور ان کا استدلال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے ہے مگر یہ حقیقتاً مرفوع نہیں۔ احتمال ہے کہ ان حضرات نے قرآن مجید کے ظاہری سیاق سے یہی سمجھا ہو کہ "ایام حج" سے مراد یہی ایام تشریق ہیں۔ جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے۔ یوم النحر سے پہلے اور ایام تشریق کے بعد کے دن بھی مراد ہو سکتے ہیں اور سنن دار قطنی وغیرہ میں جو یہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ھدی نہ رکھنے والے متمتع کو روزہ کی رخصت دی تو وہ ضعیف ہے کیونکہ اس کا راوی یحیٰی بن سلام قوی نہیں۔ اس لئے راجح یہی ہے کہ ایام تشریق میں بہر نوع روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

(٥٦١) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لاَ تَخُصُّوا لَيْلَةَ الجُمُعَةِ بِقِيَامٍ، مِنْ بَيْنِ اللَّيَالِي، وَلاَ تَخُصُّوا يَوْمَ الجُمُعَةِ بِصِيَامٍ، مِنْ بَيْنِ الأَيَّامِ، إِلاَّ أَنْ يَكُونَ فِي صَوْمٍ يَصُومُهُ أَحَدُكُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دوسری راتوں میں سے جمعہ کی رات کو قیام کرنے کیلئے مخصوص نہ کرو اور نہ ہی دوسرے دنوں میں سے جمعہ کے دن کو روزہ کیلئے مختص کرو سوائے اس کے کہ جمعہ کا دن ایسے دن میں آجائے جس دن روزہ رکھتا ہو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لاتختصوايوم الجمعة ﴾ یعنی اکیلا جمعہ کے دن کو روزہ کیلئے مختص نہ کرو۔ اس لئے کہ جمعہ کا دن عید کا دن ہے اور عید کے دن روزہ نہیں ہوتا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ممانعت تحریمی ہے مگر جمہور نے اسے نہی تنزیہی پر محمول کیا ہے کیونکہ ترمذی میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت کم جمعہ کا روزہ چھوڑتے تھے۔ مگر اس میں احتمال ہے کہ شاید اس کے ساتھ آپؐ ایک دن پہلے یا بعد میں بھی روزہ رکھتے ہوں گے۔ یاد رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا ریب جمعہ کو عید کا دن فرمایا ہے مگر عید اور جمعہ میں اتنا فرق ضرور ہے کہ عید کا دن روزہ اس سے ایک روز پہلے یا بعد روزہ رکھنے سے بھی جائز نہیں جبکہ جمعہ میں یہ صورت بالاتفاق جائز ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی اجازت دی ہے جیسا کہ اس کی بعد کی حدیث میں آرہا ہے۔

(٥٦٢) وَعَنْهُ أَيْضاً قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَصُومَنَّ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الجُمُعَةِ، إِلاَّ أَنْ يَصُومَ يَوْماً قَبْلَهُ، أَوْ يَوْماً بَعْدَهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے کوئی بھی جمعہ کے دن روزہ نہ رکھے سوائے اس کے کہ اس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد روزہ رکھے۔" (بخاری و مسلم)

(٥٦٣) وَعَنْهُ أَيْضاً أَنَّ رَسُولَ اللهِ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول

ﷺ قَالَ: «إِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلاَ تَصُومُوا». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَحْمَدُ.

اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جب شعبان آدھا ہو جائے تو روزہ نہ رکھو۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور امام احمد رحمہ اللہ نے اسے منکر کہا ہے)

حاصل کلام: یہ ممانعت اس لئے ہے کہ شعبان کے آخری دنوں میں روزے رکھ کر ضعف و کمزوری لاحق نہ ہو جائے اور رمضان المبارک کے روزہ میں قوت بحال رہے۔ یہ نہی تنزیہی ہے کیونکہ یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ شعبان کے آخری دنوں میں بھی روزہ رکھ لیتے تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے جو اس حدیث کو منکر کہا ہے تو اس بنا پر نہیں کہ اس کا کوئی راوی ضعیف ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اسے بیان کرنے میں علاء بن عبدالرحمٰن منفرد ہیں اور امام احمد تفرد ثقہ پر بھی منکر کا لفظ بول دیتے ہیں۔ نیز اس ممانعت سے وہ روزے مستثنیٰ ہیں جو عادتاً رکھے جاتے ہیں مثلاً جو شخص ہر سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھتا ہے تو نصف شعبان کے بعد بھی ان دنوں روزہ رکھنا جائز ہے۔ (فتح الباری وغیرہ)

(٥٦٤) وَعَنِ الصَّمَّاءِ بِنْتِ بُسْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لاَ تَصُومُوا يَوْمَ السَّبْتِ إِلاَّ فِيمَا افْتُرِضَ عَلَيْكُمْ، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ أَحَدُكُمْ إِلاَّ لِحَاءَ عِنَبٍ، أَوْ عُودَ شَجَرَةٍ، فَلْيَمْضُغْهَا». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، إِلاَّ أَنَّهُ مُضْطَرِبٌ، وَقَدْ أَنْكَرَهُ مَالِكٌ، وَقَالَ أَبُو دَاوُدَ: هُوَ مَنْسُوخٌ.

حضرت صماء بنت بسر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہفتہ کے دن کا روزہ نہ رکھو۔ سوائے اس روزہ کے جو تم پر فرض کیا گیا ہے۔ پس اگر تم میں سے کوئی انگور کا چھلکا یا کسی درخت کا تنکا پائے تو چاہئے کہ اس کو کھا لے۔" (اسے پانچویں نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں مگر اس میں اضطراب ہے۔ بے شک امام مالک رحمہ اللہ نے اس کا انکار کیا ہے اور ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ منسوخ ہے)

لغوی تشریح: ﴿لحاء عنب﴾ کے لام پر فتحہ اور کسرہ دونوں طرح پر ہے اور آخر میں مد ہے۔ جس کے معنی ہیں چھلکا اور "العنب" کی عین کے نیچے زیر اور نون پر فتحہ ہے۔ مشہور پھل یعنی انگور کو "عنب" کہتے ہیں۔ ﴿فليمضغها﴾ یہ باب نصر اور فتح دونوں سے آتا ہے۔ یعنی اسے کھا لے اور اس سے روزہ افطار کر لے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ہفتہ کے روز روزہ کی یہ ممانعت اس لئے ہے کہ یہود ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے۔" اور اس کی تائید آئندہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿الصماء بنت بسر رضی اللہ عنہا﴾ صاد پر زبر اور میم مشدد ان کا نام بہیہ تھا اور بھیہ کی باء پر پیش "حاء" مفتوح اور باء مشدد اور ایک قول کے مطابق ان کا نام بھیمہ میم کے اضافہ کے ساتھ تھا۔ "بسر" کی باء پر پیش اور را ساکن قبیلہ مازن سے تعلق رکھتی تھیں۔ صحابیہ تھیں۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عبداللہ بن بسر کی بہن تھیں اور بعض نے پھوپھی اور بعض نے خالہ کہا ہے۔

(٥٦٥) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَكْثَرَ مَا كَانَ يَصُومُ مِنَ الأَيَّامِ، يَوْمُ السَّبْتِ، وَيَوْمُ الأَحَدِ، وَكَانَ يَقُولُ: «إِنَّهُمَا يَوْمَا عِيدٍ لِلْمُشْرِكِينَ، وَأَنَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَهُمْ». أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ، وَهٰذَا لَفْظُهُ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہفتہ اور اتوار کو اکثر روزہ رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ "یہ دونوں دن مشرکوں کی عید کے دن ہیں اور میں ان کی مخالفت کرنا چاہتا ہوں۔" (اسے امام نسائی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے اور یہ الفاظ ابن خزیمہ کے ہیں)

حاصل کلام: پہلی حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہفتہ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ لیکن وہ روایت مضطرب اور منسوخ ہے جیسا کہ مصنف علام نے ذکر کیا ہے اور اس کی ناسخ یہی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہفتہ اور اتوار کو عموماً روزہ رکھتے تھے محض اس لئے کہ یہود و نصاریٰ کی مخالفت کی جائے۔ کیونکہ یہود ہفتہ کے دن کی اور نصاریٰ اتوار کے دن کی تعظیم کرتے تھے۔ آپؐ نے ان کے برعکس ان دنوں کا روزہ رکھ کر واضح کر دیا کہ یہ عید اور تعظیم کے دن نہیں ہیں۔

(٥٦٦) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ بِعَرَفَةَ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ غَيْرَ التِّرْمِذِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالحَاكِمُ، وَاسْتَنْكَرَهُ العُقَيْلِيُّ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عرفات میں عرفہ کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ (اسے ترمذی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے اور امام عقیلی رحمہ اللہ نے اسے منکر کہا ہے)

حاصل کلام: امام عقیلی رحمہ اللہ نے اسے منکر اس لئے کہا ہے کہ اس کے راوی حوشب بن عقیل نے یہ حدیث مھدی بن حرب الھجری سے روایت کی ہے اور حوشب کی کسی نے بھی متابعت نہیں کی۔ مگر یہ اعتراض کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ حوشب کو اکثر محدثینؒ نے ثقہ کہا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا فیصلہ بھی تقریب التھذیب میں یہی ہے کہ وہ ثقہ ہے۔ البتہ مھدی الھجری کے بارے میں امام ابن معین نے کہا ہے کہ میں اسے نہیں جانتا۔ لیکن امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے اور حافظ ذھبی نے تلخیص المستدرک میں ان کی تائید کی ہے اور امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ ابن حبان رحمہ اللہ نے ثقات میں اسے ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "مقبول" کہا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عرفات میں حاجی کو یوم عرفہ کا روزہ رکھنا حرام ہے۔ امام یحییٰ بن سعید انصاری کا یہی موقف ہے۔ اس کی تائید سنن نسائی' ترمذی وغیرہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے کہ "یوم عرفہ ہماری عید کا دن ہے" یعنی اہل عرفہ کیلئے یہ دن عید کا ہے۔ اس لئے انہیں اس روز روزہ رکھنے کی ممانعت ہے۔ البتہ جمہور کے نزدیک روزہ نہ رکھنا مستحب ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بھی حجۃ الوداع کے موقعہ پر یوم

عرفہ کا روزہ نہیں رکھا تھا۔

(٥٦٧) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ صَامَ مَنْ صَامَ الأَبَدَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ بِلَفْظِ: «لاَ صَامَ وَلاَ أَفْطَرَ».

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے (گویا) روزہ نہیں رکھا۔" (بخاری و مسلم) اور مسلم میں ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ ہیں کہ "نہ روزہ رکھا نہ افطار کیا۔"

لغوی تشریح: ﴿لاصام من صام الابد﴾ میں "الابد" ہمیشہ اور سال بھر روزہ رکھنا مراد ہے اور ہمیشہ روزہ رکھنے کی ممانعت اس لئے ہے کہ یہ طریقہ نبی کریم ﷺ کی سنت کے خلاف ہے جس کا کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ ﴿لاصام ولا افطر﴾ یعنی ہمیشہ روزہ رکھنے والے کا نہ روزہ ہے اور نہ افطار ہے۔ روزہ نہ ہونے کا مفہوم تو یہی ہے کہ یہ سنت کے خلاف ہے اور "نہ افطار کیا" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھانے پینے کی چیزوں سے محروم رہا۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنا مکروہ ہے اور باقی سارا سال روزے رکھ کر صرف عیدین اور ایام تشریق کے روزے نہ رکھنے سے یہ کراہت رفع نہیں ہو جاتی۔

٢ - بَابُ الاعْتِكَافِ وَقِيَامِ رَمَضَانَ

اعتکاف اور قیام رمضان کا بیان

(٥٦٨) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَاناً وَاحْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص ایمان اور ثواب کی نیت سے رمضان کا قیام کرتا ہے اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الاعتکاف﴾ کے لغوی معنی روکنے اور بند کرنے کے ہیں اور شرعی مفہوم یہ ہے کہ مسجد میں ایک خاص کیفیت سے اپنے آپ کو روکنا اور "قیام رمضان" سے مراد رات کو نماز پڑھنا یا قرآن پاک کی تلاوت کرنا ہے اور اس کا غالب استعمال نماز تراویح پر ہوتا ہے۔ ﴿ایمانا﴾ مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب پر یقین رکھتے ہوئے اور یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ اس کا ایمان ہی اسے قیام رمضان پر آمادہ کرتا ہے جس میں اخلاص کی نیت کی طرف اشارہ ہے اور ریاء و نمائش سے اجتناب مقصود ہے۔ ﴿احتسابا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ سے ثواب اور اس کی رضا کی نیت سے جو قیام کرتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کی راتوں کا قیام کتنے بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ آنحضرت ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں عموماً آٹھ رکعت اور تین وتر پڑھتے اور قیام بہت لمبا کرتے تھے بلکہ جن تین راتوں میں رسول اللہ ﷺ نے نماز تراویح پڑھائی ان میں بھی آپ

نے گیارہ رکعات ہی پڑھیں۔ (ابن حبان) اس لئے سنت نبوی ﷺ تو بہرنوع گیارہ رکعت ہے۔ علامہ ابن ھمام رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی اس سے زائد رکعتوں کو سنت نہیں بلکہ نفل قرار دیا ہے۔ (فتح القدیر)

(٥٦٩) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ العَشْرُ، - أَيِ العَشْرُ الأَخِيْرَةُ مِنْ رَمَضَانَ، - شَدَّ مِئْزَرَهُ، وَأَحْيَا لَيْلَهُ، وَأَيْقَظَ أَهْلَهُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آخری دھا کہ شروع ہو جاتا تو رسول اللہ ﷺ اپنی کمر کس لیتے' رات بھر جاگتے رہتے اور اپنی بیویوں کو بھی جگاتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ شد مئزرہ ﴾ مئزر کی میم کے نیچے زیر' ہمزہ ساکن ہے۔ یعنی اپنی چادر باندھ لیتے۔ یہ دراصل کنایہ ہے کہ آپؐ عبادت کے لئے کمر ہمت باندھ لیتے اس کیلئے بڑی کوشش کرتے اور سب کچھ چھوڑ کر عبادت میں لگ جاتے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی ازواج مطہرات سے عبادت کی وجہ سے علیحدگی اختیار کر لیتے۔ ﴿ واحیا لیلہ ﴾ یعنی نماز وغیرہ میں شب بیدار رہتے یا اس کا اکثر حصہ جاگتے۔ ﴿ وایقظ اھلہ ﴾ یعنی اپنے اہل خانہ کو بھی نماز و عبادت کیلئے نیند سے اٹھاتے۔

(٥٧٠) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَعْتَكِفَ، صَلَّى الفَجْرَ ثُمَّ دَخَلَ مُعْتَكَفَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اعتکاف کا ارادہ کرتے تو فجر کی نماز پڑھتے اور پھر اعتکاف کی جگہ داخل ہو جاتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ صلی الفجر ﴾ صبح کی نماز پڑھتے' اکیس رمضان کی نماز مراد ہے۔ ﴿ ثم دخل معتکفہ ﴾ اسم ظرف کا صیغہ ہے یعنی اپنے اعتکاف کی جگہ نماز فجر کے بعد آپؐ علیحدگی اختیار کر لیتے' یوں نہیں کہ یہ وقت اعتکاف کے ابتداء کا ہے بلکہ اعتکاف کیلئے تو آپؐ اکیس کی نماز مغرب ہی مسجد میں پڑھتے اور اعتکاف کی نیت سے مسجد ہی میں رات گزارتے' جب صبح کی نماز پڑھتے تو اعتکاف کی مخصوص جگہ میں تشریف لے جاتے جیسا کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے۔ اس حدیث کی یہ تاویل اس لئے ضروری ہے کہ آئندہ حدیث میں وضاحت ہے کہ آپؐ رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف کرتے تھے۔

(٥٧١) وَعَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَعْتَكِفُ العَشْرَ الأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ، حَتَّى تَوَفَّاهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ، ثُمَّ اعْتَكَفَ أَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

انہی (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تاآنکہ آپؐ وفات پا گئے۔ آپؐ کی بیویاں آپؐ کے بعد اعتکاف کرتیں۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف سنت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا اور آپؐ کے بعد ازواج مطہرات بھی اس کا اہتمام کرتی تھیں۔ (سبل)

(۵۷۲) وَعَنْهَا قَالَتْ: إِنْ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَيُدْخِلُ عَلَيَّ رَأْسَهُ، - وَهُوَ فِي المَسْجِدِ، - فَأُرَجِّلُهُ، وَكَانَ لاَ يَدْخُلُ البَيْتَ إِلاَّ لِحَاجَةٍ، إِذَا كَانَ مُعْتَكِفاً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنا سر مبارک میرے آگے کر دیتے جبکہ آپؐ (اعتکاف کی حالت میں) مسجد میں ہوتے۔ پس میں آپؐ کو کنگھی کرتی اور جب آپؐ اعتکاف میں ہوتے تو آپؐ سوائے ضروری حاجات کے گھر میں داخل نہ ہوتے۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ان كان﴾ یہ "ان" حرف تاکید ہے اور یہ ان ثقیلہ سے خفیفہ استعمال ہوا ہے' اصل کلام "انه كان" تھا ﴿ليدخل﴾ ادخال سے ہے یعنی داخل ہوتے ﴿على﴾ یہ علی حرف جار نہیں بلکہ یاء مشددہ ہے یعنی میری جانب ﴿فارجله﴾ تو میں آپؐ کو کنگھی کرتی۔ آپؐ کے بالوں کو کنگھی سے درست کرتی' تیل لگاتی اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف کرنے والا اپنے جسم کا بعض حصہ مسجد سے باہر کر سکتا ہے اور اعتکاف میں اپنی بیوی سے خدمت لے سکتا ہے۔ ﴿الا لحاجة﴾ مگر ضروری حاجت کیلئے۔ اس سے بول و براز' غسل جنابت اور خون نکلوانا وغیرہ مراد ہے جو مسجد میں نہیں کئے جا سکتے۔

(۵۷۳) وَعَنْهَا قَالَتْ: السُّنَّةُ عَلَى المُعْتَكِفِ أَن لاَ يَعُودَ مَرِيضاً، وَلاَ يَشْهَدَ جَنَازَةً، وَلاَ يَمَسَّ امْرَأَةً، وَلاَ يُبَاشِرَهَا، وَلاَ يَخْرُجَ لِحَاجَةٍ إِلاَّ لِمَا لاَ بُدَّ لَهُ مِنْهُ، وَلاَ اعْتِكَافَ إِلاَّ بِصَوْمٍ. وَلاَ اعْتِكَافَ إِلاَّ فِي مَسْجِدٍ جَامِعٍ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَلاَ بَأْسَ بِرِجَالِهِ، إِلاَّ أَنَّ الرَّاجِحَ وَقْفُ آخِرِهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اعتکاف کرنے والے پر سنت ہے کہ وہ نہ کسی مریض کی بیمار پرسی کرے نہ جنازہ میں شرکت کرے' نہ عورت کو ہاتھ لگائے اور نہ ہی اس سے مباشرت کرے اور سوائے حاجات ضروریہ کے مسجد میں سے نہ نکلے اور سوائے جامع مسجد کے اعتکاف نہ کرے۔ (ابوداؤد' اس کے راویوں میں کوئی خلل نہیں لیکن راجح یہ ہے کہ اس کے آخری الفاظ موقوف ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ان لايعود﴾ یہ عیادت سے ہے یعنی اعتکاف کی جگہ سے عیادت کیلئے نہ نکلتے۔ البتہ اگر راہ چلتے مریض کی حالت کے بارے میں سوال کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ﴿ولا يمس امراة﴾ یعنی شہوت سے عورت کو ہاتھ نہ لگاتے۔ ﴿ولا يباشرها﴾ اور نہ اس سے جماع کرتے اور یہ بھی احتمال ہے کہ "لمس" سے جماع مراد ہو اور مباشرت سے گلے ملنا وغیرہ مراد ہو۔ ﴿ولا اعتكاف الابصوم﴾

اور روزہ کے بغیر اعتکاف نہ کرتے۔ اس مسئلہ میں بہت اختلاف ہے' دلائل کا تقاضا یہ ہے کہ اعتکاف کے ساتھ روزہ مشروط نہیں ہے۔ ﴿ مسجد جامع ﴾ وہ مسجد جس میں باجماعت نماز ہوتی ہو۔ ﴿ الاان الراجح وقف آخرہ ﴾ یعنی آخری جملہ ﴿ والاعتکاف الا بصوم ﴾ موقوف ہے۔ مصنف علام نے فتح الباری میں کہا ہے کہ امام دارقطنی نے بالجزم فرمایا ہے کہ مرفوع حدیث صرف ﴿ لا یخرج لحاجۃ ﴾ ہے اور اس کے علاوہ باقی موقوف ہے اور یہاں فرمایا ہے آخری حصہ ہی موقوف ہے۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے عبدالرحمٰن بن اسحٰق کے علاوہ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہو کہ یہ سنت ہے۔

(٥٧٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «**لَيْسَ عَلَى الْمُعْتَكِفِ صِيَامٌ، إِلاَّ أَنْ يَجْعَلَهُ عَلَى نَفْسِهِ**». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالحَاكِمُ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ أَيْضاً.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "اعتکاف کرنے والے پر روزہ نہیں الاّ یہ کہ وہ اسے اپنے آپ پر مقرر کر لے۔" (اسے دارقطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کا بھی موقوف ہونا ہی راجح ہے)

حاصل کلام: صحیح یہی ہے کہ یہ روایت موقوف ہے اور اس میں سے ﴿ لا یخرج لحاجۃ ﴾ کا جملہ ہی مرفوع ثابت ہے۔ جیسا کہ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ اعتکاف بہرنوع مسجد میں ہونا چاہئے۔ جامع مسجد سے مراد امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ہے کہ اس میں نماز باجماعت ہوتی ہو۔ جمہور کا خیال ہے کہ جس پر جمعہ فرض نہیں وہ ہر اس مسجد میں اعتکاف کر سکتا ہے جس میں نماز باجماعت ہوتی ہو لیکن جس پر جمعہ فرض ہے اس کیلئے اس مسجد میں اعتکاف کرنا چاہئے جہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہو۔ علماء کا اس میں بھی اختلاف ہے کہ اعتکاف کیلئے روزہ شرط ہے یا نہیں۔ اکثر کا خیال ہے کہ روزہ شرط ہے لیکن کوئی واضح نص اس بارے میں منقول نہیں۔ تاہم رسول اللہ ﷺ سے بلاصوم اعتکاف کرنا ثابت نہیں۔ لیکن اس سے روزہ شرط ہونا لازم نہیں آتا۔

(٥٧٥) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رِجَالاً مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ أُرُوا لَيْلَةَ القَدْرِ فِي المَنَامِ، فِي السَّبْعِ الأَوَاخِرِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**أَرَى رُؤْيَاكُمْ قَدْ تَوَاطَأَتْ فِي السَّبْعِ الأَوَاخِرِ، فَمَنْ كَانَ مُتَحَرِّيَهَا، فَلْيَتَحَرَّهَا فِي**

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کچھ مردوں کو آخری ہفتہ میں شب قدر دکھائی گئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں تمہاری خواب کو دیکھتا ہوں جو آخری ہفتہ میں موافق آیا ہے۔ اگر کوئی اس کو تلاش کرنے والا ہو تو وہ آخری ہفتہ میں اسے تلاش کرے۔" (بخاری و مسلم)

السَّبْعِ الأَوَاخِرِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿ اروا ﴾ اراءة سے مبنی بر مفعول ہے۔ ﴿ فی السبع الاواخر ﴾ سے آخری سات دن مراد ہیں جس کی ابتداء تئیس کی رات سے ہوتی ہے۔ ﴿ اری ﴾ کے معنی ظن و گمان کے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں۔ ﴿ تواطات ﴾ کے معنی موافقت کے ہیں۔ ﴿ متحریها ﴾ جو اس کا طالب ہو۔ یہ "التحری" سے ہے جس کے معنی مطلوب کو حاصل کرنے میں کوشش اور جستجو کرنا ہے۔

(٥٧٦) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِيْ سُفْيَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ فِي لَيْلَةِ القَدْرِ: «لَيْلَةُ سَبْعٍ وَعِشْرِينَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ.

وَقَدِ اخْتُلِفَ فِيْ تَعْيِيْنِهَا عَلَى أَرْبَعِيْنَ قَوْلاً، أَوْرَدْتُها فِي فَتْحِ البَارِي.

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب قدر کے بارے میں فرمایا "یہ ستائیس کی رات ہے۔" (ابوداؤد) اس حدیث کا موقوف ہونا زیادہ راجح ہے۔ (حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ) شب قدر کی تعیین میں اختلاف کیا گیا ہے' اس بارے میں چالیس اقوال ہیں۔ جنہیں میں نے فتح الباری میں نقل کیا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ والراجح وقفه ﴾ یعنی راجح یہ ہے کہ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نہیں۔ البتہ یہ حکماً مرفوع ہے۔ ﴿ قد اختلف ﴾ اس کے تعین میں اختلاف کیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں چالیس قول نقل کئے ہیں مگران میں راجح اور زیادہ قوی قول یہ ہے کہ شب قدر آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے ایک رات ہے اور وہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ کبھی اکیس' کبھی تئیس' کبھی پچیس' کبھی ستائیس اور کبھی انتیس کی رات کو اور جن روایات میں بڑے جزم سے تعین کا ذکر ہے جیسے اسی روایت میں ستائیس کا ذکر اور بعض روایات میں اکیس اور بعض میں تئیس کا ذکر ہے تو یہ اس لئے کہ اس سال اسی رات شب قدر تھی یوں نہیں کہ ہمیشہ اسی رات ہی شب قدر ہوگی۔ مگر بعض نے اس سے سمجھ لیا کہ ہمیشہ شب قدر اسی رات ہوگی۔ اس بارے میں اختلاف کا سبب بھی درحقیقت یہی ہے۔

(٥٧٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَرَأَيْتَ إِنْ عَلِمْتُ أَيَّ لَيْلَةٍ لَيْلَةُ القَدْرِ، ما أقول فيها؟ قَالَ: «قُولِي اللَّهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ، تُحِبُّ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا' اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے بتلائیں کہ اگر میں جان لوں' شب قدر کونسی ہے تو اس میں کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا "کہہ' اے اللہ! بے شک تو ہی درگزر کرنے والا ہے' تو درگزر کرنا پسند کرتا ہے' مجھ

الْعَفْوَ، فَاعْفُ عَنِّي». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ غَيْرَ أَبِي دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْحَاكِمُ. سے درگزر فرما۔" (اسے ابوداؤد کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور اسے ترمذی اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ا رایت ﴾ آپ مجھے بتلائیں یہ ﴿ اخبرنی ﴾ کے معنی میں ہے۔ ﴿ ای لیلة ﴾ مفعول ہونے کے اعتبار سے ﴿ ای ﴾ پر نصب اور مبتداء ہونے کے ناطے ضمہ ہوگا اور اس کے بعد اس کی خبر ہے۔ ﴿ عفو ﴾ کے عین پر زبر اور واؤ مشدد ہے۔ یعنی بہت درگزر کرنے والا' بہت معاف کرنے اور بخشنے والا۔

(٥٧٨) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَشُدُّوا الرِّحَالَ إِلاَّ إِلى ثَلاَثَةِ مَسَاجِدَ، الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِي هَذَا، وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سوائے تین مسجدوں کے (کسی کیلئے) کجاوے نہ باندھو۔ (یعنی) مسجد الحرام' میری اس مسجد اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لا تشدوا الرحال ﴾ "الرحال" رحل کی جمع ہے اور وہ اونٹ کے کجاوے کو کہتے ہیں جیسے گھوڑے کی کاٹھی ہوتی ہے اور کجاوے باندھنا سے کنایہ یہ ہے کہ ان تین مسجدوں کے علاوہ حصول برکت و فضیلت' سفر مت کرو۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان تین مقامات کے علاوہ کسی بھی مقام کو باعث برکت سمجھ کر یا وہاں نماز پڑھنے کی نیت سے سفر کرنا درست نہیں۔ تبرک کی تخصیص اس لئے ہے کہ ان تین مساجد کی طرف سفر اسی مقصد کیلئے ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے علاوہ دوسرے مقامات کی طرف سفر کی ممانعت بھی اسی مقصد سے مختص ہے۔ البتہ دوسرے اغراض و مقاصد کیلئے سفر کرنا جائز ہی نہیں بلکہ بسا اوقات واجب ہے جس کی تفصیل الصارم المنکی وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ حدیث ان تینوں مقامات کے شرف و فضل پر دال ہے اور اسے یہاں لانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان مقامات میں اعتکاف کیا جائے' وہاں عبادت اور ذکر و تلاوت میں مقدور بھر کوشش کی جائے۔

٦۔ كِتَابُ الْحَجِّ

حج کے مسائل

(١) بَابُ فَضْلِهِ وَبَيَانُ مَنْ فُرِضَ عَلَيْهِ

حج کی فضیلت و فرضیت کا بیان

(٥٧٩) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «الْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلاَّ الْجَنَّةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عمرہ دوسرے عمرے تک دونوں کے مابین گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کا بدلہ جنت کے علاوہ اور کوئی نہیں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿كتاب الحج﴾ کی حاء پر فتح اور کسرہ دونوں آتے ہیں' جس کے لغوی معنی ہیں قصد کرنا اور لغت کے امام خلیل نے کہا ہے کہ اس کے معنی محترم مقام کی طرف باکثرت قصد کرنا ہے اور اصطلاح شریعت میں مسجد الحرام کی طرف مخصوص اعمال سے قصد کرنا ہے اور یہ بالاتفاق اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک اس کی فرضیت سن چھ ہجری میں ہوئی بعض نے نو یا دس ہجری کہا ہے۔ زاد المعاد میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کا رجحان اسی طرف ہے۔ ﴿العمرة﴾ لغت میں عمرہ کے معنی زیارت کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی قصد و ارادہ کے کئے ہیں اور اصطلاح شریعت میں اس سے مراد احرام' طواف' سعی' صفا و مروہ' سر منڈانا یا بال کٹوانا ہے۔ اسے عمرہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہی اعمال کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیت اللہ کا قصد کیا جاتا ہے۔ ﴿الحج المبرور﴾ سے مراد وہ حج ہے جس میں کسی گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔ بعض نے کہا ہے حج مبرور وہ ہے جس کے بعد حج کرنے والے کی دینی و اخلاقی حیثیت پہلے سے بہتر ہو جائے اور بعض نے اس کے معنی حج مقبول کے کئے ہیں اور یہ سب اقوال باہم قریب ہیں' ان میں کوئی بڑا فرق نہیں۔

(٥٨٠) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! عَلَى النِّسَاءِ جِهَادٌ؟ قَالَ: «نَعَمْ، عَلَيْهِنَّ جِهَادٌ لاَ قِتَالَ فِيهِ؛ الحَجُّ وَالعُمْرَةُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا' اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! کیا عورتوں پر جہاد ہے؟ آپ نے فرمایا "ہاں! ان پر وہ جہاد ہے جس میں لڑائی نہیں (یعنی) حج اور عمرہ۔" (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں۔ اس کی سند صحیح ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿علی النساء جهاد﴾ کہ کیا عورتوں پر جہاد ہے؟ اس میں حرف استفہام محذوف ہے اور حج و عمرہ پر جہاد کا اطلاق مجازاً ہے کیونکہ ان میں بھی جہاد کی طرح مشقت و تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ ﴿واصله فی الصحیح﴾ اس کی اصل ﴿الصحیح﴾ میں ہے۔ صحیح سے یہاں صحیح بخاری مراد ہے اور یہ حدیث عمرہ کے وجوب کی دلیل ہے۔

(٥٨١) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ ﷺ أَعْرَابِيٌّ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَخْبِرْنِي عَنِ العُمْرَةِ، أَوَاجِبَةٌ هِيَ؟ فَقَالَ: «لاَ، وَأَنْ تَعْتَمِرَ خَيْرٌ لَكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ. وَأَخْرَجَهُ ابْنُ عَدِيٍّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ ضَعِيفٍ وَعَنْ جَابِرٍ مَرْفُوعاً: «اَلْحَجُّ وَالعُمْرَةُ فَرِيضَتَانِ».

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک بدوی حاضر ہوا تو اس نے کہا' اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! مجھے عمرہ کے بارے بتلائیے کہ کیا یہ واجب ہے؟ تو آپ نے فرمایا "نہیں اگر تو عمرہ کرے تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔" (اسے احمد و ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کا موقوف ہونا راجح ہے) اور امام ابن عدی نے ایک اور ضعیف سند سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ "حج اور عمرہ دونوں فرض ہیں۔"

لغوی تشریح: ﴿والراجح وقفه﴾ راجح بات یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے اور یہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے انہی سے ایک صحرا نورد بدو نے سوال کیا اور انہوں نے اسے یہ جواب دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت راوی کا وہم ہے بلکہ اس کی سند ضعیف اور ناقابل استدلال ہے جس کی تفصیل تحفۃ الاحوذی (ج ٢ : ص ١١٣) میں دیکھی جا سکتی ہے ﴿من وجه آخر ضعیف﴾ ایک اور ضعیف سند سے کیونکہ وہ عبداللہ بن لہیعہ عن عطاء عن جابر کی سند سے مروی ہے اور ابن لہیعہ اس میں کمزور ہے۔ امام ابن عدی نے کہا ہے کہ یہ عطاء سے غیر محفوظ ہے۔ امام دار قطنی رحمہ اللہ نے یہی روایت حضرت زید رضی اللہ عنہ بن ثابت سے مرفوعاً بیان کی ہے مگر اس میں اسماعیل بن مسلم المکی ضعیف ہے اور ابن سیرین کا حضرت زید

سے سماع بھی نہیں اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک اور سند سے ابن سیرین سے موقوف روایت کیا ہے اس کی سند پہلی سے زیادہ صحیح ہے۔ یعنی یہ بھی حضرت زیدؓ کا قول ہے مگر سند میں انقطاع ہے۔ (سبل' التلخیص) عمرہ کے وجوب اور عدم وجوب کے بارے میں اختلاف ہے۔ راجح قول یہی ہے کہ یہ واجب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ' ابن عباس رضی اللہ عنہما ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اس کے قائل ہیں۔

(٥٨٢) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قِيلَ يَا رَسُولَ اللهِ! مَا السَّبِيلُ؟ قَالَ: «**الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ**». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَالرَّاجِحُ إِرْسَالُهُ، أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ أَيْضاً، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عرض کیا گیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! "سبیل" سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا "راستے کا خرچ اور سواری۔" (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے مگر راجح اس کا مرسل ہونا ہے اور ترمذی نے اسے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں کمزوری ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ما السبيل ﴾ "سبیل" کیا ہے؟ یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جو وجوب حج کیلئے "سبیل" کو شرط قرار دیا ہے یہ سبیل کیا ہے؟ جس کا حکم سورۂ ال عمران میں یوں ہے وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا (٣: ٩٧) ﴿ الزاد والراحلہ ﴾ راحلہ سے مراد سواری' خواہ وہ جانور ہو' موٹر کار ہو' بحری جہاز ہو یا ہوائی جہاز اور الزاد سے واپسی تک اہل و عیال کے خرچ سے زائد مال مراد ہے۔

(٥٨٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَقِيَ رَكْباً بِالرَّوْحَاءِ، فَقَالَ: «**مَنِ الْقَوْمُ**»؟ قَالُوا: ٱلْمُسْلِمُونَ، فَقَالُوا: مَنْ أَنْتَ؟ قَالَ: «**رَسُولُ اللهِ**»، فَرَفَعَتْ إِلَيْهِ ٱمْرَأَةٌ صَبِياً، فَقَالَتْ: أَلِهٰذَا حَجٌّ؟ قَالَ: «**نَعَمْ، وَلَكِ أَجْرٌ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روحاء مقام پر کچھ سواروں سے ملے تو آپؐ نے فرمایا تم کون ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا' ہم مسلمان ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا آپ کون ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا "اللہ کا رسول ہوں۔" پھر آپؐ کی خدمت میں ایک عورت اپنے بچے کو اٹھا کر لائی اور پوچھا کیا اس کا حج ہے؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں! اس کا ثواب تجھے ملے گا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ركبا ﴾ را پر زبر اور کاف ساکن یہ "راکب" کی جمع ہے۔ قافلے کو کہتے ہیں۔ ﴿ بالروحاء ﴾ راء پر فتحہ آخر میں مد ہے۔ مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ ﴿ فقالوا من انت ﴾

تو انہوں نے کہا آپ کون ہیں؟ قاضی عیاض نے کہا کہ آپ انہیں رات کے وقت ملے ہوں اور وہ آپؐ کو پہچان نہ سکے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دن کو ملے ہوں مگر پہلے انہوں نے آپؐ کو نہ دیکھا ہو ﴿ولک اجر﴾ اور اجر و ثواب تمہیں ملے گا اسے اٹھانے اور ساتھ لے کر حج کرنے کی بدولت۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نابالغ بچے کا حج درست ہے لیکن یہ حج اس سے بلوغت کے بعد کفایت نہیں کرتا جیسا کہ آئندہ چوتھی حدیث کے تحت آرہا ہے۔

(٥٨٤) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ الفَضْلُ بْنُ عَبَّاسٍ رَدِيفَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَجَاءَتِ ٱمْرَأَةٌ مِّنْ خَثْعَمَ، فَجَعَلَ الفَضْلُ يَنْظُرُ إِلَيْها، وَتَنْظُرُ إِلَيْهِ، وَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ يَصْرِفُ وَجْهَ الفَضْلِ إِلَى الشِّقِّ الآخَرِ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ فَرِيْضَةَ اللهِ عَلَى عِبَادِهِ فِي الحَجِّ أَدْرَكَتْ أَبِيْ شَيْخاً كَبِيْراً، لاَ يَثْبُتُ عَلَى الرَّاحِلَةِ، أَفَأَحُجُّ عَنْهُ؟ قَالَ: «نَعَمْ»، وَذَلِكَ فِي حَجَّةِ الوَدَاعِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی روایت ہے کہ فضل بن عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھے کہ قبیلہ خثعم کی ایک عورت آئی تو فضل رضی اللہ عنہ اس کی طرف دیکھنے لگے اور وہ ان کی طرف دیکھنے لگی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم فضل رضی اللہ عنہ کا منہ دوسری جانب پھیرتے تھے۔ پس اس عورت نے کہا' اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! بے شک حج' اللہ کا فرض ہے اس کے بندوں پر۔ میرا باپ بڑی عمر والا بوڑھا ہے۔ وہ سواری پر بیٹھ نہیں سکتا کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں! اور یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے۔" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ردیف﴾ ایک سواری پر دو بیٹھنے والوں میں سے پیچھے والے کو "ردیف" کہتے ہیں۔ ﴿خثعم﴾ خاء پر زبر اور ثاء ساکن اور عین پر زبر' یمن کے مشہور قبیلہ کا نام ہے اور اسے منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ ﴿الشق﴾ یعنی جانب۔ آپؐ نے حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ کا چہرا اس لئے پھیر دیا تا کہ شیطان انہیں فتنہ میں مبتلا نہ کر دے۔ ﴿حجۃ الوداع﴾ یہ وہ حج ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس ہجری میں کیا اور اس کے تین ماہ بعد آپؐ وفات پا گئے اور "الوداع" کے واؤ پر زبر ہے اس کا مصدر "ودع تودیعا" ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ واؤ کے نیچے کسرہ ہے یوں یہ موادعۃ کا مصدر ہے۔ آخری حج کا نام حجۃ الوداع اس لئے رکھا گیا کہ آپؐ نے اس سال لوگوں کو یا حرم کعبہ کو رخصت کیا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ زندہ آدمی اگر معذور ہو اور اس کی صحت کی امید نہ ہو تو اس کی جانب سے حج بدل جائز ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس پر حج فرض ہو مگر وہ کسی مستقل بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے حج کرنے کی طاقت نہ پاتا ہو تو اس کی طرف سے حج بدل جائز ہے۔ لیکن عارضی بیماری جس کے دور

ہو جانے کا امکان ہو' میں نیابت درست نہیں یہ شرط حج فرض کیلئے ہے نفلی حج کیلئے اس میں بلا شرط نیابت جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہی موقف ہے اور حج بدل کیلئے بہتر یہی ہے کہ اس کا قریبی ہی نائب بنے۔

راوی حدیث: ﴿ فضل بن عباس رضی اللہ عنہ ﴾ آپؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے۔ ان کی والدہ کا نام ام الفضل لبابۃ الکبری بنت الحارث الھلالیۃ تھا۔ نہایت حسین و جمیل تھے۔ معرکہ حنین میں آپؐ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ آپؐ کو غسل دینے میں بھی شریک تھے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سب سے بڑے یہی تھے۔ جہاد کیلئے شام تشریف لے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ طاعون عمواس کے سال ۱۸ھ میں انتقال ہوا۔ بعض نے کہا ہے یرموک میں شہید ہوئے اور بعض نے کہا کہ دمشق میں وفات پائی۔ ان کے جسم پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر تھی۔

(٥٨٥) وَعَنْهُ أَنَّ ٱمْرَأَةً مِنْ جُهَيْنَةَ جَاءَتْ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَتْ: إِنَّ أُمِّي نَذَرَتْ أَنْ تَحُجَّ، فَلَمْ تَحُجَّ، حَتَّى مَاتَتْ، أَفَأَحُجُّ عَنْهَا؟ قَالَ: «نَعَمْ، حُجِّي عَنْهَا، أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلَى أُمِّكِ دَيْنٌ أَكُنْتِ قَاضِيَتَهُ؟ اقْضُوا اللَّهَ، فَاللَّهُ أَحَقُّ بِالوَفَاءِ». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ہے کہ قبیلہ جھینہ کی ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کیا' بے شک میری ماں نے حج کرنے کی منت مانی تھی لیکن وہ حج نہیں کر سکی' اور فوت ہو گئی ہے کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں! اس کی طرف سے حج کر' اگر تیری ماں کے ذمہ ادھار ہوتا تو کیا تو وہ قرض نہ اتارتی؟ اللہ کا حق پورا کرو کیونکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کا حق پورا کیا جائے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ جھینہ ﴾ جیم پر پیش' ھا پر زبر۔ یہ تصغیر ہے اور مشہور قبیلہ کا نام ہے۔ اکثر کا خیال ہے یہ قحطان کی اولاد میں حمیر کی ایک شاخ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا تعلق معد بن عدنان سے ہے۔ ﴿ حجی ﴾ امر مخاطب کا صیغہ ہے اور یہ دلیل ہے کہ میت کی طرف سے حج بدل جائز ہے۔ "دین" دال پر زبر یعنی قرض اور اسے دین اس لئے کہا گیا تاکہ اس کی اہمیت اجاگر ہو جائے۔

(٥٨٦) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَيُّمَا صَبِيٍّ حَجَّ، ثُمَّ بَلَغَ الحِنْثَ، فَعَلَيْهِ أَنْ يَحُجَّ حَجَّةً أُخْرَى، وَأَيُّمَا عَبْدٍ حَجَّ، ثُمَّ أُعْتِقَ فَعَلَيْهِ أَنْ يَحُجَّ حَجَّةً أُخْرَى». رَوَاهُ ابْنُ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو بچہ حج کرے پھر وہ بلوغت کو پہنچ جائے تو اس پر ضروری ہے کہ دوسرا حج کرے اور جو غلام حج کرے پھر آزاد کر دیا جائے تو اس پر لازم ہے کہ دوسرا حج کرے۔" (اسے ابن ابی شیبہ اور

أَبِي شَيْبَةَ وَالبَيْهَقِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، إِلاَّ أَنَّهُ اخْتُلِفَ فِي رَفْعِهِ، وَالمَحْفُوظُ أَنَّهُ مَوقُوفٌ.

بیہقی نے روایت کیا ہے اس کے راوی ثقہ ہیں مگر اس کے مرفوع ہونے میں اختلاف کیا گیا ہے اور محفوظ یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ بلغ الحنث ﴾ کی حاء کے نیچے کسرہ' نون ساکن' اس کے معنی گناہ کے ہیں۔ یعنی اس عمر کو پہنچ گیا کہ اس کے نامۂ اعمال میں جرم کی بنا پر گناہ لکھ دیا جاتا ہے کیونکہ بچپن میں کیا ہوا جرم اللہ کے ہاں قابل مواخذہ نہیں۔ بلوغت کی عام علامت احتلام کا ہونا ہے۔ جس سے وہ مرد بن جاتا ہے۔

(٥٨٧) وَعَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَخْطُبُ يَقُولُ: «**لاَ يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلاَّ وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ، وَلاَ تُسَافِرُ المَرْأَةُ إِلاَّ مَعَ ذِي مَحْرَمٍ**»، فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ امْرَأَتِي خَرَجَتْ حَاجَّةً، وَإِنِّي اكْتُتِبْتُ فِي غَزْوَةِ كَذَا وَكَذَا، قَالَ: «**انْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خطبہ میں یہ ارشاد فرماتے سنا کہ "کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ ہرگز اکیلا نہ ہو مگر اس کے ساتھ محرم ہو اور کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔" پس ایک آدمی کھڑا ہوا تو اس نے کہا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! بے شک میری عورت حج کیلئے روانہ ہوئی اور میرا نام فلاں فلاں غزوہ میں شامل ہونے کیلئے لکھا گیا ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا "جاؤ اپنی بیوی کے ہمراہ حج کرو۔" (متفق علیہ اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ لا یخلون ﴾ یہ نون تاکید کے ساتھ "خلوۃ" سے نہی کا صیغہ ہے ﴿ ذومحرم ﴾ میم اور راء پر زبر اور ان کے مابین حاء ساکن ہے۔ اس سے عورت کے وہ قریبی مراد ہیں جن سے اس کا نکاح حرام ہے۔ جیسے باپ' بیٹا' بھائی وغیرہ ﴿ اکتتبت ﴾ باب افتعال سے متکلم مجہول کا صیغہ ہے یعنی میرا نام مجاہدین کی فہرست میں شامل ہے۔ فلاں غزوہ کیلئے متعین کیا گیا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت محرم کے بغیر حج نہیں کر سکتی اور عورت کیلئے یہ بھی فی الجملہ "من استطاع الیہ سبیلا" کے حکم میں شامل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیر محرم مرد اور عورت کیلئے تنہائی میں علیحدہ ہونا حرام ہے بلکہ ایک حدیث میں ہے جب بھی دونوں علیحدہ ہوں گے تیسرا ان کے ساتھ شیطان ہوگا۔ اس طرح عورت کو تنہا محرم کے بغیر سفر کرنا بھی حرام ہے۔ بعض فقہاء نے بعض ادلہ کی بنا پر بوڑھی' قافلہ کی صورت میں یا ذی حشمت عورت کو اس کی اجازت دی ہے مگر حدیث کے صریح الفاظ اس کے خلاف ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت پر حج فرض ہو تو نماز کی طرح اس کی اجازت خاوند سے ضروری نہیں۔ البتہ

نفلی حج ہو تو عورت کو بہرنوع اجازت لے کر جانا چاہیے۔

(٥٨٨) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَمِعَ رَجُلاً يَقُولُ: لَبَّيْكَ عَنْ شُبْرُمَةَ، قَالَ: «مَنْ شُبْرُمَةُ»؟ قَالَ: أَخٌ لِيْ، أَوْ قَرِيْبٌ لِيْ، قَالَ: «حَجَجْتَ عَنْ نَفْسِكَ»؟ قَالَ: لاَ، قَالَ: «حُجَّ عَنْ نَفْسِكَ، ثُمَّ حُجَّ عَنْ شُبْرُمَةَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَالرَّاجِحُ عِنْدَ أَحْمَدَ وَقْفُهُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی سے سنا' وہ کہہ رہا تھا: "شبرمہ کی طرف سے لبیک۔ آپؐ نے فرمایا "شبرمہ کون ہے؟" اس نے کہا میرا بھائی یا میرا قریبی ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا "تو نے اپنی طرف سے حج کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا" پہلے اپنی طرف سے کر کر پھر شبرمہ کی طرف سے کرلینا۔" (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے اور امام احمد کے نزدیک اس کا موقوف ہونا راجح ہے)

لغوی تشریح: ﴿ شبرمۃ ﴾ شین اور راء پر پیش ہے ان کے مابین باء ساکن۔ ﴿ او قریب لی ﴾ یہ راوی کا شک ہے کہ اس نے بھائی کہا یا کہ وہ میرا قریبی ہے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ اگر کسی نے خود حج نہیں کیا تو وہ دوسرے کی طرف سے نیابت نہیں کر سکتا اور اگر اس نے کسی کی جانب سے حج کی نیت سے احرام باندھا ہو تو وہ اسی کی جانب سے قرار پائے گا۔ دوسرے کی طرف سے نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی صحت و ضعف میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے اس کے مرفوع ہونے کی نفی کی ہے مگر امام احمد رحمہ اللہ سے اس کی تصحیح بھی منقول ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ' ابن حبان رحمہ اللہ وغیرہ نے اسے صحیح کہا ہے جبکہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے مرسل کہا ہے۔ بہرنوع اگر اسے موقوف بھی قرار دیا جائے تب بھی یہ قابل استدلال ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کسی بھی صحابی سے مخالفت ثابت نہیں۔ اس لئے صحیح یہی ہے کہ حج بدل میں نائب پہلے خود حج کرے پھر نیابت کرے۔

(٥٨٩) وَعَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فَقَالَ: «إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ الحَجَّ»، فَقَامَ الأَقْرَعُ ابْنُ حَابِسٍ، فَقَالَ: أَفِيْ كُلِّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللهِ!؟ قَالَ: «لَوْ قُلْتُهَا لَوَجَبَتْ. الحَجُّ مَرَّةً، فَمَا زَادَ فَهُوَ تَطَوُّعٌ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ غَيْرَ التِّرْمِذِيِّ، وَأَصْلُهُ فِي مُسْلِمٍ مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا تو آپؐ نے فرمایا "بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے" تو اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا: کیا ہر سال' اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپؐ نے فرمایا "اگر میں ہاں کہہ دیتا تو یہ (ہر سال کے لیے) فرض ہو جاتا۔ حج ایک بار ہے پس اس سے جو زائد ہے وہ نفل ہے۔" (اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا

ہے اور اس کی اصل مسلم میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ حج عمر بھر میں صرف ایک بار فرض ہے اس سے زائد نفل ہے اور اس روایت میں جو یہ مذکور ہے کہ اگر میں ہر سال حج فرض ہونے کا کہہ دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا۔ مگر یہ نہیں کہتا تاکہ امت پر مشقت نہ پڑ جائے۔ اس سے بعض علماء کا خیال ہے کہ احکام شرعیہ کا تقرر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی مرضی سے کر سکتے تھے لیکن اکثر علماء اسے درست نہیں سمجھتے اور یہی موقف درست ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریعی حکم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا پر ہی موقوف ہوتا تھا۔ اس اصولی اختلاف کی تفصیل اصول و عقائد کی کتابوں میں موجود ہے جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔

راوی حدیث: ﴿ اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ ﴾ یہ قبیلہ تمیم سے تعلق رکھتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد جو وفد بنو تمیم کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اس میں شامل تھے اور مؤلفۃ القلوب میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جاہلیت اور اسلام میں اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کا انتقال ہوا۔

٢ - بَابُ الْمَوَاقِيتِ

(احرام کے) میقات کا بیان

(٥٩٠) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَقَّتَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ ذَا الْحُلَيْفَةِ، وَلِأَهْلِ الشَّامِ الْجُحْفَةَ، وَلِأَهْلِ نَجْدٍ قَرْنَ الْمَنَازِلِ، وَلِأَهْلِ الْيَمَنِ يَلَمْلَمَ، هُنَّ لَهُنَّ، وَلِمَنْ أَتَى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِهِنَّ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ، وَمَنْ كَانَ دُوْنَ ذٰلِكَ فَمِنْ حَيْثُ أَنْشَأَ، حَتَّى أَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَكَّةَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ والوں کے لئے ذوالحلیفہ' شام والوں کیلئے جحفہ' نجد والوں کیلئے قرن منازل اور یمن والوں کیلئے یلملم کو احرام باندھ کر نیت کرنے کی جگہیں مقرر کیا ہے اور یہ میقاتیں ان کیلئے ہیں (جن کا ذکر ہوا) اور ان لوگوں کیلئے بھی' جو دوسرے شہروں سے ان کے پاس سے حج یا عمرہ کے ارادہ سے گزریں اور جو کوئی ان میقاتوں کے ورے (اندر) ہو وہ جہاں سے چلے وہیں سے (احرام باندھے) یہاں تک کہ مکہ والے مکہ سے احرام باندھیں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب المواقیت ﴾ یہ میقات کی جمع ہے۔ وہ ہے جو ایک عبادت کے وقت اور جگہ کی حد بندی کرتا اور متعین کرتا ہے۔ اور یہاں ان سے وہ مقامات مراد ہیں جنہیں شارع علیہ السلام نے احرام کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اس سے آگے احرام باندھے بغیر حرم کی طرف جانا جائز نہیں ہے۔ ﴿ وقت ﴾ یعنی

احرام کیلئے میقات مقرر کیا اور یہ توقیت سے تحدید و تعین کے معنی کیلئے ہے۔ ﴿ ذوالحلیفة ﴾ حاء پر ضمہ، تصغیر ہے، جو مدینہ طیبہ کے وسط سے پانچ میل کی مسافت پر ہے جو آج کل "بئر علی" کے نام سے مشہور ہے۔ "الجحفة" جیم پر پیش اور حاء ساکن، مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جو سمندر کے قریب مکہ مکرمہ سے ساڑھے چار مراحل (مرحلہ ایک دن کی مسافت کے برابر فاصلے کو کہتے ہیں) پر اور مدینہ طیبہ سے پونے چھ مراحل پر واقع ہے اس کا نام مھیعہ تھا۔ سیلاب آیا تو وہ سب کچھ بہالے گیا جس کی بنا پر اسے جحفہ کہا جانے لگا۔ یہ بہت بڑی بستی تھی مگر اب ویران ہو چکی ہے۔ اسی لئے آج کل اس سے کچھ پہلے "رابغ" مقام سے احرام باندھتے ہیں۔ کیونکہ وہاں پانی کا انتظام ہے۔ ﴿ قرن المنازل ﴾ اسے ﴿ قرن الثعالب ﴾ بھی کہا گیا ہے یا یہ دو علیحدہ مقام ہیں۔ یہ بیضوی شکل کا چمکدار پہاڑ ہے جو مکہ مکرمہ سے مشرق کی جانب دو مرحلوں کی مسافت پر واقع ہے۔ ﴿ یلملم ﴾ یاء اور دونوں لام پر فتحہ ہے اور درمیانی میم ساکن، جو مکہ مکرمہ سے جنوب کی طرف دو مرحلوں کی مسافت پر واقع پہاڑ کا نام ہے۔ مکہ مکرمہ اور اس کے درمیان تقریباً تیس میل کی مسافت ہے۔ ﴿ ھن ﴾ یعنی یہ میقات اور مقامات ﴿ لھن ﴾ ان مذکورہ اہل بلدان کے لئے ہیں۔ ﴿ ممن اراد الحج والعمرة ﴾ جو حج اور عمرہ کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو حج اور عمرہ کی نیت سے نہ ہو وہ احرام کے بغیر مکہ مکرمہ میں داخل ہو سکتا ہے۔ ﴿ ومن کان دون ذلک ﴾ اور جو اس کے ورے ہو یعنی جو میقات اور مکہ مکرمہ کے درمیان ہو تو وہ احرام باندھے ﴿ من حیث انشا ﴾ جہاں سے نکلا ہے یا جہاں سے سفر کا آغاز کیا ہے۔ یعنی اپنے گھر اور اپنی بستی سے ہی احرام باندھے۔ ﴿ حتی اھل مکة من مکة ﴾ یہاں تک کہ اہل مکہ، مکہ مکرمہ ہی سے احرام باندھیں۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اہل مکہ حج اور عمرہ کا احرام مکہ مکرمہ سے باندھیں جو حکماً اہل مکہ میں سے ہیں وہ بھی وہیں احرام باندھیں اور آج کل جو عمرہ کے احرام کیلئے میقات سے باہر جا کر احرام باندھنے کا طریقہ چل نکلا ہے، اس کی چنداں ضرورت نہیں۔

(٥٩١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَقَّتَ لِأَهْلِ العِرَاقِ ذَاتَ عِرْقٍ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَأَصْلُهُ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ حَدِيْثِ جَابِرٍ، إِلاَّ أَنَّ رَاوِيَه شَكَّ فِيْ رَفْعِهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اہل عراق کیلئے ذات عرق کو۔ میقات مقرر کیا (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے مگر اس کے راوی نے اس کے مرفوع ہونے میں شک کیا ہے)

وَفِيْ صَحِيْحِ البُخَارِيِّ: أَنَّ عُمَرَ هُوَ الَّذِيْ وَقَّتَ ذَاتَ عِرْقٍ.

اور صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذات عرق کو میقات مقرر کیا تھا۔

وَعِنْدَ أَحْمَدَ وَأَبِيْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ

احمد، ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ نبی ﷺ نے مشرق والوں کیلئے عقیق کو میقات مقرر فرمایا

وَقَّتَ لِأَهْلِ الْمَشْرِقِ الْعَقِيْقَ. تھا۔"

لغوی تشریح: ﴿ ذات عرق ﴾ عین کے نیچے کسرہ ہے اور یہ مکہ مکرمہ سے دو مرحلوں کی مسافت پر واقع ایک جگہ کا نام ہے اور وہ قرن منازل کے شمال میں اس کے برابر واقع ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے۔ ﴿ وفی البخاری ..... ﴾ اور بخاری میں ہے کہ ذات عرق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میقات مقرر کیا۔ تو یہ بظاہر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت کے خلاف ہے اور ان دونوں میں جمع و تطبیق کی صورت یوں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مرفوع روایت نہ پہنچی ہو۔ انہوں نے اس بارے میں اجتہاد کیا تو ان کا اجتہاد درست اور سنت کے مطابق نکلا۔ ﴿ العقیق ﴾ یہ "ذات عرق" سے کچھ پیچھے ایک جگہ کا نام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ "ذات عرق" کی حدود میں داخل ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ ہر وادی جسے سیلاب نے وسیع کر دیا ہو اسے عقیق کہتے ہیں اور اہل مشرق سے اہل عراق اور ان کے راستے سے گزرنے والے مراد ہیں۔ ان دونوں احادیث میں تطبیق یہ ہے کہ "ذات عرق" میقات واجب ہے اور "عقیق" میقات مستحب ہے کیونکہ وہ بھی ذات عرق ہی سے ہے۔

حاصل کلام: خوب یاد رہے کہ وادی "مر الظہران" جو آج کل وادی فاطمہ کے نام سے مشہور و معروف ہے' وہ طائف کے سامنے مکہ کی مشرقی جانب سے شروع ہوتی ہے اور جنوب جدہ کے قریب بحر احمر کے مغربی جانب جا کر ختم ہوتی ہے۔ اس وادی کے دو کنارے ہیں۔ ایک جنوبی کنارہ جو طائف کے راستے میں بڑی وادی کے پاس نخلہ یمانیہ سے پہلے ہے اور اسی کو "قرن المنازل" کہتے ہیں اور دوسرا شمالی کنارہ ضریبہ کے قریب ہے جسے "ذات عرق" کہتے ہیں۔ جہاں سے اہل عراق' اہل نجد شمالی گزرتے ہیں اور یہ دونوں کنارے ایک دوسرے کے محاذات ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان بہت مسافت ہے اور یہ مسافت مکہ مکرمہ سے ایک جیسی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذات عرق کو میقات مقرر کرنے میں اجتہاد سے کام لیا جو علاقے والوں کی ضرورت اور شریعت میں آسانی کے عین مطابق تھا جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقررہ میقات کے موافق ہوا تو گویا نور علی نور کا مصداق ہوا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ جو شخص ان پانچوں میقات میں کسی ایک میقات پر سے نہ گزرے تو اسے چاہئے کہ وہ جونسے میقات کے برابر سے گزرے۔ وہاں احرام باندھ لے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی میقات کے محاذ اور برابری کی وجہ سے ہی ذات عرق کو اہل عراق کیلئے مقرر کیا تھا اور تمام علماء اس اصول و ضابطہ پر متفق ہیں۔ محاذات کا مفہوم یہ ہے کہ جو میقات کسی کے دائیں یا بائیں جانب ہو اور وہ مکہ کی طرف جانے والا ہو۔ اس کی وضاحت یوں سمجھئے کہ جب ہم ان پانچوں میقات کو ایک خط کے ذریعے ملائیں تو مکہ مکرمہ کو ہر جانب سے وہ خط گھیرے میں لے لے گا۔ لہٰذا جب بھی کوئی شخص مکہ مکرمہ کی طرف ان میقات کے علاوہ کسی بھی جگہ سے آئے تو لازمی ہے کہ وہ اس خط پر سے گزرے گا جو دوسرے میقات سے ملا رہا ہوگا۔ یہ خط ہی دراصل میقات کے برابر کا خط ہے۔

اس لئے حاجی جب اس خط سے باہر ہوگا وہ آفاق میں ہوگا اس پر احرام واجب نہیں مگر جب اس خط کے پاس سے گزرے گا تو وہ میقات کے محاذ پر ہوگا اس لئے اسے بغیر احرام کے آگے بڑھنا جائز نہیں ہوگا۔ پھر یہ تمام میقات خشکی پر ہیں اور ان کو ملانے والے خطوط بھی خشکی پر ہوں گے لہٰذا جب تک کوئی شخص بحری جہاز کے ذریعے سمندر میں سفر کر رہا ہوگا وہ ان میقات کے برابر نہیں ہوگا۔ یہ صورت تو تبھی ہوگی جب وہ سمندری سفر سے فارغ ہو کر خشکی کے راستہ پر پڑے گا۔ ہماری تحقیق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان اور ہندوستان سے جو حجاج کرام بذریعہ بحری جہاز حج کرنے کیلئے جاتے ہیں ان پر جدہ تک پہنچنے سے پہلے احرام باندھنا واجب نہیں کیونکہ وہ سمندری سفر میں نہ تو میقات پر سے گزرے ہیں اور نہ ہی کسی میقات کے برابر سے گزرے ہیں۔ ان کا جہاز ابھی یلملم اور اس کے محاذات سے دور آفاق میں ہے جبکہ ان کے اور حدود میقات کے مابین تقریباً ایک سو میل کی مسافت ہے۔ ان کی مثال تو ابھی اس شخص کی سی ہے جو خرمہ سے طائف یا لیث سے طائف جا رہا ہے یا مدینہ طیبہ سے یا خیبر سے ینبع کی طرف ذوالحلیفہ کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستہ سے جا رہا ہو۔ بلاشبہ میقات اس کے دائیں یا بائیں جانب آئے گا لیکن ابھی وہ میقات کے برابر نہیں آیا کیونکہ ابھی وہ حدود میقات کے پیچھے ہے۔ اسی طرح بحری جہاز پر سفر کرنے والا جب تک سمندر میں رہے گا وہ حدود میقات کے پیچھے ہوگا اس کے برابر قطعاً نہیں ہوگا تا آنکہ جدہ پر جا کر نہ اترے کیونکہ جو خط یلملم اور جحفہ کو ملاتا ہے وہ سمندر کے قریب جدہ سے کچھ آگے مکہ مکرمہ کی جانب پڑتا ہے۔

٣ - بَابُ وُجُوهِ الإِحْرَامِ وَصِفَتُهُ — احرام کی اقسام اور صفت کا بیان

(٥٩٢) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ عَامَ حَجَّةِ الوَدَاعِ، فَمِنَّا مَنْ أَهَلَّ بِعُمْرَةٍ، وَمِنَّا مَنْ أَهَلَّ بِحَجٍّ وعُمْرَةٍ، وَمِنَّا مَنْ أَهَلَّ بِحَجٍّ، وَأَهَلَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِالحَجِّ، فَأَمَّا مَنْ أَهَلَّ بِعُمْرَةٍ فَحَلَّ عِنْدَ قُدُوْمِهِ، وَأَمَّا مَنْ أَهَلَّ بِحَجٍّ، أَوْ جَمَعَ بَيْنَ الحَجِّ وَالعُمْرَةِ، فَلَمْ يَحِلُّوْا حَتَّى كَانَ يَوْمُ النَّحْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع کے سال نکلے، ہم میں سے بعض وہ تھے جنہوں نے عمرہ کیلئے تلبیہ کہا اور ہم میں سے کچھ وہ تھے جنہوں نے حج اور عمرہ کیلئے تلبیہ کہا اور ہم میں سے بعض وہ تھے جنہوں نے حج کیلئے لبیک پکارا اور رسول اللہ ﷺ نے صرف حج کا تلبیہ پکارا۔ پھر جنہوں نے عمرہ کیلئے لبیک کہا تھا وہ حلال ہوگئے اور جنہوں نے حج کیلئے لبیک کہا یا حج اور عمرہ کو جمع کیا تھا وہ حلال نہ ہوئے یہاں تک کہ قربانی کا دن ہوا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب وجوہ الاحرام و صفتہ﴾ الوجوہ وجہ کی جمع ہے۔ اور اس سے اقسام احرام

مراد ہیں۔ اور وہ حج یا عمرہ یا دونوں ہیں اور صفتہ' سے مراد محرم کی وہ کیفیت ہے جسے وہ حالت احرام میں اختیار کرتا ہے۔ ﴿ خرجنا ﴾ ہم نکلے۔ حج کیلئے نبی کریم ﷺ کی معیت میں نکلنا ہفتہ کے روز نماز ظہر کے بعد تھا جبکہ ذی القعدہ کے پانچ دن ابھی باقی تھے۔ ﴿ حجۃ الوداع ﴾ حجۃ الوداع دس ہجری میں ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے بعد اس کے علاوہ اور کوئی حج نہیں کیا اور اسے حجۃ الوداع اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں آپؐ نے لوگوں کو الوداع کہا تھا۔ ﴿ اھل بعمرۃ ﴾ یعنی صرف عمرہ کا احرام باندھا ایسے شخص کو متمتع کہتے ہیں۔ ﴿ اھل بحج وعمرۃ ﴾ حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھا۔ ایسے شخص کو ''قارن'' کہتے ہیں اور جس نے صرف حج کیلئے احرام باندھا ہو اسے ﴿ مفرد ﴾ کہتے ہیں اور ﴿ الاھلال ﴾ بلند آواز کو کہتے ہیں اور اس سے مراد احرام باندھنے کے بعد بلند آواز سے تلبیہ کہنا ہے۔ ﴿ فحل ﴾ یعنی وہ حلال ہوگیا اور یہ تب ہوتا ہے جب بیت اللہ کے طواف اور صفا و مروہ کے مابین سعی کرنے کے بعد سر کے بال منڈوائے جاتے ہیں یا کٹوائے جاتے ہیں اور احرام کھول دیا جاتا ہے۔ ﴿ یوم النحر ﴾ نحر یعنی قربانی کا دن اور وہ دس ذی الحجہ ہوتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے تنہا حج کا احرام باندھا تھا یعنی حج مفرد کیا تھا لیکن دوسرے بہت سے دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ قارن تھے اور حج و عمرہ کا اکٹھا احرام باندھا تھا اور یہی بات صحیح ہے اور اقسام حج میں یہی قسم سب سے افضل ہے جس کی تفصیل دو بڑی بڑی شروح احادیث میں موجود ہے اور جو شخص ''مفرد'' ہوتا ہے تو وہ صرف قربانی کے دن ہی حلال ہوتا ہے۔ پھر یہ حدیث صحیح بخاری و مسلم کی ان روایات کے بھی مخالف ہے جن میں آپؐ نے جن صحابہ کرامؓ کے پاس ھدی یعنی قربانی نہ تھی انہیں فرمایا تھا کہ تم حج کو عمرہ بنا لو۔ عمرہ کو مکمل کر کے حج کا احرام مکہ سے باندھ لو۔ اسی لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت دراصل ان صحابہ کرامؓ کے متعلق ہے جن کے پاس قربانی تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حج کی تین قسمیں ہیں۔ حج قران' حج تمتع' حج افراد۔ ان تینوں میں سے افضل کونسا حج ہے؟ عموماً اہل حدیث اور احناف حج قران کو افضل قرار دیتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کیلئے یہی حج پسند کیا۔ اس میں مشقت بھی زیادہ اٹھانی پڑتی ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں اس پر نفیس بحث کی ہے۔ مگر امام احمد رحمہ اللہ' امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ حج تمتع کو افضل کہتے ہیں کہ اس میں سہولت ہے اور آنحضرت ﷺ نے ایک مرحلہ پر اس کی خواہش کا اظہار فرمایا تھا۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے اور بعض حضرات حج افرا کو افضل قرار دیتے ہیں مگر پہلا قول ہی دلائل کے اعتبار سے بوجوہ راجح ہے۔

٤ - بَابُ الإِحْرَامِ وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهِ. احرام اور اس کے متعلقہ امور کا بیان

(٥٩٣) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مَا أَهَلَّ رَسُولُ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نہیں لبیک پکارا مگر صرف مسجد کے

اللهِ ﷺ إلاَّ مِنْ عِنْدِ الْمَسْجِدِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ پاس۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب الاحرام ﴾ احرام کا باب' یہ حج یا عمرہ میں داخل ہونے کا نام ہے۔ "احرام" اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں داخل ہو جانے والے پر بہت سی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو اس سے پہلے حلال تھیں۔ ﴿ الا من عند المسجد ﴾ مگر صرف مسجد کے پاس۔

حاصل کلام: مسجد سے مسجد ذوالحلیفہ مراد ہے۔ جس وقت آپ اپنی اونٹنی پر سیدھے کھڑے ہوئے تھے یہ بات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان حضرات کی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے کہی ہے جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے "بیداء" کے مقام سے احرام باندھا تھا۔ احادیث میں منقول ہے کہ آپ نے تین بار لبیک پکارا تھا۔ جب آپ نے دو رکعات پڑھ لی تھیں۔ یعنی آپ مسجد کے اندر ہی تھے کہ آپ نے لبیک کہا اور یہ بھی منقول ہے کہ جب آپ "بیداء" کی چوٹی پر چڑھے تو آپ نے لبیک کہا۔ یہ احادیث بظاہر آپس میں متعارض ہیں مگر ان میں یوں تطبیق دی گئی ہے کہ آپ نے احرام تو مسجد کے اندر ہی باندھا اور جنہوں نے وہاں آپ کے احرام کا مشاہدہ کیا انہوں نے اسی کا ذکر کیا اور جب آپ مسجد سے باہر تشریف لائے اور اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر باواز بلند لبیک کہا تو باہر دیکھنے والوں نے سمجھا کہ اب آپ نے احرام باندھا ہے۔ پھر جب بیداء پر پہنچے اور لبیک کہا تو جن حضرات نے وہاں لبیک کہتے سنا تو انہوں نے سمجھا کہ آپ نے یہاں سے احرام باندھا ہے گویا ہر فریق نے اپنے مشاہدہ کے مطابق خبر دی۔ اس لئے ان روایات میں کوئی تناقض نہیں۔

(٥٩٤) وَعَنْ خَلاَّدِ بْنِ السَّائِبِ، عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «أَتَانِي جِبْرِيلُ، فَأَمَرَنِي أَنْ آمُرَ أَصْحَابِي، أَنْ يَرْفَعُوا أَصْوَاتَهُمْ بِالإِهْلاَلِ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

خلاد بن سائب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور مجھے حکم دیا کہ میں اپنے صحابہؓ کو حکم دوں کہ لبیک کہتے ہوئے اپنی آوازوں کو بلند کریں۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی اور امام ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث صریح دلیل ہے کہ بلند آواز سے لبیک کہنی چاہئے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ صحابہ کرامؓ اس قدر اونچی آواز سے تلبیہ کہتے کہ ان کا گلا بیٹھ جاتا۔ جمہور علماء کرامؒ کی یہی رائے ہے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بلند آواز سے تلبیہ صرف مسجد منیٰ اور مسجد حرام کے پاس کہنا چاہئے۔ (السبل)

راوی حدیث: ﴿ خلاد ﴾ کی خاء پر زبر اور لام مشدد۔ یہ خلاد بن سائب بن خلاد بن سوید انصاری خزرجی ہیں۔ ثقہ تابعیؒ ہیں جنہوں نے انہیں صحابی کہا انہیں وہم ہوا۔

﴿ ابیه ﴾ ان کے والد سائب رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ ان کی کنیت ابو سلمہ ہے۔ اور وہ بدر میں شہید

ہوئے۔ خلاد عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں یمن کے گورنر بنے۔ بعض نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں یمن کا عامل مقرر کیا اور ۷۱ھ میں فوت ہوئے۔

(۵۹۵) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَجَرَّدَ لِإِهْلاَلِهِ، وَاغْتَسَلَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے احرام باندھنے کے وقت کپڑے اتارے اور غسل کیا۔ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن کہا ہے)

حاصل کلام: امام ترمذی رحمہ اللہ نے گو اس حدیث کو حسن کہا ہے مگر امام عقیلی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے لیکن اس بارے میں متعدد احادیث مروی ہیں اس لئے احرام کے وقت غسل کرنا مسنون ہے۔

(۵۹٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ سُئِلَ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ مِنَ الثِّيَابِ؟ قَالَ: «لاَ يَلْبَسُ القَمِيصَ، وَلاَ العَمَائِمَ، وَلاَ السَّرَاوِيلاَتِ، وَلاَ البَرَانِسَ، وَلاَ الخِفَافَ، إِلاَّ أَحَدٌ لاَ يَجِدُ نَعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الخُفَّيْنِ، وَلْيَقْطَعْهُمَا أَسْفَلَ مِنَ الكَعْبَيْنِ، وَلاَ تَلْبَسُوا شَيْئاً مِنَ الثِّيَابِ مَسَّهُ الزَّعْفَرَانُ، وَلاَ الوَرْسُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، واللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: احرام باندھنے والا کیا لباس پہنے؟ آپؐ نے فرمایا "وہ قمیص، پگڑی، شلوار و پاجامہ، کنٹ ٹوپ اور موزے نہ پہنے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پاس جوتے نہیں تو وہ موزے پہن لے اور اسے چاہئے کہ دونوں کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لے اور ایسا کوئی کپڑا نہ پہنے جسے زعفران اور کیسو (ایک زرد رنگ کی خوشبو دار بوٹی) لگا ہوا ہو۔" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿العمائم﴾ یہ عمامہ کی جمع ہے جو سر پر لپیٹا جاتا ہے اور ﴿السراویل﴾ چادر کی جگہ ٹانگوں میں پہنی جاتی ہے۔ جس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ﴿البرانس﴾ یہ برنس کی جمع ہے باء اور نون پر ضمہ اور راء ساکن ہے۔ یہ ہر اس کپڑے کو کہتے ہیں جس کا کچھ حصہ ٹوپی وغیرہ پر مشتمل ہو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ لمبی ٹوپی ہے جو ابتدائے اسلام میں حج کرنے والے پہنتے تھے۔ ﴿الخفاف﴾ خاء کے نیچے زیر۔ خف کی جمع ہے یعنی موزے۔ ﴿من الكعبين﴾ کہ انہیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ دے تاکہ وہ جوتے کے حکم میں ہو جائیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ احرام کے دوران ٹخنے ننگے رہیں اور "کعب" سے مراد وہ ابھری ہوئی دو ہڈیاں ہیں جو پاؤں اور پنڈلی کے جوڑ کے قریب دائیں بائیں ہوتی ہیں۔ ﴿الورس﴾ واؤ پر زبر اور راء ساکن زرد رنگ کی خوشبودار گھاس جس میں کپڑے رنگے جاتے ہیں۔ زعفران اور ورس کے رنگ سے رنگے ہوئے لباس کی ممانعت اس لئے ہے کہ ان میں خوشبو ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ احرام باندھنے کیلئے قمیص' پاجامہ' شلوار' ٹوپی اور موزے پہننا درست نہیں۔ جوتا اگر میسر نہ ہو اور صرف موزے ہوں تو انہیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لینے کا حکم ہے۔ فقہاء کے مابین اس بارے میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ موزے پہننے کو جائز قرار دیتے ہیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں موزوں کو کاٹنے کا حکم منسوخ ہے کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ابتداء احرام کے وقت تھی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں کاٹنے کا حکم نہیں اور یہ حکم آپؐ نے عرفات میں بیان فرمایا تھا۔ اس لئے کاٹنے کا حکم منسوخ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کاٹنے کا حکم اس حدیث سے واجب نہیں رہا۔ مگر جمہور علماء کاٹنے کے قائل ہیں اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مطلق روایت کو مقید پر محمول کرتے ہیں۔ امام ابن قدامہ (صاحب المغنی) نے کہا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ حدیث پر عمل کرتے ہوئے موزوں کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لیا جائے تاکہ اختلاف سے بچ نکلے۔ اسی طرح شلوار کے بارے میں بھی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر شوافع اس کو چادر نہ ہونے کی صورت میں مطلقاً پہننے کے قائل ہیں اور ان کا استدلال بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس کے قطعاً قائل نہیں۔ البتہ امام محمد بن حسن شیبانی اور بعض شوافع کا کہنا ہے کہ اگر چادر میسر نہ ہو تو شلوار کو پھاڑ کر چادر نما بنا کر پہننا جائز ہے۔ مگر ان کا یہ قول محض قیاس پر مبنی ہے جس پر کوئی نص نہیں۔ اس لئے شلوار کے بارے میں صحیح موقف امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہی کا معلوم ہوتا ہے کہ چادر نہ ہونے کی بنا پر احرام میں شلوار پہننا جائز ہے۔ نیز اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زعفران اور ورس سے رنگا ہوا لباس بھی احرام میں جائز نہیں۔ یہ ممانعت رنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ خوشبو کی وجہ سے ہے کیونکہ احرام کے بعد خوشبو لگانا بالاتفاق حرام ہے۔ البتہ اگر اسے دھو کر اس کی خوشبو زائل کر دی جائے تب جائز ہے۔

(۵۹۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أُطَيِّبُ رَسُولَ اللهِ ﷺ لِإِحْرَامِهِ قَبْلَ أَنْ يُحْرِمَ، وَلِحِلِّهِ قَبْلَ أَن يَطُوفَ بِالْبَيْتِ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ احرام باندھنے سے پہلے میں رسول اللہ ﷺ کو احرام کے وقت اور احرام کھولنے کے وقت خوشبو لگاتی تھی۔ اس سے پہلے کہ آپؐ بیت اللہ کا طواف کریں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اطیب ﴾ یہ تطییب سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے کہ اس میں خوشبو لگاتی تھی۔ ﴿ لاحرامه ﴾ یعنی احرام پہننے سے پہلے۔ اس سے ثابت ہوا کہ احرام باندھنے سے پہلے خوشبو لگانا جائز ہے گو اس کی خوشبو حالت احرام میں بھی آتی رہے مگر احرام کی حالت میں خوشبو لگانا حرام ہے۔ ﴿ قبل ان یطوف بالبیت ﴾ بیت اللہ کے طواف سے پہلے' اس سے مراد طواف زیارت ہے جو دس ذی الحجہ کو رمی جمار' قربانی اور حلق یعنی سرمنڈوانے کے بعد کیا جاتا ہے۔

(۵۹۸) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لاَ يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ، وَلاَ يُنْكِحُ، وَلاَ يَخْطُبُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "احرام والا نکاح نہ کرے اور نہ نکاح دے اور نہ منگنی کرے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لا ینکح المحرم﴾ یعنی خود نکاح نہ کرے ﴿ولا ینکح﴾ یہ پہلے نکاح سے ہے یعنی نہ کسی دوسرے کو نکاح دے۔ ﴿ولا یخطب﴾ یہ خطبہ خاء کی زیر سے ہے یعنی نہ منگنی کرے۔ نکاح کیلئے کسی عورت کا مطالبہ نہ کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام کی حالت میں خود نکاح کرنا یا کسی کو نکاح دینا کسی کو اپنے لئے یا کسی اور کیلئے شادی کا پیغام دینا ناجائز ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو یہ مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالت احرام میں نکاح کیا تھا تو یہ محض وہم ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

(۵۹۹) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ صَيْدِهِ الحِمَارَ الوَحْشِيَّ وَهُوَ غَيْرُ مُحْرِمٍ - قَالَ: فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لِأَصْحَابِهِ - وَكَانُوا مُحْرِمِينَ -: هَلْ مِنْكُمْ أَحَدٌ أَمَرَهُ، أَوْ أَشَارَ إِلَيْهِ بِشَيْءٍ؟ قَالُوا: لاَ، قَالَ: «فَكُلُوا مَا بَقِيَ مِنْ لَحْمِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے ان کے جنگلی گدھے کو شکار کرنے کے قصے میں جبکہ انہوں نے احرام نہیں باندھا تھا' مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا اور وہ احرام والے تھے "کیا تم میں سے کسی نے اسے حکم دیا تھا یا اس کی طرف کسی چیز سے اشارہ کیا تھا؟" انہوں نے کہا نہیں' آپؐ نے فرمایا "پس کھاؤ اس کے گوشت سے جو بچ گیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فی قصة الحمار الوحشی﴾ جنگلی گدھے کو شکار کرنے کے قصہ میں' اس قصہ کی تفصیل یہ ہے کہ ابو قتادہؓ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ کہیں نکلے تھے مگر اپنے چند ساتھیوں سمیت پیچھے رہ گئے۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے احرام نہیں باندھا تھا مگر ان کے ساتھی احرام کی حالت میں تھے۔ انہوں نے جب وحشی گدھا دیکھا تو اسے نظر انداز کر دیا مگر جب ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی نظر اس پر پڑی تو وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوگئے اور ساتھیوں سے کہا کہ میری لاٹھی پکڑاؤ مگر انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔ پھر ابو قتادہ رضی اللہ عنہ اس پر حملہ آور ہوئے اور اسے زخمی کر دیا۔ ذبح کر کے حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس کا گوشت کھایا اور ان کے ساتھیوں نے بھی کھایا مگر پھر وہ پریشان ہوگئے۔ بالآخر جب وہ آنحضرت ﷺ سے جا ملے تو آپؐ نے یہ سارا ماجرہ عرض کیا جس کا جواب اس روایت میں مذکور ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جنگلی جانور کا شکار جب غیر محرم کرے اور محرم نے اس سلسلے میں اس سے کوئی اعانت نہ کی ہو اور نہ ہی

اس بارے میں کوئی اشارہ کیا ہو تو محرم بھی اس سے کھا سکتا ہے مگر اس بارے میں مزید تفصیل ہے جو آئندہ حدیث کے تحت آ رہی ہے۔

(٦٠٠) وَعَنِ الصَّعْبِ بْنِ جَثَّامَةَ اللَّيْثِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ أَهْدَى لِرَسُولِ اللهِ ﷺ حِمَاراً وَحْشِياً، وَهُوَ بِالأَبْوَاءِ أَوْ بِوَدَّانَ، فَرَدَّهُ عَلَيْهِ، وَقَالَ: «**إِنَّا لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيْكَ إِلاَّ أَنَّا حُرُمٌ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک وحشی گدھا بطور تحفہ بھیجا اور آپؐ "ابواء" یا "ودان" مقام پر تھے تو آپؐ نے وہ انہیں واپس کر دیا اور فرمایا کہ "ہم نے یہ اس لئے واپس کیا کہ ہم احرام والے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حمارا وحشیا﴾ یعنی وحشی گدھے کا ایک ٹکڑا۔ کیونکہ صحیح مسلم میں اس کے گوشت اور گوشت کا کچھ حصہ کے الفاظ بھی ہیں۔ ملاحظہ ہو مسلم باب تحریم الصید للمحرم ﴿بالابواء﴾ الف پر زبر اور باء ساکن ہے۔ یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے مابین ایک پہاڑ کا نام ہے جس کے پاس ایک بستی آباد ہے اور وہ بستی بھی اسی کی طرف منسوب ہے۔ آنحضرت ﷺ کی والدہ کا انتقال اسی جگہ پر ہوا اس کے اور جحفہ کے مابین بیس یا تیس میل کی مسافت ہے۔ ﴿ودان﴾ واؤ پر زبر اور دال مشدد ہے۔ یہ ابواء کے قریب جگہ کا نام ہے۔ ﴿حرم﴾ حاء اور راء دونوں پر پیش ہے۔ یعنی ہم محرم ہیں۔ یہ حدیث بظاہر پہلی حدیث کے معارض ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم کیلئے شکار کا گوشت حرام ہے گو اس کی اجازت یا اشارہ وغیرہ سے شکار نہ کیا گیا ہو مگر پہلی حدیث میں اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان تطبیق یہ دی گئی ہے کہ شکار جب محرم کیلئے کیا گیا ہو تو اس کا کھانا بھی محرم کیلئے حرام ہے گو اس نے اس کا اشارہ وغیرہ بھی نہ کیا ہو کیونکہ مسند امام احمد اور ابن ماجہ میں سند جید کے ساتھ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ ہی کی حدیث میں مروی ہے کہ جب میں نے آپؐ نے عرض کیا کہ جناب یہ شکار میں نے آپؐ کیلئے کیا ہے تو آپؐ نے اس میں سے کچھ بھی تناول نہ فرمایا۔ اسی طرح ترمذی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "حالت احرام میں زمین کا شکار تمہارے لئے حلال ہے بشرطیکہ تم نے اسے شکار نہ کیا ہو یا تمہارے لئے وہ شکار نہ کیا گیا ہو۔" جس سے معلوم ہوا کہ شکار جب محرم کے حکم سے یا اس کے اشارہ وغیرہ سے کیا گیا ہو یا شکار محرم کی ضیافت کیلئے کیا گیا ہو تو اس کیلئے اس کا کھانا ناجائز ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو محرم شکار کا گوشت کھا سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿صعب رضی اللہ عنہ﴾ کی صاد پر زبر اور عین ساکن۔ بن ﴿جثامہ﴾ جیم پر زبر اور "ثا" مشدد، اللیثی لیث قبیلہ سے تھے۔ ودان اور الابواء میں رہتے تھے۔ خلافت صدیقی میں ان کا انتقال ہوا مگر بعض کا قول ہے کہ خلافت عثمانؓ تک زندہ رہے۔

(٦٠١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ

تَعَالَى عَنْهَا ، قَالَتْ : قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ : خَمْسٌ مِنَ الدَّوَابِّ كُلُّهُنَّ فَوَاسِقُ، يُقْتَلْنَ فِي الحِلِّ وَالحَرَمِ : العَقْرَبُ، وَالحِدَأَةُ، وَالغُرَابُ، وَالفَأْرَةُ، وَالكَلْبُ العَقُورُ» . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ﷺ نے فرمایا ''جانوروں میں سے پانچ سب کے سب شریر ہیں۔ حل اور حرم (سب جگھوں پر) مار دیئے جائیں اور وہ ہیں بچھو' چیل' کوا' چوہا اور کاٹ کھانے والا کتا۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ الدواب ﴾ باء پر شد ہے اور دابۃ کی جمع ہے۔ ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو زمین پر چلتا ہے پھر عموماً اس کا استعمال چوپائے جانوروں پر ہونے لگا۔ ﴿ فواسق ﴾ فاسقۃ کی جمع اور ان کا فسق اور شران کی خباثت اور کثرت نقصان کی بنا پر ہے۔ ﴿ الحداۃ ﴾ حاء کی کسرہ کے ساتھ ''عنبۃ '' کے وزن پر وہ خبیث جانور جسے چیل کہتے ہیں۔ ﴿ العقرب ﴾ یعنی بچھو اور اس میں سانپ بالاولیٰ شامل ہے۔ ﴿ والکلب العقور ﴾ عین پر زبر ﴿ عقر ﴾ سے ہے جس کے معنی قتل کرنا اور زخمی کرنا ہیں اور اس سے مراد ہر چیرنے پھاڑنے والا درندہ مراد ہے۔ جیسے شیر' چیتا بھیڑیا وغیرہ۔

(٦٠٢) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ احْتَجَمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بے شک نبی ﷺ نے سینگی لگوائی جب کہ آپؐ احرام کی حالت میں تھے۔ (بخاری و مسلم)

(٦٠٣) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: حُمِلْتُ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ وَالقَمْلُ يَتَنَاثَرُ عَلَى وَجْهِي، فَقَالَ: «مَا كُنْتُ أُرَى الوَجَعَ بَلَغَ بِكَ مَا أَرَى، أَتَجِدُ شَاةً؟» قُلْتُ : لاَ ، قَالَ: «فَصُمْ ثَلاثَةَ أَيَّامٍ ، أَوْ أَطْعِمْ سِتَّةَ مَسَاكِينَ، لِكُلِّ مِسْكِيْنٍ نِصْفُ صَاعٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس اٹھا کر لایا گیا اور جوئیں میرے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا ''میرا یہ خیال نہ تھا کہ تم کو بیماری نے اس حالت کو پہنچا دیا ہو گا جو میں دیکھ رہا ہوں' کیا تیرے پاس بکری ہے؟'' میں نے عرض کیا کہ : نہیں۔ آپؐ نے فرمایا ''تین دن روزہ رکھ یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع ہر مسکین کے حساب سے کھانا دے۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ حملت ﴾ صیغہ مجہول ہے یعنی مجھے اٹھا کر لایا گیا۔ ﴿ القمل ﴾ قاف پر زبر اور میم ساکن جنہیں جوئیں کہتے ہیں۔ ﴿ یتناثر ﴾ یعنی کثرت کی وجہ سے وہ سر سے میرے منہ پر گر رہی تھیں اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ انہیں مارتے نہیں تھے کیونکہ وہ محرم تھے۔ ''ما کنت اری'' اری کے ھمزہ پر پیش صیغہ مجہول کی وجہ سے یعنی مجھے یہ گمان نہ تھا۔ ﴿ الوجع ﴾ یعنی تکلیف ﴿ ما اری ﴾ ھمزہ پر زبر۔ دیکھنے کے معنی میں۔ یعنی جو میں دیکھ رہا ہوں۔ ﴿ اتجد شاۃ ﴾ یعنی حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی یہ حالت دیکھ کر آپؐ نے انہیں سر منڈوانے کا حکم دیا اور اس کے کفارہ کے طور پر ایک بکری ذبح کرنے یا تین دن کا روزہ رکھنے

کا یا چھ مساکین کو کھانا کھلانے کا حکم دیا۔

راوی حدیث: ﴿کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ﴾ عجرہ کے عین پر پیش اور جیم ساکن' یہ جلیل القدر صحابی قبیلہ "البلی" سے تعلق رکھتے تھے جو انصار کا حلیف تھا۔ کوفہ چلے گئے تھے بالآخر مدینہ طیبہ میں ۵۱ھ میں ۷۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(٦٠٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا فَتَحَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مَكَّةَ، قَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي النَّاسِ، فَحَمِدَ اللَّهَ، وَأَثْنَى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى حَبَسَ عَنْ مَكَّةَ الفِيلَ، وَسَلَّطَ عَلَيْهَا رَسُولَهُ وَالمُؤْمِنِينَ، وَإِنَّهَا لَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ كَانَ قَبْلِي، وَإِنَّمَا أُحِلَّتْ لِي سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ، وَإِنَّهَا لَنْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ بَعْدِي، فَلاَ يُنَفَّرُ صَيْدُهَا، وَلاَ يُخْتَلَى شَوْكُهَا، وَلاَ يَحِلُّ سَاقِطَتُهَا إِلاَّ لِمُنْشِدٍ. وَمَنْ قُتِلَ لَهُ قَتِيلٌ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ»، فَقَالَ العَبَّاسُ: إِلاَّ الإِذْخِرَ، يَا رَسُولَ اللهِ! فَإِنَّا نَجْعَلُهُ فِي قُبُورِنَا وَبُيُوتِنَا، فَقَالَ: «إِلاَّ الإِذْخِرَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مکہ کی فتح دی تو رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے پھر اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا "بے شک اللہ تعالیٰ نے ہاتھیوں کو مکہ سے روک دیا مگر اپنے رسول (ﷺ) اور مومنوں کو اس پر غلبہ عطا فرمایا اور تحقیق مجھ سے پہلے مکہ کسی پر حلال نہ تھا مگر میرے لئے دن کی ایک گھڑی حلال کر دیا گیا ہے اور یقیناً میرے بعد یہ کسی کیلئے حلال نہیں ہو گا یعنی نہ اس کا شکار بھگایا جائے' نہ اس کا کوئی کانٹے دار درخت کاٹا جائے اور نہ ہی اس کی گری ہوئی چیز سوائے شناخت کرنے والے کے کسی پر حلال ہے اور جس کا کوئی آدمی مارا جائے وہ دو بہتر سوچے ہوئے کاموں میں سے ایک کام میں اختیار رکھتا ہے۔" تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا : یارسول اللہ (ﷺ)! اذخر (ایک قسم کی گھاس) کے سوا' کیونکہ اسے ہم اپنی قبروں اور چھتوں میں رکھتے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا "سوائے اذخر کے' (یعنی اسے کاٹنے کی اجازت ہے۔)" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حبس﴾ یعنی روکا اور منع کیا۔ ﴿الفیل﴾ ہاتھی جسے ابرہہ اور اس کا لشکر بیت اللہ کو گرانے کیلئے لے کر آیا تھا۔ جس کا قصہ مشہور و معروف ہے۔ "وسلط" یہ تسلیط سے ہے یعنی غلبہ کے معنی میں ﴿ساعۃ من نھار﴾ دن کی ایک گھڑی اور اس سے بیت اللہ میں داخل ہونے سے عصر تک کا وقت مراد ہے۔ ﴿لاینفر﴾ صیغہ مجہول تنفیر سے ہے یعنی بھگایا نہ جائے ﴿ولا یختلی﴾ یہ بھی صیغہء مجہول ہے یعنی نہ کاٹا جائے۔ ﴿ساقطتھا﴾ یعنی اس کی گری پڑی چیز۔ ﴿الالمنشد﴾ یہ انشاد

سے ہے یعنی اس کی گری پڑی چیز کھانے یا قبضہ کرنے کی نیت سے نہ اٹھائی جائے البتہ اس کو اس نیت سے اٹھانا جائز ہے کہ اسے لوگوں میں متعارف کرایا جائے تاآنکہ اس کا مالک مل جائے اور وہ اسے حاصل کرے۔ ﴿ قتیل ﴾ یعنی مقتول۔ ﴿ فھو ﴾ یعنی مقتول کا ولی۔ ﴿ بخیر النظرین ﴾ یعنی ولی کو دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا حق ہے' چاہے تو قصاص لے یا دیت وصول کرے۔ ﴿ الا الاذخر ﴾ یعنی آپؐ یہ فرمائیں "الا الاذخر" اذخر کے سوا کہ اس کو کاٹنے کی اجازت ہے۔ اذخر کے ہمزہ اور خاء کے نیچے زیر ہے اور ذال ساکن۔ یہ لمبے پتوں والی خوشبو دار گھاس ہے جسے گھروں کی چھتوں میں لکڑیوں کے اوپر رکھا جاتا تھا اور قبروں کو بند کرنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا۔ مکہ مکرمہ کی حرمت کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں بسنے والوں کو قتل کرنا حرام ہے جو اس میں داخل ہوگیا اسے گویا امن مل گیا۔ اس کا شکار اور اس کے درخت اور جڑی بوٹی کاٹنا حرام ہیں۔ اس میں گری پڑی چیز اپنے استعمال کیلئے اٹھانی حرام ہے۔

(٦٠٥) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَاصِمٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ، وَدَعَا لِأَهْلِهَا، وَإِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ، كَمَا حَرَّمَ إِبْرَاهِيمُ مَكَّةَ؛ وَإِنِّي دَعَوْتُ فِي صَاعِهَا وَمُدِّهَا بِمِثْلِ مَا دَعَا بِهِ إِبْرَاهِيمُ لِأَهْلِ مَكَّةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تحقیق ابراھیم علیہ السلام نے مکہ کو حرمت دی اور اس کے بسنے والوں کیلئے دعا کی اور بے شک میں نے مدینہ کو حرمت دی۔ جس طرح ابراھیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام قرار دیا اور یقیناً میں نے مدینہ کے صاع اور اس کے مد کے متعلق ابراھیم علیہ السلام کی طرح دعا کی جو مکہ میں بسنے والوں کے متعلق تھی۔"

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ حرم مکۃ ﴾ یہ تحریم سے ہے یعنی اس کو حرم بنایا اور مدینہ طیبہ کی تحریم کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا شکار حرام ہے۔ اس کے درخت کاٹنے حرام ہیں اور وہاں بدعات کا ارتکاب حرام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ کی طرح مدینہ طیبہ بھی حرم ہے اور ابراھیم علیہ السلام نے مکہ کو حرمت دی کا مفہوم یہ ہے کہ دعا سے اسے حرمت دی گئی کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ ان اللہ حرم مکۃ کہ اللہ نے مکہ کو حرام قرار دیا ہے۔

(٦٠٦) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الْمَدِينَةُ حَرَامٌ مَا بَيْنَ عَيْرٍ إِلَى ثَوْرٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مدینہ حرم ہے عیر سے ثور کے درمیان۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ عیر ﴾ عین کے نیچے زیر اور یاء ساکن۔ یہ مدینہ طیبہ کے جنوب میں پہاڑ کا نام ہے جس

کے جنوب مغرب میں قباء واقع ہے ﴿ ثور ﴾ ثاء پر زبر' واؤ ساکن' یہ چھوٹا سا گول پہاڑ ہے جو مدینہ طیبہ کے شمال میں جبل احد کے پیچھے واقع ہے۔ ایک روایت میں ہے "مابین عیر و احد" کہ عیر اور احد کے درمیان یعنی ثور کی جگہ جبل احد کا ذکر ہے مگر دونوں میں کوئی جوہری فرق نہیں۔ احد اور ثور قریب قریب ہیں۔ جبل ثور مکہ مکرمہ میں بھی ہے۔ اس میں ہجرت کے موقعہ پر آپؐ چھپے تھے اور اس کا ذکر قرآن پاک کی اس آیت میں بھی ہے "اذهما فی الغار" یہاں سے یہ جبل ثور نہیں بلکہ مدینہ طیبہ کا جبل ثور مراد ہے۔ اس حدیث سے شمالاً جنوباً حرم مدینہ کی تحدید معلوم ہوتی ہے۔ شرقاً غرباً اس کی تحدید کے متعلق مروی ہے کہ "انها حرام مابین لابتيها" کہ دو حروں کے درمیان جو کچھ ہے حرام ہے اور اس سے مراد ایک "حرۂ و برہ" ہے جو مدینہ طیبہ کے مغرب میں ہے اور دوسرا حرۂ واقم جو مدینہ طیبہ کے مشرق میں ہے یوں چاروں سمت حرم مدینہ کی تحدید واضح ہو جاتی ہے۔

٥ - بَابُ صِفَةِ الحَجِّ وَدُخُول مَكَّة — حج کا طریقہ اور مکہ میں داخل ہونے کا بیان

(٦٠٧) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ حَجَّ، فَخَرَجْنَا مَعَهُ، حَتَّى إِذَا أَتَيْنَا ذَا الحُلَيْفَةِ فَوَلَدَتْ أَسْمَاءُ بِنْتُ عُمَيْسٍ، فَقَالَ: «اغْتَسِلِي، وَاسْتَثْفِرِي بِثَوْبٍ، وَأَحْرِمِي»، وَصَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي المَسْجِدِ، ثُمَّ رَكِبَ القَصْوَاءَ، حَتَّى إِذَا اسْتَوَتْ بِهِ عَلَى البَيْدَاءِ، أَهَلَّ بِالتَّوْحِيدِ: «لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ، لاَ شَرِيكَ لَكَ، لَبَّيْكَ، إِنَّ الحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالمُلْكَ، لاَ شَرِيكَ لَكَ»، حَتَّى إِذَا أَتَيْنَا البَيْتَ ٱسْتَلَمَ الرُّكْنَ، فَرَمَلَ ثَلاَثاً، وَمَشَى أَرْبَعاً، ثُمَّ أَتَى مَقَامَ إِبْرَاهِيمَ فَصَلَّى، ثُمَّ رَجَعَ إِلَى

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج کیا تو ہم آپؐ کے ساتھ نکلے یہاں تک کہ ہم ذوالحلیفہ پہنچے تو اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے بچہ جنا۔ آپؐ نے فرمایا "غسل کر اور کسی کپڑے سے لنگوٹ باندھ لے اور احرام باندھ لے۔" رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں نماز پڑھی اور قصواء (آپؐ کی اونٹنی کا نام) پر سوار ہو گئے یہاں تک کہ جب آپؐ بیداء کے برابر آئے تو آپؐ نے توحیدی تلبیہ پکارا "حاضر ہوں' اے میرے اللہ! میں حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں' میں حاضر ہوں' بلاشک سب تعریفیں اور انعامات تیرے ہیں۔ بادشاہت بھی تیری ہے' تیرا کوئی شریک نہیں۔" یہاں تک کہ ہم بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ رکن (اسود) کو آپؐ نے بوسہ دیا' تین بار رمل کیا اور چار بار معمول کے مطابق چلے۔ پھر آپؐ مقام ابراہیم پر

الرُّكْنِ ، فَاسْتَلَمَهُ، ثُمَّ خَرَجَ مِنَ البَابِ إِلَى الصَّفَا، فَلَمَّا دَنَا مِنَ الصَّفَا، قَرَأَ ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللهِ﴾ «أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِ»، فَرَقِيَ الصَّفَا حَتَّى رَأَى البَيْتَ، فَاسْتَقْبَلَ القِبْلَةَ، فَوَحَّدَ اللَّهَ، وَكَبَّرَهُ، وَقَالَ: «**لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، وَحْدَهُ، لاَ شَرِيكَ لَهُ، لَهُ المُلْكُ، وَلَهُ الحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، أَنْجَزَ وَعْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ، وَهَزَمَ الأَحْزَابَ وَحْدَهُ**»، ثُمَّ دَعَا بَيْنَ ذٰلِكَ قَالَ مِثْلَ هٰذَا ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ نَزَلَ مِنَ الصَّفَا إِلَى المَرْوَةِ، حَتَّى إِذَا انْصَبَّتْ قَدَمَاهُ فِيْ بَطْنِ الوَادِيْ سَعَى، حَتَّى إِذَا صَعِدَ مَشَى إِلَى المَرْوَةِ، فَفَعَلَ عَلَى المَرْوَةِ كَمَا فَعَلَ عَلَى الصَّفَا، فَذَكَرَ الحَدِيْثَ، وَفِيْهِ: فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ تَوَجَّهُوا إِلَى مِنًى، وَرَكِبَ النَّبِيُّ ﷺ، فَصَلَّى بِهَا الظُّهْرَ وَالعَصْرَ وَالمَغْرِبَ وَالعِشَاءَ وَالفَجْرَ، ثُمَّ مَكَثَ قَلِيْلاً حَتَّى طَلَعَتِ الشَّمْسُ، فَأَجَازَ حَتَّى أَتَى عَرَفَةَ، فَوَجَدَ القُبَّةَ قَدْ ضُرِبَتْ لَهُ بِنَمِرَةٍ، فَنَزَلَ بِهَا، حَتَّى إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ أَمَرَ بِالقَصْوَاءِ فَرُحِلَتْ لَهُ، فَأَتَى بَطْنَ الوَادِيْ، فَخَطَبَ النَّاسَ، ثُمَّ أَذَّنَ، ثُمَّ أَقَامَ، فَصَلَّى الظُّهْرَ،

آئے اور نماز پڑھی پھر رکن (حجر اسود) کی طرف واپس آئے اور اس کو بوسہ دیا۔ پھر مسجد حرام کے دروازہ سے صفا کی طرف نکلے جب صفا کے نزدیک پہنچے تو یہ آیت پڑھی۔ "تحقیق صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔" (پھر فرمایا) "میں شروع کرتا ہوں (سعی کو) اس مقام سے کہ جہاں سے اللہ نے شروع کیا ہے۔" پھر صفا پر چڑھے۔ یہاں تک کہ آپؐ نے بیت اللہ کو دیکھا۔ پھر قبلہ رخ ہوئے اور اللہ کی وحدانیت اور کبریائی بیان کی اور کہا" اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔ بادشاہی اور سب خوبیاں اسی کی ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور اپنے بندے کی مدد کی اور کفار کی جماعت کو اکیلے اسی نے شکست دی۔" پھر اس کے درمیان تین بار دعا کی۔ پھر صفا سے اترے اور مروہ کی طرف گئے۔ یہاں تک کہ جب آپؐ کے دونوں پاؤں وادی کے نشیب میں پڑے تو دوڑے یہاں تک کہ آپؐ نشیب سے اوپر چڑھے اور مروہ کی طرف چلے۔ مروہ پر وہی کچھ کیا جو صفا پر کیا تھا۔ پھر جابر رضی اللہ عنہ نے ساری حدیث بیان کی جس میں یہ ہے کہ جب ترویہ کا دن (۸ ذی الحج) ہوا تو لوگ منیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور نبی ﷺ سوار تھے پھر وہاں ظہر' عصر' مغرب' عشاء اور صبح کی نماز پڑھی۔ پھر تھوڑی دیر ٹھہرے یہاں تک کہ سورج نکل آیا تو وہاں سے روانہ ہوئے اور مزدلفہ سے گزرتے ہوئے عرفات میں پہنچے تو خیمہ میں اترے جو آپؐ

ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى العَصْرَ، وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا شَيْئاً، ثُمَّ رَكِبَ حَتَّى أَتَى المَوقِفَ، فَجَعَلَ بَطْنَ نَاقَتِهِ القَصْوَاءِ إِلَى الصَّخَرَاتِ، وَجَعَلَ جَبَلَ المُشَاةِ بَيْنَ يَدَيْهِ، وَاسْتَقْبَلَ القِبْلَةَ، فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفاً حَتَّى غَرَبَتِ الشَّمْسُ، وَذَهَبَتِ الصُّفْرَةُ قَلِيْلاً، حَتَّى إِذَا غَابَ القُرْصُ دَفَعَ، وَقَدْ شَنَقَ لِلْقَصْوَاءِ الزِّمَامَ، حَتَّى إِنَّ رَأْسَهَا لَيُصِيْبَ مَورِكَ رَحْلِهِ، وَيَقُولُ بِيَدِهِ اليُمْنَى: «**يَا أَيُّهَا النَّاسُ! اَلسَّكِيْنَةَ، اَلسَّكِيْنَةَ**»، وَكُلَّمَا أَتَى جَبَلاً أَرْخَى لَهَا قَلِيْلاً حَتَّى تَصْعَدَ، حَتَّى أَتَى المُزْدَلِفَةَ، فَصَلَّى بِهَا المَغْرِبَ وَالعِشَاءَ، بِأَذَانٍ وَاحِدٍ وَإِقَامَتَيْنِ، وَلَمْ يُسَبِّحْ بَيْنَهُمَا شَيْئاً، ثُمَّ اضْطَجَعَ حَتَّى طَلَعَ الفَجْرُ، فَصَلَّى الفَجْرَ حِيْنَ تَبَيَّنَ لَهُ الصُّبْحُ، بِأَذَانٍ وَإِقَامَةٍ، ثُمَّ رَكِبَ حَتَّى أَتَى المَشْعَرَ الحَرَامَ، فَاسْتَقْبَلَ القِبْلَةَ، فَدَعَا، وَكَبَّرَ، وَهَلَّلَ، فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفاً حَتَّى أَسْفَرَ جِدًّا، فَدَفَعَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ، حَتَّى أَتَى بَطْنَ مُحَسِّرٍ، فَحَرَّكَ قَلِيْلاً، ثُمَّ سَلَكَ الطَّرِيْقَ الوُسْطَى الَّتِيْ تَخْرُجُ عَلَى الجَمْرَةِ الكُبْرَى، حَتَّى أَتَى الجَمْرَةَ الَّتِي

کیلئے نمرہ میں لگایا گیا تھا۔ پھر جب سورج ڈھلنے لگا تو آپؐ نے قصواء پر پالان رکھنے کا حکم دیا۔ آپؐ سوار ہو کر وادی کے درمیان میں آئے اور لوگوں کو خطبہ دیا پھر اذان دلوائی پھر اقامت کہلوائی تو نماز ظہر ادا کی پھر اقامت کہلوائی تو عصر کی نماز پڑھی اور ان دونوں کے درمیان کوئی نماز نہ پڑھی۔ پھر سوار ہو کر ٹھہرنے کی جگہ پر پہنچے تو اپنی اونٹنی قصواء کا پیٹ پتھروں کی طرف کر دیا اور راہ چلنے والوں کو اپنے سامنے کر لیا اور اپنا رخ قبلہ کی جانب کر لیا۔ پھر آپؐ اس وقت تک ٹھہرے رہے کہ سورج غروب ہونے لگا اور تھوڑی سی زردی ختم ہو گئی حتیٰ کہ سورج مکمل طور پر غروب ہو گیا پھر آپؐ اسی حالت میں واپس ہوئے۔ آپؐ نے قصواء کی باگ اتنی تنگ کر رکھی تھی کہ اس کا سر آپؐ کے پالان کے اگلے ابھرے ہوئے حصے کو پہنچتا تھا اور آپؐ اپنے داہنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرماتے تھے "اے لوگو! تسکین و اطمینان اختیار کرو" اور جب بھی آپؐ کسی ٹیلے پر آتے تو باگ تھوڑی سی ڈھیلی کر دیتے کہ وہ اوپر چڑھ جاتی یہاں تک کہ آپؐ مزدلفہ تشریف لائے اور وہاں ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نماز پڑھی اور دونوں کے درمیان کوئی نفلی نماز نہیں پڑھی۔ پھر لیٹ گئے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ جب صبح کا وقت ظاہر ہوا تو آپؐ نے اذان اور اقامت سے فجر کی نماز پڑھی۔ پھر سوار ہو کر مشعر حرام پر آئے۔ پس آپؐ قبلہ رو ہوئے دعا کی اور تکبیر و تہلیل کہتے رہے۔ آپؐ وہاں اچھی طرح

عِنْدَ الشَّجَرَةِ، فَرَمَاهَا بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ، يُكَبِّرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ مِّنْهَا، مِثْلِ حَصَى الْخَذْفِ، رَمٰى مِنْ بَطْنِ الْوَادِيْ، ثُمَّ انْصَرَفَ إِلَى الْمَنْحَرِ، فَنَحَرَ، ثُمَّ رَكِبَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَأَفَاضَ إِلَى الْبَيْتِ، فَصَلّٰى بِمَكَّةَ الظُّهْرَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ مُطَوَّلاً.

سفیدی ظاہر ہونے تک ٹھہرے رہے پھر سورج نکلنے سے پہلے واپس ہو کر وادی محسر کے نشیب میں آ گئے تو سواری کو کچھ تیز کر دیا۔ پھر درمیانی راستہ پر چلے جو جمرہ کبریٰ (بڑا شیطان) پر پہنچتا ہے پھر آپؐ اس جمرہ پر آئے جو درخت کے پاس ہے تو اسے سات کنکریاں وادی کے نشیب سے ماریں' ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتے تھے' ان میں سے ہر کنکری خذف (لوبیے کے دانے) کے برابر تھی۔ پھر آپؐ قربان گاہ کی طرف گئے اور وہاں قربانی کی پھر رسول اللہ ﷺ سوار ہوئے اور بیت اللہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر مکہ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ (اسے مسلم نے تفصیل سے بیان کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اسماء بنت عمیس﴾ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ کا نام ہے اور جو بچہ اس وقت پیدا ہوا اس کا نام محمد رضی اللہ عنہ تھا۔ ﴿واستثفری﴾ یہ "استثفار" سے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں لنگوٹ کسنا اور وہ یوں کہ عورت اپنی کمر سے کوئی چیز یا (رسی یا ازار وغیرہ) بند باندھ لیتی ہے پھر ایک چوڑا کپڑا خون کی جگہ پر رکھ کر اسے آگے پیچھے سے کمر کی رسی کے ساتھ باندھ لیتی ہے۔ ﴿واحرمی﴾ احرام باندھ لے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نفاس کی حالت میں احرام باندھنا درست ہے۔ ﴿القصواء﴾ قاف پر زبر اور صاد ساکن' اس کے اصل معنی تو کان کٹا ہوا' کے ہیں مگر یہاں یہ آنحضرت ﷺ کی اونٹنی کا لقب ہے اس کا کان کٹا ہوا نہ تھا بلکہ آپؐ نے پیار سے اس کا یہ لقب رکھا تھا۔ ﴿البیداء﴾ دراصل بیابان جگہ جہاں کوئی چیز نہ ہو۔ اسے "البیداء" کہتے ہیں مگر یہاں ذوالحلیفہ کے قریب مخصوص جگہ کا نام مراد ہے۔ ﴿اھل﴾ اھلال سے ماضی کا صیغہ ہے یعنی آپ ﷺ نے اپنی آواز کو بلند کیا۔ ﴿بالتوحید﴾ یعنی تلبیہ میں صرف اللہ وحدہ لاشریک کا ذکر کیا جبکہ جاہلیت میں مشرکین تلبیہ میں شرکیہ کلمات بھی کہتے تھے۔ ﴿لبیک﴾ لبی کا مصدر ہے جب "لبیک" کہے گا تو یہ مصدری معنی میں منصوب ہوگا اور اس کا عامل محذوف ہوگا اور مکرر "لبیک" سے مقصود تکثیر و تاکید ہے۔ اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ آپ کے دربار میں حاضر ہوں۔ یعنی آپ کی اطاعت پر قائم۔ آپ کی اطاعت پر قائم ہوں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ میں نے آپ کی دعوت کو قبول کر لیا' قبول کر لیا۔ اور یہ تلبیہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حج کا جواب ہے۔ ﴿ان الحمد﴾ همزہ کے نیچے زیر ہے جملہ مستانفہ کی بنا پر مگر تعلیل کی صورت میں اس پر زبر آئے گی۔ ﴿استلم الرکن﴾ رکن یعنی حجر اسود

پر ہاتھ رکھا اور اس کا بوسہ لیا۔ ﴿ فرمل ﴾ یعنی اپنے کندھوں کو ہلاتے ہوئے پہلوانوں کی طرح تیز تیز چلے۔ ﴿ ثلاثا ﴾ یعنی سات میں سے تین چکریوں دوڑ کر پورے کئے۔ ﴿ ومشی اربعا ﴾ اور باقی چار حسب عادت چل کر پورے کئے۔ اس طواف کو طواف قدوم کہتے ہیں نیز اسے طواف دخول' طواف ورود بھی کہتے ہیں اور یہ حج کا پہلا طواف ہے۔ ﴿ مقام ابراھیم ﴾ وہ معروف پتھر جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کا نقش ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر اسی کے اوپر کھڑے ہو کر کی تھی۔ تعمیر کے وقت جب دیوار اوپر ہوتی تو یہ پتھر بھی خود بخود اوپر ہو جاتا تھا۔ ﴿ فصلی ﴾ پھر دو رکعت طواف کے بعد پڑھیں۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد قل یا ایھا الکفرون اور دوسری میں قل ھو اللہ احد پڑھی۔ ﴿ من الباب ﴾ یعنی الصفا کا معروف دروازہ۔ ﴿ دنا ﴾ قریب ہوئے۔ ﴿ شعائر ﴾ یہ شعیرۃ کی جمع ہے یعنی علامت اور یہاں شعائر سے مراد وہ مناسک ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کی علامت قرار دیا ہے۔ صفا اور مروہ بھی انہی شعائر میں سے ہیں جن کے مابین سعی کی جاتی ہے۔ ﴿ ابدا بما بدا اللہ ﴾ یعنی میں صفا سے شروع کرتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بھی صفا کا ذکر پہلے کیا ہے۔ اور مروہ کا بعد میں ﴿ فرقی ﴾ سبل السلام میں ہے کہ قاف پر زبر ہے مگر مختار الصحاح میں ہے کہ اس کے نیچے زیر پڑھی جائے گی۔ یعنی چڑھے ﴿ انجز وعدہ ﴾ یعنی اپنے رسول اور دین کے بارے میں غلبہ کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا۔ ﴿ نصر عبدہ ﴾ اپنے بندے کی مدد کی۔ بندہ سے خود آپؐ کی ذات گرامی مراد ہے۔ ﴿ وھم الاحزاب ﴾ یہ حزب کی جمع ہے اس کے معنی جماعت اور لشکر ہے۔ یعنی ان کے لشکر کو ختم کر دیا اور شکست سے دوچار کیا۔ ﴿ ثم دعا بین ذلک ﴾ یعنی مذکورہ ذکر کے درمیان دعا کی۔ ﴿ ثلاث مرات ﴾ تین مرتبہ اس سے لازم آتا ہے کہ آپؐ نے یہ ذکر تین بار کیا۔ ﴿ حتی اذا انصب ﴾ یہ انصباب سے ہے یعنی وادی میں نیچے اترے۔ ﴿ حتی اذا صعد ﴾ یعنی وادی کے نشیب سے اوپر چڑھے۔ ﴿ فذکر الحدیث ﴾ یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مکمل حدیث ذکر کی' مگر مصنف رحمہ اللہ نے اس میں سے بقدر ضرورت ذکر کی۔ ﴿ یوم الترویۃ ﴾ تاء پر زبر راء ساکن اور واؤ کے نیچے زیر اور یاء مخفف یہ مصدر ہے۔ "ارواء" یعنی پینے کے معنی میں اور "یوم الترویۃ" ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ ہوتی ہے۔ اسے یوم ترویہ اس لئے کہتے ہیں کہ اسی دن حجاج میدان عرفات کی ضرورت کیلئے پانی لیتے تھے کیونکہ وہاں ان دنوں پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ﴿ توجھوا ﴾ یعنی انہوں نے قصد کیا اور روانہ ہوگئے۔ ﴿ فصلی بھا ﴾ یعنی منیٰ میں پہنچنے کے بعد پانچوں نمازیں وقت کے مطابق ادا کیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے ایک دن اور ایک رات قیام فرمایا تھا ﴿ ثم مکث قلیلا ﴾ یعنی نو ذی الحجہ کی نماز فجر کے بعد تھوڑی دیر ٹھہرے۔ ﴿ فاجاز ﴾ یعنی پھر چلے اور آگے بڑھے ﴿ حتی اتی عرفۃ ﴾ یعنی میدان عرفات کے قریب پہنچ گئے۔ ﴿ القبۃ ﴾ قاف پر پیش' چھوٹے خیمے کو کہتے ہیں۔ ﴿ بنمرۃ ﴾ نون پر زبر' میم کے نیچے زیر اور راء پر زبر میدان عرفات سے کچھ پہلے معروف جگہ کا نام ہے جو عرفات کا حصہ نہیں۔ ﴿ فرحلت ﴾ مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ ترحیل سے ہے یعنی اس پر کجاوا رکھا اور چلنے کی تیاری کی۔ ﴿ فاتی بطن الوادی ﴾

اس وادی سے مراد وادی عرنہ ہے جس کے عین پر پیش راء پر زبر اور اس کے بعد نون۔ وادی عرنہ امام شافعی رحمہ اللہ اور اکثر علماء کے نزدیک میدان عرفات میں سے نہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ اسے عرفات کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ ﴿ الموقف ﴾ قاف کے نیچے زیر یعنی عرفات میں ٹھہرنے کی جگہ۔ ﴿ الی الصخرات ﴾ پتھروں کی طرف۔ اس سے مراد وہ بکھرے ہوئے پتھر جو جبل رحمت کے دامن میں ہیں۔ یہ میدان عرفات کا درمیانی حصہ ہے اور یہاں ٹھہرنا مستحب ہے۔ ﴿ حبل المشاة ﴾ حاء کے اوپر زبر اور باء ساکن اور مشاۃ کی میم پر پیش "ماش" کی جمع ہے اس کے معنی ہیں پیدل چلنے کا راستہ۔ ریت کے درمیان ٹیلے کو بھی حبل کہتے ہیں اور بعض نسخوں میں یہ لفظ "جبل" بھی آیا ہے۔ ﴿ وذهبت الصفرة قليلا ﴾ یعنی سورج غروب ہونے کے بعد اس کی کچھ زردی بھی ختم ہوگئی۔ جس سے اس کے غروب کا یقین ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنت یہ ہے کہ میدان عرفات میں اپنے موقف میں اچھی طرح سورج غروب ہونے تک ٹھہرا جائے اور میدان عرفات میں وقوف کا وقت عرفہ کے دن سورج ڈھلنے سے لے کر یوم النحر کی طلوع فجر تک ہے۔ جو شخص اس وقت میں میدان عرفات میں ٹھہرے گا اس کا موقف صحیح ہے اور جو اس دوران یہاں قیام نہ کر سکا اس کا حج فوت ہوگیا۔ ﴿ حتى اذا غاب القرص ﴾ یعنی جب سورج کی ٹکیہ غائب ہوگئی اور وہ اچھی طرح غروب ہوگیا۔ قرص کسی گول چیز کو کہتے ہیں۔ ﴿ دفع ﴾ یہ "اذا" کا جواب ہے یعنی آپ عرفات سے روانہ ہوئے۔ ﴿ وقد شنق ﴾ واؤ حالیہ ہے اور ﴿ شفق ﴾ کی نون پر زبر یعنی ملا اور کھینچنے سے تنگ ہوا۔ ﴿ الزمام ﴾ زاء کے نیچے زیر یعنی اونٹنی کی مہار' یعنی مہار کو کھینچا تنگ کیا تا کہ وہ نہ بھاگے۔ ﴿ ليصيب ﴾ لام تاکید کا ہے اور اس پر زبر ہے یعنی چھوٹا تھا اور پہنچ جاتا تھا۔ ﴿ مورك ﴾ میم پر زبر واؤ ساکن راء کے نیچے زیر۔ کجاوے کا اگلا حصہ جس پر سوار ہونے والا تھک کر کبھی اپنے پاؤں بھی رکھ لیتا ہے۔ ﴿ السكينة ﴾ اس پر زبر ہے یعنی اطمینان کو لازم پکڑو۔ ﴿ كلما اتى حبلا ﴾ حاء کے ساتھ یعنی جب بھی ریت کے کسی ٹیلے پر آتے ﴿ ارخى لها ﴾ تو اس کی مہار ڈھیلی کر دیتے ﴿ لم يسبح ﴾ یہ تسبیح سے ہے یعنی نفل نہیں پڑھے۔ ﴿ اضطجع ﴾ یعنی سونے کیلئے لیٹ گئے۔ ﴿ لاتبين ﴾ یعنی ظاہر ہوا۔ ﴿ لمشعر الحرام ﴾ یہ مزدلفہ میں مشہور پہاڑ کا نام ہے جسے قزح بھی کہا جاتا ہے۔ ﴿ وهلل ﴾ یہ تھلیل سے ہے یعنی لا الہ الا اللہ پڑھا۔ ﴿ اسفر ﴾ یعنی جب روشن ہوگیا۔ ﴿ بطن محسر ﴾ میم پر پیش حاء پر زبر سین کے نیچے زیر اور شد مشہور وادی کا نام ہے جو منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان ہے اور یہ نہ منیٰ کا حصہ ہے اور نہ ہی مزدلفہ کا اس کا نام "وادی محسر" اس لئے رکھا گیا کہ ابرھہ کے ہاتھی یہاں رک گئے اور آگے پیش قدمی سے عاجز آگئے۔ ﴿ فحرك ﴾ یہ تحریک سے ہے یعنی آپ نے اپنی اونٹنی کو حرکت دی تا کہ وہ تیز چلے اس لئے کہ یہ وادی عذاب کی جگہ ہے جیسے آپ سفر کے دوران میں قوم ثمود کی بستی سے جلدی سے گزر گئے تھے۔ ﴿ ثم سلك الطريق الوسطى ﴾ دونوں راستوں کے درمیان والے راستہ پر چلے اور یہ وہ راستہ تھا جو عرفات کے راستہ کے علاوہ تھا ﴿ التى تخرج على الجمرة الكبرى ﴾ اسے جمرۃ عقبہ بھی کہتے ہیں اور "جمرة" کنکریوں

کے جمع ہونے کا نام ہے۔ ﴿ حتی اتی ﴾ یعنی یہاں تک کہ آپؐ وہاں پہنچے۔ ﴿ الجمرہ التی عند الشجرہ ﴾ یہ جمرات میں سے سب سے آخری جمرہ ہے۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ منیٰ کی حد کیلئے منیٰ کا حصہ نہیں۔ آپؐ کے زمانہ میں وہاں درخت تھا تبھی اسے کہا گیا ہے کہ جو جمرہ درخت کے قریب ہے۔ ﴿ الخذف ﴾ فاء پر زبر ذال ساکن' انگلیوں کے پوروں سے کنکری پھینکنا جو لوبیا کے دانہ کے برابر ہوتی ہو۔ ﴿ رمی من بطن الوادی ﴾ یعنی وادی کے نشیب سے کنکریاں ماریں۔ بایں طور پر کہ منیٰ' عرفہ اور مزدلفہ آپؐ کی دائیں جانب اور مکہ مکرمہ بائیں جانب تھا۔ اس رمی کے بعد تلبیہ ختم ہو جاتا ہے۔ ﴿ المنحر ﴾ یعنی قربان گاہ اور وہ منیٰ ہے۔ ﴿ نحر ﴾ یہ لبہ سے ہوتا ہے جیسے حلق سے دوسرا جانور ذبح کیا جاتا ہے ﴿ افاض ﴾ یعنی آپؐ روانہ ہوئے اور وہاں سے کوچ کیا۔ ﴿ الی البیت ﴾ یعنی کعبہ مکرمہ کی طرف طواف زیارت کیلئے اور اسے طواف افاضہ اور طواف الرکن بھی کہتے ہیں۔ یہ طواف حج میں فرض ہے۔ یوم النحر کو اگر یہ طواف نہ ہو سکے تو یہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ہر صورت میں یہ طواف کرنا پڑے گا۔

(٦٠٨) وَعَنْ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا فَرَغَ مِنْ تَلْبِيَتِهِ فِي حَجٍّ أَوْ عُمْرَةٍ سَأَلَ اللَّهَ رِضْوَانَهُ وَالجَنَّةَ، وَاسْتَعَاذَ بِرَحْمَتِهِ مِنَ النَّارِ. رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب حج یا عمرہ میں تلبیہ یعنی لبیک کہنے سے فارغ ہوتے تو اللہ تعالیٰ سے اس کی رضامندی اور جنت طلب کرتے اور اس کی رحمت کے ساتھ آگ سے پناہ مانگتے۔ (اسے امام شافعی رحمہ اللہ نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اذا فرغ من تلبیتہ ﴾ اس سے مراد ہر وہ تلبیہ ہے جو محرم کسی بھی وقت کہے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد دعا مستحب ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ فراغت سے مراد وہ وقت ہو جب لبیک کہنا ختم ہو جاتا ہے اور یہ روایت اس لئے ضعیف ہے کہ اس کا راوی محمد بن ابی زائدہ ضعیف ہے۔

راوی حدیث ﴿ حضرت خزیمہ بن ثابت بن الفاکہ رضی اللہ عنہ ﴾ انصار کے قبیلہ اوس کی خطمی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی کنیت ابو عمارہ ہے۔ بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ فتح مکہ کے دن خطمی قبیلہ کا جھنڈا آپ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے اور اسی موقعہ پر شہید ہوئے۔

(٦٠٩) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «نَحَرْتُ هٰهُنَا، وَمِنًى كُلُّهَا مَنْحَرٌ، فَانْحَرُوا فِي رِحَالِكُمْ، وَوَقَفْتُ هٰهُنَا، وَعَرَفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ،

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں نے قربانی اس جگہ کی ہے مگر منیٰ سارے کا سارا قربان گاہ ہے۔ لہٰذا تم اپنے اپنے ٹھہرنے کے مقامات پر قربانی کر دو اور میں نے اس جگہ قیام کیا ہے مگر عرفات کا سارا میدان جائے قیام

وَوَقَفْتُ هٰهُنَا، وَجَمْعٌ كُلُّهَا مَوْقِفٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

ہے اور میں نے یہاں قیام کیا مگر مزدلفہ سارا جائے قیام ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿وجمع کلها موقف﴾ الجمع میں جیم پر فتحہ اور میم ساکن ہے۔ مزدلفہ کا دوسرا نام ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اسے جمع اس لئے کہتے ہیں کہ جب حضرت آدم و حوا کو جنت سے زمین پر اپنے اپنے مقام و ٹھکانے پر اتارا گیا تو دونوں کی اس مقام پر ملاقات ہوئی۔ ان کے یہاں جمع ہونے کی بنا پر اس جگہ کا نام جمع پڑ گیا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لوگوں کے اجتماع اور اکٹھے ہونے یا اس مقام پر مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کو جمع کر کے ادا کرنے کی وجہ سے اسے "الجمع" کہا گیا ہے۔

(٦١٠) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا جَاءَ إِلَى مَكَّةَ دَخَلَهَا مِنْ أَعْلَاهَا، وَخَرَجَ مِنْ أَسْفَلِهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب حج کیلئے مکہ میں داخل ہوئے تو اس موقع پر مکہ کی بالائی جانب سے داخل ہوئے اور جب واپس جانے کیلئے مکہ سے نکلے تو زیریں حصہ سے نکلے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس روایت میں رسول اللہ ﷺ کا مکہ میں داخل ہونے اور نکلنے کا راستہ بیان ہوا کہ آپؐ ثنیہ علیا کے راستہ سے داخل ہوئے اور ثنیہ سفلیٰ سے واپس ہوئے۔ بعض کے نزدیک حج کیلئے مکہ میں داخل ہونا انہی راستوں سے مسنون ہے اور بعض نے اسے سہولت اور آسانی پر محمول کیا ہے اور اسے مسنون قرار نہیں دیا۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے رسول اللہ ﷺ کے اس طرح مکہ میں داخلہ کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ بالائی جانب سے مکہ میں داخلہ کی صورت میں شہر مکہ اور خانہ کعبہ سامنے کی جانب پڑتے ہیں۔

(٦١١) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ كَانَ لَا يَقْدُمُ مَكَّةَ إِلَّا بَاتَ بِذِي طُوًى، حَتَّى يُصْبِحَ، وَيَغْتَسِلَ، وَيَذْكُرُ ذٰلِكَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ جب بھی مکہ میں آتے تو ذی طویٰ میں صبح تک شب بسر کرتے اور غسل کرتے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اسی طرح کیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بات﴾ رات گزارتے۔ ﴿بذی طوی﴾ طویٰ کے "طا" پر ضمہ اور آخر پر تنوین۔ مکہ کے قریب ایک مقام و جگہ۔ (کہ جو آج کل --- ایک پرانے کنویں کی وجہ سے --- بئر طویٰ کے نام سے مشہور ہے)

(٦١٢) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپؐ حجر

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ كَانَ يُقَبِّلُ الحَجَرَ الأَسْوَدَ، وَيَسْجُدُ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الحَاكِمُ مَرْفُوعاً، وَالبَيْهَقِيُّ مَوْقُوفاً.

اسود کو بوسہ دیتے اور اس کے سامنے سجدہ کرتے۔ (اسے حاکم نے مرفوع اور بیہقی نے موقوف روایت کیا ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے حجراسود کو بوسہ دینے اور اس پر سجدہ کرنے کی مشروعیت معلوم ہوتی ہے۔ جمہور کی بھی یہی رائے ہے۔ لیکن اس حدیث میں وھم اور اضطراب پایا جاتا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حجراسود پر سجدہ کرنا بدعت ہے۔ اس کی تفصیل نیل الاوطار (ص: ۴۴) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

غالباً مطلب یہ ہے کہ اس پر اپنی پیشانی رکھتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ' امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ اسے جائز سمجھتے ہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ نے اسے بدعت کہا ہے اور قاضی عیاض نے کہا ہے کہ یہ امام مالک رحمہ اللہ کا شذوذ ہے۔

(٦١٣) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَرْمُلُوا ثَلاَثَةَ أَشْوَاطٍ وَيَمْشُوا أَرْبَعاً، وَأَن يَمْشُوا بَيْنَ الرُّكْنَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ تین چکروں میں تیز قدم چلیں اور دونوں رکنوں کے درمیان چار چکر عام معمول کے مطابق چل کر لگائیں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ امرهم ﴾ ھم سے مراد آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے موقع پر نبی ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم ارشاد فرمایا تھا۔ ﴿ ان یرملوا ﴾ میم پر ضمہ۔ دوڑتے ہوئے۔ ﴿ اشواط ﴾ شوط کی جمع ہے جس کے معنی ہیں چکر لگانا۔

(٦١٤) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا (أَنَّهُ كَانَ إِذَا طَافَ بِالبَيْتِ الطَّوَافَ الأَوَّلَ خَبَّ ثَلاَثاً وَمَشَى أَرْبَعاً. وَفِي رِوَايَةٍ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ إِذَا طَافَ فِي الحَجِّ أَوِ العُمْرَةِ أَوَّلَ مَا يَقْدُمُ فَإِنَّهُ يَسْعَى ثَلاَثَةَ أَطْوَافٍ بِالبَيْتِ وَيَمْشِيْ أَرْبَعَةً). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب بھی بیت اللہ کا طواف قدوم (پہلا طواف) کرتے تو اس کے پہلے تین چکروں میں پہلوانوں کی سی چال چلتے اور (باقی) چار میں آہستہ چلتے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ (حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کا عمل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں) میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے حج یا عمرہ کے لیے بھی جب طواف قدوم کیا تو اس کے پہلے تین چکر دوڑ کر لگائے اور باقی چار میں آپ آہستہ چال چلتے۔

(متفق علیہ)

(٦١٥) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَمْ أَرَ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَسْتَلِمُ مِنَ الْبَيْتِ غَيْرَ الرُّكْنَيْنِ الْيَمَانِيَّيْنِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی اس کے راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سوائے دونوں یمانی رکنوں کے بیت اللہ کے کسی رکن کو چھوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ يستلم ﴾ یعنی ہاتھ سے چھوتے۔ یہ ہر طواف میں مسنون ہے ﴿ غير الركنين اليمانيين ﴾ نون کے بعد والی "یا" مخفف ہے اور یمن کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اس پر تشدید ہے اور یمن کی طرف ان کا رخ ہے' اس لئے ان کو رکن یمانی کہتے ہیں اور ﴿ ركن البيت ﴾ یعنی حجر اسود کا رخ بھی اسی طرف ہے اور یہ دونوں رکن حجر اسود اور دوسرا رکن وہ ہے جو کعبہ کے جنوب مغرب میں ہے۔ ان دونوں کا استلام اس وجہ سے ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی رکھی ہوئی بنیادوں پر قائم ہیں۔ دونوں شامی رکنوں کی یہ حیثیت نہیں ہے۔

(٦١٦) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ قَبَّلَ الْحَجَرَ الْأَسْوَدَ، وَقَالَ: إِنِّي أَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ، لاَ تَضُرُّ وَلاَ تَنْفَعُ، وَلَوْلاَ أَنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُقَبِّلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تو پتھر ہے کسی قسم کے نفع و نقصان کا مالک نہیں۔ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حجر اسود کو بوسہ اسے نفع و نقصان دینے والا سمجھ کر نہیں دیا جاتا۔ عمل تو صرف رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کی پیروی میں کیا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان سے مشرکین کے اس نظریہ کی تردید مقصود تھی جو پتھروں کو بذات خود نفع و نقصان کا مختار و مالک سمجھتے تھے۔

(٦١٧) وَعَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَطُوفُ بِالْبَيْتِ، وَيَسْتَلِمُ الرُّكْنَ بِمِحْجَنٍ مَّعَهُ، وَيُقَبِّلُ الْمِحْجَنَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو طفیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ کا طواف کرتے دیکھا ہے آپؐ نوکیلے سرے والی چھڑی جو آپؐ کے پاس تھی' سے حجر اسود کو چھوتے اور اس چھڑی کو بوسہ دیتے تھے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بمحجن ﴾ میم پر کسرہ۔ ٹیڑھے سرے والا ڈنڈا۔ خم دار چھڑی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر اژدھام اور رش زیادہ ہو اور حجراسود کو بوسہ دینا مشکل یا ناممکن نظر آئے تو چھڑی لگا کر اس چھڑی کو چوم لے۔ مسند احمد میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا "تو طاقتور اور زور آور آدمی ہے۔ حجراسود تک رسائی حاصل کرنا تیرے لئے کوئی دشوار کام نہیں ہے مگر دھکم پیل سے کمزوروں کو اذیت اور تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے اگر تمہیں فارغ وقت میسر آجائے تو ہاتھ سے مس کرلیا کرو بصورت دیگر حجراسود کے سامنے کھڑے ہو کر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ہی کہہ لیا کرو۔ اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ مناسک حج کے ادا کرتے ہوئے دوسروں کو تکلیف و اذیت دینا جائز نہیں اور اگر حجراسود کا استلام صرف ہاتھ کے اشارہ سے ہو تو ہاتھ کو چومنا نہیں چاہئے کیونکہ ہاتھ اور چھڑی وغیرہ کو تبھی بوسا دینا ہے جب وہ حجراسود سے لگیں۔

راوی حدیث: ﴿ابوالطفیل رضی اللہ عنہ﴾ عامر بن واثلہ لیثی کنانی رضی اللہ عنہ۔ حیات نبی ﷺ کے آٹھ سال پائے۔ ۱۰۰ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور ایک قول کے مطابق ۱۰۲ھ میں وفات پائی اور ایک قول ان کی وفات کے بارے میں ۱۰۳ھ کا بھی ہے۔ روئے زمین پر بسنے والے صحابہ کرامؓ میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے یہ خوش قسمت صحابی ہیں۔

(٦١٨) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: طَافَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مُضْطَبِعاً بِبُرْدٍ أَخْضَرَ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سبز چادر میں طواف کیا جس کو آپؐ نے دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿مضطبعا﴾ اضطباع سے ماخوذ ہے۔ اپنی چادر کے درمیانی حصہ کو اپنی دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈالنا۔ اس طرح دایاں کندھا ننگا و برہنہ رہتا ہے۔

حاصل کلام: اضطباع پہلے پہل عمرۃ القضاء میں کیا گیا کیونکہ اس وقت مشرکین کو یہ بتانا مقصود تھا کہ مسلمان جسمانی و بدنی طور پر کمزور نہیں۔ اس کے بعد ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق رمل اور اضطباع دونوں ہمیشہ کیلئے مسنون قرار پائے۔ اب اس طرح کے لباس کے علاوہ مردوں کیلئے دوسرے کسی بھی طرز و ڈھنگ کا لباس جائز نہیں۔ البتہ یہ اضطباع صرف پہلے سات چکروں کیلئے اور بعض نے کہا ہے کہ صرف رمل کی صورت میں اضطباع ہے بعد کے چار چکروں میں نہیں۔ (سبل)

راوی حدیث: ﴿یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابوصفوان تمیمی ہے۔ مکہ کے رہنے والے تھے اور قریش کے حلیف تھے۔ مشہور و معروف صحابی رسول ہیں۔ حنین' طائف اور تبوک کے معرکوں میں حاضر ہو کر داد شجاعت دیتے رہے۔ حضرات ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کی جانب سے عامل مقرر کئے جاتے رہے۔ تقریباً پچاس برس کی عمر تک بقید حیات رہے۔

(٦١٩) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ يُهِلُّ مِنَّا الْمُهِلُّ فَلاَ يُنْكَرُ عَلَيْهِ، وَيُكَبِّرُ مِنَّا الْمُكَبِّرُ فَلاَ يُنْكِرُ عَلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ لا الٰہ الا اللہ کہتے تھے' اسے بھی برا نہیں سمجھا جاتا تھا اور بعض ہم میں سے تکبیریں کہتے تھے ان کو بھی برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں منیٰ سے عرفات جانے کی کیفیت کا بیان ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس مقام پر تلبیہ کی جگہ تکبیر کہنا بھی صحیح اور درست ہے۔

(٦٢٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ فِي الثَّقَلِ، أَوْ قَالَ: فِي الضَّعَفَةِ، مِنْ جَمْعٍ، بِلَيْلٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے مسافروں کے سامان کے ساتھ (یا فرمایا) کہ کمزوروں کے ساتھ رات ہی کو مزدلفہ سے (منیٰ کی جانب) بھیج دیا تھا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فی الثقل ﴾ ثا اور قاف دونوں پر فتحہ۔ سامان مسافر ﴿ الضعفة ﴾ ضاد' عین اور فا پر فتحہ ضعیف کی جمع ہے۔ اس سے مراد خواتین' بچے' خادم وغیرہ ﴿ من الجمع ﴾ مزدلفہ سے منیٰ کی طرف لے جانے کیلئے مجھے بھیجا۔ ﴿ بلیل ﴾ رات کے وقت۔ طیبی کی رائے یہ ہے کہ کمزور و ضعیف حضرات کو اژدھام کی زحمت اور تکلیف سے بچنے کی غرض سے پہلے بھیج دینا مستحب ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کمزور حضرات کیلئے مزدلفہ میں پوری رات گزارے بغیر ہی منیٰ کی جانب روانگی کی رخصت ہے اور جو اس اژدھام اور کثرت میں آئے اس کیلئے مزدلفہ سے نماز فجر سے پہلے واپس روانہ ہونا جائز نہیں۔

(٦٢١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: اسْتَأْذَنَتْ سَوْدَةُ رَسُولَ اللهِ ﷺ لَيْلَةَ الْمُزْدَلِفَةِ أَنْ تَدْفَعَ قَبْلَهُ، وَكَانَتْ ثَبْطَةً، يَعْنِي ثَقِيْلَةً، فَأَذِنَ لَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے مزدلفہ کی رات آپؐ سے اجازت طلب کی کہ وہ آپؐ سے پہلے واپس آجائے (یہ اجازت انہوں نے اس لئے طلب کی) کہ بھاری جسم والی تھیں۔ (اس وجہ سے آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر چلتی تھیں) آپؐ نے ان کو اجازت دے دی۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: بیماری اور جسمانی کمزوری کے علاوہ بھاری بھرکم جسم بھی معذوری میں شامل ہے۔ ایسے حاجی کو بھی مزدلفہ میں پوری رات گزارے بغیر منیٰ کی طرف جانے کی رخصت و اجازت ہے۔

راوی حدیث ﴿ حضرت سودہ بنت زمعہ بن عبد شمس قرشیہ عامریہ رضی اللہ عنہا ﴾

ان کا کا شمار امہات المومنین میں ہوتا ہے مکہ مکرمہ ہی میں ابتدائی دور میں اسلام قبول کیا اور اپنے خاوند کے ساتھ دوسری بار ہجرت حبشہ میں شریک ہوئیں۔ ان کا خاوند وہاں فوت ہوگیا۔ تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح سے پہلے آپؐ نے ان سے نکاح کر لیا۔ اور ۵۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

(٦٢٢) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ لَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَرْمُوا الجَمْرَةَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَفِيهِ انْقِطَاعٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ "طلوع آفتاب سے پہلے کنکریاں نہ مارو۔" (اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں انقطاع ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رات کو رمی جائز نہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک رمی طلوع آفتاب کے بعد جائز ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک آدھی رات کے بعد جائز ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قادر اور باہمت آدمی طلوع فجر کے بعد رمی کرے۔ مجبور رات کو بھی کر سکتا ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ صرف طلوع آفتاب کے بعد ہی رمی کے قائل ہیں۔ ﴿وفیہ انقطاع﴾ اس کی سند منقطع ہے۔ اس لئے کہ اس کے راوی حسن عرنی کا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں۔

(٦٢٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَرْسَلَ النَّبِيُّ ﷺ بِأُمِّ سَلَمَةَ لَيْلَةَ النَّحْرِ، فَرَمَتِ الجَمْرَةَ قَبْلَ الفَجْرِ، ثُمَّ مَضَتْ، فَأَفَاضَتْ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ عَلَى شَرْطِ مُسْلِمٍ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو قربانی والی رات پہلے بھیج دیا تھا۔ انہوں نے فجر کے طلوع ہونے سے پہلے کنکریاں ماریں پھر جا کر طواف افاضہ کیا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ اس کی سند مسلم کی شرط پر ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿فرمت الجمرۃ قبل الفجر﴾ انہوں نے فجر سے پہلے رمی کی یہ رعایت صرف عورتوں کیلئے اور ان کمزوروں کیلئے ہے جو ان کے ہمراہ جائیں۔ اس حدیث سے یہ دلیل پکڑنا صحیح نہیں ہے کہ اس وقت ان مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ بھی دوسروں کیلئے کنکریاں مارنا جائز ہے۔ یہ حدیث پہلی حدیث سے سند کے اعتبار سے راجح ہے۔ اس لئے دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔

(٦٢٤) وَعَنْ عُرْوَةَ بْنِ مُضَرِّسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ

حضرت عروہ بن مضرس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو کوئی مزدلفہ میں ہماری

رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ شَهِدَ صَلاَتَنَا هَذِهِ، يَعْنِي بِالْمُزْدَلِفَةِ، فَوَقَفَ مَعَنَا حَتَّى نَدْفَعَ، وَقَدْ وَقَفَ بِعَرَفَةَ قَبْلَ ذَلِكَ لَيْلاً أَوْ نَهَاراً، فَقَدْ تَمَّ حَجُّهُ، وَقَضَى تَفَثَهُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

نماز میں شامل ہوا اور ہمارے ساتھ وقوف کیا یہاں تک کہ ہم نے کوچ کیا اور اس سے قبل عرفات میں رات یا دن میں قیام کر چکا ہو تو اس کا حج مکمل ہو گیا اور اس نے اپنی میل کچیل اتار لی۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿من شهد صلاتنا هذه﴾ جس نماز کیلئے اب ہم نکلے ہیں اس میں جو حاضر ہو گیا۔ ﴿ليلا او نهارا﴾ اس میں ایک فقہی مسئلہ بیان ہوا ہے کہ عرفہ کے روز زوال آفتاب کے بعد سے لے کر دسویں ذی الحجہ کی صبح تک جو عرفات میں قیام پذیر رہا اس نے حج پا لیا جیسا کہ خطابی نے کہا ہے۔ ﴿فقد تم حجه﴾ اس نے حج کو پورا کر لیا سے مراد ہے حج کا بڑا حصہ مکمل کر لیا۔ اس سے عرفہ کا وقوف مراد ہے کیونکہ اسی کے فوت ہونے کا خوف اور اندیشہ ہوتا ہے ﴿وقضى تفثه﴾ اس نے اپنے مناسک حج ادا کر لئے۔ "تفث" دراصل سر کے بال منڈوانے یا ترشوانے کے بعد محرم حلال ہونے کے موقع پر جو کچھ کرتا ہے اس میں اونٹوں کی قربانی اور دیگر سارے مناسک حج ادا کرنے بھی شامل ہیں کیونکہ "تفث" تو اس کے بعد ہی پورا ہوتا ہے۔ اصل میں "تفث" میل کچیل کو کہتے ہیں۔ اس حدیث کے شروع کا حصہ یوں ہے کہ عروہ بن مضرس نے فرمایا کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس مزدلفہ میں اس وقت پہنچا جب آپؐ نماز کیلئے تشریف لے جا رہے تھے۔ میں نے عرض کیا میں "طے" کے پہاڑوں سے آ رہا ہوں۔ میں نے اپنی سواری کو دوڑا دوڑا کر تھکا دیا ہے اور اپنے نفس کو مشقت میں مبتلا کیا ہے۔ خدا کی قسم میں ہر پہاڑ پر قیام کرتا رہا ہوں، کیا اب بھی مجھ پر حج کے کوئی ارکان باقی ہیں؟ پھر ساری حدیث ذکر کی۔

راوی حدیث: ﴿عروه بن مضرس رضی اللہ عنہ﴾ میم پر ضمہ، ضاد پر فتحہ اور راء مشدد اس کے نیچے زیر، سلسلہ نسب یوں ہے۔ ابن اوس بن حارثہ بن لام الطائی۔ حجۃ الوداع میں شامل ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ان سے دس احادیث مروی ہیں۔

(٦٢٥) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ الْمُشْرِكِينَ كَانُوا لاَ يُفِيضُونَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، وَيَقُولُونَ: أَشْرِقْ ثَبِيرُ! وَإِنَّ النَّبِيَّ ﷺ خَالَفَهُمْ، فَأَفَاضَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مشرکین طلوع آفتاب کے بعد واپس لوٹتے تھے اور کہتے تھے ثبیر تو (ایک پہاڑ کا نام) روشن ہو گیا اور نبی ﷺ نے ان کی مخالفت کی اور طلوع آفتاب سے پہلے واپس تشریف لے آئے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لايفيضون﴾ واپس نہیں آتے تھے یعنی مزدلفہ سے منیٰ کی جانب۔ ﴿اشرق﴾ اشراق

سے امر کا صیغہ ہے۔ اشراق کہتے ہیں روشنی میں دخول کو۔ یعنی چاہیئے کہ تجھ پر سورج طلوع ہو۔ ثبیر کی ثا پر فتحہ اور باء کے نیچے کسرہ۔ مبنی علم الضم ہے۔ نداء محذوف کا منادیٰ ہونے کی وجہ سے ثبیر ہے۔ منیٰ کی طرف جانے والے کے بائیں پہلو معروف پہاڑ کا نام ہے۔ مکہ کے بڑے عظیم پہاڑوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ قبیلہ ھذیل کے ثبیر نامی ایک شخص کے نام پر معروف ہوا۔ اسی پہاڑ پر وہ دفن ہوا۔ ایک روایت میں اتنا اضافہ بھی ہے "کیما نغیر" تاکہ ہم غارت گری کر سکیں۔ یا ہم چل سکیں۔ اس کے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں تاکہ ہم چلیں اور ہمارے گھوڑے ہمیں لے کر سرپٹ دوڑیں۔ اس حدیث سے یہ دلیل ملتی ہے کہ مزدلفہ سے واپسی طلوع آفتاب سے پہلے روشنی میں ہونی چاہیئے اور جو طلوع سورج تک وہاں وقوف نہ کر سکا اس کا وقوف فوت ہوگیا۔

(٦٢٦) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ وَأُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُم، قَالاَ: لَمْ يَزَلِ النَّبِيُّ ﷺ يُلَبِّي حَتَّى رَمَى جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما دونوں سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جمرہ عقبہ (چھوٹا شیطان) کو کنکری مارنے تک تلبیہ کہتے رہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿حتی رمی جمرۃ العقبۃ﴾ جمرہ عقبہ کو کنکری مارنے کے عمل سے فارغ ہونے کے بعد تلبیہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ یہ امام احمد رحمہ اللہ کی رائے ہے اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جونہی پہلی کنکری ماری جائے گی تلبیہ ختم ہو جائے گا۔

(٦٢٧) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ جَعَلَ الْبَيْتَ عَنْ يَسَارِهِ، وَمِنًى عَنْ يَمِيْنِهِ، وَرَمَى الْجَمْرَةَ بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ، وَقَالَ: هٰذَا مَقَامُ الَّذِي أُنْزِلَتْ عَلَيْهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے بیت اللہ کو اپنی بائیں جانب اور منیٰ کو اپنی دائیں جانب رکھا اور جمرہ کو سات سنگریزے مارے اور فرمایا کہ یہ ان کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے جن پر سورۂ بقرہ کا نزول ہوا تھا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿رمی الجمرۃ﴾ اس جمرہ سے جمرۃ العقبہ مراد ہے۔ ﴿انزلت علیہ سورۃ البقرۃ﴾ سورۂ کا بالخصوص ذکر اس لئے کیا کہ حج کے اکثر احکام اس میں بیان ہوئے ہیں۔ گویا اس سے اس پر متنبہ اور خبردار کرنا مقصود ہے کہ حج کے اعمال توقیفی ہیں۔ ان میں رد و بدل اور ترمیم و تنسیخ کا کوئی مجاز نہیں۔

راوی حدیث ﴿اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما﴾ ان کی کنیت ابومحمد یا ابوزید تھی۔ اسامہ کے همزہ پر ضمہ ہے۔ نسب نامہ اس طرح ہے۔ اسامہ بن زید بن حارثہ بن شراحیل کلبی۔ رسول اللہ ﷺ کے پیارے اور محبوب آزاد کردہ غلام کا بیٹا۔ ان کی والدہ محترمہ ام ایمن رسول اللہ ﷺ کی رضاعی والدہ۔ اپنی وفات سے

قبل ان کو ایسے لشکر کا سربراہ مقرر فرمایا جس میں اکابر صحابہ کرام ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ جیسے بھی شامل تھے۔ اس وقت اٹھارہ برس کے نوجوان تھے۔ یہ لشکر نبی ﷺ کی وفات کی وجہ سے روانہ نہ ہو سکا۔ بعد میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے روانہ فرمایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کی وفات ۵۴ھ میں ہوئی۔

(٦٢٨) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَمَى رَسُولُ اللهِ ﷺ الجَمْرَةَ يَوْمَ النَّحْرِ ضُحًى، وَأَمَّا بَعْدَ ذٰلِكَ، فَإِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جمرہ کو قربانی کے روز چاشت کے وقت کنکریاں ماریں اور اس روز کے بعد آفتاب ڈھلنے کے بعد۔ (مسلم)

حاصل کلام: پہلے روز زوال آفتاب سے پہلے کنکریاں مارنی چاہئیں اور باقی ایام میں زوال آفتاب کے بعد۔ اگر دس تاریخ کو زوال آفتاب سے پہلے کنکریاں نہ مار سکے تو پھر اسی روز زوال آفتاب کے بعد مارنی چاہئیں۔

(٦٢٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ كَانَ يَرْمِيْ الجَمْرَةَ الدُّنْيَا بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ، يُكَبِّرُ عَلَى إِثْرِ كُلِّ حَصَاةٍ، ثُمَّ يَتَقَدَّمُ، ثُمَّ يُسْهِلُ، فَيَقُومُ، فَيَسْتَقْبِلُ القِبْلَةَ، فَيَقُومُ طَوِيلاً، وَيَدْعُو، فَيَرْفَعُ يَدَيْهِ، ثُمَّ يَرْمِي الوُسْطَى، ثُمَّ يَأْخُذُ ذَاتَ الشِّمَالِ، فَيُسْهِلُ، وَيَقُومُ مُسْتَقْبِلَ القِبْلَةِ، ثُمَّ يَدْعُو، فَيَرْفَعُ يَدَيْهِ، وَيَقُوْمُ طَوِيلاً، ثُمَّ يَرْمِي جَمْرَةَ ذَاتِ العَقَبَةِ، مِنْ بَطْنِ الوَادِيْ، وَلاَ يَقِفُ عِنْدَهَا، ثُمَّ يَنْصَرِفُ، فَيَقُولُ: هٰكَذَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَفْعَلُهُ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ سب سے قریبی جمرہ کو سات سنگریزے مارتے اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہتے۔ پھر آگے تشریف لے جاتے اور میدان میں آکر کھڑے ہو جاتے اور قبلہ رخ ہو کر طویل قیام فرماتے اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا کرتے۔ پھر جمرہ وسطیٰ (درمیانہ شیطان) کو کنکریاں مارتے۔ پھر بائیں جانب ہو جاتے اور میدان میں آکر قبلہ رخ کھڑے ہو جاتے۔ پھر اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے اور دعا فرماتے اور طویل قیام فرماتے۔ اس کے بعد جمرۂ عقبہ کو کنکریاں وادی کی نچلی جگہ سے مارتے مگر وہاں قیام نہ فرماتے پھر واپس تشریف لے آتے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح عمل کرتے دیکھا ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ الجمرة الدنيا ﴾ دال پر ضمہ اور کسرہ دونوں طرح ہے۔ اس کے معنی قریب کے ہیں۔ مسجد خیف کے قریب ہونے کی وجہ سے اسے ﴿ الجمره الدنيا ﴾ کہا گیا ہے اور یہ پہلا جمرہ ہے جسے ایام تشریق میں کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ ﴿ ثم يسهل ﴾ یسھل میں "یا" پر ضمہ معنی اس کے

میدان کی طرف آنے کے ہیں۔ زمین کا نشیبی حصہ۔ ﴿ یرمی الوسطی ﴾ وسطیٰ سے مراد جمرہ ثانیہ (دوسرا جمرہ) جو دونوں جمروں کے درمیان ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ جمرہ کو سنگریزے مار کر وہیں کھڑے نہ رہتے بلکہ وہاں سے چل کر میدان میں آکھڑے ہوتے اور پورے اطمینان کے ساتھ قبلہ رخ ہو کر طویل دعا فرماتے۔ لہٰذا کنکریوں کے مارے جانے کے بعد وہیں کھڑے نہیں رہنا چاہئے بلکہ میدان میں کھلی جگہ آکر طویل دعا ہاتھ اوپر اٹھا کر کرنی چاہئے۔ اس طرح اژدھام کی زد سے بھی محفوظ رہے گا۔

(٦٣٠) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «اللَّهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِينَ»، قَالُوا: وَالْمُقَصِّرِيْنَ، يَا رَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ فِي الثَّالِثَةِ: «وَالْمُقَصِّرِينَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہی یہ حدیث بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "الٰہی سر منڈوانے والے حاجیوں پر رحم فرما۔" صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! بال ترشوانے والے پر بھی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا "بال ترشوانے والوں پر بھی۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ المحلقین ﴾ تحلیق سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حج اور عمرہ سے حلال ہونے کے موقع پر اپنے سر منڈواتے ہیں۔ حلق دراصل بالوں کو جڑوں تک صاف کر دینا۔ ﴿ والمقصرین ﴾ یہ عطف تلقین ہے یعنی آپ یہ کہیں قل والمقصرین اور تقصیر بال ترشوانے کو کہتے ہیں جن میں بال جڑ سے صاف نہیں کئے جاتے۔

(٦٣١) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ وَقَفَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ، فَجَعَلُوا يَسْأَلُونَهُ، فَقَالَ رَجُلٌ: لَمْ أَشْعُرْ، فَحَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَذْبَحَ، قَالَ: «اذْبَحْ وَلاَ حَرَجَ»، وَجَاءَ آخَرُ فَقَالَ: لَمْ أَشْعُرْ، فَنَحَرْتُ قَبْلَ أَنْ أَرْمِيَ، قَالَ: «ارْمِ وَلاَ حَرَجَ»، فَمَا سُئِلَ يَوْمَئِذٍ عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ وَلاَ أُخِّرَ إِلاَّ قَالَ: «افْعَلْ وَلاَ حَرَجَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع میں ایک مقام پر کھڑے ہوگئے۔ صحابہؓ نے آپؐ سے سوالات کرنے شروع کئے۔ کسی نے کہا مجھے علم نہیں تھا میں نے قربانی سے پہلے حجامت بنوا لی۔ آپؐ نے اسے فرمایا قربانی کرو کوئی حرج نہیں اور ایک آدمی نے عرض کیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کر لی۔ آپؐ نے اسے فرمایا "اب کنکریاں مار لے کوئی حرج نہیں۔" اس روز آپؐ سے کسی عمل کے مقدم و مؤخر کرنے کے متعلق استفسار پر آپؐ نے فرمایا "جاؤ اب کر لو' کوئی حرج نہیں۔"

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وقف فی حجة الوداع ﴾ دسویں ذی الحجہ کے روز زوال آفتاب کے بعد جب آپؐ اپنی سواری پر سوار رہتے ہوئے جمرہ کے پاس خطاب فرمانے کھڑے ہوتے۔ ﴿ لم اشعر ﴾ اشعر میں عین پر ضمہ، معنی ہے مجھے اس کا علم نہیں ہوا۔ میں سمجھ نہ سکا۔ ﴿ قدم ولا اخر ﴾ قدم، اخر دونوں باب تفعیل سے ماخوذ ہیں صیغۂ مجہول ہیں۔ یاد رہے کہ قربانی کے روز حجاج کرام کے ذمہ چار کام بالترتیب انجام دینا ہوتے ہیں۔ پہلا جمرہ عقبہ کو سنگریزے مارنا۔ دوسرا قربانی کرنا۔ تیسرا سر منڈانا یا بال ترشوانا۔ چوتھا طواف افاضہ۔ علماء کا اس پر تو اتفاق و اجماع ہے کہ یہ ترتیب شرعی طور پر مطلوب و مقصود ہے لیکن ان کے درمیان بعض معمولات کے آگے پیچھے ہونے کے جواز میں اختلاف ہے۔ اسی طرح یہ ترتیب آگے پیچھے ہونے پر وجوب دم میں بھی اختلاف ہے اور اس حدیث سے ان حضرات کی تائید ہوتی ہے جو تقدیم و تاخیر کے جواز کے قائل ہیں اور دم کے بھی قائل نہیں ہیں۔

(٦٣٢) وَعَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَحَرَ قَبْلَ أَنْ يَحْلِقَ، وَأَمَرَ أَصْحَابَهُ بِذٰلِكَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود قربانی حجامت کرانے سے پہلے کی اور اپنے صحابہؓ کو بھی اس کا حکم دیا۔ (بخاری)

راوی حدیث: ﴿ مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہما ﴾ مسور کے میم کے نیچے کسرہ ہے۔ سین ساکن اور "واؤ" پر فتحہ، بن مخرمہ۔ مخرمہ میں میم پر فتحہ اور "خاء" ساکن اور "راء" پر فتحہ۔ زہری قرشی ہیں۔ صاحب فضل لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مکہ منتقل ہو گئے۔ یزید بن معاویہ نے جب ۶۴ھ کے آغاز میں مکہ کا محاصرہ کیا تو اس وقت نماز پڑھتے ہوئے ان کو منجنیق کا گولہ آکر لگا اور وہ وفات پا گئے۔

(٦٣٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا رَمَيْتُمْ وَحَلَقْتُمْ، فَقَدْ حَلَّ لَكُمُ الطِّيبُ، وَكُلُّ شَيْءٍ، إِلاَّ النِّسَاءَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب کنکریاں مار چکو اور سر کے بال منڈوا لو تو تمہارے لئے خوشبو اور بیویوں کے علاوہ ہر چیز حلال ہو گئی۔" (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا اور اس کی سند میں ضعف ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ الا النساء ﴾ یعنی بیویوں سے مجامعت جائز نہیں کیونکہ بیویوں سے مباشرت و ہم بستری طواف افاضہ کے بعد جائز ہوتی ہے ﴿ وفی سندہ ضعف ﴾ اس لئے کہ اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ ایسا راوی ہے جس کے متعلق کلام ہے۔

(٦٣٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم

اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَيْسَ عَلَى النِّسَاءِ حَلْقٌ، وَإِنَّمَا عَلَى النِّسَاءِ التَّقْصِيرُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

ﷺ نے فرمایا کہ ”عورتوں کیلئے سر منڈوانا نہیں بلکہ ان کیلئے صرف بال ترشوانا ہے۔“ (اسے ابوداؤد نے حسن سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خواتین کو سر کے بال منڈوانا نہیں بلکہ انہیں صرف بال کترانا چاہئے اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کیلئے بال کترانا ہی مشروع ہے۔

(٦٣٥) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ العَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ المُطَّلِبِ اسْتَأْذَنَ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَن يَبِيْتَ بِمَكَّةَ لَيَالِيَ مِنًى، مِنْ أَجْلِ سِقَايَتِهِ، فَأَذِنَ لَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی کہ وہ منیٰ والی راتیں مکہ میں کاٹے تاکہ وہ آب زمزم پلا سکیں تو آپؐ نے ان کو اجازت دے دی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ليالى منى﴾ منیٰ کی راتوں سے مراد' ۱۱ ویں' ۱۲ ویں اور ۱۳ ویں کی راتیں ہیں۔ یہ اجازت انہوں نے اس مقصد اور غرض کیلئے طلب کی کہ وہ اور اس کے ساتھی رات کو آب زمزم کھینچ کر حوض بھر لیتے تھے اور فی سبیل اللہ اس کو تقسیم کرتے تھے۔ ”فاذن لہ“ یہ اجازت اس بات کی دلیل ہے کہ جو لوگ معذور نہ ہوں ان کو منیٰ ہی میں یہ راتیں گزارنی واجب ہیں اور جس کو کوئی عذر پیش آجائے مثلاً منیٰ میں خیمے میں آگ بھڑک اٹھے اور طویل رات گزارنا ناممکن و مشکل نظر آئے تو وہاں رات گزارنا ضروری نہیں اور تیسری رات بھی وہاں گزارنا واجب نہیں کیونکہ جو شخص جلدی کر کے دو دن ہی منیٰ میں رہ کر چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے۔

(٦٣٦) وَعَنْ عَاصِمِ بْنِ عَدِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَرْخَصَ لِرُعَاةِ الإِبِلِ فِي البَيْتُوتَةِ عَنْ مِنًى، يَرْمُونَ يَوْمَ النَّحْرِ، ثُمَّ يَرْمُونَ الغَدَ وَمِنْ بَعْدِ الغَدِ لِيَوْمَيْنِ، ثُمَّ يَرْمُونَ يومَ النَّفْرِ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹ کے چرواہوں کو منیٰ سے باہر رات گزارنے کی اجازت دے دی کہ قربانی کے دن کنکریاں ماریں پھر دوسرے اور تیسرے دو روز بھی کنکریاں ماریں پھر کوچ کے روز سنگریزے ماریں۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے' ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ارخص﴾ اور ایک نسخہ میں رخص ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی رخصت و اجازت دے دی۔ ﴿رعاة﴾ ”را“ پر ضمہ راع کی جمع ہے۔ ﴿فى البيتوتة﴾ بات کا مصدر ہے۔ رات

گزارنا کے معنی ہیں اور رات گزارنے سے مراد منیٰ میں مذکورہ راتوں میں سے رات کا بسر کرنا۔ عن منی عن یہاں بعد اور دوری کیلئے ہے۔ یعنی منیٰ سے باہر اس سے دور رہتے ہوئے یعنی نبی کریم ﷺ نے انہیں اپنے اونٹوں کی دیکھ بھال اور منیٰ سے دوران کی حفاظت و حراست کیلئے منیٰ میں رات نہ گزارنے کی اجازت دے دی۔ ﴿ ثم یرمون الغد ومن بعد الغد لیومین ﴾ یعنی وہ گیارہ اور بارہ ذوالحجہ کو کنکریاں مارتے تھے۔ مراد ہے کہ وہ دو دن کی رمی کو جمع کرتے تھے۔ ﴿ ثم یرمون یوم النفر ﴾ منی سے واپسی کا دن اور اس سے مراد ہے تیرہویں تاریخ۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ عام حاجیوں کیلئے منیٰ میں شب باشی واجب ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ رخصت و اجازت واجب ہی کی صورت میں ہوتی ہے ورنہ اجازت کی ضرورت ہی نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوعبیداللہ یا ابوعمرو ہے۔ بنو عبید بن زید کے حلیف تھے۔ بنو عبید کا تعلق بنو عمرو بن عوف جو انصار سے تھے' کے ساتھ تھا۔ غزوۂ بدر اور بعد کے غزوات میں حاضر رہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بدر کے روز یہ قبائل عالیہ پر امیر تھے۔ نبی ﷺ نے ان کیلئے حصہ مقرر فرمایا۔ ۴۵ھ میں فوت ہوئے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ جنگ یمامہ کے روز شہید ہوئے اس وقت ان کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔

(٦٣٧) وَعَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ النَّحْرِ، اَلْحَدِيْثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانی کے روز خطبہ دیا اور ساری حدیث ذکر کی۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: حج کے دورانیہ میں نبی کریم ﷺ سے کئی خطبے ثابت ہیں۔ مالکیہ اور احناف کے نزدیک ایک خطاب ساتویں ذی الحجہ کو اور دوسرا عرفہ میں اور تیسرا گیارہویں ذی الحجہ کو۔ دسویں ذی الحجہ یعنی قربانی کے دن کے خطاب کو مالکیہ اور حنفیہ خطبہ نہیں صرف چند نصیحتیں کہتے ہیں۔ یہ عید کا خطبہ نہیں کیونکہ آنحضور ﷺ نے نماز عید تو ادا فرمائی نہیں تھی۔ بعض اسے بھی خطبہ ہی کہتے ہیں اس طرح چار خطبے مسنون ہو جاتے ہیں۔

(٦٣٨) وَعَنْ سَرَّآءَ بِنْتِ نَبْهَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَومَ الرُّءُوسِ فَقَالَ: «أَلَيْسَ هَذَا أَوْسَطَ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ؟». اَلْحَدِيْثَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت سراء بنت نبھان رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سروں والے دن خطاب فرمایا اور فرمایا "کیا یہ دن ایام تشریق کا درمیانہ دن نہیں ہے؟" اور ساری حدیث ذکر کی۔ (اسے ابوداؤد نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یوم الرووس ﴾ اس میں سب کا اتفاق ہے کہ یوم الرؤس سے ذوالحجہ کی ۱۲ ویں تاریخ مراد ہے۔ اس کا نام یوم الرؤس اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس روز کثرت سے قربانی کے جانوروں کے

سروں کو پکایا اور کھایا جاتا ہے۔ ﴿ اوسط ایام التشریق ﴾ سبل السلام میں ہے کہ اس سے اس دن کے افضل ہونے کا بھی احتمال ہے اور اوسط سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ دونوں کے درمیان میں واقع ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یوم النحر بھی ایام تشریق میں شامل ہے مگر بہت سے علماء کی رائے یہ ہے کہ ایام تشریق سے مراد قربانی کے دن کو چھوڑ کر باقی تین دن ہیں کیونکہ وہاں کے لوگ ان تین ایام میں قربانی کے گوشت کو خشک کرنے کیلئے دھوپ میں رکھتے تھے۔ اس لئے ان ایام کا نام ایام تشریق ہے۔

راوی حدیث: ﴿ سراء بنت نبهان رضی اللہ عنہا ﴾ سراء کے را پر فتحہ اور تشدید اور نبھان کے نون پر فتحہ اور با ساکن ہے۔ قبیلہ غنو سے تھیں۔ ربیعہ بن عبدالرحمٰن نے اس سے روایت بیان کی ہے۔

(٦٣٩) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهَا: «طَوَافُكِ بِالبَيْتِ، وَسَعْيُكِ بَيْنَ الصَّفَا وَالمَرْوَةِ، يَكْفِيكِ لحَجِّكِ وَعُمْرَتِكِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "تیرا بیت اللہ کا طواف کر لینا صفا اور مروہ کے مابین سعی کر لینا حج اور عمرے کیلئے کافی ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: معلوم رہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تلبیہ عمرہ کا کہا تھا۔ مگر وہ ایام ماہواری میں مبتلا ہوگئیں تو ان سے نبی ﷺ نے فرمایا "عمرے کو چھوڑ دو اور ان سے فرمایا کہ حج کا احرام باندھ لو۔" ﴿ رفضها ﴾ کے معنی ہیں اسے ترک کر دے اور عمرے کے اعمال و افعال کو نظرانداز کر دے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عمرے سے نکل جا اور اسے باطل کر دے۔ یہ ابطال کا فعل حج اور عمرہ میں صحیح نہیں بجز اس صورت کے کہ احکام سے فراغت کے بعد حلال ہو جائے۔ جب انہوں نے حج کا احرام باندھ لیا تو اب وہ قارنہ بن گئیں۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ قارن کیلئے حج اور عمرہ دونوں کیلئے ایک ہی طواف اور ایک ہی سعی کافی ہے۔

(٦٤٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمْ يَرْمُلْ فِي السَّبْعِ الَّذِيْ أَفَاضَ فِيْهِ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ التِّرمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے طواف افاضہ میں طواف کے سات چکروں (پھیروں) میں کسی چکر میں بھی رمل نہیں فرمایا۔" (اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فی السبع الذی افاض فیه ﴾ طواف افاضہ کے طواف کے سات پھیرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طواف افاضہ میں رمل نہیں اور نہ ہی طواف وداع میں۔ رمل صرف طواف قدوم میں ہے۔ طواف قدوم اس طواف کو کہتے ہیں جو مکہ میں پہلے داخلہ کے وقت کیا جاتا ہے۔ نیز یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ رمل صرف مردوں کیلئے ہے۔ خواتین کیلئے نہیں ہے ہاں اگر

کسی وجہ سے کسی حاجی کا طواف قدوم میں رمل چھوٹ گیا ہو تو اس کی تلافی کیلئے طواف افاضہ میں رمل کر لے۔

(٦٤١) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى الظُّهْرَ وَالعَصْرَ وَالمَغْرِبَ وَالعِشَاءَ، ثُمَّ رَقَدَ رَقْدَةً بِالمُحَصَّبِ، ثُمَّ رَكِبَ إِلَى البَيْتِ، فَطَافَ بِهِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے (بالترتیب اپنے اپنے وقت میں) ظہر اور عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھیں اور پھر مقام محصب پر تھوڑا سو گئے پھر سوار ہو کر بیت اللہ کی جانب تشریف لے گئے اور طواف کیا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ رقد رقدۃ ﴾ یعنی تھوڑا سا سو گئے۔ ﴿ بالمحصب ﴾ محصب اس جگہ کا نام ہے جہاں آپؐ نے نمازیں ادا فرمائیں اور استراحت بھی فرمائی اور یہ کوچ کا آخری دن تھا۔ یعنی ایام تشریق کا تیسرا دن۔ محصب بروزن محمد۔ جگہ کا نام ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان پھیلی ہوئی ہے۔ وہ بہ نسبت مکہ سے منیٰ کے زیادہ قریب ہے اسے ابطح اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے ہیں۔ فطاف بہ۔ اس سے طواف وداع مراد ہے اور یہ حج کا سب سے آخری طواف ہوتا ہے۔

(٦٤٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّهَا لَمْ تَكُنْ تَفْعَلُ ذٰلِكَ - أَيِ النُّزُولَ بِالأَبْطَحِ - وَتَقُولُ: إِنَّمَا نَزَلَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ لِأَنَّهُ كَانَ مَنْزِلاً أَسْمَحَ لِخُرُوجِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ ابطح (محصب) میں فروکش ہونے کا عمل نہیں کرتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مقام پر اس لئے قیام فرمایا تھا کہ یہاں سے واپسی میں آسانی و سہولت زیادہ تھی۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بالا بطح ﴾ ابطح سے محصب مراد ہے۔ ﴿ اسمح ﴾ زیادہ سہل و آسان ﴿ لخروجہ ﴾ مکہ سے مدینہ کو جانے کیلئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محصب میں قیام کرنا ان مناسک حج میں سے نہیں ہے جو مستحب ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ آپؐ اس مقام پر اس لئے اترے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں قریش نے بنو ہاشم سے نبوت کے ساتویں سال میں قطع تعلق کا عہد و پیمان کیا اور وہاں بیٹھ کر اس بائیکاٹ کا معاہدہ لکھا اور نبی ﷺ یہاں اللہ کا شکر ادا کرنے کیلئے اترے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور اپنے رسول کو غلبہ عطا فرمایا۔ اس لئے ان کا قول ہے کہ حاجیوں کو یہاں فروکش ہونا چاہئے۔ مگر میرے نزدیک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہی درست ہے۔ واللہ اعلم۔

(٦٤٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالبَيْتِ، إِلاَّ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ سب سے آخر میں تمہارا عمل بیت اللہ کا طواف ہو مگر ایام ماہواری والی

أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الحَائِضِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. عورتوں کیلئے تخفیف کر دی گئی ہے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: یہ طواف وداع ہے جو سب مناسک حج کے اتمام و اختتام پر کیا جاتا ہے۔ یہ طواف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سوا سب کے نزدیک واجب ہے۔ اگر کسی وجہ سے رہ جائے تو دم دینا پڑتا ہے مگر ان عورتوں کیلئے معاف ہے جو ایام ماہواری میں ہوں۔

(٦٤٤) وَعَنِ ابْنِ الزُّبَيْرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلاَةٌ فِي مَسْجِدِي هَذَا، أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلاَةٍ فِيمَا سِوَاهُ، إِلاَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ، وَصَلاَةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، أَفْضَلُ مِنْ صَلاَةٍ فِي مَسْجِدِي هَذَا بِمِائَةِ صَلاَةٍ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "میری اس مسجد میں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب دوسری مساجد میں نماز ادا کرنے کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ ہے۔ بجز مسجد حرام کے اور مسجد حرام میں ایک نماز کی ادائیگی میری اس مسجد میں سو نماز پڑھنے سے افضل ہے۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں مسجد نبویؐ اور بیت اللہ میں نماز پڑھنے کا ثواب مذکور ہے۔ آپؐ نے اپنی مسجد کی طرف لفظ ھذا سے جو اشارہ فرمایا ہے اس سے یہ مطلب مفہوم ہوتا ہے کہ جتنی مسجد نبوی عہد نبوی میں تھی اس میں ایک نماز کا ثواب دوسری مساجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ بعد کے ادوار میں جو اضافے اور وسعت ہوئی ہے وہ گویا اس میں شامل نہیں مگر اضافہ شدہ حصہ بھی چونکہ اصل مسجد نبوی کے ساتھ ملحق ہے اس لئے وہ بھی مسجد نبوی کے حکم میں ہے اور اس میں بھی ثواب اسی قدر ملے گا جو حدیث میں بیان ہوا ہے۔ طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ مسجد اقصیٰ میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب پانچ صد نمازوں کے ثواب کے برابر ملتا ہے اور مسجد نبویؐ میں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب ایک ہزار نمازوں کے برابر اور مسجد حرام میں ایک نماز کی ادائیگی کا دوسری مساجد میں ایک لاکھ پڑھی جانے والی نمازوں کے برابر ثواب ملتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابن الزبیر رضی اللہ عنہما﴾ ان کی کنیت ابوبکر ہے۔ نام ان کا عبداللہ بن زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ ہے۔ قریش کے قبیلہ اسد سے ہیں۔ اس لئے قرشی اسدی کہلائے۔ ان کی والدہ محترمہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا ہجرت مدینہ کے وقت حمل سے تھیں۔ جوں ہی یہ قباء پہنچیں ابن زبیر کی ولادت ہوگئی۔ ہجرت کے بعد پیدا ہونے والا یہ پہلا نومولود تھا۔ بکثرت روزے رکھتے۔ بہت نمازیں پڑھتے۔ بڑے جسیم اور مضبوط گرفت کے مالک تھے۔ فصیح اللسان تھے۔ حق و صداقت کو قبول کرنے والے اور رشتہ داروں کے دکھ تکلیف کو پہنچنے والے تھے۔ ۶۴ھ میں یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد ان کی بیعت کی گئی۔ حجاز' عراق' یمن' مصر اور اکثر علاقہ شام پر یہ غالب آئے۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے مکہ میں ان کا محاصرہ کر لیا اور ان

کو ۷۳ھ میں پھانسی پر لٹکا کر شہید کر دیا گیا۔

٦ - بَابُ الفَوَاتِ وَالإِحْصَارِ حج سے رہ جانے اور روکے جانے کا بیان

(٦٤٥) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: قَدْ أُحْصِرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَحَلَقَ رَأْسَهُ، وَجَامَعَ نِسَاءَهُ، وَنَحَرَ هَدْيَهُ، حَتَّى اعْتَمَرَ عَاماً قَابلاً . رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دیا گیا تو آپؐ نے اپنا سر منڈوایا اور قربانی کی اور اپنی ازدواج سے تعلق زن و شو قائم کیا یہاں تک کہ آپؐ نے آئندہ سال عمرہ کیا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ باب الفوات والاحصار ﴾ فوات کے فاء پر فتحہ۔ یعنی اس کا کیا حکم ہے۔ جس نے حج کا احرام باندھا ہو مگر وہ حج نہ کر سکے۔ جیسے وہ شخص جو عرفہ میں اس وقت پر نہ پہنچ سکا جس میں وقوف عرفہ ضروری اور فرض ہے اور احصار کے معنی رکنا ہے۔ جیسے کوئی بیمار ہو جائے یا پہنچنے سے عاجز ہو جائے یا اس کے اور بیت اللہ کے درمیان دشمن حائل ہو جائے جو اسے بیت اللہ پہنچنے میں رکاوٹ ہو۔ جب دشمن کی وجہ سے پہنچنا ناممکن ہو تو دشمن کی اس رکاوٹ و ممانعت کو حصر کہتے ہیں۔ ﴿ احصر ﴾ صیغۂ مجہول یعنی عمرہ سے روک دیا گیا۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ٦ھ میں پیش آیا تھا۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ محصر کو جہاں روک دیا گیا ہو وہیں احرام کھول کر حلال ہو جائے اور وہیں اپنی قربانی کر دے۔ ﴿ حتی اعتمر عاما قابلا ﴾ حتی کہ آئندہ سال عمرہ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عمرہ کی قضا واجب ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ یہی خبر ہے کہ آپؐ نے کیا اور یہ وجوب کو مقتضی نہیں ہے بلکہ اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ یہ عمرہ آپؐ کا پہلے عمرہ کی قضا تھی۔ بلکہ یہ تو مستقل طور پر دوسرا عمرہ تھا اور اس کا نام عمرة القضاء تو صرف اس لئے رکھا گیا کہ حدیبیہ کے موقع پر اس مسئلہ کا فیصلہ دونوں فریق کیلئے تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں صلح حدیبیہ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ٦ھ میں رسول اللہ ﷺ احرام بند ہو کر اپنے اصحاب کے ہمراہ مکہ کی طرف آئے۔ مشرکین نے حدیبیہ کے مقام پر آگے بڑھنے سے روک دیا۔ آپؐ نے وہیں احرام کھول دیا' قربانی کی اور سر کے بال منڈائے۔ صحابہ نے بھی تھوڑے سے تامل کے بعد احرام کھول دیئے اور جن کے پاس قربانی کے جانور تھے وہیں نحر و ذبح کر دیئے۔

احصار میں کون سی چیزیں شمار ہوتی ہیں۔ جمہور کہتے ہیں کہ حج و عمرہ کے بجالانے میں جو چیز بھی مانع ہو اور رکاوٹ بنے اسی سے احصار پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر بعض کہتے ہیں کہ احصار صرف دشمن کے مانع آنے کی صورت ہی میں ہوتا ہے۔ محصر کی قربانی کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا مذہب ہے

کہ جس جگہ احرام کھولا جائے اسی جگہ قربانی کر دی جائے گی خواہ وہ جگہ حل ہو یا حرم اور یہی قول راجح ہے۔ مگر احناف کے نزدیک قربانی ہر صورت میں حرم میں ذبح و نحر ہونی چاہئے اور اسے کسی کے ذریعہ سے حرم میں بھیج دیا جائے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر قربانی کا جانور حرم میں پہنچانا ناممکن ہو تو جہاں ہو وہیں ذبح کر دے۔ رہا یہ مسئلہ کہ محصر پر قربانی واجب ہے یا نہیں اکثر علماء تو اسے واجب کہتے ہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ واجب نہیں کیونکہ حضور ﷺ کے تمام اصحاب کے پاس ہدی تو نہیں تھی اگر واجب ہوتی تو پھر سب کیلئے اس کا وجوب ہوتا۔ حالانکہ ایسا ثابت نہیں اور یہی بات راجح معلوم ہوتی ہے۔

(٦٤٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى ضُبَاعَةَ بِنْتِ الزُّبَيْرِ ابْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي أُرِيْدُ الْحَجَّ، وَأَنَا شَاكِيَةٌ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «حُجِّي وَاشْتَرِطِي أَنَّ مَحِلِّي حَيْثُ حَبَسْتَنِي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے۔ اس نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں حج کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں مگر میں بیمار ہوں۔ نبی ﷺ نے اسے فرمایا کہ "حج کر مگر یہ شرط کر لے کہ میرے احرام کھولنے کی جگہ وہی ہوگی جہاں اے اللہ! تو نے مجھے روکا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿شاكية﴾ بیمار۔ ﴿محلي﴾ میم پر فتحہ اور "حا" کے نیچے کسرہ یعنی حج سے خروج کا وقت اور احرام کھول کر میرے حلال ہو جانے کی جگہ۔ یعنی وقت اور مقام دونوں کا بیان مقصود ہے۔ ﴿حبستني﴾ صیغۂ مخاطب یعنی اے اللہ! جہاں تو مجھے روک لے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام میں شرط لگانا صحیح ہے۔ شرط لگانے والے کو جب کوئی مانع پیش ہو جائے تو محصر کی طرح اس پر قربانی وغیرہ کرنا لازم نہیں۔

(٦٤٧) وَعَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ الْحَجَّاجِ بْنِ عَمْرٍو الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ كُسِرَ أَوْ عَرِجَ فَقَدْ حَلَّ، وَعَلَيْهِ الْحَجُّ مِنْ قَابِلٍ»، قَالَ عِكْرِمَةُ: فَسَأَلْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ وَأَبَا هُرَيْرَةَ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالاَ: صَدَقَ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ نے حجاج بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کا پاؤں توڑا جائے یا لنگڑا ہو جائے وہ احرام سے باہر آگیا اب اس پر آئندہ سال حج کرنا لازمی و ضروری ہے۔" عکرمہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو ان دونوں نے جواب دیا کہ حجاج بن عمرو نے ٹھیک اور سچ کہا ہے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔)

قَالَ مُصَنِّفُهُ - حَافِظُ العَصْرِ، قَاضِي القُضَاةِ أَبُو الفَضْلِ أَحْمَدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ حَجَرِ الكَنَانِيُّ العَسْقَلَانِيُّ المِصْرِيُّ، أَبْقَاهُ اللَّهُ فِي خَيْرٍ -: آخِرُ الجُزْءِ الأَوَّلِ، وَهُوَ النِّصْفُ مِنْ هٰذَا الكِتَابِ المُبَارَكِ، قَالَ: وَكَانَ الفَرَاغُ مِنْهُ فِي ثَانِي عَشَرَ شَهْرِ رَبِيعٍ الأَوَّلِ سَنَةَ سَبْعٍ وَعِشْرِيْنَ وَثَمَانِمِائَةٍ، وَهُوَ آخِرُ رُبْعِ العِبَادَاتِ، يَتْلُوْهُ فِي الجُزْءِ الثَّانِي كِتَابُ البُيُوعِ. وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً دَائِماً أَبَداً. غَفَرَ اللَّهُ لِكَاتِبِهِ وَلِوَالِدَيْهِ وَلِكُلِّ المُسْلِمِيْنَ، وَحَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الوَكِيْلُ.

بلوغ المرام کے مصنف حافظ العصر' قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ابوالفضل احمد بن علی بن حجرالکنانی العسقلانی مصری اللہ تعالیٰ ان کو بھلائیوں میں ہمیشہ زندہ رکھے نے کہا ہے کہ اتنا حصہ جزء اول کا آخری حصہ ہے اور وہ اس کتاب کا نصف ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں ۸۲۷ھ ماہ ربیع الاول کی ۱۲/ تاریخ کو اس سے فارغ ہوا اور یہ عبادات کے چوتھائی کا آخری حصہ ہے۔ اب اس کے ساتھ دوسرا نصف کتاب البیوع کا آغاز ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے کاتب اور اس کے والدین اور جمیع مسلمین کو اپنے دامن مغفرت میں ڈھانپ لے اور اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

لغوی تشریح: ﴿کسر﴾ صیغۂ مجہول۔ ﴿اوعرج﴾ عین اور را دونوں پر فتحہ۔ پاؤں میں ایسی چوٹ آنا جو پیدائشی نہ ہو اور جب پیدائشی ہو تو اس صورت میں عرج را کو کسرہ سے پڑھا جائے گا۔ ﴿فقد حل﴾ یعنی اس کیلئے احرام ترک کر دینا جائز ہے اس کے بعد وہ اپنے وطن اور گھر کی طرف لوٹ سکتا ہے۔ ﴿وعلیہ الحج من قابل﴾ آئندہ سال حج کی قضائی دے گا جبکہ یہ فرضی حج ہو لیکن اگر حج نفلی ہو تو پھر کچھ بھی نہیں۔ اس سلسلے میں علامہ الیمانی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا تینوں احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ محرم احرام سے تین امور کی وجہ سے نکل سکتا ہے۔ (۱) احصار کی وجہ سے۔ یہ احصار خواہ کسی مانع کی وجہ سے پیدا ہوا ہو۔ (۲) اس نے شرط کر لی ہو۔ (۳) کسی حادثہ کی وجہ سے پاؤں وغیرہ میں چوٹ آگئی ہو یا وہ لنگڑا ہوگیا ہو۔ جس شخص کا حج احصار کے علاوہ کسی دوسری وجہ سے فوت ہوا ہو اس کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ حج اور عمرہ کیلئے جو احرام باندھا تھا اس سے حلال ہو جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ عمرہ کے لئے تلبیہ کہے گا اور از سر نو دوبارہ احرام باندھے گا پھر جس کا حج فوت ہو جائے اس کیلئے دم دینے میں اختلاف ہے۔ ظاہر بات یہی ہے کہ دم دینا واجب نہیں ہے۔ (دم دینا --- یعنی قربانی کرنا)

حدیث کے بعد والی عبارت ۱۲۹۹ھ کے مطبوعہ نسخہ مطبع صدیقیہ جو بھوپال کا ایک سرکاری مطبع ہے میں موجود ہے۔ یہ نواب صدیق حسن خاں کے زمانہ کا مطبع ہے۔ اس طباعت کی چند خصوصیات و امتیازات ہیں۔ یہ مطبوعہ نسخہ شیخ الاسلام زکریا بن محمد انصاری کے تحریر کردہ مخطوطہ نسخہ سے لیا گیا ہے جو مؤلف کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اس نسخہ کو اول تا آخر پوری احتیاط اور تحقیق سے ان کے روبرو پڑھا۔ اس مخطوطہ نسخہ میں ان کے بڑے بڑے شاگردوں کے نام بھی ہیں جنھوں نے شیخ الاسلام زکریا کے سامنے اس نسخہ کو پڑھا تھا۔ انہوں نے اس میں اپنے اپنے دستخطوں اور مہروں کے ساتھ اپنی شنید اور سنی ہوئی باتیں اور پیغامات اور اجازات کو ثبت کر دیا۔ مثلاً امام یوسف جو مصنف کی اولاد ہیں۔ شیخ عبدالباسط بن احمد ھیثمی' ازھری' شیخ محمد بن عبداللطیف ملیجی اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مشائخ کا ذکر ہے۔ اس نسخہ کی طباعت نواب صدیق حسن خاں والی بھوپال کی زیر نگرانی ہوئی اور اس کی مراجعت و تصحیح بڑے بڑے محققین علماء نے فرمائی اور اس کے آخر میں کچھ کلمات جناب شیخ علی علاء الدین آلوسی مؤلف روح المعانی کے پوتے کے ہیں جو جمادی الاولیٰ ۱۲۹۹ھ میں بھوپال میں تشریف لائے تھے۔

راوی حدیث: ﴿ضباعۃ بنت زبیر﴾ ان کی کنیت ام حکیم ہے۔ ضباعہ کے ضاد پر ضمہ۔ پورا نام ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب بن ھاشم بن عبد مناف ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی چچا زاد بہن ہیں۔ مقداد بن اسود کی اہلیہ تھیں اور ان کے دو بچے عبداللہ اور کریمہ تھے۔ حضرت علیؓ کی خلافت میں فوت ہوئیں۔

﴿عکرمۃ﴾ عکرمہ کے عین پر کسرہ' کاف ساکن اور راء پر کسرہ۔ ابو عبداللہ کنیت۔ عکرمہ مدنی' عبداللہ بن عباسؓ کے غلام تھے۔ بربر قبیلہ سے تھے۔ بڑے بڑے علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ فقہاء مکہ میں سے تھے۔ تابعین کے درمیانے درجے میں شامل ہیں۔ ۱۰۷ھ میں اسی سال کی عمر پاکر فوت ہوئے۔ بعض نے سن وفات میں اختلاف کیا ہے۔

﴿حجاج بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ﴾ ان کا پورا نام حجاج بن عمرو بن غزیہ انصاری مازنی مدنی ہے۔ شرف صحابیت سے سرفراز ہیں۔ حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ صفین میں شامل ہوئے۔ ان سے دو احادیث مروی ہیں' جن میں سے ایک یہ ہے۔